جنرل پرویز مشرف کا دورِ اقتدار

سیاسی، نظریاتی اور آئینی کشمکش کا ایک جائزہ

ابو عمار زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی

(سلسلہ مطبوعات: ۱۴)

کتاب: جنرل پرویز مشرف کا دور اقتدار

مصنف: ابوعمار زاہد الراشدی

ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ

فون: 055-4000394

aknasir2003@yahoo.com

اشاعت اول: جون ۲۰۰۸

قیمت: 350روپے

فہرست

☆ جمہوری قوتیں، انتخابات اور نئی حکومت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نحمدہ تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

جنرل پرویز مشرف کا دورِ اقتدار اس لحاظ سے منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے اہداف اور پروگرام کو ڈپلومیسی کی زبان میں لپیٹنے کی حتی الوسع کوشش نہیں کی۔ صحیح یا غلط جو کچھ بھی کیا، کھلے بندوں کیا اور بہت سے معاملات جو ان سے پہلے مصلحتوں کے پردوں میں ''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' کی کیفیت سے دوچار تھے، ان کے دورِ اقتدار میں اوپن ہو گئے ہیں۔

پاکستانی سیاست کی امریکی مفادات کے ساتھ وابستگی کا آغاز قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی ہو گیا تھا، بلکہ بعض دانش وروں کے خیال میں اس کی منصوبہ بندی پاکستان کے وجود میں آنے سے بھی پہلے کر لی گئی تھی، لیکن بہت مدت تک یہ وابستگی ''ریموٹ کنٹرولڈ'' رہی اور اس کے اتار چڑھاؤ سے کماحقہ واقفیت باشعور سیاسی حلقوں کے دائرے میں گردش کرتی رہی، لیکن اسے جنرل پرویز مشرف کے دورِ اقتدار کا کمال کہیے، نائن الیون کے سانحہ کا نتیجہ گردانیے یا ہر معاملہ کی تہہ تک میڈیا کی رسائی کا کرشمہ قرار دیجیے کہ سارے حجابات درمیان سے اٹھ گئے ہیں اور اب تک در پردہ طے پانے والے معاملات اب ''اوپن تھیٹر'' کی صورت میں ملک کے ہر شہری کو سامنے دکھائی دینے لگے ہیں۔ صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دورِ اقتدار میں ان کے بھائی اور اس وقت کی قومی اسمبلی میں قائد حزبِ اختلاف سردار بہادر خان مرحوم نے جب ایک موقع پر قومی اسمبلی کے فلور پر یہ کہا کہ پاکستان میں کوئی حکومت بھی امریکہ کی مرضی کے بغیر تبدیل یا قائم نہیں ہوتی تو میرے جیسے سیاسی کارکنوں کو اس وقت بہت تعجب ہوا تھا، لیکن آج قومی سیاست میں کوئی ہلکی سی ہلچل دیکھ کر بھی ملک کے ایک عام شہری کی نظر بے ساختہ واشنگٹن کے ایوانوں کی طرف اٹھ جاتی ہے کہ وہاں کا سیاسی موسم کیا ہے اور ہواؤں کا رخ کدھر کو ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے دور میں بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے، متعدد سانحات پیش آئے اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر انھیں مختلف چیلنجز کا سامنا رہا، لیکن وہ اپنے مشن اور پروگرام پر پوری جرات اور حوصلہ مندی کے ساتھ قائم رہے۔ میاں محمد نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کی جلاوطنی کا معاملہ ہو، نائن الیون کا سانحہ ہو، افغانستان پر امریکی اتحاد کی فوج کشی کا المیہ ہو، ملک میں دینی قوتوں کو کارنر کرنے کا محاذ ہو، عدالتِ عظمیٰ کا بحران ہو، لال

مسجد کی قیامت صغریٰ ہو، وزیرستان، سوات اور بلوچستان میں فوجی طاقت کا استعمال ہو، نواب اکبر بگٹی کا الم ناک قتل ہو، میاں محمد نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کی واپسی اور پھر بے نظیر بھٹو کی شہادت ہو، فروری ۲۰۰۸ کے الیکشن میں جنرل پرویز مشرف کی حامی سیاسی جماعتوں کی واضح شکست ہو، الیکشن کے بعد سیاسی جماعتوں کا جنرل پرویز مشرف کے خلاف متحدہ محاذ ہو یا اس نوعیت کے دیگر سنگین قومی معاملات، ان سب میں جنرل پرویز مشرف نے ''کمانڈو'' کی حیثیت سے اپنی پیشہ ورانہ تربیت اور صلاحیتوں کا خوب استعمال کیا ہے اور اب جبکہ قومی سیاست کی بڑی جماعتوں، عدلیہ، میڈیا اور دینی قوتوں سمیت ہر جانب سے انھیں مخالفانہ یلغار کا سامنا ہے، انتخابات کے نتیجے میں برسر اقتدار آنے والی جماعتوں کی طرف سے ان کے آئینی اور قانونی صدر ہونے کے بارے میں تحفظات کا کھلم کھلا اظہار کیا جا رہا ہے اور ان پر مستعفی ہونے کے لیے دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے، وہ ایک ''کمانڈو'' کے طور پر ان سب کا سامنا کر رہے ہیں اور پوری طرح ایکشن میں نظر آتے ہیں۔

یہ ان کی ''کمانڈو'' تربیت کا کمال ہے یا ان کے مضبوط کھونٹے (امریکہ اور فوج) کا کرشمہ کہ وہ آج بھی خود کو منتخب اور آئینی صدر قرار دیتے ہوئے نہ صرف اپنی صدارتی مدت پوری کرنے کے عزم پر قائم ہیں بلکہ اپنے تمام تر اختیارات کے دفاع اور اپنے ایجنڈے میں مزید پیش رفت کے لیے بھی مستعد ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف پوری قوم کھڑی ہے اور دوسری طرف چند ساتھیوں کے ساتھ صدر پرویز مشرف مورچہ زن ہیں اور دیکھنے والوں کو ابھی تک یہ تاثر نہیں مل رہا کہ وہ اپنے موقف، پوزیشن اور ایجنڈے سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ ان گزارشات کی اشاعت تک حالات خدا جانے کیا رخ اختیار کرتے ہیں، مگر تادمِ تحریر صورت احوال یہی ہے اور اسی تناظر میں یہ سطور قلم بند کی جا رہی ہیں۔

جنرل مشرف کی پالیسیوں اور ایجنڈے پر بحث کا آغاز ان کا دور اقتدار شروع ہوتے ہی ہو گیا تھا جو نہ صرف ان کے اقتدار پر فائز رہنے تک جاری رہے گا بلکہ اس کے بعد بھی ان کے مثبت اور منفی اثرات ونتائج پر مدتوں مباحثے ہوتے رہیں گے۔ ایک دینی کارکن اور اس کے ساتھ ایک صحافی اور کالم نگار کے طور پر میں نے بھی جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں، اقدامات، ایجنڈے اور اہداف کے حوالے سے مسلسل لکھا ہے اور بہت کچھ لکھا ہے جو روزنامہ پاکستان، روزنامہ اسلام، ماہنامہ الشریعہ اور دیگر جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر نے اس سلسلے میں میری تحریروں کا زیر نظر مجموعہ مرتب کر کے انھیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت کا بھی اہتمام کر دیا ہے۔ خدا کرے ہماری یہ کوشش قومی سیاست میں مثبت رجحانات کے فروغ اور اسلامی اقدار وروایات کی نمائندگی اور پاسداری میں مفید ثابت ہو۔ آمین یا الہ العالمین

ابوعمار زاہد الراشدی

۲۴ رمئی ۲۰۰۷

۱۲/اکتوبر کا 'فوجی انقلاب'
پاکستانی سیاست کے پس منظر میں

میاں نواز شریف کی خدمت کمیٹیاں اور نازی پارٹی

حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے ایک دفعہ ذکر کیا کہ شاہ فیصل شہید کے جنازے میں شرکت کے لیے جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سعودی عرب گئے تو قومی اسمبلی کے اپوزیشن لیڈر کے طور پر مفتی صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ دورانِ سفر گفتگو میں بھٹو مرحوم نے مفتی صاحب سے دریافت کیا کہ مفتی صاحب، آپ نے ہٹلر کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ میں نے تو نہیں کیا، کہیں آپ نے تو ہٹلر پر کوئی کتاب نہیں پڑھی؟ بھٹو صاحب نے کہا کہ میں نے کئی بار پڑھی ہے اور وہ ہر وقت میرے مطالعہ کی مخصوص کتابوں میں موجود رہتی ہے۔ مفتی صاحب نے پوچھا کہ اس کا آخری باب بھی پڑھا ہے؟ مولانا مفتی محمود کا کہنا تھا کہ بھٹو مرحوم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور گفتگو کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔

یہ مکالمہ کل شام اس وقت اچانک یاد آ گیا جب گوجرانوالہ کے معرف قانون دان محمد اقبال بھٹی ایڈووکیٹ میرے پاس بیٹھے ''خدمت کمیٹیاں'' کے متوقع کردار اور اس کے نتائج پر بحث کر رہے تھے اور اس خیال کا اظہار کر رہے تھے کہ مسلم لیگ حکومت ان کمیٹیوں سے وہی کام لینا چاہ رہی ہے جو ہٹلر نے سوسائٹی کے مختلف شعبوں پر گرفت قائم رکھنے کے لیے نازی پارٹی کے کارکنوں سے لیا تھا۔ محمد اقبال بھٹی ایڈووکیٹ اس بات پر مصر تھے کہ یہ خدمت کمیٹیاں صرف حکومتی پارٹی کے ایک ''لابنگ گروپ'' کے طور پر سامنے لائی گئی ہیں جن کا عام آدمی کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، البتہ حکمران جماعت بیوروکریسی کے جس فرد کو کارنر کرنا چاہے گی، اس کے خلاف یہ خدمت کمیٹیاں ایک اچھی

آڑ بن سکیں گی اور اس طرح مسلم لیگی حکومت نوکر شاہی کے جن کو قابو میں لانے کے لیے اپنے پروگرام کو آگے بڑھا سکے گی۔

اقبال بھٹی کے ذہن میں یہ اشکال بھی ہے کہ ان خدمت کمیٹیوں کے لیے جن اختیارات کی بات کی جا رہی ہے، ان کا فریم ورک کیا ہوگا اور انھیں اختیارات تفویض کیے جانے کے بعد مختلف محکموں میں احتساب اور باز پرس کا پہلے سے چلا آنے والا داخلی سسٹم کہاں جائے گا؟ اور اگر وہ موجود رہے گا تو فائنل پوزیشن کسے حاصل ہوگی؟ اگر فائنل اتھارٹی وہی سابقہ سسٹم رہے گا تو پھر اتنے لمبے چکر کا کیا فائدہ کہ بات تو شرعی عدالتوں کی طرح گھوم گھما کر اسی جگہ آ جائے گی کہ اصل اتھارٹی وہی پہلے سے چلا آنے والا سسٹم ہے اور یہ نیا نظام محض ایک ''شوپیس'' ہے جو ''نیا پن'' دیکھنے کے خواہش مند لوگوں کو خوش کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

اقبال بھٹی نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد مجھے تبصرہ کرنے کے لیے کہا تو میں نے عرض کیا کہ مجھے ان کی ''لابنگ گروپ'' والی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ میاں محمد نواز شریف حکومتی نظام اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں کو ''پارٹی'' کے ذریعے کنٹرول کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور انھیں کسی ستم ظریف نے ''نازی پارٹی'' کے طریق کار پر کوئی کتاب پڑھا دی ہے یا کم از کم ایران کے ''پاسداران انقلاب'' کا تصور ان کے ذہن کے کسی گوشے میں ضرور موجود ہے، کیونکہ جس طرح انھوں نے اپنے اختیارات میں اضافہ کیا ہے اور تمام اہم آئینی اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر لیے ہیں، اس کے بعد مسلم لیگی کارکنوں اور بہی خواہوں پر مشتمل خدمت کمیٹیوں کے مجوزہ اسٹرکچر کا اس کے سوا اور مقصد متعین نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ سب کچھ ایک خوب صورت خواب اور خوش فہمی کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا، کیونکہ بات کسی پارٹی یا تحریک کے طریق کار کو اسٹڈی کرنے اور اسے اختیار کر لینے سے نہیں بن جاتی، بلکہ اس کے لیے مطلوبہ قیادت اور تربیت یافتہ کارکنوں کی ایک کھیپ کی بھی ہر سطح پر ضرورت ہوتی ہے جو بدقسمتی سے مسلم لیگ کے پاس نہیں ہے۔ مسلم لیگ کے پاس پہلے اور آخری لیڈر قائداعظم تھے جن کی وفات کے بعد اس جماعت کو آج تک کوئی لیڈر نہیں ملا اور اس کے نظریاتی کارکن یا تو قبروں میں جا چکے ہیں اور یا پھر

چودھری محمد حسین چٹھہ کے اکا دکا حضرات حسرت اور بے بسی کی تصویر بنے ''کھڈے لائن'' لگے ہوئے ہیں۔

اب یہ بات میاں محمد نواز شریف کو کون سمجھائے کہ نہ وہ ''ہٹلر'' ہیں اور نہ ہی مسلم لیگ کی موجودہ کھیپ میں ''نازی پارٹی'' کی سی صلاحیتوں اور استعداد کار کا دور دور تک کوئی سراغ ملتا ہے، اس لیے محض ''نسخہ ہاتھ لگ جانے'' سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ غریب قوم اس قسم کے تجربات کے بیلنے سے کئی بار گزر چکی ہے۔ اسے ایک بار پھر اس میں سے گزارنے کا کوئی نیا نتیجہ برآمد نہیں ہوگا اور اگر بالخصوص کچھ عناصر انھیں ''ہٹلر'' بنانے پر تل ہی گئے ہیں اور مصنوعی ذرائع اور سہاروں سے ''ہلاشیری'' دے کر انھیں اس راستے پر بہرحال آگے لے جانا چاہتے ہیں تو ہم ان کے لیے وہی مشورہ دہرانا چاہیں گے جو مولانا مفتی محمودؒ نے بھٹو مرحوم کو دیا تھا کہ ہٹلر کی کتاب حیات کا آخری باب بھی پڑھ لیں کہ اس کتاب کا فائنل اور آخری باب وہی ہے اور اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۲۳/ اپریل ۱۹۹۸ء۔

میاں شریف کے لیے ایک قابل غور نکتہ

طیارہ سازش کیس کا فیصلہ میں نے دینہ ضلع جہلم میں سنا۔ دینہ کے عالم دین مولانا محمد حسین ایک عرصہ سے انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ ان کے بیٹے امین الرشید نے حرکۃ الجہاد الاسلامی کے ساتھ میدان جنگ میں شہادت پائی ہے اور انھوں نے اس کی یاد میں دینہ میں جامع امینیہ اسلامیہ کے نام سے دینی درس گاہ تعمیر کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ تین کنال جگہ میں طالبات کی دینی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا جائے گا۔ ۶ راپریل کو اس کی سنگ بنیاد کی تقریب تھی جس میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ تقریب سے فارغ ہو کر مقامی سماجی رہنما اور بلدیہ کے سابق کونسلر حاجی محمد مستقیم انصاری کے گھر کھانا کھا رہا تھا کہ کیس کے فیصلہ کی تفصیلات کا علم ہوا۔ فیصلے پر تعجب بھی ہوا اور ایک حد تک اس بات پر اطمینان بھی کہ اس سے زیادہ سنگین سزا شاید ملک میں کسی نئے سیاسی خلفشار کا باعث بن جاتی۔ بہرحال عدالت کا فیصلہ ہے جس کے حسن و قبح کا جائزہ لینے کے لیے عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ کے دونوں مراحل ابھی باقی ہیں اور حتمی نتیجہ کے سامنے آنے میں غالباً زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

گوجرانوالہ واپسی کے لیے جہلم کے جنرل بس اسٹینڈ سے ویگن پر بیٹھا تو میری سیٹ درمیان میں تھی اور پچھلی سیٹ پر دو خواتین تھیں جن میں سے ایک کسی شادی میں شرکت کے بعد گھر واپس جا رہی تھی۔ ویگن کے روانہ ہوتے ہی ان دونوں کی گفتگو شروع ہوئی اور گوجرانوالہ پہنچنے تک کسی وقفہ کے بغیر یہ سلسلہ جاری رہا۔ گفتگو کا آغاز حسب توقع نواز شریف کیس کے فیصلے سے ہوا اور پھر شادی بیاہ

سے لے کر مہنگائی اور تقدیر تک معاملات اس کی لپیٹ میں آتے رہے۔ گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ خواتین تعلیم یافتہ نہیں ہیں بلکہ عام گھریلو قسم کی عورتیں ہیں، مگر انہوں نے طیارہ سازش کیس اور سابقہ حکومت کے ساتھ موجودہ حکومت کی کارکردگی کا تقابل کرتے ہوئے جو باتیں کیں، وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھیں کہ ہمارے ہاں سیاسی شعور کا دائرہ پہلے کی طرح محدود نہیں رہا بلکہ ایک عام شہری اور گھریلو عورت کے لیے بھی سیاسی معاملات کے پس منظر میں جھانکنا اب کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔

بات چیت کا آغاز ایک خاتون کے اس جملہ سے ہوا کہ ''نواز شریف نوں عمر سزا بول گئی اے'' اور پھر اس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا، اس کے دو جملوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھوں گا۔ ان کا کہنا تھا کہ نواز شریف نے کوئی ایسا کام تو نہیں کیا تھا جس پر اسے یہ سزا دی جاتی، ہاں ''اے پہاڑی جیہڑی واپس کیتی سو، اے چنگا نئیں سو کیتا''، یعنی کرگل کے مورچے مجاہدین سے خالی کرانے والی بات نواز شریف سے ہمدردی رکھنے والی اس خاتون کو بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اس نے نواز شریف کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہمارا کوئی ''ماسی دا پتر'' نہیں تھا مگر غریبوں کے لیے اچھا تھا اور اس کے دور میں غریبوں کو سہولت حاصل ہوتی تھی جو موجودہ حکومت میں نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اس نے گفتگو کا رخ موجودہ حکومت کی طرف موڑ دیا اور کہا کہ اس حکومت نے تو غریبوں کے لیے کچھ نہیں کیا، الٹا مہنگائی میں اضافہ کیا ہے۔ اس نے خدا جانے کس جگہ کا ذکر کیا کہ وہاں غریب لوگوں کو ریڑھیاں لگانے سے روک دیا گیا ہے جس پر اس کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اینہاں نے روٹی ٹکر دا وسیلہ وی لوکاں کولوں کھوہ لیا اے''۔ دونوں حکومت کے تقابل کے بعد پھر ان خواتین کا رخ نواز شریف کی طرف تھا اور اب ان کی امید کا سہارا یہ آس تھی کہ ''چلو خیر اے، اپیلاں اپولاں وچ جان چھٹ جائے گی سو''۔

یہ بظاہر دو عام سی عورتوں کا تبصرہ ہے، مگر رائے عامہ کی جس سطح کی وہ نمائندگی کر رہی ہیں، اس کو نظر انداز کرنا آج کے دور میں ممکن نہیں ہے اور موجودہ حکومت کے پالیسی سازوں کے لیے یقیناً یہ لمحہ فکر ہے۔ میاں نواز شریف کو سنائی جانے والی اس سزا سے مجھے بھی ذاتی طور پر دکھ ہوا ہے مگر اس

سب کچھ کے پیچھے ان کا اپنا رویہ اور طرزِ عمل کارفرما ہے، اس لیے اس پر دکھ کے اظہار کے سوا اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔

مجھے کچھ عرصہ میاں صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ جس دور میں ''اسلامی جمہوری اتحاد'' (آئی جے آئی) قائم ہوا تو وہ پنجاب کے صدر تھے اور میں نائب صدر تھا، لیکن سیاسی سوچ، سیاسی طرزِ عمل اور سیاسی معاملہ کاری کے فقدان کے باعث دو چار قدم سے زیادہ ان کے ساتھ نہ چل سکا اور استعفا دے کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے نزدیک معاملات کے یہاں تک پہنچنے کا بنیادی سبب بھی یہی ہے کہ ملک کا وزیراعظم اور بڑی سیاسی پارٹی کا سربراہ ہونے کے باوجود میاں محمد نواز شریف سیاسی معاملات کو سیاسی انداز سے ڈیل کرنے کا سلیقہ نہ سیکھ سکے اور وہ آخر وقت تک ''سیاست'' اور ''کاروبار'' کے فرق کو ذہنی طور پر قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ لیکن اس سے ہٹ کر ایک اور پہلو سے بھی ''طیارہ سازش کیس'' کے اس فیصلے کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ اسلامی تاریخ میں برمکی خاندان بہت معروف خاندان ہے۔ عباسی خلافت کے آغاز سے ہی وسطی ایشیا (بلخ) سے تعلق رکھنے والے اس خاندان کے سربراہ خالد برمکی نے پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح کی حکومت میں اہم عہدہ حاصل کر لیا تھا اور اس کے بعد اس کے بیٹے یحییٰ اور دو پوتوں فضل اور جعفر نے ہارون الرشید کے دربار میں جو رسوخ حاصل کیا، اس سے پوری دنیا انگشت بدنداں ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک دور میں ہارون الرشید کی وسیع و عریض سلطنت میں، جو بلاشبہ اپنے دور کی دنیا کی سب سے بڑی منظم سلطنت تھی، یحییٰ برمکی اور اس کے بیٹوں کو خلیفہ کے بعد سب سے زیادہ بااختیار خاندان کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اقتدار، دولت اور پروٹوکول کے سہ آتشہ نشے نے ان کے دماغوں کو ساتویں آسمان سے بھی اوپر پہنچا دیا تھا کہ اچانک خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی۔ جعفر برمکی خلیفہ ہارون الرشید کے حکم پر قتل ہوا اور اس کی لاش کئی روز تک بغداد کے بازار میں لٹکتی رہی، جبکہ یحییٰ اور اس کے دیگر بیٹوں نے زندگی کے باقی دن قید خانے میں گزارے۔

امام ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھا ہے کہ جن دنوں برمکی خاندان کا سربراہ یحییٰ برمکی

اپنے بیٹوں کے ہمراہ ''الرقہ'' کے قید خانے میں زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا، اس کے ایک بیٹے نے دریافت کیا کہ ابا جان! اس قدر اقتدار، دولت اور شہرت کے بعد اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں، آخر اس کا سبب کیا ہے؟ یحییٰ برمکی جہاں دیدہ شخص تھا، اس لیے کسی تکلف کے بغیر اس نے جواب دیا: ''بیٹا! لگتا ہے کسی مظلوم کی بددعا نے چپکے سے عرش کا دروازہ کھٹکھٹا لیا ہے اور ہم اس سے بے خبر رہے ہیں''۔

مجھے شریف فیملی کے سربراہ میاں محمد شریف سے ہمدردی ہے، لیکن میں یحییٰ برمکی کی زبان میں انہیں یہی پیغام دینا چاہوں گا کہ اقتدار، دولت اور پروٹوکول کے سہ آتشہ نشے کی زد میں آنے والے مظلوموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ہوسکتا ہے، اپنی موجودہ آزمایش کا اصل سبب معلوم کرنے میں انہیں کچھ سہولت حاصل ہو جائے۔*

O

---

* روزنامہ اوصاف، ۱۱/اپریل ۲۰۰۰ء۔

اقتدار کے لیے مختلف طبقات کی کشمکش

گزشتہ ایک کالم میں میاں محمد نواز شریف اور ان کے خاندان کی سعودی عرب جلاوطنی پر تبصرہ کرتے ہوئے طاقت اور دولت کی کشمکش کے حوالے سے کچھ عرض کرنے کا وعدہ کیا تھا، اس لیے آج اسی سلسلے میں کچھ گزارشات پیش کی جا رہی ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد ملک کی باگ ڈور جن طبقات کے ہاتھوں میں چلی گئی، وہ تین ہیں: ۱۔ جاگیردار اور زمیندار، ۲۔ بیوروکریٹس، ۳۔ جرنیل صاحبان۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کی آمد تک ملک کی اسٹیبلشمنٹ انھی تین طبقات سے عبارت رہی ہے۔ قائداعظم مرحوم جلد دنیا سے رخصت ہو گئے اور وہ ویسے بھی ان میں سے کسی طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان کی وفات کے بعد کوئی ایسی شخصیت باقی نہ رہی جو ان طبقات کو اپنے اپنے دائرۂ کار تک محدود رکھنے اور ان کے درمیان توازن قائم کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکتی، اس لیے ان تینوں نے باہمی تعلقات کار خود طے کیے اور باری باری اس ملک پر حکمرانی کرتے رہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے پہلی بار اس تکون کو توڑنے اور اس میں دو نئے طبقات کو داخل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے تاجروں اور علمائے کرام کو اقتدار کے اس دائرہ میں شامل کرنا چاہا۔ تاجروں کی حد تک وہ کامیاب رہے کہ میاں محمد نواز شریف کی صورت میں تاجروں اور صنعت کاروں کے ایک نمائندہ کو وہ اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے، مگر علمائے کرام اپنی انتہائی سادگی یا بہت زیادہ ہوشیاری کی وجہ سے اس گیم کا حصہ نہ بن سکے اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم

تمام تر کوشش کے باوجود انھیں شریک کار بنانے میں کامیاب نہ ہوئے، چنانچہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے بعد اقتدار کی دوڑ میں جاگیرداروں، زمینداروں، بیوروکریٹس اور جرنیلوں کے ساتھ تاجر وصنعت کار بھی خود کو برابر کا شریک سمجھنے لگے اور انھوں نے اقتدار اعلیٰ پر فائز ہوتے ہی ملک کو صنعتی ترقی کی شاہراہ پر گام زن کرنے اور اس طریقے سے اپنی بالادستی اور برتری قائم کرنے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔

دوسرے طبقات کو اقتدار اور اختیارات میں ایک نئے طبقے کی شرکت ویسے ہی ہضم نہیں ہو رہی تھی، اس لیے جب اس نئے طبقے نے اس شرکت کو مستحکم کرنے بلکہ بالاتر حیثیت دینے کے لیے اقدامات شروع کیے تو قوت ہاضمہ مزید کمزور ہوگئی اور یہ اسی بدہضمی کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف میاں محمد نواز شریف اپنے خاندان سمیت ملک بدر ہو چکے ہیں بلکہ صنعت وتجارت سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں اور تاجروں اور صنعت کاروں کے لیے تجارت وصنعت کے روایتی سسٹم کو برقرار رکھنا مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

جنوبی ایشیا میں پاکستان کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی خواہش مند قوتوں اور اس خطہ کو معاشی لوٹ کھسوٹ کا میدان بنانے کے لیے کوشاں بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ وہ اس طبقاتی کشمکش کو نہ صرف برقرار رہنے دیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں اور کبھی ایک کی اور کبھی دوسرے کی پیٹھ تھپتھپا کر اپنا کام نکالتے رہیں۔

اگر سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کو بیوروکریسی کا، جنرل محمد ایوب خان مرحوم کو جرنیلوں کا، ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو جاگیرداروں کا اور میاں محمد نواز شریف کو تاجروں اور صنعت کاروں کا نمائندہ سمجھ کر اب تک کی صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کی شخصی خوبیوں اور ذاتی کردار سے قطع نظر ایک بات سب میں قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے شخص واحد میں اختیارات کا ارتکاز اور شخصی وفاداریوں کا نیٹ ورک قائم کرنے کی مسلسل کوشش جس میں ان میں سے کسی نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی اور ہر ایک نے زیادہ سے زیادہ اختیارات سمیٹنے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شخصی وفاداری کے دائرے میں شامل کرنے کے لیے ملک کے تمام تر وسائل کو ہر ممکن حد تک استعمال کیا

ہے۔ اسی وجہ سے ملک میں اسلام یا جمہوریت میں سے کسی کو پاؤں جمانے کا موقع نہیں مل سکا، کیونکہ صاف ستھری جمہوریت قائم کی صورت میں عوام کے منتخب نمائندوں کے سامنے صحیح معنوں میں جواب دہ ہونے کا تصور مطلق العنانیت کے اس فلسفہ کے منافی تھا جوان سب طبقات کے نمائندوں کا نصب العین قرار پا چکا تھا اور اسلام کا عادلانہ نظام عملاً نافذ ہونے کی صورت میں طے شدہ اور ناقابل ترمیم اصولوں کی بہر حال پابندی نے بھی اس فلسفہ کو کھوکھلا کر دینا تھا۔ اس لیے ان سب میں یہ انڈرسٹینڈنگ موجود رہی ہے کہ اسلام یا جمہوریت میں سے کسی کو پاکستان میں قدم نہیں جمانے دینا اور نصف صدی کے ناقابل تردید شواہد اور حقائق گواہ ہیں کہ اس معاملہ میں ان سب نے وقت آنے پر ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کیا۔

اس پس منظر میں میاں محمد نواز شریف جنرل محمد ضیاء الحق کی شہ پر اعلیٰ سطح پر اقتدار کی اس دوڑ میں شریک ہوئے اور خود کو تاجر وصنعت کار طبقہ کا نمائندہ سمجھتے ہوئے انھوں نے اقتدار کے معاملات کو ڈیل کرنا شروع کیا۔ چونکہ تاجر تھے اور ہر معاملہ پیسوں سے حل کرنے کے عادی تھے، اس لیے انھوں نے یہاں بھی دولت ہی کا ہتھیار سب سے زیادہ استعمال کیا اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اقتدار کی چوکور میں شریک دوسرے طبقات کو پیچھے دھکیلنے میں مصروف ہو گئے۔ غلام اسحاق خان کو ایوان صدر سے رخصت کرنے میں انھیں خود بھی وزیر اعظم ہاؤس چھوڑنا پڑا مگر انھیں حوصلہ ہوا کہ بیوروکریسی سے محاذ آرائی ان کے لیے کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ فاروق احمد لغاری کو پہلے اختیارات سے محروم کر کے اور پھر ایوان صدر سے رخصت کر کے وہ یہ سمجھے کہ جاگیردار طبقہ کو بھی انھوں نے شکست دے دی ہے اور جب وہ جنرل جہانگیر کرامت سے استعفا لینے میں کامیاب ہو گئے تو اپنے خیال میں وہ پوری طرح فارم میں آ چکے تھے، بلکہ انھوں نے اس سے قبل ایک چوتھا محاذ بھی جسٹس سجاد علی شاہ کو گھر بھجوا کر سر کر لیا تھا، اس لیے انھیں اپنے راستے میں فوج کے سوا اور کوئی موثر رکاوٹ اب دکھائی نہیں دے رہی تھی اور اسی رکاوٹ کو دور کرنے کی غرض سے انھوں نے بارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو وہ اقدامات کیے جن کا نتیجہ آج ساری قوم کے سامنے ہے۔

اگر چہ میاں شہباز شریف ملک میں واپس آنے، سیاست میں حصہ لینے اور اپنے سیاسی کیریئر

کو بچانے کے عندیہ کا اظہار کر رہے ہیں اور وہ غالباً اس کی کوشش بھی کریں گے، مگر ہمارے خیال میں معاملات پھر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلے گئے ہیں اور اقتدار کی سابقہ تکون نہ صرف بحال ہوگئی ہے بلکہ کسی نئے طبقہ کی شمولیت کے بارے میں پہلے سے زیادہ حساس بھی ہو چکی ہے۔ اس تکون کو توڑنا تاجر اور صنعت کار طبقہ کے بس کی بات نہیں ہے۔ پہلے راؤنڈ میں ہی اس کا سانس پھولنے لگا ہے، اس لیے قومی سیاست اور اقتدار اعلیٰ کی دوڑ میں شریف خاندان کی واپسی کی بات کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، البتہ مسلم لیگ کے اس دوڑ میں شریک رہنے کا امکان موجود ہے لیکن وہ تاجروں اور صنعت کاروں کی نمائندہ نہیں ہوگی بلکہ حسب سابق جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفادات کا تحفظ کا رول سنبھال لے گی اور وہی اس کا اصلی رول ہے۔

جاگیرداروں، نوکر شاہی اور جرنیلوں کی اس تکون کو توڑنے کی صلاحیت صرف ایک طبقہ کے پاس ہے اور وہ ہے دینی جماعتیں جن کے پاس عقیدہ ہے، مستقل فلسفہ حیات ہے، متبادل نظام ہے اور ہر سطح پر عقیدہ اور ایثار کے جذبہ سے سرشار کارکنوں کی کھیپ ہے، لیکن ان کی موجودہ قیادت شخصی ترجیحات اور وقتی مفادات کے خول سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں ہے، بلکہ بعض دینی قائدین کی سرگرمیاں دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ دوسروں کے سامنے دینی حلقوں کی نمائندگی کرنے کی بجائے دینی حلقوں کے سامنے دوسروں کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں، اس لیے جب تک دینی جماعتوں کو بلند حوصلہ قیادت نہیں ملتی اور ان کی ترجیحات درست نہیں ہوتیں، اس وقت تک یہ کہ نہ صرف اسٹیبلشمنٹ کی اس تکون کے عزائم اور پروگرام کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کا راستہ بھی پوری طرح کلیئر ہے کیونکہ جب رکاوٹیں خود ہی ساتھ بہنے کے لیے تیار ہوں تو سیلاب کو گھروں میں داخل ہونے سے کون روک سکتا ہے؟*

O

* روزنامہ اوصاف، ۱۲؍جنوری ۲۰۰۱ء۔

دستور کو چھیڑنا خطرناک ہوگا

جناب محمد رفیق تارڑ ایوان صدر سے رخصت ہو کر لاہور میں اپنی رہایش گاہ پر آرام کر رہے ہیں اور بعض اخبارات کی رپورٹ کے مطابق ان کا ارادہ اب مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا ہے۔ وہ ملک میں دستور کی آخری علامت کے طور پر باقی رہ گئے تھے اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے فوجی حکام کے تقاضے پر استعفا دینے سے بھی انکار کیا مگر ان کے انکار کے باوجود انہیں پی سی او کے تحت سبک دوش کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کو بھی تحلیل کر دیا گیا اور ان منتخب اداروں کے سربراہوں کو بھی ان کے مناصب سے فارغ کر دیا گیا جس کے بعد اب اس ملک میں دستور کی کوئی رسمی علامت بھی موجود نہیں رہی جو جنرل پرویز مشرف کے چیف ایگزیکٹو بننے سے قبل تک نافذ العمل تھا اور اب ملک کا سارا نظام پی سی او کے تحت چلایا جا رہا ہے جس کی تمام تر بنیاد چیف ایگزیکٹو کی شخصی وفاداری پر ہے۔

جب جنرل ضیاء الحق مرحوم نے چوہدری فضل الٰہی مرحوم کو صدارت سے سبکدوش کر کے صدر مملکت کا منصب سنبھالا تو پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمود ان دنوں شیرانوالہ گیٹ لاہور میں تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ جب صدر ضیاء الحق مرحوم کے بطور صدر حلف اٹھانے کی خبر ملی، حضرت مولانا عبید اللہ انور بھی تشریف فرما تھے۔ اس موقع پر کچھ اخبار نویس آ گئے۔ انہوں نے مفتی صاحبؒ سے ردعمل معلوم کرنا چاہا تو مفتی صاحب نے کہا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے اور مزید کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ اخبار نویس چلے گئے۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ نے مفتی صاحب سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے؟ مفتی صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت

آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ نے فرمایا کہ یہ معمولی بات تو نہیں ہے، بہت بڑی بات ہے اور ''ایہہ ہتھاں دیاں دتیاں نے، دنداں نال کھولنیاں وی اوکھیاں ہو جان گیاں''۔ یعنی یہ ہاتھوں سے دی ہوئی گانٹھیں دانتوں کے ساتھ کھولنی بھی مشکل ہو جائیں گی۔ اس پر حضرت مولانا مفتی محمودؒ کچھ متفکر ہوئے مگر فرمایا کہ اب تو میں نے جو کچھ کہا ہے، کہہ چکا ہوں۔

بالکل اسی طرح کی کیفیت اب میری ہو رہی ہے کہ دستور کے حوالے سے پریشانی اور اضطراب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۳ء کا دستور ملک کے چاروں صوبوں کے علاوہ تمام سیاسی و دینی حلقوں کا متفقہ دستور ہے جو قومی وحدت کی واحد علامت ہے۔ اس وقت ملک میں علاقائی، فرقہ وارانہ اور لسانی حوالوں سے جو تفریقیں دن بدن وسیع ہوتی جا رہی ہیں اور جو نئے نئے دستوری مسائل اور تقاضے سامنے آ رہے ہیں، انہیں اگر ۱۹۷۳ء کے دستور کے دائرے سے ہٹ کر چھیڑنے کی کوشش کی گئی اور اس دستوری ڈھانچے کو کراس کر کے ان مسائل کا حل نکالنے کا راستہ اختیار کیا گیا تو ملک شدید دستوری بحران سے دوچار ہو سکتا ہے اور عالمی سطح پر جو لابیاں اور ادارے اس سلسلہ میں متحرک دکھائی دیتے ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس خطرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا کوئی دستوری بحران پیدا کرنے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کی قومی وحدت کو نقصان پہنچانے کے لیے بین الاقوامی عوامل و محرکات بھی پس پردہ سرگرم عمل ہو گئے ہیں، اس لیے ملک کے سیاسی حلقوں کو یہ مسئلہ سرسری انداز میں نہیں لینا چاہیے اور اس صورت حال کے تمام تر مضمرات اور خدشات کو سامنے رکھتے ہوئے ''دستور پاکستان'' کے ہر حال میں تحفظ اور اس کی جلد از جلد بحالی کے لیے ٹھوس لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

دستور کے تحفظ کی بات کرتے ہوئے خدا جانے میرے ذہن میں یہ بات کیوں بار بار آ رہی ہے کہ خانہ کعبہ کی موجودہ تعمیر خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کے خلاف ہے، مگر اس کے باوجود اسے صرف اس لیے برقرار رکھا گیا ہے کہ اس کے نقشے میں بار بار ردوبدل سے امت میں خلفشار پیدا ہو گا اور ''خانہ کعبہ'' حکمرانوں کے درمیان بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کا ابراہیمی نقشہ یہ تھا کہ اس کی کرسی (دروازہ) زمین کے برابر تھی، دو

دروازے آمنے سامنے تھے اور حطیم کا حصہ چھت کے تحت بیت اللہ میں شامل تھا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل مشرکین مکہ نے اسے دوبارہ تعمیر کیا تو ایک دروازہ بند کر دیا، کرسی اونچی کر دی اور حطیم کا حصہ چھت سے باہر نکال دیا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس خواہش کا اظہار کیا کہ خانہ کعبہ کو دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقشہ کے مطابق تعمیر کیا جائے مگر یہ فرمایا کہ قریش جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، وہ اس بات کو محسوس کریں گے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جب یزید کی بیعت سے انکار کر کے حجاز مقدس میں حکومت قائم کر لی تو انہوں نے اپنی خالہ محترمہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے جناب نبی اکرم کی یہ خواہش سن رکھی تھی، اس لیے انہوں نے خانہ کعبہ کو گرا کر اسے ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کر دیا مگر جب حضرت عبداللہ بن زبیر کو شکست دے کر اور انہیں شہید کر کے حجاج بن یوسف نے مکہ مکرمہ کا کنٹرول سنبھالا تو خانہ کعبہ کو پھر سے گرا کر اسے قریش کی طرز پر تعمیر کر دیا۔ اس کے بعد بنو امیہ سے جب خلافت بنو عباس میں منتقل ہوئی تو عباسی خلفا نے پھر خانہ کعبہ کو گرانے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق اسے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا جس پر اس وقت کے امام اہل سنت حضرت امام مالکؒ نے فتویٰ دیا کہ اب خانہ کعبہ اسی حالت میں رہے گا اور اسے گرا کر پھر سے تعمیر کرنا اب جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اگر ہر آنے والا حکمران اسی طرح کرتا رہے گا تو خانہ کعبہ بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ چنانچہ حضرت امام مالکؒ کے فتوے کے بعد عباسی حکمران اس ارادے پر عمل سے رک گئے اور تب سے خانہ کعبہ اسی طرح چلا آ رہا ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اصل بات ملی وحدت، ملکی سالمیت اور قومی خود مختاری کی ہے اور خاکم بدہن یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اگر ۱۹۷۳ء کے دستور کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تو یہ تینوں باتیں خطرات کا شکار ہو جائیں گی، اس لیے ہمارے حکمران اور سیاسی قائدین کو اس مسئلہ پر پوری سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور دستوری ڈھانچے کے تحفظ اور بحالی کے لیے کسی مصلحت، دباؤ یا مفاد کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔*

---

* روزنامہ اوصاف ۴/ جولائی ۲۰۰۱ء۔

ریفرنڈم کی دلدل

صدر محمد ایوب خان مرحوم کا ریفرنڈم مجھے یاد نہیں ہے۔ میں اس وقت چھوٹا بچہ تھا۔ البتہ اتنی سرگرمیاں اس دور کی ذہن کی یادداشت کے خانے میں محفوظ ہیں کہ دستور کے لیے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی قیادت میں نظام العلما پاکستان نے کچھ تجاویز مرتب کی تھیں جنہیں عرضداشت کے طور پر وزارت قانون کو مختلف شہروں سے خطوط کی شکل میں بھجوانے کی مہم جاری تھی اور گکھڑ سے اس پر دستخط کرانے کے لیے میں نے بھی تھوڑا بہت کام کیا تھا۔ اس کے علاوہ ضلعی سطح پر علما کا ایک وفد، جس میں حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ اور والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم شامل تھے، سرکردہ سیاسی زعما سے ملاقاتیں کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں اس اجلاس کا نقشہ گھوم رہا ہے جس میں ان دونوں بزرگوں نے ممتاز مسلم لیگی لیڈر چوہدری صلاح الدین چٹھہ مرحوم (جناب حامد ناصر چٹھہ کے والد محترم) سے ملاقات کے لیے احمد نگر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

البتہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کا ریفرنڈم میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں اس وقت ایک سرگرم سیاسی کارکن کے طور پر متحرک تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمود کی وفات کے بعد جمعیت علمائے اسلام دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی اور حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی کی قیادت میں کام کرنے والی جمعیت میں مجھے مرکزی ڈپٹی سیکرٹری جنرل کے طور پر اہم حیثیت حاصل تھی۔ اسے عام حلقوں میں درخواستی گروپ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور سیاسی دنیا میں اس کا تشخص یہ تھا کہ اس نے پیپلز پارٹی کے ساتھ ایم آر ڈی میں شریک کار بننے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے عام تاثر یہ تھا کہ جمعیت

علمائے اسلام کا درخواستی گروپ جنرل ضیاء الحق کی پالیسیوں کا ساتھ دے رہا ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا اور ہماری پالیسی جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم یا ایم آر ڈی میں سے کسی کا ساتھ دینے کی بجائے دینی نقطہ نظر سے ہر صحیح بات کی حمایت کرنے کی تھی اور ہم کسی بلاک یا لابی کی طرف رجحان رکھنے کے بجائے آزادانہ فیصلے کیا کرتے تھے۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے ریفرنڈم کے اعلان پر بھی ہم نے مجلس شوریٰ کا اجلاس بلا لیا اور اس ریفرنڈم کے طریق کار سے اختلاف کرتے ہوئے اس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اس ریفرنڈم میں سوال کیا گیا تھا کہ کیا آپ اسلامی نظام کا ملک میں نفاذ چاہتے ہیں؟ اور اس سوال کے ہاں کی صورت میں جواب پر نتیجہ یہ مرتب کیا جا رہا تھا کہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم پانچ سال کے لیے ملک کے صدر منتخب ہو گئے ہیں۔ ہم نے اس کا بائیکاٹ کیا اور دو حوالوں سے اسے غلط ٹھہرایا۔ ایک اس حوالے سے کہ ریفرنڈم میں سوال کا عنوان بنا کر اسلامی نظام کے نفاذ کو پھر سے متنازعہ اور حل طلب مسئلہ کی حیثیت دے دی گئی ہے حالانکہ یہ مسئلہ قیام پاکستان سے پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہوگا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ مرحوم نے متعدد اجتماعات میں واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا تھا کہ پاکستان میں قرآن و سنت کی حکمرانی ہوگی، اس لیے ہمارے نزدیک یہ سوال ہی سرے سے غلط تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی نظام کے نفاذ کو جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی صدارت کے ساتھ مشروط کرنے کا سوال ہماری سمجھ سے بالاتر تھا، اس لیے ہم دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ اس کے بائیکاٹ میں شریک ہو گئے۔

ریفرنڈم کے روز مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے سامنے شیرانوالہ باغ میں ہمارے حلقے کا پولنگ اسٹیشن تھا اور میں جامع مسجد میں اپنے کمرے کی گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے بیٹھا سارا منظر دیکھ رہا تھا کہ ہمارے حلقہ کے بزرگ مسلم لیگی رہنما الحاج بابو محمد اسماعیل جو موجودہ ناظم سٹی تحصیل الحاج بابو جاوید احمد کے والد ہیں، مجھے دیکھ کر تشریف لائے اور کہا کہ آئیں، ہمارے ساتھ چل کر ریفرنڈم میں ووٹ ڈالیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہم نے بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ اسلامی نظام نہیں چاہتے؟ میں نے جواب دیا کہ میں اسلامی نظام کو متنازعہ مسئلہ نہیں سمجھتا

جس پر وہ چلے گئے۔

اس ریفرنڈم کے حوالے سے ایک اور واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جامع مسجد کے ایک نمازی ریفرنڈم سے ایک روز قبل شام کے وقت میرے پاس تشریف لائے اور اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے تعاون کے لیے کہا۔ ان کی پریشانی یہ تھی کہ ان کی اہلیہ، جو ایک سکول میں معلّمہ تھیں، صبح ڈیوٹی پر گئی تھیں مگر شام تک واپس نہیں آئیں اور نہ ہی ان کا کچھ پتہ چل رہا تھا۔ بات واقعی پریشانی کی تھی۔ میں نے بھی ایک دو جگہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ دوسرے روز ان صاحب سے ملاقات ہوئی تو میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ رات کافی دیر کے بعد ان کی اہلیہ گھر واپس آئیں اور جب ان سے پوچھا کہ اب تک وہ کہاں رہیں تو انہوں نے انتہائی غصے سے جواب دیا کہ ''اسلام نافذ کرتی رہی ہوں۔'' انہیں کسی خفیہ مقام پر دوسری معلمات کے ساتھ اس ڈیوٹی کے لیے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا کہ وہ بیلٹ پیپروں پر مہریں لگاتی رہیں اور مطلوبہ ہدف پورا کرنے کے بعد انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اب جنرل پرویز مشرف کے ریفرنڈم کا سامنا ہے اور اگرچہ سیاست میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے متحرک نہیں ہوں، لیکن قومی مسائل سے دلچسپی اور ان پر کوئی نہ کوئی رائے رکھنے کا سزاوار ضرور ہوں جو میری دینی اور قومی ذمہ داری بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جنرل پرویز مشرف کو ریفرنڈم کی اس دلدل کی طرف لے جانے والے اگر ان کے ''دانا دشمن'' نہیں تو ''نادان دوست'' ضرور ہیں جنہوں نے انہیں خواہ مخواہ اس الجھن میں ڈال دیا ہے۔ انہوں نے پی سی او کے تحت صدارت سنبھال لی تھی اور اکتوبر میں الیکشن کا اعلان کر رکھا تھا۔ ملک کی سیاسی جماعتیں ان کے اقتدار کو چیلنج نہیں کر رہی تھیں بلکہ الیکشن میں حصہ لینے کے لیے تیار دکھائی دیتی تھی، حتیٰ کہ جن لیڈروں کو انہوں نے سیاست سے آؤٹ کرنے کا اعلان کیا ہے، وہ بھی الیکشن میں حصہ لینے کے حوالے سے ملک میں واپسی کی بات کر رہے تھے اور اگر سیاسی جماعتیں بائیکاٹ بھی کر دیتیں تو الیکشن میں اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کی پرانی روایت دہرانے کے کئی ذرائع موجود تھے اور نئی اسمبلی نے بہرحال ان کے اقدامات کو آئینی تحفظ دینے کے بعد ہی اپنے کام کا آغاز کرنا تھا، اس لیے اس مخمصہ میں پڑنے کی

ضرورت ہی نہیں تھی۔

ہوسکتا ہے کہ عالمی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے یہ سارا جتن کیا جا رہا ہو، جس کا اظہار وفاقی وزیر قانون ڈاکٹر خالد رانجھا نے بھی گزشتہ روز ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اپنی روایتی صاف گوئی کے ساتھ کر دیا ہے کہ امریکہ نے ہمارا ہاتھ پکڑا ہے اور اسے بھی اپنی قوم کو دکھانا ہے کہ پاکستان کے عوام جنرل پرویز مشرف کے ساتھ ہیں، لیکن اس بھولپن پر بے ساختہ سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ عالمی رائے عامہ اور امریکی رائے عامہ کو کس قدر بے وقوف سمجھا جا رہا ہے اور جس ملک کے خفیہ ادارے پاکستان کے ہر بڑے شہر میں خود ڈیرے لگائے بیٹھے ہیں، اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور سرمہ لگانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا جانے عالمی رائے عامہ اور اس کے ساتھ امریکی رائے عامہ کو اس قدر کمزور کیسے سمجھ لیا گیا ہے کہ انہیں موچی دروازے میں اے آر ڈی کے جلسہ کو ہر قیمت پر ناکام بنانے اور مینار پاکستان پر جنرل پرویز مشرف کے جلسہ کو بہرصورت کامیاب بنانے کے لیے سرکاری مشینری اور قومی دولت کا بے تحاشا استعمال نظر نہیں آیا ہوگا اور اسی لاہور میں گورنر پنجاب جنرل (ر) خالد مقبول کے بستی بستی انتخابی جلسوں کے ساتھ ساتھ ریفرنڈم کے خلاف جماعت اسلامی کی ریلی روکنے کے لیے سرکاری رکاوٹوں، لاٹھی چارج، آنسو گیس کا استعمال اور لیڈروں کی گرفتاریوں کا منظر دکھائی نہیں دے رہا ہوگا۔ اس کھلے منظر پر اگر ہمارے ارباب اختیار خوش اور مطمئن ہیں تو وہ اپنی سادگی کی اس انتہا پر ہمدردی کے مستحق ہیں اور اگر اس سب کچھ کے باوجود عالمی رائے عامہ اور امریکی قیادت کے نزدیک اس ریفرنڈم کی کوئی سیاسی اور اخلاقی حیثیت باقی رہ گئی ہے تو ان کی پیاز کے چھلکوں کی طرح تہہ در تہہ سیاسی ترجیحات قابل داد ہیں کیونکہ مشرق وسطیٰ میں طاقت اور گولی کے ذریعے حقائق کا نقشہ الٹ دینے والے اگر جنوبی ایشیا میں وہی کام سیاسی حربوں اور دھاندلیوں کے ذریعے کرنا چاہیں تو ان کا ہاتھ کون روک سکتا ہے؟*

O

* روزنامہ اوصاف، ۲۶/اپریل ۲۰۰۲ء۔

جنرل مشرف کی مجوزہ سیاسی اصلاحات

صدر جنرل پرویز مشرف نے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے جن اصلاحات کا اعلان کیا ہے، وہ نئی نہیں ہیں بلکہ یہ دستوری آنکھ مچولی کا لازمی حصہ بن چکی ہیں جو قیام پاکستان سے لے کر اب مسلسل جاری ہیں اور جس میں ہمارے حکمران طبقات باری باری طاقت کو اپنے ہاتھ میں لینے اور پھر اسے کنٹرول میں رکھنے کا تجربہ کرتے آ رہے ہیں۔ گورنر جنرل غلام محمد سے اس کھیل کا آغاز ہوا اور اسکندر مرزا، جنرل محمد ایوب خان، جنرل محمد یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق، بے نظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف کے ادوار سے گزرتا ہوا اب یہ کھیل جنرل پرویز مشرف کی کپتانی میں ایک نئے دور کا آغاز کر رہا ہے۔ سیاستدان، بیوروکریٹس اور جنرل صاحبان اس کھیل کی اصل ٹیمیں ہیں اور جس ٹیم نے بھی وکٹ سنبھالی ہے، کھیل کے ضوابط اور اخلاقیات کی کوئی پروا کیے بغیر وکٹ پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہوا، کر گزری ہے۔ درمیان میں ۵۶ء اور ۷۳ء کے دساتیر کی منظوری کے دو مراحل ایسے آئے ہیں جن میں قوم کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ شاید اب قومی سیاست کی گاڑی طاقت کی کشمکش سے نجات پا کر اصول اور ضوابط و قواعد کی پٹری پر چل پڑے گی مگر اصول، قانون، ضابطہ اور اخلاقیات کا دورانیہ بہت مختصر رہا اور قوت و طاقت کے حصول اور اس کے اندھا دھند استعمال کی روش پھر قوم کو سیاسی دھینگا مشتی کے دور میں واپس لے گئی۔

اختیارات کے ایک ہاتھ میں ارتکاز کا تصور بہت پرانا ہے۔ غلام محمد نے اسی فلسفہ کے تحت دستور ساز اسمبلی کا کریا کرم کیا تھا اور سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسے سند جواز بھی فراہم کر دی

تھی، لیکن جنرل محمد ایوب خان نے بھی یہی فارمولا اپنایا اور عدالت عظمیٰ اس کی پشت پر رہی۔ اس کے بعد جنرل محمد یحییٰ خان کے دور میں فرد واحد کے فیصلوں نے ملک کو دولخت کر دیا اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں ۷۳ء کا دستور منظور ہوا تو محبّ وطن حلقوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا کہ اب ملک میں فرد واحد کے فیصلوں کی بجائے پارلیمنٹ اور اداروں کی حکمرانی کا دور شروع ہوگا اور طاقت کی بالادستی کے فلسفہ سے نجات ملے گی، مگر بدقسمتی سے ۷۳ء کے دستور کو منظور کرنے والے سیاست دان جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہی یک طرفہ دستوری ترامیم کے ذریعے اختیارات کو ایک ہاتھ میں مرتکز کرنے اور اختلاف کرنے والے نمائندوں کو اٹھا کر پارلیمنٹ ہاؤس سے باہر پھینک دینے کی کارروائی سامنے آئی تو اصول و قانون کی بالادستی اور اداروں کی حکمرانی کا خواب ایک بار پھر پریشان ہو گیا اور پاکستان دوبارہ غلام محمد کے دور میں واپس چلا گیا۔

جنرل ضیاء الحق آئے اور انہوں نے دستور کی بساط لپیٹ کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تو ان کے دلائل بھی وہی تھے جو آج نئی سیاسی اصلاحات کے حق میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ دلائل اس سے قبل جناب غلام محمد اور جنرل محمد ایوب خان کے کام بھی آ چکے تھے، چنانچہ انہی دلائل کی بنیاد پر عدالت عظمیٰ نے جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصی حکومت کو بھی تحفظ فراہم کر دیا۔ اس کے بعد بے نظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف نے دو دو باریاں لیں مگر طرز وہی رہا کہ حکومت کی کرسی پر ہیں تو تمام اختیارات اور طاقت کو مٹھی میں رکھتے ہوئے مخالفین کو آزادانہ سیاسی زندگی اور کردار کے مواقع سے محروم کرنا اور اقتدار سے باہر ہیں تو برسر اقتدار گروہ کو ہر قیمت پر اقتدار سے ہٹانا اور کسی طرح بھی آرام سے حکومت نہ کرنے دینا ان دو سیاسی قوتوں کی اولین ترجیح رہی اور بالآخر اسی کشمکش نے جنرل پرویز مشرف کی تشریف آوری کی راہ ہموار کی جس کے نتیجے میں پوری قوم اور خاص طور پر سیاسی قوتوں کو ان اصلاحات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن میں ایک طرف جنرل پرویز مشرف ہیں اور دوسری طرف اے آر ڈی اور متحدہ مجلس عمل کے دو پلیٹ فارموں کی صورت میں ملک کی کم و بیش تمام اہم دینی و سیاسی جماعتیں ہیں جو ان اصلاحات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن عدالت عظمیٰ کی فراہم کردہ چھتری نے ان اصلاحات کے نفاذ کو یقینی بنا دیا ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے سیاسی فارمولے، اصلاحات، قوم سے خطاب اور اقدامات میں کوئی ایسی نئی بات نظر نہیں آ رہی جو اس سے قبل غلام محمد، جنرل محمد ایوب خان اور جنرل ضیاء الحق کے فارمولوں میں شامل نہ رہی ہو۔ صرف نیشنل سیکیورٹی کونسل کے بارے میں جنرل پرویز مشرف کہہ سکتے ہیں کہ نیا سیاسی اقدام ہے لیکن جب بات طاقت اور صرف طاقت کی بالادستی کے حوالے سے ہو رہی ہے اور ہر معاملہ میں طاقت ہی کو حرف آخر قرار دیا جا رہا ہے تو قومی سلامتی کونسل کے قیام سے بھی صورت حال میں کوئی فرق رونما نہیں ہوگا۔ جس کے ہاتھ میں طاقت ہوگی، سلامتی کونسل بھی اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔ کسی مرحلہ میں اس قومی سلامتی کونسل نے ''طاقت ور'' کے ہاتھ سے پھسلنے کی کوشش کی تو اس کے پاس طاقت کے اظہار کے اور ذرائع بھی موجود ہوں گے اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ روایت بالاتر قانون کا درجہ اختیار کر چکی ہے کہ جب ''طاقت ور'' اپنی طاقت کے اظہار اور استعمال کا فیصلہ کر لیتا ہے تو مذہب، سیاست، عدالت یا کسی بھی دوسرے فورم کے لیے اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس طاقت کو آگے بڑھنے سے روک سکے یا کم از کم اسے کہہ ہی سکے کہ جناب والا! آپ جو کچھ کر رہے ہیں، درست نہیں ہے۔

ہمیں مستقبل کا نقشہ بھی اسی طرح نظر آ رہا ہے کہ اگر جنرل پرویز مشرف کی اصلاحات کے مطابق اکتوبر کے انتخابات منعقد ہو جاتے ہیں تو اسمبلیاں وجود میں آئیں گی۔ وہ جنرل موصوف کے آئینی اقدامات کو آٹھویں دستوری ترمیم کی طرز پر تحفظ فراہم کریں گی، اس کے بعد سیاسی عمل آگے بڑھے گا اور ایک دو انتخابات کے بعد کسی بھی سیاسی جماعت نے پارلیمنٹ میں مضبوط پوزیشن اختیار کر لی تو جنرل پرویز مشرف کی سیاسی اصلاحات اور ان کے آئینی تحفظات کا تیا پانچہ اور اختیارات کی کشمکش ہوگی جو اس قدر طول پکڑے گی کہ پھر کسی جنرل کے انتظار میں لوگوں کی نگاہیں جی ایچ کیو کی طرف اٹھنے لگیں گی، اور اس کے بعد پردۂ غیب سے ایک اور جنرل محمد ایوب خان نمودار ہوں گے جو قوم کو سیاست دانوں کی بدعنوانیوں اور بے اصولیوں سے نجات دلانے کی پرانی گیم کا ازسرنو آغاز فرما دیں گے۔

اسلام کے سیاسی نظام میں اور آج کے سیاسی فلسفوں میں یہی فرق ہے کہ اسلام میں اصول

وضوابط پہلے سے طے شدہ ہیں جن میں ردوبدل کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ حکومت نے جس پٹڑی پر چلنا ہے، وہ متعین ہے اور اس کا کانٹا بدلنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے، جبکہ جمہوریت سمیت آج کے تمام سیاسی نظاموں کی بنیاد اس پر ہے کہ انسانوں نے اصول بھی خود طے کرنے ہیں اور ان پر عمل درآمد کا اہتمام بھی خود کرنا ہے۔ یہ اصول وضوابط اور اخلاق وقوانین فردِ واحد طے کرے، کوئی گروہ یا طبقہ انہیں ترتیب دے یا کوئی منتخب پارلیمنٹ ان کا خاکہ مرتب کرے، بہرحال انسانوں نے ہی طے کرنے ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں طے کرنے کا اختیار رہتا ہے، ان کے ذہنی رجحانات، گروہی یا شخصی مفادات اور سیاسی ترجیحات کی چھاپ بہرحال ان اصولوں اور ضوابط پر نمایاں ہوتی ہے۔

خلافت راشدہ کا آغاز خلیفہ اول حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کے اس خطبہ سے ہوتا ہے جب انہوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد مسجد نبوی میں کھلے بندوں قوم سے خطاب کیا تھا اور اپنی پالیسیوں کا اعلان فرمایا تھا۔ اس میں انہوں نے کوئی سیاسی فارمولا نہیں پیش کیا تھا اور نہ ہی دستوری اصلاحات کے بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت محسوس کی تھی، بلکہ یہ فرمایا تھا کہ اصول وضوابط اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی شکل میں طے شدہ ہیں، اگر میں ان کے مطابق چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلوں تو مجھے پکڑ کر سیدھا کر دو۔

خدا کرے کہ یہ فلسفہ پاکستانی حکمرانوں کی سمجھ میں بھی آ جائے کیونکہ دستوری اکھاڑ پچھاڑ اور طاقت کی کشمکش سے نجات کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۱۷ رجولائی ۲۰۰۲۔

پاکستان، اسلام اور امت مسلمہ

پرویز حکومت کی ترجیحات

عالمی طاقتوں کا ایجنڈا اور جنرل مشرف کا امتحان

سپریم کورٹ آف پاکستان کے بارہ جج صاحبان نے متفقہ طور پر جنرل پرویز مشرف کے ۱۲ را کتوبر کے اقدام کو نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا ہے اور انہیں تین سال تک عام انتخابات کرانے کی ہدایت کرتے ہوئے آئین میں ترمیم کا اختیار بھی سونپ دیا ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کو بھی سپریم کورٹ نے اسی نوعیت کا اختیار دیا تھا مگر اس میں تین سال کے عرصہ کی قید نہیں تھی چنانچہ جنرل مرحوم نے اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے مختلف اقدامات کے ذریعے گیارہ سال تک اقتدار کو اپنے پاس رکھا تھا اور اگر بہاولپور کا سانحہ پیش نہ آتا تو بظاہر ابھی اقتدار سے ان کا الگ ہونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

جنرل پرویز مشرف نے ۱۲ را کتوبر کو میاں محمد نواز شریف کی حکومت برطرف کرتے ہوئے آرمی چیف کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تو ان کا اقدام آئین سے ماورا ہونے کے باوجود نہ صرف پاکستانی عوام نے اسے قبول کرتے ہوئے اس میں خیر مقدم اور خوش آمدید کا رنگ بھر دیا تھا بلکہ بین الاقوامی اداروں اور امریکہ سمیت مغربی حکومتوں نے بھی اس کے بارے میں ''گوارا ہے'' کی پالیسی اختیار کر لی تھی، اس لیے کہ میاں محمد نواز شریف کی حکومت عالمی قوتوں اور پاکستانی عوام دونوں کی توقعات پر پوری نہیں اتری تھی اور بیک وقت دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں وہ دونوں کے اعتماد سے محروم ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ۱۲ را کتوبر کے اقدام کو دونوں حلقوں میں اپنے اپنے انداز سے قبول کر لیا گیا اور اب سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسے سند جواز بھی فراہم کر دی ہے۔

اس ''عدالتی مینڈیٹ'' کے بعد جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا کیا رخ ہوتا ہے؟ اس کا اندازہ چند روز تک ہو جائے گا بلکہ کچھ کچھ ہو بھی رہا ہے، مگر ہماری ''فقیرانہ رائے'' ہے کہ جنرل پرویز مشرف بھی میاں نواز شریف کی طرح اس مخمصے کا شکار ہو چکے ہیں کہ عالمی اداروں اور پاکستانی عوام میں سے کس کو خوش رکھنا ہے اور ان میں سے کس کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کرنی ہے، کیونکہ ان دونوں کی خواہشات، توقعات اور ترجیحات مختلف بلکہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور دونوں کو بیک وقت خوش رکھنے کی کوئی کوشش اب میاں نواز شریف کے حشر سے سبق حاصل نہ کرنے کی کوشش ہی قرار دی جا سکتی ہے۔

مغربی ممالک اور عالمی اداروں کی توقعات اور ایجنڈا کچھ اس طرح سے ہے کہ:

o پاکستان جنوبی ایشیا میں بھارت کی بالادستی قبول کرتے ہوئے کشمیر سے دست بردار ہو جائے، چین کے خلاف امریکہ کے قائم کردہ متحدہ محاذ میں شریک ہو اور نیپال، سکم اور بھوٹان کی طرح ایک طفیلی ریاست کی حیثیت اختیار کر لے۔

o صنعتی ترقی کا خواب دیکھنا چھوڑ دے، وسطی ایشیا کی منڈی کی طرف للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے کی بجائے ایک زرعی ملک کی حیثیت پر اکتفا کرے اور صنعتی ممالک کے لیے وسطی ایشیا تک محض ایک گزرگاہ بن جانے کے ساتھ ساتھ خود بھی منڈی بننا قبول کرے۔

o مشرق وسطیٰ میں امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کے لیے خطرات کا باعث بننے کی بجائے ان کے استحکام اور ترقی کے لیے کردار ادا کرے۔

o حکومت پاکستان بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور بڑی حکومتوں کے قرضے اور سود کی قسطیں بہرصورت ادا کرنے کے لیے اپنے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھاتی چلی جائے اور مالیاتی اداروں کو یہ مواقع فراہم کرتی رہے کہ وہ پاکستانی عوام کو کوئی ریلیف فراہم کرنے کی بجائے ان کے گرد معاشی پابندیوں اور ٹیکسوں کے حصار تنگ سے تنگ کرتے چلے جائیں۔

o پاکستان اپنی شمال مغربی سرحد پر افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کی تقویت اور استحکام کا باعث نہ بنے بلکہ طالبان کو کسی طرح گھیر گھار کر شمالی اتحاد کے ساتھ مخلوط حکومت کے لیے

آمادہ کرے تاکہ افغانستان کی حکومت میں ''اسلامیت'' کے عنصر کو جس حد تک ممکن ہو، کم کیا جا سکے۔

o پاکستان کے اندر دینی مدارس، جہادی تحریکات اور مذہبی اقدار کی حوصلہ شکنی کی جائے اور ثقافت و کلچر کی آڑ میں حلال و حرام کے تصور سے ناآشنا معاشرت کے فروغ کی مہم کو ہر سطح پر عام کیا جائے۔

ظاہر بات ہے کہ یہ ایجنڈا یا اس کی کوئی ایک شق بھی پاکستان کے عوام کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے، بلکہ اپنے پڑوس میں طالبان حکومت کی سادگی، قناعت پسندی، دینی حمیت، قومی غیرت اور قرضوں کے لیے عالمی طاقتوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے کی روش کو دیکھ کر پاکستانی عوام کا بھی جی چاہتا ہے کہ ان کے ملک کا نظام تبدیل ہو، پروٹوکول اور پرسٹیج (prestige) کے تکلفات سے انہیں نجات ملے، انہیں قناعت پسند اور کفایت شعار حکمران اور افسران میسر ہوں اور اس کے علاوہ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں طبقاتی امتیاز سے چھٹکارا حاصل ہو، وسائل اور دولت کی غلط تقسیم اور ہوش ربا معاشی تفاوت کی لعنت سے جان چھوٹے، قرضوں کا شکنجہ ٹوٹے، قومی دولت لوٹنے والوں کا حقیقی احتساب ہو اور ان سے قومی دولت اور اثاثے واپس لیے جائیں، وہ مذہبی عدم رواداری اور فرقہ وارانہ تشدد کی دلدل سے نکلیں، ایک پرامن اور خوشحال قوم کی حیثیت سے اقوام عالم کی برادری میں انہیں ایک جائز اور باوقار مقام حاصل ہو، پاکستان کی شہ رگ کشمیر سے بھارت کا آہنی پنجہ ہٹے اور کشمیری عوام آزادی حاصل کریں، اسلامی ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہوں اور ایک مضبوط اسلامی بلاک تشکیل پائے، بیت المقدس آزاد ہو اور فلسطینیوں کو ان کے جائز حقوق ملیں، جنوبی ایشیا میں بھارت کے ساتھ برابری کی بنیاد پر باوقار تعلقات قائم ہوں، طاقت کا کوئی بھی عدم توازن اس علاقہ میں بھارت کی بالادستی کا ذریعہ نہ بنے اور افغانستان اور وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات اسلامی اخوت کی بنیاد پر مستحکم سے مستحکم ہوتے چلے جائیں۔

یہ دو ایجنڈوں کا ٹکراؤ ہے اور دو پروگراموں کا تصادم ہے اور جنرل پرویز مشرف کا اصل امتحان اب شروع ہوا ہے کہ وہ ان میں سے کس کا ساتھ دیتے ہیں اور کس پروگرام کو قبول کرتے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف برسرِ اقتدار آئے تو بہت سے دوست پوچھتے تھے اور اب بھی مختلف حضرات

دریافت کرتے رہتے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف کس کے نمائندے ہیں اور کس لابی سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں ان سے عرض کیا کرتا تھا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دو دھاری تلوار کس طرف چلے گی۔ یہ آنے والا وقت بتائے گا اور جنرل پرویز مشرف کا ایجنڈا اور ترجیحات نشان دہی کریں گی کہ وہ اصل میں کس کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ وقت آ گیا ہے اور سپریم کورٹ کے فیصلے نے جنرل پرویز مشرف کو اس فیصلہ کن دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے انہوں نے بہرحال کسی ایک طرف ٹرن لینا ہے۔

میں ایک نازک مرحلہ پر جنرل پرویز مشرف سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صرف اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ صرف ایک شخص کا ٹرن نہیں بلکہ جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام کے مجموعی تناظر میں پوری امت مسلمہ کا ٹرن بھی ہو سکتا ہے، اس لیے وائٹ ہاؤس اور کعبۃ اللہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے ہوئے وہ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں اور پوری طرح جائزہ لے لیں کہ وہ تاریخ کے صفحات میں اپنی تصویر صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری یا میر جعفر، میر صادق اور شریف مکہ حسین میں سے کس کے ساتھ دیکھنا چاہیں گے؟*

O

---

* روزنامہ اوصاف، ۱۹ مئی ۲۰۰۰ء۔

صدر مشرف کی گوادر ڈپلومیسی

صدر جنزل پرویز مشرف بھارت کے کامیاب دورے سے واپس آ گئے ہیں اور ان کے دورے کے مختلف پہلوؤں پر قومی اور بین الاقوامی پریس میں گفت وشنید کا سلسلہ جاری ہے۔جس رات جنزل پرویز مشرف آ گرہ سے واپس اسلام آباد آئے، صبح کے اخبارات کی جلی سرخیوں میں دورے کو ناکام قرار دے کر بھارت کے رویے پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا اور ایک دو روز کے بعد دورے کو ناکام کی بجائے نامکمل کہنا شروع کر دیا گیا مگر ہمارے خیال میں یہ دورہ نہ نامکمل تھا نہ ناکام، بلکہ صدر مشرف نے وہ تمام مقاصد حاصل کر لیے جو وہ اس دورے سے حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ آ گرہ سے اپنے مشن میں کامیاب ہوکر واپس لوٹے ہیں۔

صدر پرویز مشرف نے پہلے ایسے حالات پیدا کیے کہ بھارت خود انہیں دہلی آنے کی دعوت دے اور اس کے لیے ان کی ''گوادر ڈپلومیسی'' کامیاب رہی، کیونکہ گوادر اور عوامی جمہوریہ چین کا تعلق ظاہر کر کے انہوں نے امریکہ بہادر کے سر پر خطرے کی گھنٹی بجادی جس سے بھارت پر دباؤ میں اضافہ ہوا اور یوں جنزل پرویز مشرف کو مذاکرات کی دعوت دینے کے سوا اس کے پاس کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔ بہت سے دوستوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یہ بیٹھے بٹھائے بھارت کو کیا ہوا کہ اس نے پاکستان میں فوجی حکومت کے حوالے سے اپنے روایتی طرز عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے جنزل پرویز مشرف کو نہ صرف مذاکرات کے لیے دہلی بلا لیا بلکہ ان کے استقبال اور آ ؤ بھگت میں بھی پورے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا مگر جب ان سے عرض کیا گیا کہ وہ اسے جنزل پرویز مشرف کی

''گوادر ڈپلومیسی'' کے پس منظر میں دیکھیں تو انہیں اس دورے کے پس پردہ حقائق کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ جنرل پرویز مشرف نے دورۂ بھارت میں ہر جگہ کشمیر کا ذکر کیا اور مذاکرات میں بھی کشمیر ہی کے ذکر کو مقدم رکھا، حتیٰ کہ وہ بھارت کے وزیراعظم اور وزیر خارجہ کو مشترکہ اعلامیہ میں اس کا تذکرہ شامل کرنے پر قائل کرنے میں ابتدائی مرحلہ میں کامیاب بھی ہو گئے مگر بھارت کشمیر کو متنازعہ معاملہ بلکہ نفس مسئلہ تسلیم کرنے میں بھی متردد رہا۔ اس طرح صدر پاکستان عالمی سطح پر پاکستان کے اس موقف کو پھر سے اجاگر کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل تنازعہ کشمیر پر ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوئے بغیر دونوں ملکوں کے تعلقات کا معمول پر آنا اور جنوبی ایشیا میں کشیدگی کا کم ہونا ممکن نہیں، جبکہ بھارت اس مسئلہ کو حل کرنے بلکہ اسے متنازعہ تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے اور اس کی ہٹ دھرمی ہی دراصل کشیدگی کو کم کرنے اور باہمی تصادم کو روکنے کے امکانات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

جنرل پرویز مشرف نے تنازعہ کشمیر کے تذکرہ کے بغیر مشترکہ اعلامیہ کو قبول کرنے کی بجائے اعلامیہ کے بغیر واپس آنے کو ترجیح دے کر کشمیری عوام اور پاکستان کی رائے عامہ کو اپنے بارے میں یہ اعتماد دلا دیا ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے پاکستانی اور کشمیری عوام کے موقف کے ساتھ واضح کمٹمنٹ رکھتے ہیں بلکہ اسے بلا جھجک ہر فورم پر پیش کرنے اور اس پر ڈٹ جانے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ اسی طرح صدر پاکستان نے تحریک آزادیٔ کشمیر اور اس کی پشت پناہی کرنے والی پاکستانی رائے عامہ کو نیا حوصلہ اور اعتماد بخشا ہے جسے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ حکومت پاکستان بین الاقوامی فورم پر ان کے جذبات و احساسات کی کما حقہ ترجمانی نہیں کر پاتی اور پاکستانی حکومتیں مسئلہ کشمیر پر قومی موقف اور بین الاقوامی مصلحتوں کے درمیان ترجیحات طے کرنے میں اکثر و بیشتر لچک کا مظاہرہ کر جاتی ہیں۔

بھارت کے پاس سب سے بڑا پوائنٹ ''سرحد پار دہشت گردی'' کا ہے جسے وہ دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کے ساتھ نتھی کر کے پیش کر رہا ہے اور بین الاقوامی رائے عامہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اصل بات ''دہشت گردی کی روک تھام'' کی ہے جس میں پاکستان تعاون کے

لیے تیار نہیں، لیکن اس کے لیے مشکل یہ ہے کہ وہ کشمیری عوام کی جن مسلح کارروائیوں کو ''دہشت گردی'' قرار دے رہا ہے، ان کا تعلق کشمیری عوام کی اس تاریخی جدوجہد سے ہے جو وہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اپنے لیے خودارادیت کا مسلمہ حق حاصل کرنے کے لیے گزشتہ نصف صدی سے جاری رکھے ہوئے ہیں، اس لیے مسئلہ کشمیر پر تنازعہ کو حل کیے بغیر ان عسکری کارروائیوں کو ''دہشت گردی'' قرار دلوانا آسان بات نہیں ہے جبکہ جنرل پرویز مشرف نے مسئلہ کشمیر کے حل کرنے میں بھارت کے انکار کو ایک بار پھر ''فلیش'' کر کے دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ کشمیر میں عسکری کارروائیوں کا تعلق کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی سے ہے اور مسئلہ کشمیر کے حل کا دار و مدار بھارت کے طرز عمل پر ہے، اس لیے ان عسکری کارروائیوں کی، جن کو بھارتی حکومت ''دہشت گردی'' قرار دے رہی ہے، بالواسطہ طور پر ذمہ داری خود بھارت پر عائد ہوتی ہے۔

اس لیے ہماری ناقص رائے میں صدر جنرل پرویز مشرف کا دورۂ بھارت کامیاب رہا ہے کیونکہ اس سے انہوں نے جو مقاصد حاصل کیے ہیں، وہ شاید کسی ''گول مول مشترکہ اعلامیہ'' کی صورت میں حاصل نہ ہو پاتے، البتہ اب اصل ضرورت اس حوالے سے مستقبل کی منصوبہ بندی کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ صدر پرویز مشرف اگر آئندہ بھی اسی سنجیدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے تو وہ بھارت کو مسئلہ کشمیر کے حل کی ضرورت کا احساس دلانے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۲۶/جولائی ۲۰۰۱ء۔

پاک بھارت تعلقات اور بین الاقوامی سیاست

جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین جنرل محمد عزیز خان نے گزشتہ دنوں راولاکوٹ کی ایک تقریب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ قوم کے ہر باشعور شہری کے دل کی آواز ہے اور ہمیں ان باتوں پر اس لیے بھی زیادہ خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ کافی عرصہ کے بعد ''ادھر سے'' ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا ہے جس سے تپش اور لو کے اس موسم میں وقتی طور پر ہی سہی، مگر کچھ سکون سا محسوس ہوا ہے۔ جنرل صاحب نے پاک بھارت تعلقات کے حوالے سے یہ کہہ کر قوم کو گزشتہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہندو مسلم کشمکش کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو جانے سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات معمول پر آ جائیں گے، وہ غلطی پر ہیں اس لیے کہ بھارت کا تنازع ہمارے ساتھ صرف کشمیر کے مسئلہ پر نہیں بلکہ اس کے ایجنڈے کا بنیادی ہدف جنوبی ایشیا پر اپنی بالادستی یا جنرل صاحب موصوف کے بقول تھانیداری قائم کرنا ہے اور وہ پاکستان کو اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتا ہے۔

دراصل عالمی قوتیں اور فری ورلڈ ٹریڈ کے نام پر دنیا کی معیشت کو اپنے قبضے میں لینے کی خواہش مند طاقتوں کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان موجودہ کشیدگی کو کسی نہ کسی طرح کم کیا جائے تاکہ انہیں آزاد منڈیاں فراہم ہوں اور وہ کسی رکاوٹ کے بغیر اپنی مصنوعات کو کھلی مارکیٹ میں لا سکیں۔ اس کے ساتھ ہی مغربی نظام اور فلسفہ وتہذیب کی راہ میں پاکستان کو ایک نظریاتی اور تہذیبی حریف تصور کرتے ہوئے عالمی استعمار اس کی موجودہ پوزیشن کے برقرار رہنے پر

راضی نہیں ہے، اس لیے اس کے سوا اسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا کہ پاکستان اور بھارت کی صلح ہو اور انہیں یورپی یونین طرز کی کسی نیم سیاسی یا تجارتی وحدت میں یکجا کر دیا جائے جس کے بعد پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے دست بردار کرنا آسان ہو جائے گا اور اس کی فوج کے سائز کو بھی کم کیا جا سکے گا اور اس طرح پاکستان ایک اسلامی اور عالم اسلام کی نظریاتی قیادت کی صلاحیت سے بہرہ ور ریاست کی بجائے بھارت کے زیر اثر ایک ملک کا درجہ اختیار کر لے گا، لیکن ان منصوبہ سازوں کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ کم از کم ایک ہزار سالہ مسلم ہندو کشمکش کے تاریخی پس منظر میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ نہ تو ہندو ذہنیت اپنے پڑوس کے مسلمانوں کو اس حالت میں قبول کر سکتی ہے کہ وہ ایک برابر کی قوت اور قوم کے طور پر رہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے یہ صورت حال قابل قبول ہوگی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ ان کی بالادستی کے تاثر کے ساتھ زندگی گزاریں۔

آپ حالات کا جو بھی تجزیہ کر لیں اور دنیا کے حالات میں تبدیلیوں اور نئے عالمی رجحانات کا جس قدر ڈھنڈورا پیٹ لیں، مگر اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جنوبی ایشیا میں مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کی حریف قومیں ہیں جن کے درمیان دشمنی اور کشمکش کی تاریخ ایک ہزار سال سے زیادہ طویل پس منظر رکھتی ہے اور جن کے درمیان آج بھی ایک دوسرے پر بالادستی کے نہ صرف جذبات موجود ہیں بلکہ اس کے لیے دونوں طرف سے تیاریاں بھی جاری ہیں۔ مغربی اقوام اگر یہ سمجھتی ہیں کہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کوئی ایسی مصالحت کرا سکتی ہیں جس سے یہ دونوں قومیں باہم شیر و شکر ہو کر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن یا جی ایٹ کی چراگاہ بن جائیں گی تو یہ ان کی غلط فہمی ہے اور انہیں اس حوالہ سے اپنے تجزیوں اور اندازوں کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مسئلہ کشمیر کے حل کے حق میں نہیں ہیں۔ مسئلہ کشمیر تو ایک زندہ تنازع ہے جس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالنا ہوگا اور یہ نہ صرف مغربی اقوام بلکہ آزادی اور انسانیت کا نام لینے والی دنیا بھر کی تمام اقوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ کشمیریوں کو ان کا جائز حق دلانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور پاکستان جو کشمیریوں کے جائز اور مسلمہ حق کے لیے کشمیری عوام کا ساتھ دے رہا ہے، اسے کشمیریوں کے ساتھ تعاون سے دست بردار کرانے کے لیے دباؤ ڈالنے کی بجائے اس کے

موقف پر سنجیدگی سے غور کریں۔ مسئلہ کشمیر کا جو حل بھی کشمیری عوام کی خواہشات اور ان کے مسلمہ حقوق کے مطابق ہوگا، اس کا خیر مقدم کیا جائے گا لیکن مسئلہ کشمیر کا کوئی ایسا حل جس میں کشمیری عوام کی وحدت، آزادی اور ان کے شہری حقوق کو عالمی استعمار کی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیا جائے اور بڑی طاقتیں اپنے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کشمیری عوام کے حقوق اور قربانیوں کو نظر انداز کر کے اپنی مرضی کا کوئی حل ان پر مسلط کر دیں تو اس سے کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا، بلکہ مزید الجھ جائے گا اور یقیناً ایک نئی کشمکش کا نقطہ آغاز ثابت ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی مسئلہ کشمیر کا کوئی نہ کوئی حل مسلط کرنے کے بعد پاکستان اور بھارت کو مصالحت کے بہانے کسی سیاسی یا تجارتی وحدت کے دائرے میں اکٹھا کر کے اگر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ اس سے ایک ہزار سالہ مسلم ہندو کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا تو یہ خام خیالی کی بات ہوگی۔ اس کشمکش کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مغل بادشاہت کے دور میں کوئی مسئلہ کشمیر موجود نہیں تھا، لیکن جنوبی ہند کے جنونی ہندوؤں نے دہلی کے مسلم اقتدار کے خاتمہ کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ مرہٹوں کی یلغار کا راستہ روکنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو قندھار سے آنا پڑا تھا اور پانی پت کے میدان میں تلوار کے زور پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا بھی اس میں برابر کا حق ہے اور وہ بھی اس خطہ میں آزادی اور خود مختاری کے ساتھ زندہ رہنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

آج بھی جنوبی ہند میں ''ہندو احیائیت'' کی تحریک پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ''مرہٹہ ازم'' ایک بار پھر منظم شکل میں سامنے آ رہا ہے اور تین سو سال قبل کی طرح آج بھی اس کا ایجنڈا یہی ہے کہ مسلمان اس خطہ میں یا ان کے تابع اور برخوردار بن کر رہیں اور یا ملک چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ ''ہندو احیائیت'' کے اس ایجنڈے اور یلغار کا سامنا سر جھکا کر اور دنیا کی بڑی قوتوں سے امن کی بھیک مانگ کر نہیں ہوگا بلکہ ماضی کی طرح آج بھی اس کا حل شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر میں ہے، احمد شاہ ابدالی کی یلغار میں ہے اور پانی پت کے میدان میں ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا وجدان یہ کہتا ہے کہ پانی پت کی ایک اور لڑائی کا میدان گرم ہو رہا ہے۔ اسے روکنے کے لیے ہر طرف سے کوششیں ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن تاریخ کے عمل کو کبھی روکا جا سکا ہے

اور نہ اب روکا جا سکتا ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر قوموں کی تاریخ کے نقشے بنانا اور چیز ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو ایک بار پھر دہرانے جا رہی ہے اور اس کی آندھی جب اٹھتی ہے تو اس کا راستہ کسی کے بس میں نہیں رہتا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن ارشادات میں ''غزوۂ ہند'' کی بات فرمائی ہے اور اس کے فیصلہ کن مرحلہ کا اس خطہ میں اسلام کی بالا دستی اور مسلمانوں کے غلبہ کی صورت میں بعض ارشادات میں ذکر فرمایا ہے، تاریخ کے مسلسل عمل کا رخ اسی جانب ہے اور جلد یا بدیر وہ آخری اور فیصلہ کن معرکہ بہرحال بپا ہو کر رہنا ہے۔ اس حوالہ سے تو ہمیں کسی قسم کا کوئی تردد یا شبہ نہیں ہے، البتہ کچھ عرصہ سے پاکستان کی عسکری قیادت کے بارے میں یہ شک ذہنوں میں ابھرنے لگا ہے کہ کہیں جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ ماضی اور تاریخ کے مسلسل عمل کا شعور اور ادراک ہماری عسکری قیادت کے ذہنوں سے محو تو نہیں ہو گیا؟ جنرل محمد عزیز خان نے راولاکوٹ کی تقریر میں ہمارا یہ شک دور کر دیا ہے، اس لیے ان کی حقیقت بیانی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی خدمت میں یہ عرض کرنے کو جی چاہ رہا ہے کہ:

تری آواز مکے اور مدینے*

O

* روزنامہ اسلام، ۲۷ رجون ۲۰۰۳ء۔

''سب سے پہلے پاکستان''؟

صدر جنرل پرویز مشرف ان سطور کی اشاعت تک امریکہ کے دورے پر روانہ ہو چکے ہوں گے۔ وہ صدر امریکہ جارج ڈبلیو بش کی دعوت پر امریکہ کا دورہ کر رہے ہیں اور ان کا سرکاری دورہ ۱۲رفروری سے ۱۴رفروری تک ہوگا جس کے دوران وہ صدر بش سے تفصیلی مذاکرات بھی کریں گے جب کہ اس سے قبل وہ امریکہ پہنچنے کے بعد غیر سرکاری مصروفیات بھگتائیں گے۔

صدر پرویز مشرف کے اس دورہ کو عالمی حلقوں میں خاصی اہمیت دی جا رہی ہے اور امریکی سفارت کاروں نے اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ اس موقع پر پاکستان کی امداد کا کوئی بڑا پیکج دیا جا رہا ہے جس سے بعض حلقے بہت زیادہ خوش دکھائی دیتے ہیں کہ اس سے پاکستان کی تقدیر بدل جائے گی اور وطن عزیز بہت سی معاشی مشکلات کے بھنور سے نکل آئے گا۔

دوسری طرف ملک کے سیاسی و دینی حلقوں میں بھی ''پرویز بش مذاکرات'' کا شدت سے انتظار ہو رہا ہے کیونکہ مستقبل کے بہت سے معاملات کا انحصار ان مذاکرات پر سمجھا جا رہا ہے۔ آئندہ عام انتخابات ہوں گے یا نہیں؟ اور ان انتخابات کا دائرہ اور رخ کیا ہوگا؟ دینی جماعتوں کو قومی سیاست میں آزادانہ اور سرگرم کردار ادا کرنے کا موقع ملے گا یا ان کی سرگرمیوں کو مزید محدود کرنے کی کوئی صورت نکالی جائے گی؟ سپریم کورٹ آف پاکستان کی طرف سے ملنے والی کلیئرنس کے بعد صدر پرویز مشرف ''دستور پاکستان'' میں جو مبینہ ترامیم لا رہے ہیں، ان کا رخ کس سمت میں ہوگا؟ اور آئین کے اسلامی تشخص اور بنیادوں کے بارے میں بین الاقوامی حلقے جو مسلسل دباؤ ڈال رہے

ہیں، وہ صدر پرویز مشرف کی دستوری ترامیم میں کس حد تک اثر انداز ہوگا؟ مقبوضہ کشمیر میں بھارت پر دباؤ بڑھانے کے لیے مسلح جہادی تحریکات کی حمایت کا جو تسلسل اب تک قائم ہے، وہ برقرار رہے گا یا اسے ختم کر کے ''مذاکرات کی میز'' تک مسئلہ کشمیر کو محدود کر دیا جائے گا؟ فلسطین، بیت المقدس اور دیگر حوالوں سے بہت سے مسائل کے بارے میں پاکستان کی پالیسیوں میں ملت اسلامیہ اور مسلم ممالک کو بہرحال ترجیح دینے کی روش برقرار رہے گی یا اسے عالمی برادری کے ''اجتماعی رجحانات'' میں تحلیل کر دیا جائے گا؟ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے اہم اور نازک سوالات کے جوابات کا انحصار ان مذاکرات پر ہے جو ۱۳ر فروری ۲۰۰۲ء کو وائٹ ہاؤس میں صدر امریکہ جارج ڈبلیو بش اور صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کے درمیان ہو رہے ہیں اور اسی وجہ سے کسی بھی سیاسی یا دینی حلقے سے تعلق رکھنے والا ہر باشعور پاکستانی، صدر جنرل پرویز مشرف کے دورۂ امریکہ اور صدر بش کے ساتھ ان کے مذاکرات کے نتائج کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ حلقوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ پاکستان کے کھاتے میں ان مذاکرات کے نتیجے میں کتنے ڈالر منتقل ہوتے ہیں، اور کچھ حلقے اس انتظار میں ہیں کہ عالم اسلام اور جنوبی ایشیا کے حوالہ سے امریکہ اور اس کی زیر قیادت عالمی اتحاد کی پالیسیوں اور پروگرام کا کون سا نیا رخ سامنے آتا ہے؟ یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔

مالی امداد کے حوالہ سے تو ہمارے بعض مہربان امریکہ کی طرف سے اب تک ملنے والی ''امداد'' سے بھی خوش ہیں اور انہیں اس بات کا غم ہے کہ ہم اس ''امداد'' پر امریکہ کی شکرگزاری کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں، چنانچہ ہمارے جنرل (ر) نشاط احمد صاحب کا ایک انٹرویو گزشتہ روز ایک قومی روزنامہ میں صفحہ اول پر شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:

> ''اچھی خاصی معاشی امداد بھی مل رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ناشکرے لوگ ہیں۔ کوئی جو کچھ بھی کر دے، ہم کہتے ہیں کہ کچھ نہیں کیا۔ یہ بچگانہ رویہ ہے۔''

یہ معاشی امداد کس مقدار میں ہے؟ پاکستان کی ضروریات اور حالیہ بحران میں اس کے نقصانات کے ساتھ اس امداد کا تناسب کیا ہے؟ یہ امداد کون کون سی قربانیوں کے عوض ملی ہے؟ اور پاکستان کو اس امداد کے عوض آئندہ کیا کچھ امریکی خواہشات کی بھینٹ چڑھانا ہے؟ ہمارے جنرل

صاحب کو اس سے کوئی غرض نہیں، البتہ یہ فکر انہیں پریشان اور شرمندہ کر رہی ہے کہ ان ڈالروں کے عوض پاکستانی قوم امریکہ کے حضور سجدہ ریز کیوں نہیں ہوئی؟ اور اتنے ڈالر مل جانے کے بعد بھی پاکستانیوں کے جذبات نے اپنے ''معاشی آقا'' کے لیے سراپا تشکر کی شکل اختیار کیوں نہیں کی؟ مگر اس سے قطع نظر ہم صدر پرویز مشرف کے دورۂ امریکہ کے موقع پر ان کی خدمت میں دو گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں جو یقیناً ان کے ذہن میں بھی ہوں گی، مگر یاددہانی کے لیے یہ معروضات ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ صدر محترم کو یہ بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وائٹ ہاؤس میں ان کی پذیرائی اور مقبولیت نارمل حالات میں نہیں رہی ہے اور نہ ہی نارمل اور معمولات کے حالات میں اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ پذیرائی اور مقبولیت کچھ خاص توقعات کے حوالہ سے ہے اور امریکی قیادت یہ امید لگائے بیٹھی ہے کہ عالم اسلام اور جنوبی ایشیا کے بارے میں اس کے ایجنڈے اور پروگرام کو آگے بڑھانے میں صدر پرویز مشرف اس کے لیے زیادہ بہتر معاون اور مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی لیے امریکی قیادت نے اپنے بہت سے ضابطوں اور اصولوں کو وائٹ ہاؤس میں صدر پرویز مشرف کے خیر مقدم کے لیے نظر انداز کر دیا ہے۔ ہمیں صدر پرویز مشرف کی حب الوطنی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہم انہیں ایک باشعور اور محبِّ وطن پاکستانی سمجھتے ہیں اور اسی اعتماد پر ان سے یہ درخواست کر رہے ہیں کہ وقت آ گیا ہے کہ انہیں اب صدر بش سے مذاکرات کے دوران پاکستان اور جنوبی ایشیا کے بارے میں امریکی ایجنڈے اور تعاون کی کوئی حد طے کر دینی چاہیے اور امریکی رہنماؤں کے سامنے ایک واضح لکیر کھینچ دینی چاہیے کہ ہم اس حد تک جا سکتے ہیں اور چونکہ اس سے آگے ہمارے ملی تشخص، ملکی سالمیت اور قومی خودمختاری کی حدود شروع ہو جاتی ہیں، اس لیے اس سے آگے بڑھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

ملی تشخص، ملکی سالمیت اور قومی خودمختاری کی حدود کو جنرل پرویز مشرف بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ہمیں اس سلسلہ میں ان کے فہم پر بھروسہ ہے، اس لیے اس کی تفصیلات میں جائے بغیر ان سے درخواست ہے کہ ان معاملات کو اب مزید مبہم چھوڑنے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہی اور اب

حدود کار اور تعاون کے دائروں کی واضح حد بندی کے بغیر امریکی اتحاد کے ایجنڈے کے ساتھ مزید آ گے بڑھنا پاکستان کے تشخص، وحدت، سالمیت اور خود مختاری کے بارے میں بہت بڑا ''رسک'' لینے کے مترادف ہوگا۔

دوسری گزارش اگرچہ صدر محترم کو محسوس ہوگی، لیکن ہمارے لیے عرض کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ صدر محترم کا خیال ہے کہ ہمیں صرف پاکستان کے معاملات تک محدود رہنا چاہیے اور دوسرے مسلمان ملکوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لینی چاہیے۔ وہ اسے ٹھیکے داری سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کا ارشاد ہے کہ ہم ساری دنیا کے ٹھیکے دار نہیں ہیں، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بات درست نہیں ہے، اس لیے کہ سلطنت خداداد پاکستان، جس کی صدارت پر جنرل پرویز مشرف فائز ہیں، قائم ہی اس لیے ہوئی تھی کہ دنیا میں اسلامی تہذیب کا احیا کرے، اسلامی طرز حیات کی نمائندگی کرے اور مثال اور آئیڈیل کے طور باقی دنیائے اسلام کی راہنمائی کرے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے ان امور کی دوٹوک صراحت کی ہے اور ان کی حیات وخدمات سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص اس سے بے خبر نہیں ہے، اس لیے ملت اسلامیہ کے مفادات، اسلامی طرز حیات کی نمائندگی اور اسلامی تہذیب کے دنیا بھر میں احیا کی بات کرنا اگر ''ٹھیکے داری'' ہے تو قائداعظم کے واضح ارشادات کی روح سے ہم ٹھیکے دار ہیں اور اس ٹھیکے داری سے انکار پاکستان کے مقصد قیام کی نفی ہے کیونکہ یہ بات پاکستان کے خمیر میں شامل ہے۔

اس پس منظر میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ صدر جنرل پرویز مشرف کا ذاتی خیال کچھ بھی ہو، مگر اسلام کی ٹھیکے داری کے لیے قائم ہونے والے پاکستان کے صدر کی حیثیت سے ان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ عالمی فورم پر اسلام کی بات کریں، اسلامی تہذیب وثقافت کی بات کریں اور ملت اسلامیہ کے مفادات کی بات کریں اور صرف یہ نہ دیکھیں کہ مغرب اور اس کی قیادت اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا سوچ رہی ہے بلکہ یہ منظر بھی سامنے رکھیں کہ عالم اسلام کے جذبات مغربی اتحاد کے موجودہ طرز عمل کے بارے میں کیا ہیں؟ اور دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۳ر فروری کے مذاکرات میں صدر امریکہ جارج ڈبلیو بش سے اس مسئلہ پر بات کریں کہ امریکی

اتحاد اسلامی تہذیب وعقائد اور عالم اسلام کے خلاف اپنی مہم کو کس حد تک آگے لے جانا چاہتا ہے؟

یہ منظر تو سب کے سامنے ہے کہ مغرب اور ملت اسلامیہ کے درمیان کشیدگی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور سیاست ومعیشت کے ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت کے حوالہ سے بھی کشمکش دن بدن تیز ہو رہی ہے، اس لیے امریکی اتحاد کے سربراہ سے اس سلسلہ میں دوٹوک بات کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ امریکی اتحاد عالم اسلام کے ساتھ اپنے معاملات کو جنگ، دباؤ اور قوت کے زور پر ہی طے کرنا چاہتا ہے یا مغرب اور عالم اسلام کے درمیان باوقار گفتگو، ڈائیلاگ اور مذاکرات کی کوئی گنجایش بھی باقی رہ گئی ہے؟ ہمارے خیال میں اگر صدر جنرل پرویز مشرف ان مذاکرات میں اور ان مذاکرات کے حوالہ سے عالم اسلام کو اس تذبذب سے نکالنے کے لیے کوئی نتیجہ خیز کردار ادا کر سکیں تو رائے عامہ کو اپنا آئندہ موقف اور پروگرام طے کرنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۱۲ر فروری ۲۰۰۲ء۔

کیا جنرل مشرف اس پیغام کو سمجھنے کی زحمت کریں گے؟

امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے خاتمہ اور سوویت یونین کے بکھر جانے کے بعد نیٹو کے مستقبل کا سوال پیدا ہوا تو نیٹو کے اس وقت کے سیکرٹری جنرل نے ایک مختصر سے جملے میں یہ کہہ کر نیٹو کو باقی رکھنے کا جواز پیش کیا تھا کہ ’’ابھی اسلام باقی ہے۔‘‘

نیٹو اس فوجی معاہدہ کا نام ہے جو سوویت یونین کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے باہمی مشترکہ دفاع کے لیے طے کر رکھا تھا جبکہ اس کے جواب میں سوویت یونین نے ’’وارسا پیکٹ‘‘ کے نام سے باہمی فوجی تعاون کا معاہدہ کیا ہوا تھا۔ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان کشمکش کے خاتمہ اور دونوں کے ایک میز پر بیٹھ جانے بلکہ سوویت یونین کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد ان دونوں معاہدوں کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ وارسا پیکٹ تو سوویت یونین کے ساتھ ہی تحلیل ہو گیا مگر نیٹو کے اربابِ حل وعقد نے اسے باقی رکھنے کی ضرورت سمجھی اور وہ بدستور قائم ہے اور اس کا ایجنڈا وہی ہے جو نیٹو کے ایک سیکرٹری جنرل کے حوالہ سے سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے، البتہ اتنا فرق ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ امریکہ اپنے حریف اسلام اور اس کے نام لیواؤں کو قوت کے بل پر دبانا چاہتا ہے مگر برطانیہ کے سوا یورپی یونین کے دیگر ارکان مسلمانوں کو مارنے کے بجائے انہیں اعتماد میں لے کر محبت پیار کی فضا میں اسلام سے دور ہٹانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، بالکل اسی طرح جیسے سرد جنگ کے دور میں سوویت یونین نے اپنے مقبوضہ مسلم علاقوں میں جبر وتشدد کے ذریعہ اسلامی شعائر وروایات کو مٹانے کا طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا جبکہ امریکہ اور اس کے حلیف ممالک اپنے

زیر اثر مسلم ممالک میں انسانی حقوق، آزادی اور معاشی ترقی کا سنہری جال پھیلا کر اسلامی اقدار و روایات کو کمزور سے کمزور کر دینے کے لیے سرگرم عمل تھے۔ اسے ایک چھوٹی سی مثال سے زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ ترکی سے سنکیانگ تک ترکی النسل مسلمانوں کا ایک مسلسل علاقہ اور پٹی کا جو حصہ سوویت یونین کے قبضہ میں آیا، اس نے وہاں جبر و تشدد کے ذریعہ مساجد و مدارس کو ویران کیا، اور جس خطہ نے امریکہ کے زیر اثر رہنا قبول کیا، وہاں قانون اور جمہوریت کے نام پر مساجد و مدارس کو بند کیا گیا۔ مقصد دونوں طرف ایک تھا، صرف طریق کار کا فرق تھا۔ اب بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ تقسیم کار پر انڈرسٹینڈنگ ہوگئی ہے کہ اگر جبر و تشدد اور عسکریت کے ذریعہ مسلمانوں کو دبانے کی کوشش کامیاب نہ ہونے پائے تو مفادات، نام نہاد جمہوریت اور آزادی کے لیبل کے ساتھ مسلمانوں کو قابو میں رکھا جائے اور عالم اسلام میں اسلامی رجحانات کو آگے بڑھنے سے روکا جائے۔ یہ بھی صرف طریق کار کا فرق ہے، ورنہ ایجنڈا سب کا ایک ہے کہ:

o عالم اسلام میں اسلام کے بطور نظام نفاذ کی کوئی صورت کامیاب نہ ہونے دی جائے۔

o آزادیٔ نسواں، مساوات، انسانی حقوق اور لبرل ازم کے نام پر مسلمانوں کے کلچر اور خاندانی نظام کو تباہ کر دیا جائے۔

o اسلامی اقدار و روایات کو کمزور کر کے مسلمانوں کو عالمی تہذیب کے خوش نما لیبل کے ساتھ مغربی ثقافت کا خوگر بنایا جائے۔

o مسلم ممالک کو معاشی خود مختاری، سیاسی حاکمیت اور سائنسی و عسکری ٹیکنالوجی سے بہر حال دور رکھا جائے۔

o مسلم ممالک اور اقوام کا کوئی ایسا اتحاد قائم نہ ہونے دیا جائے جو ان کی تہذیبی و سیاسی اجتماعیت کا عنوان بن سکے۔

سرد جنگ میں سوویت یونین اور امریکہ کی کشمکش کے دوران ایک تیسرا بلاک بھی وجود میں آیا تھا جسے تیسری دنیا یا غیر وابستہ تحریک کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز مارشل ٹیٹو، پنڈت نہرو، ڈاکٹر سوئیکارنو اور جمال عبدالناصر کی کوششوں سے ہوا اور اس میں دنیا کے اکثر ممالک خود کو

غیر وابستہ قرار دیتے ہوئے شامل ہو گئے۔ ان میں وہ چند ممالک بھی تھے جو فی الواقع غیر جانبدار اور غیر وابستہ تھے لیکن اکثریت ایسے ممالک کی تھی جو کسی نہ کسی بلاک سے بالواسطہ وابستہ تھے، لیکن غیر وابستہ بلاک میں شمولیت کے مفاد سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ یہ بلاک اگرچہ معاشی اور فوجی اعتبار سے بڑی طاقتوں کے ہم پلہ نہ تھا، لیکن ایک عالمی سیاسی فورم کے طور پر اس کا وجود اور سرگرمیاں بہرحال وزن رکھتی تھیں اور اس نے سرد جنگ کے دوران اپنا کردار مسلسل ادا کیا۔ اصولی طور پر سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد غیر وابستہ تحریک کی بقا کا بھی کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا لیکن جس طرح نیٹو نے اپنے وجود کے لیے جواز تلاش کر لیا ہے، اسی طرح غیر وابستہ تحریک کو بھی دوبارہ عالمی سیاست میں متحرک ہونے کا جواز امریکہ کی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے مل گیا ہے جو وہ عراق کے بارے میں مسلسل اختیار کیے ہوئے ہے اور نہ صرف یہ کہ اس نے عالمی رائے عامہ کو یکسر نظر انداز کر رکھا ہے بلکہ وہ اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کے بارے میں بھی مسلسل کہہ رہا ہے کہ اگر سلامتی کونسل نے اجازت نہ دی، تب بھی وہ عراق پر حملہ کر کے رہے گا اور اسے اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کی کوئی پروا نہیں ہے۔

امریکہ کی یہ فرعونیت اور ہٹ دھرمی مسلم ممالک کی سربراہ کانفرنس کی تنظیم میں تو غیرت کی کوئی چنگاری نہیں بھڑکا سکی، البتہ اس خلا کو پر کرنے کے لیے غیر وابستہ تحریک میدان عمل میں کود پڑی ہے اور اس کے لیے ملائشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد کی جرات و ہمت قابل داد ہے۔ عالم اسلام کے موجودہ حکمرانوں میں مہاتیر محمد واحد لیڈر ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی شدید دھاندلی پر جرات کے ساتھ احتجاج کرتے ہیں اور عملاً کچھ کر سکیں یا نہیں، مگر دوٹوک موقف اور کلمہ حق کہنے کی حد تک اپنی بات کسی نہ کسی حوالہ سے کہہ جاتے ہیں۔ انہوں نے کوالالمپور میں غیر وابستہ تحریک کے سربراہوں کا اجلاس طلب کیا ہے اور اس عالمی فورم سے امریکہ کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر عراق پر حملہ نہ کرے۔ غیر وابستہ تحریک کی سربراہ کانفرنس کے بعد کوالالمپور میں ہی اسلامی سربراہ کانفرنس کا ہنگامی اجلاس بھی مہاتیر محمد کی تحریک سے منعقد ہو گیا ہے اور ان سطور کی اشاعت تک اس کے فیصلے اور قراردادیں منظر عام پر آ چکے ہوں گے۔ ہم ان دونوں کانفرنسوں کے

فیصلوں اور اعلانات کے بارے میں کچھ تفصیل کے ساتھ بعد میں عرض کریں گے۔ آج کی محفل میں صرف دو حوالوں سے گزارش کرنا چاہتے ہیں:

ایک بات یہ ہے کہ مہاتیر محمد نے کہا ہے کہ سپر پاور سے مجھ سمیت سبھی خوف زدہ ہیں مگر ضمیر بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ وہ چاہتے تو میری گردن اڑا دیتے، لیکن تیسری دنیا کے حقوق کی آواز اٹھانا ضروری ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ۷۸ سالہ مہاتیر محمد نے، جو گزشتہ ربع صدی سے ملائشیا کے حکمران چلے آ رہے ہیں، یہ کہہ کر دنیا بھر کے مسلم حکمرانوں کو پیغام دیا ہے اور انہیں دعوت دی ہے کہ وہ صرف جان، اقتدار اور مفادات کے حوالہ سے ہی پالیسیاں طے نہ کریں بلکہ ضمیر کی آواز بھی سنیں اور انصاف کے تقاضوں کے لیے خطرات کی پروا کیے بغیر ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دنیا کے مسلم حکمران اگر اس پیغام پر توجہ دے سکیں تو آج بھی عالم اسلام کو مشکلات و مسائل کی دلدل سے نکالا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ غیر جانبدار تحریک اور اسلامی سربراہ کانفرنس کے دوران کانفرنس کے چیئرمین کی حیثیت سے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کو اپنی جگہ صدارت کی کرسی پر بٹھا دیا اور مہاتیر محمد کے اصرار پر جنرل پرویز مشرف نے ایک گھنٹے تک کانفرنس کے صدر کے طور پر فرائض سرانجام دیے۔ ہم صدر پاکستان کو یہ اعزاز دینے پر مہاتیر محمد کے شکر گزار ہیں اور صدر جنرل پرویز مشرف سے یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مشرقِ ایشیا کے اس بزرگ اور تجربہ کار سیاستدان اور دانش ور کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں جس نے اپنے عمل سے یہ بتایا ہے کہ دنیائے اسلام اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سربراہ کو واشنگٹن کے وائٹ ہاؤس میں جارج ڈبلیو بش کے پہلو میں نہیں بلکہ عالمی رائے عامہ اور عالمی ضمیر کی نمائندگی کرنے والے سیاسی فورم کی قیادت کے منصب پر فائز دیکھنا چاہتی ہے، مگر کیا جنرل پرویز مشرف دنیا بھر کے مضطرب مسلمانوں کے اس پیغام کو سمجھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟*

O

* روزنامہ اوصاف، یکم مارچ ۲۰۰۳ء۔

جنرل پرویز مشرف کا دورۂ امریکہ: چند گزارشات

جنرل پرویز مشرف آئندہ ماہ امریکہ جا رہے ہیں جہاں وہ جنرل اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کریں گے، متعدد عالمی لیڈروں سے ملاقاتیں کریں گے اور اخباری اطلاعات کے مطابق وہ یہودیوں کی ایک آرگنائزیشن کے تحت پروگرام میں بھی شریک ہوں گے جہاں وہ اسلام میں اعتدال پسندی اور روشن خیالی کے حوالے سے اپنے نقطۂ نظر پر گفتگو کریں گے۔

جنرل اسمبلی کا یہ اجلاس اس حوالے سے خاصا اہم ہے کہ اس میں اقوام متحدہ کے نظام میں بعض اہم اصلاحات زیر غور آنے والی ہیں جن میں سلامتی کونسل کی مستقل نشستوں میں توسیع بھی شامل ہے۔ اس توسیع کی صورت میں جرمنی، بھارت اور جاپان سمیت بہت سے ممالک سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت حاصل کرنے کے لیے تگ ودو کر رہے ہیں اور عالم اسلام نے بھی اپنے لیے مستقل نشست کا مطالبہ کیا ہے جس کے لیے او آئی سی اور سعودی عرب کے وزیر خارجہ شہزادہ سعود الفیصل کے بیانات آچکے ہیں، جبکہ پاکستان سلامتی کونسل کی نشستوں میں توسیع کے حوالے سے تحفظات رکھتا ہے جس کی وجہ سفارتی حلقوں میں یہ سمجھی جا رہی ہے کہ سلامتی کونسل کی مستقل نشستوں میں اضافے کی صورت میں بھارت کے سلامتی کونسل کے مستقل رکن بن جانے کے امکانات بڑھ جائیں گے جو علاقائی تناظر میں بہر حال پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے، اس لیے پاکستان کی طرف سے شروع سے سلامتی کونسل کی مستقل نشستوں میں اضافے کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

اس بارے میں ہم اس سے پہلے اسی کالم میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ عالم اسلام کے لیے اصل مسئلہ سلامتی کونسل کی مستقل نشست کا حصول نہیں، بلکہ اقوام متحدہ کے پورے تنظیمی ڈھانچے اور پالیسی میکرنیٹ ورک نے نظام کو چلانے کے لیے جو اصول وضوابط طے کر رکھے ہیں، وہ عالم اسلام کے مجموعی مفاد میں نہیں ہیں۔ ان میں دو باتیں سرفہرست ہیں۔ ایک تو یہ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا وہ چارٹر جسے انسانی حقوق کے مسلمہ عالمی معیار کا درجہ دے دیا گیا ہے، اس کی بعض دفعات صریح اسلامی تعلیمات کے منافی اور مسلم معاشرت کے تقاضوں سے متضاد ہیں۔ اس چارٹر پر مکمل نظر ثانی کے بغیر اسے عالم اسلام کے لیے مذہبی اور معاشرتی طور پر پوری طرح قابل قبول قرار نہیں دیا جا سکتا، جبکہ دوسری بات یہ ہے کہ عسکری قوت میں توازن کو چند ممالک کے ہاتھ میں رکھنے کے لیے جو عالمی قواعد وضوابط وضع کیے گئے ہیں اور جن کی بنیاد پر عراق کو مسلح کارروائی کا نشانہ بنایا گیا ہے، وہ اقوام وممالک کے درمیان برابری اور مساوات کے اصول کے منافی ہیں۔ انہیں صرف اس لیے درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ قواعد وضوابط ان ممالک واقوام نے طے کیے ہیں جن کے ہاتھ میں اس وقت طاقت ہے اور وہ اپنی قوت کے بل پر مجبور اور بے بس اقوام سے کچھ بھی منوا سکتے ہیں۔

اگر بات اصول اور مساوات کی ہے تو جس طرح ان قوتوں کو ایٹمی قوت سمیت جدید ترین عسکری ٹیکنالوجی حاصل کرنے کا حق ہے جن کے پاس اس وقت وہ وافر مقدار میں موجود بھی ہے، اسی طرح ان ممالک واقوام کو بھی یہ ٹیکنالوجی حاصل کرنے کا پورا حق حاصل ہے جو اس سے محروم ہیں۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ جن قوتوں نے یہ قوت حاصل کر لی ہے، وہ صرف اس لیے اس کے حقدار ہیں کہ ان کے پاس وہ موجود ہے اور جن کے پاس یہ قوت موجود نہیں ہے، وہ صرف اس لیے اس کے حصول کا حق نہیں رکھتے کہ ان کے پاس یہ موجود نہیں ہے۔ یہ دلیل نہیں ہے، بلکہ دھونس اور دھاندلی ہے جس کی زد سب سے زیادہ عالم اسلام پر پڑ رہی ہے اور مسلم ممالک کو نہ صرف اس سے پوری قوت اور پلاننگ کے ساتھ روکا جا رہا ہے بلکہ پاکستان، جس نے یہ قوت کسی حد تک حاصل کر لی ہے اور اس کے ساتھ وہ چند ممالک جو اس عسکری قوت کی طرف پیش رفت کی صلاحیت کسی طرح حاصل کر سکتے ہیں، مسلسل دباؤ کی زد میں ہیں اور یہ دباؤ صرف زبانی نہیں، بلکہ عملی ہے جس کا نشانہ

عراق بن چکا ہے اور ایران کو اس کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔

ہمارے خیال میں مسلم لیڈر شپ کو اس سلسلے میں اپنے معذرت خواہانہ رویے پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور اقوام متحدہ کے ان قواعد وضوابط کو جرات اور حوصلہ کے ساتھ چیلنج کرنا ہوگا جو تیسری دنیا، بالخصوص مسلم ممالک کو جدید ترین عسکری ٹیکنالوجی کے حصول سے روکتے ہیں۔ اگر او آئی سی اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر پر نظر ثانی، سلامتی کونسل میں ویٹو پاور کے ساتھ دنیا میں اپنی آبادی کے تناسب سے نشستوں کے حصول اور عسکری قوت کے حصول کی ترجیحات میں توازن قائم کروانے کے لیے کوئی متفقہ لائحہ عمل طے کر سکے تو اقوام متحدہ کا فورم ایک عالمی ادارے کی صورت میں مسلم دنیا کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے، ورنہ یہ یک طرفہ تسلط اور طاقت کی اجارہ داری کی ایک منظم شکل ہے جس سے پیچھا چھڑانا ہی عالم اسلام کے مجموعی مفاد کے لیے واحد راستہ رہ جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلم دنیا کے لیڈر حقیقت پسندی سے کام لیں اور سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا فیصلہ کریں کہ یا تو وہ اقوام متحدہ کے نظام میں توازن قائم کرنے کی عملی جدوجہد کریں اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو اس سے دامن چھڑانے کا کوئی قابل عمل راستہ تلاش کیا جائے۔

اس پس منظر میں ہم صدر جنرل پرویز مشرف سے یہ گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ جس اعتدال پسندی اور روشن خیالی کا نعرہ لگاتے ہیں، اس کا دائرہ صرف اپنے ملک تک ہی محدود نہ رکھیں، بلکہ عالمی سطح پر ان اجارہ دارانہ رویہ رکھنے والی تنگ نظر اقوام کو بھی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا راستہ دکھانے کی کوشش کریں جو تیسری دنیا اور مسلم ممالک کی آزادی، خود مختاری، معاشی وسائل اور تہذیبی تشخص کا مکمل استحصال کر رہی ہیں اور دولت اور طاقت کے بل پر انہوں نے پوری دنیا کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ جنرل اسمبلی سے ان کا خطاب اس کا بہترین موقع ہے اور نہ صرف خطاب بلکہ لابنگ اور میڈیا کے ذرائع بھی ان کے پاس موجود ہیں جنہیں وہ اس مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

جہاں تک یہودیوں کی کسی آرگنائزیشن کے زیر اہتمام کسی اجتماع میں ان کی شمولیت اور خطاب کا تعلق ہے، ہمیں اصولی طور پر اس سے اختلاف نہیں ہے۔ وہ اپنی بات کہنے کے لیے کسی بھی اجتماع میں جا سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور اعتدال پسند اسلام کے بارے میں

ان کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس حوالے سے ایک اصولی بات ہم ان سے عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے ذہن میں شاید ''اصلاح مذہب'' کی وہ تحریک ہے جو تین صدی قبل یورپ میں مسیحیت کے خلاف شروع ہوئی تھی اور اس نے پورے یورپ کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ اس تحریک کی پذیرائی کے جو اسباب تھے، وہ عالم اسلام میں موجود نہیں ہیں، مثلاً:

☆ مسیحیت کی اصل تعلیمات محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے مذہب کی تعبیر وتشریح مکمل طور پر مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی اور وہ جس طرح چاہتے تھے، اس کی تعبیر کر لیتے تھے، جبکہ اسلامی تعلیمات قرآن وسنت کی صورت میں محفوظ حالت میں موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں کسی نئی یا من مانی تعبیر وتشریح کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

☆ مسیحی رہنماؤں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو کفر والحاد قرار دے دیا تھا اور ترقی کی مخالفت کر رہے تھے جبکہ مسلم دنیا میں یہ صورت حال موجود نہیں۔

☆ مسیحیت کے اس دور کے مذہبی رہنما بادشاہت اور جاگیرداری کے کیمپ میں تھے، اس لیے عوام کے ردعمل کی لہر میں وہ بھی بادشاہت اور جاگیرداری کے ساتھ بہہ گئے، جبکہ عالم اسلام کے مذہبی رہنما حکومتوں کی بجائے عوام کے ساتھ ہیں اور ان کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

اس لیے صدر پرویز مشرف یا ان کی طرح یورپی طرز کی اصلاح مذہب کی کسی تحریک کے بارے میں سوچ رکھنے والے مسلم رہنماؤں کو ایک بار پھر اس کے بارے میں غور کر لینا چاہیے اور اس فرق کا ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے جو یورپ کی اس دور کی مذہبیت اور عالم اسلام کی آج کی مذہبیت میں واضح طور پر موجود ہے اور جسے نظر انداز کر کے بہت سے دانش ور بلا جواز کنفیوژن کی فضا پیدا کر رہے ہیں۔

اسلام اعتدال پسندی کا مذہب ہے، مگر اعتدال پسندی وہی قابل قبول ہو سکتی ہے جس کی جڑیں قرآن وسنت کی تعلیمات میں ہیں اور جو امت مسلمہ کے چودہ سو سالہ اجماعی تعامل سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس سے ہٹ کر یا قرآن وسنت کے صریح احکام وقوانین سے انحراف کی صورت میں اسلام کا کوئی نیا تصور پیش کیا گیا تو اس کا نتیجہ اکبر بادشاہ کے اس دین الٰہی سے مختلف نہیں ہوگا

جس کا منظر اب سے چار سو سال قبل اسی دھرتی نے دیکھا تھا اور جس کی یاد اب تک تاریخ کے ایک مضحکہ خیز باب کی صورت میں نشانِ عبرت بنی ہوئی ہے۔*

O

---

* روزنامہ پاکستان، ۳۰/اگست ۲۰۰۵ء۔

عالمی یہودی کانگرس سے صدر مشرف کا خطاب

صدر جنرل پرویز مشرف نیویارک کے ہنگامہ خیز دورے سے واپس پہنچ کر اسلام آباد میں اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئے ہیں مگر نیویارک میں ان کے دورے کے حوالے سے مختلف امور پر بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستانی کمیونٹی کی نجی محفلوں کے علاوہ نیویارک سے شائع ہونے والے اردو اخبارات میں صدر پرویز مشرف کی باتوں پر دلچسپ تبصرے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ اخبارات اگرچہ زیادہ تر اشتہارات پر مشتمل ہوتے ہیں اور مساجد اور اسٹوروں میں مفت تقسیم کیے جاتے ہیں، لیکن پاکستانی کمیونٹی کے ایک بڑے حصے میں پڑھے جاتے ہیں اور خبروں، کالموں اور اشتہارات کی صورت میں پاکستانی کمیونٹی کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں، جبکہ پاکستان کے قومی اخبارات کے کالم نگاروں کی بعض نگارشات بھی ان اخبارات کا حصہ بنتی ہیں۔

جنرل پرویز مشرف اصلاً تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کرنے کے لیے آئے تھے اور ہم نے اس کالم میں ان کے اس خطاب کے حوالے سے ان سے گزارش کی تھی کہ وہ اقوام متحدہ میں مجوزہ اصلاحات کے بارے میں عالم اسلام کے گزشتہ صدی کے مجموعی حالات کے تناظر میں اپنے خطاب میں گفتگو کریں اور مسلم امہ کے ساتھ اقوام متحدہ کے نصف صدی کے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے عالم اسلام کی شکایات اور مشکلات کی طرف توجہ دلائیں۔ جنرل پرویز مشرف نے جنرل اسمبلی سے خطاب کے دوران بہت سی باتیں کہی بھی ہیں مگر عالمی یہودی کانگریس کے

اجتماع سے ان کے خطاب اور خواتین کانفرنس میں رونما ہونے والے افسوس ناک واقعہ نے عالمی سطح پر زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے اور بھارتی وزیر اعظم کے ساتھ ان کے مذاکرات سمیت ان کی باقی مصروفیات اور سرگرمیاں ان دو واقعات کے پیچھے دب کر رہ گئی ہیں۔

عالمی یہودی کانگریس کے اجتماع سے صدر پاکستان کا خطاب بلاشبہ تاریخی واقعہ ہے جو مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے قطع نظر کہ صدر پرویز مشرف کے اس خطاب کے بارے میں اسرائیل کے ساتھ مسلمانوں کے تنازع کے اصل فریق فلسطینیوں اور ان میں سے بھی اسرائیل کے خلاف صف آرا مزاحمتی گروپوں کا ردعمل کیا ہے کہ یہ ایک مستقل موضوعِ گفتگو ہے اور اسرائیل کے ساتھ تعلقات میں کوئی بھی پیش رفت اس ردعمل کو نظر انداز کر کے کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی، تاہم تاریخی تناظر میں صدر پرویز مشرف نے یہودی قیادت کے سامنے ماضی کا جو آئینہ پیش کیا ہے، اس کی داد نہ دینا ناانصافی کی بات ہوگی۔

صدر پرویز کا یہ کہنا تاریخی طور پر درست ہے کہ ایک صدی قبل تک مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات متوازن اور خوش گوار رہے ہیں اور مسلمان خلافتوں کے سایے میں یہودی پورے امن اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے ہیں، بلکہ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں جب بیت المقدس کا کنٹرول مسیحیوں سے حاصل کیا تو مسیحیوں نے یہودیوں کے بیت المقدس شہر میں داخلے پر پابندی لگا رکھی تھی۔کم و بیش پانچ سو سال تک محیط اس پابندی کا خاتمہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے حکم سے ہوا اور یہودیوں کو اس شہر میں آنے کی اجازت ملی، مگر یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان صدیوں سے چلے آنے والے ان خوشگوار تعلقات کو دشمنی اور عداوت میں تبدیل کرنے کا آغاز مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ یہودیوں کی طرف سے ہوا جب انھوں نے فلسطین پر قبضہ کرنے اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لیے یورپ کی ان مسیحی قوتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا جو خلافت عثمانیہ کے خلاف صلیبی جنگوں میں صدیوں تک حریف رہی ہیں اور جنھوں نے خلافت عثمانیہ کے خاتمہ اور مسلم ممالک پر استعماری تسلط کے لیے دن رات ایک کر رکھا تھا۔ یہودی اس کشمکش میں مسلمانوں کے خلاف صلیبیوں کے

حلیف بن گئے اور ان کے زیر سایہ عربوں اور فلسطینیوں کے خلاف گزشتہ ایک صدی کے دوران میں یہودیوں نے جو کچھ کیا، وہ بھی تاریخ کا ایک اہم بلکہ تازہ ترین باب ہے۔

صدر پرویز مشرف اور ان کے ہم نواؤں سے ہماری یہ گزارش ہے کہ وہ ایک صدی قبل تک کے مسلم یہودی تعلقات کا تذکرہ ضرور کریں اور عالمی سطح پر مکالمہ میں اس کا حوالہ ضرور دیں لیکن گزشتہ ایک صدی کے دوران میں عالم اسلام، عرب دنیا، فلسطین اور بیت المقدس کے بارے میں صہیونی قیادت کے طرز عمل اور کردار کو بھی سامنے رکھیں، کیونکہ اس کے بغیر وہ توازن دائرۂ امکان میں نہیں آ سکے گا جسے قائم رکھنے کے لیے وہ یہ ساری تگ ودو کر رہے ہیں اور اس کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ جہاں وہ عالمی یہودی قیادت کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، وہاں ان فلسطینیوں کو بھی اعتماد میں لینے کی کوشش کریں جو گزشتہ ایک صدی کے دوران میں اس تنازع میں سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں اور پورے حوصلہ اور جرات کے ساتھ اب تک مزاحمت کی راہ پر گام زن ہیں۔ اس معاملے میں اسرائیل کے خلاف اصل فریق وہی ہیں اور انھیں اعتماد میں لیے بغیر اس خطے میں امن کے قیام کا خواب کبھی تعبیر کی منزل حاصل نہیں کر سکے گا۔

ہمیں صدر پرویز مشرف کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ پاکستان کا اسرائیل کے ساتھ کوئی براہ راست تنازع نہیں ہے، اس لیے کہ بیت المقدس کا تنازع صرف فلسطینیوں اور عربوں کا نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام کا مسئلہ ہے اور پاکستان عالم اسلام کا نہ صرف حصہ ہے بلکہ اس کی راہ نمائی اور قیادت کا علم بردار ہے۔ صدر پرویز مشرف کے بہت سے مداحوں کا کہنا ہے کہ وہ عالم اسلام کو روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی طرف لے جانے میں پوری امت مسلمہ کی راہ نمائی کر رہے ہیں۔ اگر یہ بات درست ہے تو یہ راہ نمائی صرف ایک پہلو تک محدود نہیں رہنی چاہیے بلکہ عالم اسلام کے مسائل اور مشکلات کے حل کی کوشش بھی اس کے دائرہ میں شامل ہونی چاہیے۔ بیت المقدس عالم اسلام کا مسئلہ ہے اور عالم اسلام کی راہ نمائی کے دعوے دار پاکستان کا مسئلہ ہے، اس لیے اس مسئلہ کی موجودگی میں یہ کہنا پاکستان کے کسی بھی ذمہ دار شخص کی زبان پر زیب نہیں دیتا کہ پاکستان کا اسرائیل کے ساتھ کوئی براہ راست تنازع نہیں ہے۔

ہم فلسطینی مسئلے کے حل کے لیے صدر پرویز مشرف کی کوششوں کے مخالف نہیں ہیں، مگر صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ گزشتہ ایک صدی کے حقائق سے آنکھیں بند کر کے، بیت المقدس کے مسئلے پر امت مسلمہ کے جذبات واحساسات کو پس پشت ڈال کر اور اس کشمکش میں سب سے زیادہ پسنے اور قربانیاں دینے والے فلسطینیوں کو نظر انداز کر کے نہیں ہونا چاہیے۔ تنازع کے فریق اور اسباب بدستور موجود رہے تو اس ماحول میں ہونے والی کوئی بھی صلح اور مفاہمت ہمارے ہاں قتل وقتال کے حوالے سے ہونے والی اس صلح سے مختلف نہیں ہوگی جس میں مقتول کے وارث اپنی بے بسی اور برادری کے دباؤ کے باعث وقتی طور پر صلح تو کر لیتے ہیں لیکن یہ صلح صرف اس وقت تک ہوتی ہے جب تک مقتول کے ورثا میں سے کوئی از خود انتقام لینے کی پوزیشن میں نہ آ جائے اور جب ان میں سے کوئی خود کو اس پوزیشن میں محسوس کرنے لگتا ہے تو ساری پنچایتیں اور مصالحتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور مظلوم کا انتقام ایک زندہ حقیقت کے طور پر ان پنچایتوں اور برادریوں کا منہ چڑانے لگتا ہے۔*

O

* ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء۔

پاکستانی اور اسرائیلی وزراے خارجہ کی ملاقات

پاکستان کے وزیرِ خارجہ جناب خورشید محمود قصوری اور اسرائیل کے وزیرِ خارجہ سلوان شلوم کے درمیان گزشتہ دنوں استنبول میں ہونے والی ملاقات حسبِ توقع دنیا بھر میں موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے اور اس کے حق میں اور خلاف دلائل دیے جا رہے ہیں۔ دنیا کے کوئی بھی دو ملک آپس میں کسی بھی سطح پر رابطہ کر سکتے ہیں اور ان کے درمیان ملاقات و مذاکرات کا اہتمام ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ پاکستان نے اب تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا اور اسرائیل کے بارے میں پاکستان عوام کے جذبات میں شدت و حساسیت پائی جاتی ہے، اس لیے اس ملاقات کو خلافِ معمول قرار دیا جا رہا ہے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں اس پر سخت ردِعمل کا اظہار کیا گیا ہے کہ اتنا بڑا اقدام پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیے بغیر اٹھایا گیا ہے اور متحدہ مجلس عمل نے اس ملاقات کے خلاف یومِ احتجاج بھی منایا ہے جس کے تحت ملک کے مختلف علاقوں میں احتجاجی مظاہرے بھی ہوئے ہیں، جبکہ دوسری طرف حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے یہ کہہ کر اس ملاقات کا جواز پیش کیا ہے کہ اگر یہودی عورتوں کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے تو ان کے ساتھ ملاقات و مذاکرات کیوں نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ ہی وزیرِ اعظم جناب شوکت عزیز نے قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا اور ایسا جب بھی ہوگا، پارلیمنٹ کو اعتماد میں لے کر کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ آزاد فلسطینی ریاست کے قیام اور القدس کو اس کا دارالحکومت قرار دیے جانے تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ادھر بین الاقوامی پریس میں یہ خبریں بھی آ رہی ہیں کہ ماہ

رواں کے دوران میں نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف اور اسرائیلی وزیر اعظم ایریل شیرون کے درمیان ملاقات کا امکان بھی موجود ہے۔

متحدہ مجلس عمل کے سربراہ قاضی حسین احمد نے اس پیش رفت کو اسرائیل کو تسلیم کیے جانے کی طرف پہلا قدم قرار دیا ہے جبکہ دوسری طرف بہت سے دانش وروں کا کہنا ہے کہ بھارت کے ساتھ اسرائیل کے تیزی سے بڑھتے ہوئے تعلقات کے پس منظر میں توازن قائم کرنے کے لیے یہ رابطے ضروری ہیں اور فلسطین کی ریاست کے قیام کے سلسلے میں کسی موثر کردار کی پوزیشن میں آنے کے لیے بھی پاکستان کا اسرائیل کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ضروری ہے۔

اس ملاقات کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ ہجری سال کے اعتبار سے یہ ملاقات ۲۷رجب کو ہوئی ہے جسے محض اتفاق قرار دینا بہت مشکل ہے۔ ۲۷رجب کو اسلامی تاریخ میں یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس کی شب کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج و اسرا کے اعزاز سے نوازے گئے تھے اور اسلامی عقیدہ کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس شب ساتوں آسمانوں، عرش و کرسی اور جنت و دوزخ کے بہت سے مناظر دکھانے کے علاوہ بیت المقدس میں حضرات انبیاے کرام علیہم السلام کی امامت کے منصب پر فائز فرمایا تھا۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت جبریل علیہ السلام کے ہمراہ بیت المقدس پہنچے تو حضرات انبیاے کرام علیہم السلام سب کے سب وہاں جمع تھے اور صفیں باندھے ہوئے نماز کی امامت کے لیے کسی کے آگے بڑھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر انھیں مصلے پر کھڑا کر دیا اور آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انبیاے کرام علیہم السلام کی امامت کے فرائض سرانجام دیے جس پر انھیں ''امام الانبیاء'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ واقعہ بیت المقدس کا ہے اور اسرائیل کے ساتھ عالم اسلام کے تنازع میں مرکزی حیثیت بیت المقدس کو ہی حاصل ہے، اس لیے یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ پاکستان اور اسرائیل کے وزراے

خارجہ کی ملاقات کا اہتمام اس روز ہوا۔ پاکستان کے حکمرانوں کے بارے میں ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں اس دن کی اہمیت کا علم نہیں ہوگا کیونکہ پاکستان سمیت مسلم دنیا کے اکثر حکمران اپنی دینی روایات سے باخبر نہیں ہوتے بلکہ اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ کسی مسلم ملک میں حکمرانی کے منصب پر فائز ہونے والا شخص اسلام کی مذہبی اور دینی روایات سے بے خبر اور لاتعلق ہی رہے، البتہ اسرائیل کے حکمرانوں کے بارے میں یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسلامی روایات سے اس درجہ بے خبر ہوں گے اور انھوں نے اس ملاقات کے لیے ۲۷ / رجب کا انتخاب محض اتفاق سے ہی کر لیا ہوگا۔

بہرحال اس میں المیہ کا یہ پہلو ہمارے نزدیک ضرور موجود ہے کہ اس ملاقات کے لیے ۲۷ / رجب کا انتخاب کیا گیا۔ اگر پاکستان کے حکمرانوں کو اس دن کی دینی اہمیت کا علم نہیں ہے تو یہ افسوس ناک بات ہے اور اگر علم ہونے کے باوجود یہ دن اس ملاقات کے لیے منتخب کیا گیا ہے تو افسوس کا یہ پہلو اور بھی زیادہ گہرا اور الم ناک ہو جاتا ہے۔ ملاقات کی ضرورت و اہمیت پر گفتگو ہو سکتی ہے اور حالات کے مطابق اس کو کسی حد تک گوارا بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن زندہ قومیں ایسے امور کے لیے دنوں اور اوقات کا اہتمام سوچ سمجھ کر کیا کرتی ہیں جیسا کہ اسرائیل نے کیا ہے، اور غافل قومیں اپنی روایات و اقدار سے ایسے مواقع پر بالکل بے گانہ ہو جایا کرتی ہیں جیسا کہ ہماری طرف سے اس کا اظہار ہوا ہے۔

اس ملاقات کے حوالے سے دو باتیں اور بھی ہمارے خیال میں توجہ طلب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ پاکستان اور اسرائیل کے درمیان دوطرفہ طور پر کوئی تنازع نہیں ہے، اس لیے ان دونوں کے درمیان روابط اور سفارتی تعلقات کے قیام میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان بیت المقدس اور فلسطینی عوام کی مظلومیت کو براہ راست اپنا مسئلہ نہیں سمجھتا اور اسے صرف عربوں کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے اور نہ صرف پاکستان کے اسلامی تشخص اور دستورِ پاکستان کی تصریحات کی نفی کے مترادف ہے بلکہ پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کے دینی جذبات کی توہین بھی ہے۔ بیت المقدس دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کی

طرح پاکستان کے مسلمانوں کا بھی قبلہ اول ہے اور اس کے ساتھ پاکستان کے مسلمانوں کی عقیدت بھی اسی طرح ہے جیسے دنیا کے دیگر مسلمانوں کی ہے، اس لیے بیت المقدس کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن جانے کو پاکستان کا براہ راست مسئلہ نہ سمجھنا اور اس کی موجودگی میں یہ کہنا کہ پاکستان اور اسرائیل کے درمیان کوئی دوطرفہ تنازع موجود نہیں ہے، حقائق کا انکار ہے اور اس علاقائی نیشنلزم کے منفی ثمرات میں سے ایک ہے جو مسلمانوں پر خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے ساتھ مسلط کی گئی تھی اور جس کے گورکھ دھندے میں الجھ کر دنیا بھر کے مسلمان ایک دوسرے سے لاتعلق اور بے گانہ ہوتے جا رہے ہیں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو جسد واحد سے تعبیر فرمایا تھا اور اسلام کو پوری نسل انسانی کا مذہب قرار دے کر رنگ، نسل، علاقہ اور زبان کی تفریق سے بالاتر امت کی عملی شکل دنیا کے سامنے پیش کی تھی مگر ہم مغرب کی پیروی میں پھر اس مقام سے نیچے اتر کر رنگ، نسل، علاقہ اور زبان کی قومیتوں کے دائرے میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ مغرب کی تو مجبوری تھی کہ مذہب کے معاشرتی کردار سے دست برداری کے بعد اس کے پاس اجتماعیت اور معاشرت کی کوئی مشترکہ اساس باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے اسے نیشنلزم کے دائروں کا سہارا لینا پڑا مگر ہمارے لیے مغرب کی پیروی ہی مجبوری اور پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے اور ہمارے پاس علاقائی قومیتوں میں بٹے رہنے کا یہی ایک جواز ہے کہ چونکہ مغرب میں ایسا ہو رہا ہے، اس لیے ہمیں بھی یہی کرنا ہے۔ اس کے سوا دنیا بھر کے مسلمانوں کے مسائل اور حالات سے لاتعلق ہونے کا ہمارے پاس اور کوئی جواز موجود نہیں ہے۔

دوسری بات بھی اسی سے متعلق ہے کہ پاکستان کے مفادات اور نفع ونقصان کے تمام دائروں کو صرف اور صرف جنوبی ایشیا کی حدود کا پابند کیا جا رہا ہے اور حالات کے جبر نے ہمارے نفع نقصان کا صرف ایک ہی معیار قرار دے دیا ہے کہ بھارت کے ساتھ معاملات کی نوعیت کیا ہوگی۔ ہم نے افغانستان پر فوج کشی کے لیے امریکہ کو اسٹریٹیجک سہولتیں فراہم کیں، اس لیے کہ اگر ہم نہیں کریں گے تو بھارت ایسا کر گزرے گا اور اب اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے آغاز کے لیے بھی یہی دلیل سب سے زیادہ وزنی سمجھی جا رہی ہے کہ بھارت کے ساتھ اسرائیل کے تعلقات میں توازن لانے

کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

جنوبی ایشیا میں پاکستان اور بھارت کے درمیان طاقت کے توازن کے ساتھ ساتھ عالمی تعلقات اور اثر و رسوخ میں توازن کا موجود ہونا اور اس کا اہتمام کرنا ہماری ضرورت ہے اور ہمیں اس ضرورت سے انکار نہیں ہے، لیکن اسے عالم اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے لاتعلق ہونے کا جواز قرار دینے میں ہمیں کلام ہے اور ہم اس فلسفہ اور فکر کو درست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پھر بھارت کے ساتھ ہمارے تنازع کی بنیاد کیا ہے؟ ہم نے متحدہ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے نام سے الگ ملک کے قیام کی بنیاد اسلام پر ہی رکھی تھی اور مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب ومعاشرت کے تحفظ اور سوسائٹی میں اسلامی احکام وقوانین کے نفاذ وعمل داری کو پاکستان کے وجود کی واحد وجہ جواز قرار دیا تھا، اس لیے اگر عالمی سطح پر اسلام کا یہ کردار قابل تسلیم نہیں ہے تو صرف جنوبی ایشیا کی حد تک اسلام کے اس کردار کو پاکستان کے وجود وبقا کے لیے وجہ جواز قرار دینا بھی بہرحال محل نظر ہو کر رہ جائے گا اور پاکستان خدانخواستہ اپنے وجود کے جواز سے محروم ہو جائے گا۔*

O

---

* ستمبر ۲۰۰۵ء

دہشت گردی کے خلاف جنگ

اور پاک امریکہ تعلقات

امریکی ایجنڈا اور جنرل پرویز مشرف

امریکی نائب وزیر خارجہ مسٹر انڈر رفرتھ گزشتہ دنوں اسلام آباد آئے اور چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف اور دیگر مقتدر شخصیات سے ملاقات کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے انتباہ کیا کہ پاکستان کو اپنی سرحدی حدود میں کام کرنے والے انتہا پسند اسلامی گروپوں پر پابندی عائد کرنا ہوگی جو بین الاقوامی برادری کے لیے بڑا خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق مسٹر انڈر رفرتھ نے کہا کہ حرکت المجاہدین سمیت بہت سے مسلح اسلامی گروپ دہشت گردی کر رہے ہیں، اس لیے ان پر پابندی لگائی جائے۔ اس کے ساتھ ہی امریکی سنیٹروں کے وفد کے حالیہ دورۂ پاکستان کے اختتام پر وفد کی طرف سے جاری ہونے والے ایک بیان میں پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بہتری کے لیے پانچ شرائط پیش کی گئی ہیں۔ روزنامہ جنگ لاہور ۲۲ رجنوری ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کے مطابق امریکی وفد کی پیش کردہ شرائط یہ ہیں:

☆ دہشت گردی اور مذہبی بنیاد پرستی کا ازالہ۔

☆ جمہوریت کی بحالی کے لیے طریقہ کار اور ٹائم فریم ورک۔

☆ ایسی وسیع تر اقتصادی اصلاحات جن میں جمہوری اصلاحات جڑ پکڑ سکیں۔

☆ سی ٹی بی ٹی پر دستخط اور نیوکلیائی ہتھیاروں پر پابندی کے لیے عالمی کوششوں میں تعاون۔

☆ اپنے تمام شہریوں کی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی آزادیوں کو یقینی بنانا۔

جہاں تک امریکی مطالبات اور شرائط کا تعلق ہے، یہ نئی نہیں ہیں بلکہ ایک عرصہ سے یہ شرائط

الفاظ اور عنوان کی تبدیلیوں کے ساتھ بار بار سامنے آ رہی ہیں اور امریکی حکومت ان شرائط کی تکمیل کے لیے حکومت پاکستان پر مسلسل دباؤ جاری رکھے ہوئے ہے، مگر امریکی صدر مسٹر بل کلنٹن کے مجوزہ دورۂ بھارت سے قبل اس سلسلہ میں کسی حتمی فیصلہ کے لیے پاکستان پر زور دیا جا رہا ہے تاکہ مسٹر کلنٹن بھارت کے ساتھ پاکستان کا دورہ بھی کر سکیں اور امریکہ کی منصوبہ بندی میں جنوبی ایشیا اور کشمیر کے حوالہ سے جو پروگرام پہلے سے طے شدہ ہے، وہ اس کے آغاز کا اعلان کر سکیں۔

امریکہ کی مجبوری یہ ہے کہ جہاد کے جس عمل اور مجاہدین کے جن گروپوں کو اس نے اپنے روایتی حریف سوویت یونین کے خلاف افغانستان کے جہاد آزادی میں سپورٹ کیا تھا اور مالی، عسکری اور تربیتی امداد مہیا کی تھی، امریکہ نے ان سے یہ توقع بھی وابستہ کر لی تھی کہ مجاہدین کی یہ تنظیمیں سوویت یونین کے خاتمہ اور روس کی شکست کے بعد بھی امریکہ کی احسان مند رہیں گی اور امریکہ آئندہ بھی انہیں اپنے مقاصد اور پروگرام کے لیے حسب منشا استعمال کر سکے گا، مگر جہاں افغانستان میں امریکی امداد حاصل کرنے والے افغان گروپوں کے ہاتھ سے وہاں کا اقتدار نکل گیا اور طالبان کے نام سے ایک نئی قوت نے افغانستان کا کنٹرول حاصل کر کے امریکی ایجنڈے کے لیے آلہ کار بننے سے انکار کر دیا، وہاں مجاہدین کی تنظیموں نے بھی اپنی سرگرمیوں کے لیے نئے محاذوں کا انتخاب کیا اور امریکی اشاروں کی پروا کیے بغیر کشمیر، فلسطین، بوسنیا، صومالیہ، کوسووا، اور چیچنیا کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لیے سرگرم ہو گئیں۔ امریکہ کی خواہش تھی کہ طالبان اور جہادی تنظیمیں سنکیانگ میں وہاں کے مسلمانوں کے لیے جہاد آزادی کا میدان گرم کر کے چین کو بھی سوویت یونین کی طرح شکست دینے کے امریکی پروگرام کا حصہ بنیں مگر ان مجاہدین کی ترجیحات میں خلیج عرب سے امریکی فوجوں کی واپسی، کشمیر کی آزادی، بوسنیا، کوسووا، اور چیچنیا کے مظلوم مسلمانوں کی امداد اور فلسطین کی حقیقی آزادی جیسے معاملات زیادہ ضروری اور مقدم قرار پائے جس سے امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر اور اس کی عالم اسلام پر بالادستی کا منصوبہ فلاپ ہوتا دکھائی دینے لگا۔ اسی غصہ میں امریکہ بہادر انہی جہادی تحریکات کو دہشت گرد قرار دے کر انہیں ختم کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور امریکی نائب وزیر خارجہ اور سینیٹروں کے حالیہ دورۂ پاکستان کا پس منظر بھی یہی ہے مگر چیف ایگزیکٹو

جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹروں کے وفد کو ملاقات کے دوران جو جواب دیا ہے، وہ ہمارے نزدیک پاکستانی عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اور موجودہ معروضی حالات میں ایک غیور حکمران کی حیثیت سے انہیں یہی جواب دینا چاہیے تھا۔ چنانچہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۷ رجنوری ۲۰۰۰ء کے مطابق:

''چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹروں کے وفد کو دوٹوک الفاظ میں بتا دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جا سکتا ہے، جیسے روس کے خلاف جہاد کو نہیں روکا جا سکتا تھا۔ اعلیٰ عسکری ذرائع نے ''جنگ'' کو بتایا کہ جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹروں پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔ امریکہ کو دہشت گردی اور جہاد میں بنیادی فرق کو سمجھنا ہوگا۔ ان اعلیٰ عسکری ذرائع کے بقول جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹروں کو بتایا کہ پاکستان نے دہشت گردی اور ہائی جیکنگ کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور کرتا رہے گا، تاہم جہاں تک جہاد کا تعلق ہے، یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے۔ دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں، وہ دراصل اپنا مذہبی فریضہ نبھاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر ہو یا چیچنیا، جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں، اسے روکا نہیں جا سکتا۔''

ہمارے خیال میں جنرل مشرف کی اس دوٹوک وضاحت کے بعد اس سلسلہ میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، البتہ جنرل صاحب کو پاکستانی عوام کے جذبات کی اس جرات مندانہ ترجمانی پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے ہم ان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ امریکہ کی دیگر شرائط کے بارے میں بھی وہ دوٹوک اور صاف انداز میں وضاحت کر دیں کہ ہم ایک اسلامی ریاست کے باشندے ہیں اور اسلام صرف ہمارا سرکاری مذہب ہی نہیں بلکہ دستور پاکستان کی صراحت کے مطابق قومی دستور حیات اور حکومتی پالیسیوں کا سرچشمہ بھی ہے، اس لیے جمہوریت، معیشت، آزادیوں، حقوق اور ایٹمی قوت سمیت تمام امور کے بارے میں ہم وہی پالیسی اختیار کر سکتے ہیں جن کی قرآن وسنت کی تعلیمات میں گنجایش ہو۔

اس کے ساتھ ہی سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے حوالے سے ہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگرچہ

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کی حمایت کرنے والے حلقوں کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس پر دستخط کر دینے سے پاکستان کی موجودہ ایٹمی پوزیشن پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، مگر اصولی طور پر دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

☆ سی ٹی بی ٹی پر دستخط سے ایٹمی پروگرام بین الاقوامی کنٹرول میں چلا جائے گا اور ہم اس کے بارے میں کسی آزادانہ فیصلے کے مجاز نہیں رہیں گے۔ پھر اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ پروگرام کو کنٹرول کرنے والی بین الاقوامی اتھارٹی پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو رول بیک اور ختم کرنے کے لیے آئندہ کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔

☆ سی ٹی بی ٹی کا مقصد ایٹمی پروگرام کو مزید آگے بڑھنے سے روکنا ہے جبکہ جنگی قوت کے بارے میں قرآن حکیم کا حکم یہ ہے کہ وقت کی جدید ترین جنگی قوت حاصل کرو اور اس قوت کی حد بھی قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ: ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم۔ ''اس قوت کے ذریعہ دشمن پر تمہارا رعب قائم ہو'' جس کا مطلب اصطلاحی معنوں میں یہ ہے کہ طاقت کا توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے ایٹمی قوت اور وسائل کے لحاظ سے جب تک توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آجاتا، ایٹمی قوت میں مزید پیش رفت پر پابندی کو قبول کرنا قرآن کریم کے منشا کے خلاف ہے۔ اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ''جہاد'' اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور اس کے بارے میں جنرل پرویز مشرف کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فریضہ کی ادائیگی سے نہیں روکا جا سکتا، اسی طرح ''ایٹمی قوت'' کا اس حد تک حصول کہ توازن کا پلڑا مسلمانوں کے حق میں جھک جائے، یہ بھی ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور اس ہدف کے حصول سے قبل ایٹمی پروگرام میں مزید پیش رفت پر پابندی کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں امید ہے کہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے رفقا اس صورت حال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں گے اور جہادی تحریکات کی طرح سی ٹی بی ٹی کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات کے حوالہ سے امریکہ کو دوٹوک جواب دے کر دینی حمیت اور قومی غیرت کا بروقت مظاہرہ کریں گے۔*

---

* پندرہ روزہ الشریعہ، یکم/۱۵ فروری ۲۰۰۰ء۔

سلیم خان کے ساتھ پاکستانی حکومت کا شرمناک سلوک

چیچنیا کے سابق صدر اور موجودہ حکومت کے مشیر سلیم خان کی اسلام آباد میں گرفتاری کی خبر پڑھی تو سناٹے میں آ گیا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ سلیم خان اسلام آباد پہنچیں گے تو انہیں ایک مجاہد اور مجاہدوں کے غیور نمائندے کے طور پر پروٹوکول دیا جائے گا، جہاد کشمیر اور جہاد افغانستان میں مجاہدین کی پشت پناہی کرنے والے ادارے جہاد چیچنیا کے سرکاری سفیر سے وہاں کے حالات معلوم کر کے انہیں تعاون کا یقین دلائیں گے اور روسی جارحیت کا دلیرانہ سامنا کرنے والے غیور مسلمانوں کی پشت پر ہاتھ رکھیں گے، کیونکہ ابھی چند روز قبل پاکستان کے چیف ایگزیکٹو جنرل مشرف نے امریکی سینیٹروں سے بات چیت کرتے ہوئے چیچنیا کے جہاد کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جہاد اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے اور مسلمان جہاں کہیں بھی جہاد کرتے ہیں، خواہ کشمیر ہو یا چیچنیا، وہ اپنے مذہبی فرض کی تکمیل کرتے ہیں، اس لیے انہیں جہاد سے روکا نہیں جا سکتا۔ جنرل صاحب کے اس ارشاد کے بعد اندازہ ہوا تھا کہ چیچنیا کے جہاد کے بارے میں پاکستان کے عوام اور حکومت کے جذبات مختلف نہیں ہیں اور روسی درندگی کا شکار ہونے والے مجاہدین کو پاکستان کے عوام اور حکمرانوں کی یکساں تائید و حمایت حاصل ہے، لیکن سلیم خان کے ساتھ خفیہ اداروں کے اس شرمناک طرز عمل نے ان تمام اندازوں کو غلط ٹھہرا دیا ہے۔

سلیم خان نے کہا ہے کہ روسی فوجوں نے ان کے جسموں کو زخمی کیا مگر پاکستان کے خفیہ اداروں نے ان کی روح کو زخمی کر دیا ہے۔ وہ درست کہتے ہیں کہ یہ زخم جسموں کے زخم سے زیادہ

سخت ہوتا ہے اور آسانی سے مندمل نہیں ہو پاتا۔ سلیم خان ہمارے مہمان ہیں، جس طرح اسامہ بن لادن افغانستان کے مہمان ہیں۔ دونوں جہادی تحریکوں کے نمائندے ہیں۔ ایک مشرق وسطی میں امریکی تسلط کے خلاف معرکہ آرا ہے اور دوسرا روسی فیڈریشن کی جارحیت کا شکار مظلوم مسلمان کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اسامہ بن لادن کی گرفتاری کے لیے امریکہ ایک عرصہ سے دانت پیس رہا ہے مگر غیور طالبان کے سامنے ان کا بس نہیں چل رہا۔ افغانستان کی امارت اسلامی اپنے اس اصولی موقف پر پوری سختی کے ساتھ قائم ہے کہ اسامہ بن لادن ان کا مہمان ہے اور وہ اپنے مہمان کو ملک سے چلے جانے کے لیے نہیں کہیں گے اور نہ اسے اس کے کسی دشمن کے حوالے کریں گے۔ اس اصولی موقف کی خاطر طالبان نے امریکی بمباری برداشت کی ہے، قندھار کے عین وسط میں دہشت گردی کا سامنا کیا ہے، اقوام متحدہ کی پابندیاں قبول کی ہیں اور عالمی میڈیا کی نفرت انگیز مہم کو فیس کیا ہے، مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ اپنے موقف پر قائم ہیں اور افغان حکمران ملا محمد ربانی نے بھی اسلام آباد میں ایک بار پھر یہ کہہ کر اپنے موقف کا اعادہ کیا ہے کہ اسامہ ہمارا مسئلہ ہے اور اس پر ہمارا موقف سب کے سامنے واضح ہے۔

دوسری طرف ہم نے اپنے مہمان کو جس سلوک کا مستحق ٹھہرایا ہے، اس نے پورے عالم اسلام کے سامنے ہماری گردن جھکا دی ہے۔ یہ درست ہے کہ امریکی صدر بل کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے دورے کے پروگرام میں ابھی تک پاکستان شامل نہیں ہو سکا اور یہ بھی درست ہے کہ چیچنیا کے مظلوم اور مجاہد مسلمانوں کی پاکستان کے عوام اور دینی جماعتوں کی طرف سے مسلسل حمایت پر روسی حکمران ناراض ہیں، ہمارے خفیہ اداروں کو اس پر پریشانی ہے اور خاص طور پر امریکہ کے صدر کے پاکستان نہ آنے کا تصور ہی ہمارے حکمران طبقوں میں شامل بہت سے افراد کی نیندیں حرام کرنے کے لیے کافی ہے، لیکن کوئی ادارہ اس حد تک بھی حواس باختہ ہو سکتا ہے؟ اس کا کم از کم مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں حامد میر صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے سلیم خان سے خود مل کر میرے جیسے لاکھوں بلکہ کروڑوں پاکستانیوں کے جذبات ان تک پہنچا دیے اور ہماری ترجمانی کر دی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دیں اور اس جرات قلندرانہ پر استقامت نصیب فرمائیں۔ (آمین)

وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر کا کہنا ہے کہ اس واقعہ پر پریس میں کچھ نہ کہا جائے اور کچھ نہ لکھا جائے۔ وہ یقیناً کسی مصلحت کے تحت یہ بات کہہ رہے ہوں گے، لیکن مجھے ان کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ چیچنیا کے سابق صدر اور مجاہدین کے نمائندے کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس پر اگر احتجاج بھی نہ ہوا اور عوام اور دینی حلقوں کا ردعمل بھی سامنے نہ آئے تو اس سے چیچنیا کے مسلمانوں کے دل پر لگنے والا زخم اور زیادہ گہرا ہو جائے گا اور وہ خود کو مزید تنہا محسوس کرنے لگیں گے۔ پھر یہ تاثر بھی ابھرے گا کہ شاید پاکستان کے عوام، دینی حلقے اور صحافی بھی ''خفیہ اداروں'' کے لوگ ہیں جو اپنے معزز مسلمانوں کے ساتھ کوئی طرز عمل اختیار کرنے سے قبل امریکی اور روسی حکمرانوں کے چہروں کے زاویے دیکھتے ہیں اور ان کی پیشانیوں کی شکنیں شمار کرتے ہیں۔ اس لیے حامد میر کے ساتھ میں بھی اپنے معزز مہمان سلیم خان کے سامنے پوری پاکستانی قوم بالخصوص دینی حلقوں کی طرف سے شرمندگی کا اظہار کرتا ہوں اور ان سے ہونے والی اس شرمناک بدسلوکی پر معافی مانگتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی سلیم خان کی توہین کرنے والے خفیہ اداروں کے ان افسران سے جن کے حکم پر یہ سب کچھ ہوا، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امریکی صدر کا پاکستان نہ آنا اور روسی حکمرانوں کا اظہار ناراضگی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے لوگ اس حد تک بدحواس ہو جائیں اور بالکل ہی ''بونتر'' جائیں۔ ابھی تو عشق کے اور بھی بہت سے امتحان باقی ہیں، اس لیے اپنے حواس قائم رکھیں اور امریکہ اور روس کی چاکری کرنے کی بجائے کہیں سے غیرت وحمیت کا درس بھی لے لیں۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۶ر فروری ۲۰۰۰ء۔

امریکی دوستی اور پاکستانی حکمرانوں کی خودفریبی

صدر جنرل پرویز مشرف نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے جن ترجیحات کا اعلان کیا ہے، وہ صرف ان کی ترجیحات نہیں بلکہ پاکستان کے ہر شہری کی ہیں اور میں خود ان لوگوں میں شامل ہوں جو پاکستان کی سالمیت اور قومی وحدت کے تحفظ کو دوسری ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہیں اور پاکستان کی عسکری اور ایٹمی صلاحیت اور ان کے سائز کو ہر حالات میں برقرار دیکھنا چاہتے ہیں، اس لیے یہ تاثر دینا کہ جو لوگ امریکہ اور افغانستان کے حالیہ تناظر میں صدر پرویز مشرف سے اختلاف کر رہے ہیں، ان کی ترجیحات اس سے مختلف ہیں، قطعی طور پر غلط بات ہے۔ بات ترجیحات کی نہیں بلکہ انہیں بروے کار لانے کے لیے طریق کار کی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان ترجیحات پر عمل درآمد کے لیے صدر موصوف نے جو راستہ اختیار کیا ہے اور اپنے خطاب میں جس طریق کار کا عندیہ دے دیا ہے، وہ ان ترجیحات کے نفاذ اور عمل داری کا نہیں بلکہ خدانخواستہ انہیں سبوتاژ کرنے کا باعث بن سکتا ہے اور اسی وجہ سے ہم اس طریق کار سے پوری دیانت داری اور شرح صدر کے ساتھ اختلاف کر رہے ہیں۔

صدر محترم نے امارت اسلامی افغانستان پر حملوں کے لیے امریکہ کو سہولتیں فراہم کرنے کی پالیسی کے حق میں کہا ہے کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو بھارت یہ کر گزرے گا اور وہ امریکہ کو اس مقصد کے لیے تمام سہولتیں فراہم کرنے کی پیش کش کر چکا ہے، اس لیے ہم بھارت کو سبقت کا موقع نہیں دینا چاہتے، کیونکہ اس سے امریکہ بھارت کے ساتھ ہو جائے گا اور ہمارے ''کشمیر کاز'' کو نقصان پہنچے گا۔

سچی بات ہے اس بھولپن پر مجھے ہنسی آتی ہے، اس لیے کہ یہ بات وہ شخص تو کہہ سکتا ہے جس نے امریکہ کو پہلی بار دیکھا ہو اور امریکہ کی تاریخ، اس کے قومی مزاج سے کوئی واقفیت نہ رکھتا ہو، مگر ایسے ملک کے سربراہ کے منہ سے یہ بات بھولپن اور سادگی ہی کہلائے گی جو گزشتہ نصف صدی سے ''امریکہ دوستی'' کے مسلسل چرکے کھا رہا ہے۔ اور امریکہ کے بارے میں یہ توقع رکھنا خود فریبی کی انتہا ہے کہ وہ افغانستان کے خلاف پاکستان کی زمین یا فضا استعمال کرنے کے بعد اس خطہ میں اپنی ترجیحات بدل دے گا اور بھارت کو اپنے مخالفین میں شمار کر کے کشمیر کو آزادی دلوانے کے لیے پاکستان کی سپورٹ کرے گا۔ پاکستان کے ساتھ اس وقت امریکہ کا مفاد صرف اس قدر ہے کہ وہ پاکستان اور افغانستان کی نظریاتی وحدت کو توڑنا چاہتا ہے، ان کی باہمی دوستی کو دشمنی میں تبدیل کرنا چاہتا ہے، پاکستان اور افغانستان کے ساتھ وسطی ایشیا کے روابط کو ختم کرنا چاہتا ہے، اور چین کے خلاف اپنے مجوزہ حصار کی راہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔ یہ سب کچھ حاصل ہو جانے کے بعد امریکی ترجیحات بدستور وہی رہیں گی جو پہلے سے چلی آرہی ہیں اور جن ترجیحات میں پاکستان کو بھارت پر ترجیح دینا یا کم از کم اس کے برابر رکھنا بھی امریکی مفادات سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں رکھتا، اس لیے صدر محترم اور ان کے ساتھ اس مسئلہ کو پاک بھارت تنازع اور کشمکش کے تناظر میں دیکھنے والے دانش وروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی سوچ اور مطالعہ کا دائرہ وسیع کریں اور وسیع تر عالمی تناظر میں امریکہ کے مفادات، پالیسیوں اور عزائم کا جائزہ لیں۔

جنرل پرویز مشرف سے زیادہ کون اس بات پر واقف ہوگا کہ عربوں نے بھی اسی غلط فہمی میں امریکی کیمپ میں شمولیت اختیار کی تھی اور امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے عروج کے دور میں روس کے کیمپ میں شمار ہونے والے بعض ممالک عرب ممالک اسی توقع پر امریکی کیمپ میں چلے گئے تھے کہ ہم اس خطہ میں امریکہ کو سہولتیں فراہم کریں گے تو امریکہ ہمارے ساتھ ہو جائے گا اور جب امریکہ ہمارے ساتھ ہوگا تو فلسطین کے مسئلہ کے حل کے لیے ہمیں رعایتیں دے گا اور اسرائیل کے مقابلے میں ہمیں ترجیح دے گا، لیکن کیا ہوا؟ صدر محترم کو اگر خود واقفیت نہ ہو تو برادر مسلم ملک عرب جمہوریہ مصر کے صدر جناب حسنی مبارک سے کسی وقت راز داری کے ساتھ پوچھ لیں کہ

اسرائیل کے مقابلہ میں ترجیح اور مسئلہ فلسطین کے حل میں تعاون کی توقع پر امریکہ کے ساتھی بننے والے ملکوں کے ساتھ امریکہ بہادر نے کیا سلوک کیا ہے؟

فلسطین کی صورت حال سب کے سامنے ہے۔ وہاں اسرئیل کے جبر وتشدد، فلسطینیوں کے قتل عام اور مسجد اقصیٰ کو منہدم کرنے کی مسلسل سازشیں کسی ذی شعور شخص سے مخفی نہیں ہیں جبکہ اسرائیل کے مقابل میں جو عرب ممالک کھڑے ہیں، وہ سب کے سب امریکہ کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے امریکہ کو تیل کے چشموں پر بالادستی دلائی ہے، فوجی استعمال کے لیے زمین اور اڈے فراہم کر رکھے ہیں اور امریکہ کی ہاں میں ہاں ملانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا، صرف اس لیے کہ اسرائیل کے مقابلہ میں امریکہ انہیں بھی کچھ رعایت دے دے، لیکن ''امریکی دوستی'' کے اس فریب نے انہیں ''گھر کا نہ گھاٹ کا'' کے مصداق اقوام عالم کی برادری میں بے بسی اور عبرت کی تصویر بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس لیے جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ ہماری ترجیحات بھی وہی ہیں جو انہوں نے بیان کی ہیں۔ ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہے تو سب کچھ ہے۔ ہمیں بھی اس بات کا شعور ہے کہ ملکی معیشت کا مستحکم کرنا ہماری اولین ضرورت ہے۔ ہم بھی پاکستان کے حساس مراکز، ایٹمی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا ہر قیمت پر تحفظ چاہتے ہیں، اور ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ مسئلہ کشمیر جلد از جلد حل ہو اور امریکہ اور سب عالمی قوتیں اس میں انصاف کا ساتھ دیں، لیکن اس کا صحیح راستہ امریکہ کے ساتھ قرب بڑھانا اور اسے اپنی داخلی حدود میں عسکری دخل اندازی اور رسائی کے مواقع فراہم کرنا نہیں بلکہ اس کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنا ہے۔ ہم اس وقت انتہائی نازک موڑ پر کھڑے ہیں۔ جس طرف بھی مڑ گئے، واپسی کے لیے دور دور تک کوئی ''یوٹرن'' نہیں ہے، اس لیے فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔*

O

---

* روزنامہ اوصاف، ۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء۔

جہاد، دہشت گردی اور جہادی تحریکات

گزارش ہے کہ گزشتہ روز ایک قومی اخبار نے آنجناب کے حوالہ سے خبر شائع کی ہے کہ :

''امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دہشت گردی کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنے کے بیان پر لندن میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے وزیر داخلہ نے صحافیوں کو بتایا کہ انہوں نے طالبان کی حکومت پر واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنی سرزمین پر موجود تمام تربیتی کیمپ بند کر دے جہاں پر پاکستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مسلح تربیت حاصل کرتے ہیں۔ معین الدین حیدر نے کہا کہ انہوں نے سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد پر بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ قتل وغارت گری بند کر دیں اور اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو حکومت ان کے خلاف سختی سے نمٹے گی۔''

میں اس سلسلہ میں آنجناب کی توجہ چند حقائق کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے۔

افغانستان میں موجود عسکری ٹریننگ کے کیمپوں اور طالبان کی اسلامی حکومت کے بارے میں ایک عرصہ سے عالمی سطح پر اس تاثر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کیمپوں میں دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی ہے اور طالبان حکومت اس دہشت گردی کی سرپرستی کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان میں سنی شیعہ کشمکش اور باہمی قتل وغارت کے عنصر کو شامل کر کے اس تاثر کو یہ رخ دیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل وغارت کرنے والے سب لوگ انہی کیمپوں میں تربیت پاتے ہیں، اس لیے پاکستان میں فرقہ وارانہ امن کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ

افغانستان کے ان جہادی تربیتی مراکز کو بند کر دیا جائے۔

یہ تاثر انتہائی گمراہ کن ہے جو مغربی میڈیا اور مغرب کی سیکولر لابیاں منظّم طور پر پھیلا رہی ہیں اور امریکہ اس میں قائدانہ کردار ادا کر رہا ہے جس نے جنوبی ایشیا میں اپنے استحصالی اور استعمار پسندانہ عزائم کو بروئے کار لانے کے لیے یہ تکنیک اختیار کی ہے اور میں آنجناب سے بڑی صفائی کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالات کا اصل منظر یہ نہیں ہے جو ورلڈ میڈیا کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے اور آپ جیسے سنجیدہ حضرات نے بھی اگر اس کی تائید شروع کر دی تو اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ امریکہ جنوبی اور وسطی ایشیا کے حوالہ سے اپنے طے شدہ ایجنڈے کے لیے اس خطہ کے حکمران گروہوں کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور جنوبی ایشیا کے دورہ سے صدر کلنٹن کے خالی ہاتھ واپس جانے کا تاثر امریکی ذرائع ابلاغ کی طرف سے طے شدہ پالیسی کے تحت اندرون خانہ طے ہونے والے معاملات پر پردہ ڈالنے کے لیے دیا جا رہا ہے۔

جناب والا! امریکہ اس خطہ میں جو کچھ چاہتا ہے، وہ یقیناً آپ سے مخفی نہیں ہوگا۔ میں یاددہانی کے طور پر بعض اہم امور کا ذکر اس عریضہ میں مناسب سمجھتا ہوں۔

o امارت اسلامی افغانستان کی حکومت نے مغربی ثقافت اور اقوام متحدہ کے منشور کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی بنیاد پر خالص اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کا جو عزم کر رکھا ہے، وہ امریکہ کے لیے قابل قبول نہیں ہے اور امریکہ طالبان پر دباؤ ڈال کر انہیں ''وسیع البنیاد حکومت'' کے نام پر ایک ایسی مشترکہ حکومت کا حصہ بننے پر مجبور کرنا چاہتا ہے جو دنیا کی بہت سی دیگر مسلم حکومتوں کی طرح اسلام کا راگ تو الاپتی رہے مگر افغانستان میں اقوام متحدہ کے منشور کے نفاذ اور مغربی ثقافت اور کلچر کے فروغ میں رکاوٹ نہ بنے۔

o اس خطہ کی معیشت پر پہلے سے حاصل بالادستی کو امریکہ ''آزادانہ'' تجارت اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعہ مکمل اجارہ داری اور کنٹرول میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور چین سمیت کسی بھی دوسری قوت کے اس میں درآنے کے امکانات کو مکمل طور پر ختم کر دینا چاہتا ہے۔

o امریکہ چین کے خلاف بھارت کی سربراہی میں متحدہ محاذ کے قیام میں اسلامی جمہوریہ

پاکستان اور امارت اسلامی افغانستان کو رکاوٹ سمجھتا ہے اور ان رکاوٹوں کو اس قدر کمزور کر دینا چاہتا ہے کہ وہ امریکہ یا بھارت کے کسی بھی اقدام کی راہ میں کسی درجہ میں بھی حائل نہ ہوسکیں۔

o امریکہ اور بھارت کو مشترکہ طور پر تکلیف یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی مسلح افواج کے خلاف جو مجاہدین سال ہا سال سے نبرد آزما ہیں اور جن کی جدوجہد اور قربانیوں کی وجہ سے مسئلہ کشمیر ایک بار پھر عالمی ایجنڈے میں اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے، ان مجاہدین نے افغانستان کے انہی تربیتی مراکز میں ٹریننگ حاصل کی ہے اور ان تربیتی مراکز کو بند کرائے بغیر کشمیری مجاہدین کی سپلائی لائن کو کاٹا نہیں جا سکتا اور نہ ہی مسئلہ کشمیر کی اہمیت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

o امریکہ کو یہ بھی تکلیف ہے کہ افغانستان میں جو تربیتی مراکز خود ان کے تعاون سے قائم ہوئے تھے اور جن مراکز نے افغان قوم کو روسی افواج کے مقابلہ میں صف آرا کر کے سوویت یونین کو شکست وریخت سے دوچار کر دیا تھا، انھی مراکز سے دنیا بھر کے دیگر مسلم مجاہدین نے بھی عسکری تربیت حاصل کر لی ہے اور بوسنیا، کوسووا، فلسطین، کشمیر، چیچنیا، مورو، اراکان اور صومالیہ وغیرہ میں اسلام کی سربلندی کے نام سے صف آرا ہو چکے ہیں جس سے مسلم دنیا میں ''جہاد'' کا وہ عمل اور جذبہ ایک بار پھر عالمی سطح پر منظم ہو رہا ہے جسے ختم کرنے کے لیے مغربی طاقتیں دو صدیوں سے اپنے تمام وسائل کے ساتھ مصروف کار رہی ہیں مگر ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود فلسطین سے انڈونیشیا تک اور چیچنیا سے صومالیہ تک پوری دنیائے اسلام میں پھر سے جہاد کے نعرے پورے جوش وخروش کے ساتھ گونج رہے ہیں اور اسی وجہ سے امریکہ افغانستان کے ان تربیتی مراکز کو جلد از جلد بند کرانے کے لیے بے چین ہے۔

جناب وزیر داخلہ! جہاں تک پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور فرقہ وارانہ قتل وغارت گری کا تعلق ہے، یہ بلاشبہ انتہائی افسوسناک بلکہ شرمناک ہے اور اس کی روک تھام کے لیے حکومت پاکستان اور تمام قومی حلقوں کو سنجیدگی کے ساتھ پیش رفت کرنی چاہیے لیکن اس فرقہ وارانہ قتل وغارت کا ذمہ دار افغانستان کے تربیتی کیمپوں کو ٹھہرانا اور اس کی آڑ میں طالبان حکومت سے ان مراکز کی بندش کا مطالبہ کرنا سراسر ناانصافی اور ظلم ہے۔

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان کیمپوں سے تربیت حاصل کرنے والے کچھ افراد پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت میں ملوث ہوئے ہوں گے، لیکن یہ ہر ادارے میں ہوتا ہے۔ آنجناب محسوس نہ فرمائیں تو اگر پاکستان کی جیلوں اور مقدمات کے ریکارڈ کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لے لیا جائے کہ ملک بھر میں قتل و غارت کرنے والے افراد نے اسلحہ چلانے کی ٹریننگ کہاں کہاں سے حاصل کی ہے تو ان میں یقیناً ایسے افراد نکل آئیں گے جنہوں نے اسلحہ کی ٹریننگ پاک فوج اور پولیس کے تربیتی مراکز میں حاصل کی ہوگی، لیکن کوئی بھی باہوش شخص محض اس بنا پر پاک فوج اور پولیس کے تربیتی مراکز کو ملک میں بدامنی اور قتل و غارت کا ذمہ دار قرار نہیں دے گا، اس لیے کہ چند افراد کی انفرادی کارروائیوں کو اداروں اور مراکز کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاتا۔ اسی طرح افغانستان کے تربیتی مراکز کو بھی پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا باعث اور ذمہ دار قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

پاکستان میں سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے اصل عوامل اور سرچشمے کچھ اور ہیں اور اگر آپ ان اسباب وعوامل کی نشان دہی اور سد باب میں سنجیدہ ہیں تو میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں اعلیٰ سطحی کمیشن قائم کیا جائے جو آزادانہ انکوائری کے ذریعہ سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ کے اسباب وعوامل اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے سرچشموں کی نشان دہی کرے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس آزادانہ اعلیٰ سطحی عدالتی انکوائری کے ذریعہ پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کے فروغ میں افغانستان کے تربیتی مراکز کا کوئی کردار سامنے آیا تو اس کے سد باب اور روک تھام کے لیے ملک کے دینی حلقے آپ کے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے، لیکن محض امریکی رپورٹوں کی بنیاد پر افغانستان کے تربیتی مراکز کو پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا ذمہ دار قرار دے کر ان کی بندش کے لیے طالبان حکومت پر کسی بھی قسم کے دباؤ کی پالیسی کو ہم ''جہاد'' کے خلاف امریکی مہم کا حصہ سمجھتے ہیں اور اس کی کسی درجہ میں تائید کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

جناب معین الدین حیدر! میں آپ کو چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے وہ ریمارکس یاد دلانا

چاہتا ہوں جو انہوں نے جنوری ۲۰۰۰ء کے وسط میں امریکی سینیٹروں کے دورۂ پاکستان کے موقع پر ان کے ساتھ گفتگو کے دوران دیے تھے اور جنہیں ایک قومی اخبار نے ان الفاظ میں رپورٹ کیا تھا کہ :

''چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹروں کے وفد کو دوٹوک الفاظ میں بتا دیا ہے کہ پاکستان جہادی تنظیموں پر پابندی نہیں لگا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں کو جہاد سے روکا جا سکتا ہے، جیسے روس کے خلاف جہاد کو نہیں روکا جا سکتا تھا۔ اعلیٰ عسکری ذرائع نے ''جنگ'' کو بتایا کہ جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹروں پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہاد مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔ امریکہ کو دہشت گردی اور جہاد میں بنیادی فرق کو سمجھنا ہوگا۔ ان اعلیٰ عسکری ذرائع کے بقول جنرل پرویز مشرف نے امریکی سینیٹروں کو بتایا کہ پاکستان نے دہشت گردی اور ہائی جیکنگ کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور کرتا رہے گا، تاہم جہاں تک جہاد کا تعلق ہے، یہ اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے۔ دنیا میں مسلمان جہاں بھی جہاد کرتے ہیں، وہ دراصل اپنا مذہبی فریضہ نبھاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جہادی تنظیمیں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہیں اور یہ تنظیمیں کشمیر ہو یا چیچنیا، جہاں بھی جہاد کر رہی ہیں، اسے روکا نہیں جا سکتا۔''

جنابِ وزیرِ داخلہ! جہاد اور دہشت گردی کے حوالہ سے ہمارا موقف بھی یہی ہے اور ہم اس پر بدستور قائم ہیں۔ ہم دہشت گردی کے خلاف آپ کے ہر منصفانہ اقدام کی حمایت کریں گے مگر دہشت گردی کے خلاف کارروائی کے نام پر جہاد کے عمل، جہادی تحریکات اور جہادی تربیتی مراکز کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی پاکستان کے دینی حلقوں کے لیے قطعی طور پر قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ امید ہے کہ آنجناب بھی اپنی پالیسی ترجیحات میں ''جہاد'' اور ''دہشت گردی'' کے اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھ کر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں گے۔*

O

---

* روزنامہ اوصاف، ۱۸؍اپریل ۲۰۰۰ء۔

امریکہ کے ساتھ تعاون کے حق میں صدر مشرف کا استدلال

صدر جنرل پرویز مشرف کے خطاب میں یہ بات مجھے بہت اچھی لگی کہ انہوں نے حوالہ اور استناد کے لیے قرآن وسنت سے رجوع کیا ہے۔ ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے سربراہ کا یہی حق بنتا ہے کہ وہ قرآن وسنت سے راہنمائی حاصل کرے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں بھی قرآن وسنت کو ہی ریاستی پالیسیوں اور قوانین کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے، البتہ قرآن وسنت سے استناد کے لیے ان اصول وضوابط کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے جو راہنمائی اور ہدایت کے ان سرچشموں سے استفادہ کے لیے امت کے جمہور اہل علم کے ہاں مسلم چلے آ رہے ہیں، ورنہ اگر ہر شخص اپنی مرضی اور فہم کے مطابق قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے واقعات کو اپنے موقف کے حق میں پیش کرنے لگے تو قرآن وسنت راہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہیں گے بلکہ بازیچہ اطفال بن کر رہ جائیں گے۔

صدر محترم نے افغانستان پر حملہ میں امریکہ کی معاونت کے جواز میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں یہودی قبائل کے ساتھ معاہدہ کر کے بدر، احد اور خندق کے معرکوں میں کفار مکہ کو شکست دی اور اس کے بعد حدیبیہ میں کفار مکہ سے معاہدہ کر کے غزوۂ خیبر میں یہودیوں کی شکست کی راہ ہموار کی، اس لیے حکمت اور دانش کے تحت کسی کافر قوم سے وقتی مصالحت کا جواز موجود ہے، لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے اس لیے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں طرف کافر

اقوام تھیں اور دونوں دشمن تھیں۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے بیک وقت جنگ کو حکمت کے خلاف سمجھتے ہوئے یہ حکمت عملی اختیار کی، مگر یہاں یہ صورت حال نہیں ہے۔ یہاں ایک طرف کافر قوم ہے اور دوسری طرف مسلمان بھائی ہیں۔ ایک طرف وہ طاقت ہے جس نے گزشتہ نصف صدی میں پاکستان کے ساتھ دوستی کے تمام تر معاہدوں کے باوجود ہر نازک مرحلہ میں پاکستان سے بے وفائی کی ہے اور دوسری طرف وہ قوم ہے جس نے گرم پانیوں کی طرف سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے قدم روک کر پاکستان کی جغرافیائی سالمیت کا تحفظ کیا ہے۔ ایک طرف وہ ملک ہے جس کے ایجنڈے میں پاکستان کے جغرافیے کو تبدیل کرنا اور اسے ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنا شامل ہے اور دوسری طرف وہ ملک ہے جس میں طالبان کی اسلامی نظریاتی حکومت کا وجود ہی پاکستان کی شمال مغربی سرحد کے تحفظ کی ضمانت ہے، اس لیے میں صدر جنرل پرویز مشرف صاحب سے بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ سیرت طیبہ کا حوالہ دینے سے قبل اس بات کا ایک بار پھر جائزہ لے لیں کہ وہ کس کے ساتھ معاہدہ کر رہے ہیں اور کس کے خلاف کر رہے ہیں؟ اور اس کے ساتھ ہی اس سوال کا بھی جواب مرحمت فرما دیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکمت عملی کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو کفار مکہ اور یہود خیبر میں سے کس کے زمرہ میں شمار کیا ہے؟

جنرل صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور خلافت میں جب وہ امیر شام حضرت معاویہؓ کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور دونوں طرف مسلمان فوجیں آمنے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ معرکہ آرا تھیں، اس وقت کی سپر پاور رومن ایمپائر کے بادشاہ قیصر روم نے حضرت معاویہ کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے، مگر حضرت معاویہؓ نے اس کے جواب میں جو تاریخی موقف اختیار کیا تھا، وہ قیامت تک ایسے معاملات میں مسلم حکمرانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ ان کا یہ جواب تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہے جس میں انہوں نے قیصر روم کو مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ:

''حضرت علیؓ کے خلاف میری جنگ دو بھائیوں کی لڑائی ہے جس سے تمہیں فائدہ اٹھانے کا

موقع نہیں دوں گا اور اگر تم نے علیؓ کے خلاف فوج کشی کی تو علیؓ کے پرچم کے نیچے تمہارے خلاف میدان جنگ میں اترنے والا سب سے پہلا سپاہی معاویہؓ ہوگا۔''

اور صدر محترم کو یہ بتانے کی شاید ضرورت نہ ہو کہ یہ اس دور کی بات ہے جب دو مسلمان حکمران ایک دوسرے کے خلاف حالت جنگ میں تھے اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ یہاں تو پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کے رشتہ سے بندھے ہوئے ہیں، دونوں کے مفادات مشترکہ ہیں، دونوں ایک دوسرے کے پشتی بان ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ یہی وہ رشتہ ہے جسے توڑنے کے لیے امریکہ اور بھارت دونوں مسلسل سرگرم عمل ہیں، اس لیے ان حالات میں اگر صدر جنرل پرویز مشرف افغانستان کے خلاف امریکی حملوں میں امریکہ کو پاکستان کی زمین یا فضا فراہم کر کے فریق بننا چاہتے ہیں تو یہ ان کی مصلحت کا تقاضا یا طالبان کے طرز حکومت سے اپنے مفادات اور عیش پرستی کو خطرہ محسوس کرنے والے مراعات یافتہ طبقوں کی ضرورت تو ہو سکتی ہے، اسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ یا اسلامی تاریخ کی شاندار روایات کا آئینہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ *

O

---

* روزنامہ اوصاف، ۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء۔

امریکی عزائم اور پاکستان کا کردار

[۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو مسجد امن باغبان پورہ لاہور میں ایک عمومی نشست سے خطاب]

بعد الحمد والصلوٰۃ۔

محترم بزرگو اور دوستو! اس وقت پوری دنیا میں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن میں ہونے والے حادثات اور ان میں ہزاروں جانوں کے ضائع ہو جانے کے بعد اس پر امریکہ کے ردِعمل اور اس سے پیدا شدہ صورتِ حال پر بحث کا سلسلہ جاری ہے اور میں بھی اسی حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن کے پنٹا گون سے اغوا شدہ طیاروں کے ٹکرانے سے جو عظیم جانی و مالی نقصان ہوا، اس سے سب لوگوں کو دکھ ہوا ہے لیکن امریکہ نے اس کی ذمہ داری عرب مجاہد اسامہ بن لادن پر ڈال کر اس کی آڑ میں افغانستان پر حملہ کرنے کا جو اعلان کیا ہے، اس سے صورتِ حال میں اور کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ افغانستان کی طالبان حکومت سے امریکہ کا مطالبہ ہے کہ وہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دے مگر طالبان حکومت کا موقف یہ ہے کہ امریکہ کے پاس کوئی ثبوت ہے تو پیش کرے۔ اس کے مطالبہ پر غور کیا جائے گا۔ محض شک یا الزام پر وہ ایک مجاہد کو، جو ان کا مہمان ہے، امریکہ کے سپرد کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی افغان علما کی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسامہ بن لادن اپنے طور پر افغانستان چھوڑ دیں مگر انہیں امریکہ یا کسی اور ملک کے سپرد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طالبان حکومت کا یہ موقف بہت پرانا ہے اور

اس سے پہلے بھی امارتِ اسلامی افغانستان کی حکومت کی طرف سے کہا جاچکا ہے کہ اسامہ بن لادن رضا کارانہ طور پر افغانستان سے چلے جائیں تو ان کی مرضی ہے مگر انہیں بطور ملزم کسی ملک کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ افغان علما کی مجلسِ شوریٰ نے یہی بات اب ذرا مختلف انداز میں کہی ہے اور اسی سے وقتی طور پر کشیدگی میں کسی حد تک کمی کے آثار پیدا ہوئے ہیں مگر امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش نے آج امریکی ایوان نمائندگان سے خطاب کرتے ہوئے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ مسئلہ صرف اسامہ کا نہیں بلکہ وہ دہشت گردوں کے نیٹ ورک کو توڑنا چاہتے ہیں اور دنیا بھر میں دہشت گردوں کے تمام مراکز کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔

امریکہ کے نزدیک عالمِ اسلام کی جہادی تحریکات دہشت گرد ہیں اور جب وہ دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کی بات کرتا ہے تو اس سے مراد یہی جہادی تحریکات ہوتی ہیں جو مراکش سے انڈونیشیا تک اور چیچنیا سے صومالیہ تک پھیلی ہوئی ہیں اور کشمیر، فلسطین، چیچنیا اور مورو سمیت مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو غاصب اور مسلط قوتوں سے نجات دلانے کے لیے عسکری جدوجہد کر رہی ہیں۔ امریکہ اور اس کے حواریوں کا کہنا ہے کہ ان سب دہشت گردوں نے افغانستان میں ٹریننگ حاصل کی ہے، اس لیے افغانستان کو تباہ کرنا امریکہ کے لیے ضروری ہو گیا ہے اور اسی ہدف کو حاصل کرنے کے لیے امریکہ بھرپور جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہم پہلے ہی عرض کیا کرتے تھے کہ اسامہ بن لادن کا نام صرف بہانہ ہے، اصل مسئلہ جہادی تحریکات ہیں جو امریکہ اور اس کے حواری ممالک کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں اور اب صدر بش نے صاف طور پر تمام جہادی تحریکات کے خاتمہ کو اپنا سب سے بڑا ہدف قرار دے کر ہمارے ان خدشات کی تصدیق کر دی ہے۔ مگر اس میں ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ امریکہ افغانستان پر حملے کے لیے ہمارے کندھے پر بندوق رکھنا چاہتا ہے اور پاکستان کی زمین اور فضا سے حملہ آور ہو کر امارتِ اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کو ختم کرنے کے درپے ہے اور مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے اربابِ اختیار امریکہ کو افغانستان پر حملہ کے لیے زمینی اور فضائی سہولتیں فراہم کرنا چاہتے ہیں اور اسے اسلام اور پاکستان کے مفاد کا تقاضا بتا رہے ہیں۔ صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف صاحب نے قوم سے خطاب کرتے

ہوئے جس طرح افغانستان پر حملہ کے لیے امریکہ کے ساتھ تعاون کی پالیسی کا دفاع کیا ہے، وہ انتہائی حیران کن ہے اور میں اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہ رہا ہوں۔

صدر محترم نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا حوالہ دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے یہودیوں سے صلح کا معاہدہ کر کے کفارِ مکہ کے خلاف احد اور خندق کی جنگیں لڑی تھیں جبکہ اس کے بعد حدیبیہ میں کفارِ مکہ سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر کے خیبر میں یہودیوں سے جنگ جیتی تھی، اس لیے یہ عین حکمت اور دانش کا تقاضا ہے اور سنتِ نبوی کی پیروی ہے۔ لیکن جنرل صاحب کا یہ استدلال درست نہیں ہے اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دونوں قومیں کافر تھیں اور دونوں دشمن تھے۔ ان سے بیک وقت لڑنے کے بجائے حضورؐ نے ایک وقت میں ایک دشمن سے صلح کرنے اور دوسرے دشمن کے خلاف جنگ لڑنے کی حکمتِ عملی اختیار فرمائی جو فی الواقع دانش مندی کی بات تھی، لیکن یہاں ایک طرف امریکہ ہے جس کی مہربانیاں نصف صدی سے ہم بھگت رہے ہیں اور دوسری طرف طالبان کی اسلامی حکومت ہے جس کی باقی تمام باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بھی یہ حقیقت ہے کہ کابل میں طالبان حکومت کا وجود ہی پاکستان کی شمال مغربی سرحد کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اس لیے اس صورتِ حال پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حکمتِ عملی کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا اور اسے غلط فہمی یا دھوکہ کے عنوان سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں اسلام کی تعلیم کا تاریخ کے اس عظیم واقعہ سے پتہ چلتا ہے جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں اور دونوں ایک دوسرے کو شکست دینے کے درپے تھے۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی مسیحی سلطنت روم کے بادشاہ قیصر نے حضرت معاویہ کو پیش کش کی تھی کہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں وہ ان کی مدد کر سکتا ہے مگر حضرت معاویہؓ نے اسے انتہائی سختی کے ساتھ رد کر دیا اور وہ جواب دیا جو اسلامی تاریخ کا روشن باب اور قیامت تک آنے والے مسلم حکمرانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ انہوں نے قیصر روم کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

''میری حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ دو بھائیوں کی لڑائی ہے جس سے تمہیں فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا جائے گا اور اگر تم نے حضرت علیؓ کے خلاف فوج کشی کی تو تمہارے مقابلے میں حضرت علیؓ کے پرچم تلے سامنے آنے والا سب سے پہلا سپاہی معاویہؓ ہوگا۔''

یہ اس کیفیت کی بات ہے جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ایک دوسرے کے خلاف حالتِ جنگ میں تھے جبکہ ہماری طالبان کے ساتھ کوئی جنگ بھی نہیں ہے، اس لیے ہمارے لیے اسلام کی تعلیم یہی ہے جو حضرت معاویہؓ نے قیصرِ روم کے نام اپنے خط میں بیان فرمائی ہے۔

جنرل صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر ہم نے امریکہ کو حملے کی سہولتیں فراہم نہ کیں تو بھارت ایسا کر دے گا اور پھر امریکہ بھارت کے ساتھ ہو جائے گا جس سے ہمارے کشمیر کاز کو نقصان پہنچے گا۔ میرے نزدیک یہ انتہائی بھولپن ہے اور یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے جو امریکہ کو جانتا نہیں ہے۔ امریکہ کے بارے میں یہ توقع رکھنا خود فریبی ہے جس کا شکار ہم سے پہلے ہمارے عرب بھائی ہو چکے ہیں۔ ہمارے برادر عرب ملکوں نے اسی توقع اور امید پر امریکہ دوستی کا پرچم اٹھایا تھا کہ اسرائیل کے مقابلے میں امریکہ ان کا لحاظ کرے گا اور ان کے امریکہ کا ساتھی بننے سے اسرائیل اور عربوں کے حوالے سے امریکہ کی پالیسیوں میں توازن قائم ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور ساری دنیا یہ منظر دیکھ رہی ہے کہ امریکہ نے اپنی فوجیں سعودی عرب اور کویت میں بٹھا رکھی ہیں اور پشت پناہی اسرائیل کی کر رہا ہے۔ وسائل عربوں کے استعمال کر رہا ہے اور تحفظ اسرائیل کو فراہم کر رہا ہے اس لیے ہمارے مہربانوں کو یہ غلط فہمی ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ امریکہ پاکستان میں بیٹھ جائے گا تو بھارت کے مقابلے میں پاکستان کی حمایت بھی کرے گا اور پاکستان میں اس کی موجودگی سے پاکستان کے کشمیر کاز کو کوئی فائدہ بھی پہنچے گا۔ پھر یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب امریکہ کے بقول وہ جہادی تحریکات کا خاتمہ کر دے گا، پاکستان کو افغانستان سے لڑا دے گا اور چین کے سر پر فوجیں بٹھا کر پاک چین تعلقات میں رخنہ پیدا کر دے گا تو پھر کون سا کشمیر کاز باقی رہ جائے گا جسے بچانے کی ہمارے حکمران فکر کر رہے ہیں؟ ''کشمیر کاز'' اگر ہے تو وہ مجاہدین کی قربانیوں کی وجہ سے ہے جنہوں نے ہزاروں شہدا کا خون دے کر اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ جب یہ مجاہدین اور ان کے

گروپ ہی دہشت گرد قرار پا کر پاکستان کے ہاتھوں امریکی انتقام کا نشانہ بن جائیں گے تو ''کشمیر کاز'' کا وجود ہی کہاں باقی رہ جائے گا؟

صدرِ محترم کا ارشاد ہے کہ ہم امریکہ کو افغانستان کے خلاف سہولتیں فراہم کر کے اپنی ایٹمی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا تحفظ کر سکیں گے، مگر یہ بات بھی خود فریبی ہے اس لیے کہ ہماری عسکری صلاحیت میں اضافے اور ایٹمی پروگرام کے بارے میں امریکہ اب تک جو کچھ کہتا آ رہا ہے، اس کے پیشِ نظر ہم اس قدر فاصلے سے اپنی ایٹمی تنصیبات کو امریکی مداخلت سے محفوظ تصور نہیں کر رہے تو جب وہ گوادر، کوئٹہ اور پشاور میں آ بیٹھے گا تو پھر ایٹمی تنصیبات کے تحفظ کی گارنٹی کون دے سکتا ہے؟ اس لیے ہم دیانت داری کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ ہماری ایٹمی تنصیبات اور میزائل پروگرام کا تحفظ امریکہ کے ساتھ فاصلہ قائم رکھنے میں ہے، اسے اپنی داخلی حدود میں براجمان ہونے کا موقع دینے میں نہیں۔

جنرل پرویز مشرف صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ امریکہ کو سہولتیں دینے کی پالیسی سے ہمیں معیشت کو سنبھالا دینے میں مدد ملے گی اور ہمارے معاشی حالات سدھر جائیں گے۔ میں اس کے جواب میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات ان عرب ممالک سے دریافت کر لیجیے جن کے کندھے پر دس سال سے امریکہ سوار ہے اور اس نے وہاں اپنی فوجیں بٹھا رکھی ہیں کہ امریکہ بہادر کی تشریف آوری اور اس کی فوجوں کی آمد سے ان کی معیشت کو کتنا سہارا ملا ہے؟ ان میں سے سعودی عرب کی حالت آج یہ ہے کہ تیل کی دولت سے مالا مال اس ملک کو اپنا بجٹ کا خسارا پورا کرنے کے لیے عمرہ جیسی عبادت کو بزنس کے حساب سے ڈیل کرنا پڑ رہا ہے اور قرضے لینے کے لیے مجبور ہونا پڑا ہے اس لیے ہمارے نزدیک یہ بات بھی خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے کہ امریکہ کو افغانستان کے خلاف فوجی سہولتیں دینے سے پاکستان کی معیشت سدھرنے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

حضراتِ محترم! میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے اصل مقصد کو پہچانیں اور اس کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ میرے نزدیک امریکہ کے موجودہ عالمی کردار اور

بھاگ دوڑ کے بنیادی مقاصد تین ہیں:

ایک یہ کہ دنیا بھر کی جہادی تحریکات کو دہشت گردی کا نام دے کر سختی کے ساتھ کچل دیا جائے اور افغانستان کو اس تمام تر دہشت گردی کا سرچشمہ قرار دے کر طالبان حکومت کو ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ اپنی مرضی کی حکومت بٹھائی جائے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں فکری ہم آہنگی اور نظریاتی یگانگت کے فروغ کو وسطی ایشیا تک پھیلنے سے روکا جائے۔ ان اثرات کے وسیع ہونے کے امکانات کو سامنے رکھ کر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ یہ خطہ اگر دوبارہ اکٹھا ہو گیا تو بہت بڑی قوت بنے گا اور اسے بھارتی حلقوں میں ''مغل امپائر'' کے زندہ ہونے سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور اسے روکنے پر امریکہ اور بھارت دونوں متفق ہیں جس کی واحد صورت پاکستان اور افغانستان کی دوستی کو توڑنا ہے اور امریکہ اسے توڑنے کے لیے پاکستان کو افغانستان کے خلاف حملوں میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔

امریکہ کا تیسرا مقصد چین کے خلاف حصار قائم کرنا اور پاکستان میں بیٹھ کر پاک چین دوستی میں رخنے ڈالنا ہے تاکہ چین اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے قابل نہ رہیں اور امریکہ ان کے حوالے سے آسانی کے ساتھ من مانی کر سکے۔

ان حالات میں آپ خود سوچ لیں کہ جب خدانخواستہ پاکستان کے تعلقات چین اور افغانستان دونوں کے ساتھ خراب ہو جائیں گے اور مجاہدین کے گروپوں کو بھی دہشت گرد قرار دے کر خود پاکستان کے ہاتھوں گراؤنڈ کر دیا جائے گا تو خطے میں خود پاکستان کی حیثیت کیا رہ جائے گی اور کیا کل کوئی صاحب یہ کہنے کے لیے کھڑے نہیں ہو جائیں گے کہ کشمیریوں کے ساتھ ہمیں بہت ہمدردی ہے اور ہمیں ان کی فکر بہت زیادہ ہے لیکن خود پاکستان کی سالمیت ہمارے لیے سب سے مقدس ہے اس لیے کشمیریوں کو بھول جائیے اور پاکستان کے وجود کا تحفظ کیجیے۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے حالات کا نقشہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور میری آپ سے گزارش ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ اس صورتِ حال کا جائزہ لیں۔ یہ اسلام کے مفاد کی بات ہے، پاکستان کی سالمیت کا مسئلہ ہے اور طالبان کی اسلامی حکومت کے مستقبل کا سوال ہے۔ میں سمجھتا

ہوں کہ ملک کی دینی جماعتوں نے اس سلسلے میں جو موقف اختیار کیا ہے، وہ بالکل درست اور ملک وملت کے مفاد کا تقاضا ہے اس لیے سب دوستوں کو چاہئے کہ وہ اس موقف کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں اور دینی قوتوں کو مضبوط کریں کیونکہ اس وقت دین، ملک اور قوم کے تحفظ کا یہی ناگزیر تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔ *

O

* ماہنامہ الشریعہ، اکتوبر ۲۰۰۱ء

افغانستان کی صورت حال پر ایک پینل انٹرویو

گزشتہ روز لندن کے ٹی وی چینل اے آر وائی ڈیجیٹل کے پینل انٹرویو کے ایک پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ موضوع ''افغانستان کی صورت حال'' تھا۔ شرکائے گفتگو میں دیگر حضرات علاوہ برطانوی دارالامرا کے رکن لارڈ نذیر بھی شامل تھے۔ اردو اور انگلش کے ایک گھنٹے کے اس ملے جلے پروگرام میں ٹیلی فون پر جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد اور صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کے ترجمان جنرل راشد قریشی سے بھی رابطہ کیا گیا اور پینل کے شرکا نے ان سے سوالات کیے۔ ان کے علاوہ سیالکوٹ اور کراچی کے کچھ ناظرین نے بھی فون پر سوالات پوچھے اور اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

اے آر وائی ڈیجیٹل کے بی جے میر صاحب نے پروگرام کنڈکٹ کیا۔ ان کا پہلا سوال مجھ سے تھا کہ کیا آپ طالبان کی حمایت کرتے ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو دوسرا سوال ہوا کہ طالبان کی حمایت کس وجہ سے کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ اس لیے کہ طالبان ایک جائز موقف کے لیے لڑ رہے ہیں۔ وہ جہاد افغانستان کے منطقی اور نظریاتی نتائج کا تحفظ کر رہے ہیں۔ ان پر جنگ ٹھونسی گئی ہے اور وہ مظلوم ہیں، اس لیے میں ان کی حمایت کرتا ہوں۔ اس پر لارڈ نذیر احمد صاحب نے کہا کہ وہ اسامہ بن لادن کے حوالے سے طالبان کے موقف سے اختلاف رکھتے ہیں کیونکہ جب امریکہ اور عالمی برادری نے ان سے مطالبہ کیا کہ اسامہ بن لادن ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا مجرم ہے، اس لیے اسے امریکہ کے حوالے کر دیا جائے تو انہیں یہ مطالبہ مان لینا چاہیے تھا۔ آخر جناب نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم نے بھی تو صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابی رسول حضرت ابو جندل کو کفار مکہ کے مطالبہ پر ان کے حوالے کر دیا تھا۔

میں نے عرض کیا کہ یہ بات دو وجہ سے درست نہیں ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں قریش کے مطالبہ پر حضرت ابو جندل کو ان کے حوالے کر دیا تھا، لیکن یہ ایک معاہدے کے نتیجہ میں ہوا تھا۔ کفار مکہ کے ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا باقاعدہ معاہدہ ہوا تھا جس میں یہ شق بھی تھی کہ قریش مکہ کا کوئی شخص انہیں چھوڑ کر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے گا تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے واپس کر دیں گے۔ یہ معاہدہ طے پانے کے بعد حضرت ابو جندل پابہ زنجیر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ میں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آپ کے ساتھ مدینہ منورہ جانا چاہتا ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں معاہدہ کر چکا ہوں، اس لیے ساتھ نہیں لے جا سکتا اور ابو جندل کو قریش مکہ اپنے ساتھ واپس لے گئے۔ مگر امریکہ اور طالبان کے درمیان تو کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ نہ مجرموں کے باہمی تبادلہ کا کوئی معاہدہ موجود ہے اور نہ امریکہ نے طالبان حکومت کو تسلیم کیا ہے، اس لیے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالہ کرنے کے مطالبے کا سرے سے کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔ اور دوسری بات یہ کہ امریکہ نے اسامہ بن لادن کو مجرم قرار دے دیا ہے تو میرا سوال یہ ہے کہ اس کیس میں امریکہ کی حیثیت مدعی کی ہے یا مجسٹریٹ کی؟ اور اگر امریکہ مدعی ہے تو وہ کون سی غیر جانبدار عدالت ہے جس نے امریکہ کے اس موقف کو تسلیم کرتے ہوئے اسامہ بن لادن کو مجرم قرار دیا ہے؟ طالبان نے اسامہ کی حوالگی سے انکار نہیں کیا، صرف ثبوت مانگے ہیں اور غیر جانبدار عدالتی فورم کی تشکیل کا مطالبہ کیا ہے اور ان کا یہ موقف جائز ہے۔

گفتگو میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ طالبان پاکستان کے مخالف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بالکل نہیں۔ طالبان نے کبھی پاکستان کی مخالفت نہیں کی اور نہ اب کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان کے موقف سے اختلاف اور چیز ہے اور پاکستان کی مخالفت اس سے بالکل مختلف معاملہ ہے۔ ہمیں ان دو باتوں میں فرق کرنا چاہیے۔ پھر یہ کہا گیا کہ پاکستان سے جو لوگ افغانستان میں لڑنے کے

لیے جا رہے ہیں، وہ پاکستان کے خلاف لڑیں گے۔ اس کا جواب قاضی حسین احمد صاحب نے دیا کہ طالبان نے کسی کو اپنے ملک میں لڑنے کے لیے بلایا ہے اور نہ کوئی جا رہا ہے۔ یہ محض پروپیگنڈا ہے، جب کہ میں نے عرض کیا کہ جو لوگ افغانستان میں جا کر جہاد میں شریک ہونے کا عزم کر رہے ہیں، وہ پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ امریکہ کے خلاف لڑنے کا عزم رکھتے ہیں اور امریکہ کے خلاف جنگ کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان تو اس جنگ میں خود کو فریق ہی تسلیم نہیں کر رہا تو اس کے خلاف جنگ کیسی؟

پینل گفتگو میں ایک اور سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ قاضی حسین احمد نے اپنی ٹیلی فونک گفتگو میں کہا کہ جنرل پرویز مشرف اپنے موقف میں تنہا ہیں اور ان کے ساتھ ایک محدود ٹولہ ہے جب کہ پوری قوم ان کے اس موقف کے خلاف ہے۔ اس پر کہا گیا کہ دینی جماعتوں کو تو پارلیمنٹ میں کبھی ایسی نمائندگی حاصل نہیں رہی کہ وہ پوری قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکیں، اس لیے یہ کہنا کہ قوم ان کے ساتھ ہے، مشکل بات ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس مسئلہ کا حل مشکل نہیں ہے اور میری تجویز یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ قوم کا اجتماعی موقف کیا ہے، یا تو معطل پارلیمنٹ کا صرف اس مسئلہ پر دو گھنٹے کا اجلاس طلب کر لیا جائے اور اس سے استفسار کیا جائے کہ موجودہ حالات میں جنرل پرویز مشرف اور دینی جماعتوں میں سے کس کا موقف درست ہے اور قومی جذبات سے مطابقت رکھتا ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر عوامی ریفرنڈم کرا لیا جائے، خود بخود فیصلہ ہو جائے گا کہ قوم اس مسئلہ میں کس کے ساتھ ہے۔ میں نے ریفرنڈم کا نام لیا تو گفتگو میں شریک ایک خاتون جرنلسٹ شیری رحمٰن نے صدر ضیاء الحق مرحوم کے ریفرنڈم کا ذکر چھیڑ دیا کہ انہوں نے ریفرنڈم کرایا تھا، لیکن اس کے لیے جو الفاظ ڈیزائن کیے تھے، وہ مضحکہ خیز تھے۔ میں نے گزارش کی کہ الفاظ باہمی مشورہ سے ڈیزائن کر لیے جائیں اور عوام سے ان کے مطابق پوچھا جائے۔ آخر عوام سے پوچھیں تو سہی!

میں نے گزارش کی کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف نے جو موقف اختیار کیا ہے، وہ حالات کے جبر کا نتیجہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر حالات کا یہ جبر نہ ہوتا اور جنرل پرویز مشرف آزاد فضا میں فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تو ان کا فیصلہ یہ نہ ہوتا، البتہ انہوں نے فیصلہ کرنے میں

جلدی سے کام لیا ہے اور اپنی قوم اور بین الاقوامی مسلم برادری کو اعتماد میں لینے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہے اور اس کا اعلان کرنے کے بعد صلاح مشورے شروع کیے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور صدر پرویز مشرف فیصلہ کرنے سے قبل ملک کی دینی وسیاسی جماعتوں کو مشورہ میں شریک کر لیتے اور عالم اسلام کے راہنماؤں سے مشاورت کے ساتھ ساتھ او آئی سی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیتے تو کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آتا اور حالات اس مقام پر نہ پہنچتے جس کا آج ہم سامنا کر رہے ہیں۔

سیالکوٹ سے ایک صاحب نے فون پر سوال کیا کہ جس طرح نیٹو کے ممالک نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ان میں سے کسی ایک پر حملہ نیٹو کے سب ارکان پر حملہ متصور ہوگا، اس طرح کا کوئی معاہدہ مسلم ممالک کیوں نہیں کر لیتے؟ اس پر گفتگو میں شریک مصری صحافی عبداللہ حمودہ نے کہا کہ یہ بات نظریاتی لحاظ سے تو ٹھیک ہے، مگر عملاً مشکل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس میں عملی مشکلات ہیں، لیکن عالم اسلام کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مسلم دنیا کو بالآخر اس نکتے پر آنا ہوگا اور مشکلات کا حل نکالتے ہوئے نیٹو کی طرز کے مسلم ممالک کی تشکیل کرنا ہوگی۔

پینل گفتگو میں ننکانہ صاحب کے ناظم رائے محمد نواز کھرل بھی شریک تھے۔ انہوں نے صدر جنرل پرویز مشرف کے موقف کی تائید کی اور کہا کہ ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے طالبان کی بھی حمایت کی اور کہا کہ مسلمان کی حیثیت سے ہمارے دل طالبان کے ساتھ ہیں اور ہم ان کے لیے دعا گو ہیں۔

پینل کے سب شرکا کا اس بات پر اتفاق تھا کہ سب کچھ کے باوجود افغانستان کی شہری آبادی پر اور متعین اہداف سے ہٹ کر امریکی اور برطانوی طیاروں کی بمباری قطعی طور پر غلط اور افسوس ناک ہے اور موجودہ صورت حال میں صحیح بات یہی ہے کہ افغانستان پر فضائی حملے فوری طور پر بند کیے جائیں اور جنگی کارروائی روک کر مذاکرات اور سیاسی ذرائع سے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۱۶ر نومبر ۲۰۰۱ء۔

وہی قاتل، وہی مخبر، وہی منصف ٹھہرے

صدر جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ دنوں ایک گفتگو میں یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ افغانستان کے حوالہ سے ان کی پالیسیوں کے مخالفین دانش اور دلیل کی بجائے جذبات کی بات کرتے ہیں۔ حیرت کی وجہ یہ ہے کہ افغانستان کی جنگ کے حالیہ راؤنڈ کے آغاز سے پہلے ہی دلیل اور دانش کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا اور اس کی جگہ طاقت اور دھونس نے لے لی تھی۔ اب جب کہ جنگ خاصی بڑھ چکی ہے اور ایک نئے دور میں داخل ہونے والی ہے، جنرل پرویز مشرف کو دلیل اور دانش کیسے یاد آ گئی ہے۔

۱۱ستمبر کے نیویارک اور پینٹا گون کے سانحات کے بعد جب امریکہ نے اس کا مجرم اسامہ بن لادن کو ٹھہرایا تو دلیل اور دانش نے امریکہ سے تقاضا کیا تھا کہ کسی کو مجرم قرار دینے سے پہلے ثبوت فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے اور ان ثبوتوں کے موثر ہونے کا فیصلہ بھی خود مدعی کے بجائے کوئی غیر جانب دار فورم کیا کرتا ہے، لیکن دلیل اور دانش کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا گیا کہ ہم یہ بہتر سمجھتے ہیں، ا اس لیے تم خاموش رہو۔

امریکہ نے طالبان حکومت سے اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا تو طالبان نے دلیل اور دانش کی بات ہی کی تھی کہ ثبوت فراہم کیے جائیں اور فریقین کے لیے قابل قبول ٹریبونل تشکیل دیا جائے تو وہ اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں، مگر طالبان کی بات یہ کہہ کر مسترد کر دی گئی کہ چونکہ ہم طاقت رکھتے ہیں اور بالا دست ہیں، اس لیے ہم خود ہی مدعی، خود ہی گواہ

اور خود ہی جج ہیں۔ تم ایک غریب اور بے بس قوم ہو، تمہارے سامنے کوئی ثبوت پیش کرنا اور تمہارے کسی مطالبے پر توجہ دینا ہمارے سٹیٹس کے منافی بات ہے۔

امریکہ نے جب اقوام متحدہ کے سامنے اپنا کیس رکھا اور اس سے ''دہشت گردی'' کے خلاف کارروائی کے لیے این او سی مانگا تو دلیل اور دانش نے ڈرتے ڈرتے وہاں بھی عرض کیا تھا کہ ''دہشت گردی'' کی تعریف طے کر لی جائے اور اس کی حدود متعین کر لی جائیں تاکہ دہشت گردی کے خلاف کارروائی کی زد میں مظلوم اور مجبور اقوام نہ آ جائیں جو اپنی آزادی اور تشخص کے لیے قابض اور مسلط قوموں کے خلاف صف آرا ہیں، مگر دلیل اور دانش کی آنکھوں پر یہ کہہ کر پٹی باندھ دی گئی کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ ابھی امریکہ کو اپنے ایجنڈے کی تکمیل کرنی ہے، جب وہ ایجنڈا کسی فیصلہ کن اسٹیج پر پہنچ جائے گا تو دہشت گردی کی تعریف متعین کرنے کی درخواست پر بھی غور کر لیا جائے گا۔

امریکہ نے افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کر کے پوری دنیا کو وارننگ دی کہ جو اس جنگ میں عملی طور پر ہمارا ساتھ نہ دے گا اور دہشت گردی کے خلاف ہمارے اتحاد کا سرگرم رکن نہیں بنے گا، اسے دشمن تصور کیا جائے گا۔ دلیل اور دانش نے اس وقت بھی اپنا فرض ادا کیا تھا کہ جنگ میں کسی ایک طرف فریق بننے کی بجائے ایک راستہ غیر جانبداری کا بھی ہوتا ہے جو ہر شخص اور قوم کا حق سمجھا جاتا ہے، اس سے ملکوں اور قوموں کو محروم کر دینا دانش مندی کی بات نہیں ہے مگر دلیل اور دانش کے لبوں پر یہ کہہ کر ٹیپ لگا دی گئی کہ ہر معاملہ میں تمہارا بولنا ضروری نہیں ہے، کبھی چپ بھی ہو جایا کرو۔

امریکہ نے پاکستان کو جنگ میں فرنٹ لائن اسٹیٹ قرار دے کر اس سے فوری طور پر جواب مانگا کہ دوٹوک طور پر فوراً یہ بات بتاؤ کہ تم کس کے ساتھ ہو؟ دلیل اور دانش نے اس وقت بھی جھرجھری سی لی تھی اور زیر لب منمنائی تھی کہ یہ قومی خود مختاری کے تصور کے خلاف بات ہے اور پاکستان سے کسی معاملہ میں آزادانہ فضا میں فیصلہ کرنے کا حق ہی سرے سے چھین لینا اقوام متحدہ کے ان اصولوں کے بھی منافی ہے جس کا ہیڈکوارٹر امریکہ کے شہر نیویارک میں ہے، مگر یہ کہنے پر دلیل اور دانش کے منہ پر الٹے ہاتھ کی ایسی زوردار چپت پڑی تھی کہ اسے دوبارہ یہ بات کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

امریکہ نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون کے سانحات میں اسامہ بن لادن کے ملوث ہونے کے شواہد پیش کیے اور برطانوی حکومت نے بڑے اہتمام سے انہیں پریس کے لیے جاری کیا تو دلیل اور دانش نے برطانوی پریس اور ممتاز برطانوی ماہرین قانون کا سہارا لے کر ان کی زبان سے کہا تھا کہ ان پیش کردہ شواہد کی بنیاد پر تو کسی کیس کو قابل سماعت قرار دینا اور مجرم پر فردِ جرم عائد کرنا ہی سرے سے مشکل ہے، اسے مجرم قرار دینا اور اس کے لیے سزا کا اعلان کرنا ان شواہد کے حوالہ سے کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ مگر دلیل اور دانش کی اس بات کا جواب یہ دیا گیا کہ ثبوت فراہم کرنا، انہیں عدالت میں پیش کرنے کے قابل بنانا اور ان پر مخالفانہ دلائل کا سامنا کرنا، یہ سب ترقی یافتہ اور امیر ملکوں کے چونچلے ہیں، غریب اور بے بس ملکوں میں ان کا کیا کام؟ ان کے لیے تو صرف ہمارا فرمان کافی ہے، اس لیے ہم نے انہیں دہشت گرد کہہ دیا ہے تو وہ دہشت گرد ہیں، دلیل اور دانش کو ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔

امریکی طیاروں نے افغانستان کے بھوکے، نہتے اور بے قصور عام شہریوں کو بمباری کا نشانہ بنانا شروع کیا تو دلیل اور دانش نے گزارش کی تھی کہ شہریوں پر بمباری کرنا اور انہیں بلا وجہ موت کے گھاٹ اتارنا عقل مندی کی بات نہیں ہے، اور اگر امریکی سراغ رساں ادارے اپنے اہداف کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تو ان کی ناکامی کی سزا عام شہریوں کو دینا کسی طرح مناسب نہیں، مگر دلیل اور دانش کو اس کے جواب میں یہ سننا پڑا کہ یہ دلیل اور دانش کا موقع نہیں بلکہ غصے اور انتقام کا محل ہے، اس لیے جب تک افغانستان کی اینٹ سے اینٹ نہیں بج جاتی، ہمارا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا اور نہ ہم دلیل اور دانش کی کوئی بات سننے اور سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

صدر جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ ۱۱/ستمبر کو پہنائی جانے والی عینک اتار کر کھلی آنکھوں کے ساتھ عالمی منظر کو دیکھیں جہاں دلیل اور دانش سراسیمگی کے عالم میں ایک طرف طاقت اور دھونس کے خوفناک جلاد کے کوڑے کے سائے میں سہمی کھڑی ہے اور ذرا قریب جا کر کانوں کو اس کے منہ کے قریب کریں تو وہ اب بے چاری ''جان کی امان پاؤں تو'' کا ورد کرنے میں مصروف ہے۔ اور پھر صدر محترم ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں کہ جب وہ خود یہ کہتے ہیں کہ طالبان نے ہماری

بات نہیں مانی، اس لیے انہیں بربادی کا سامنا کرنا پڑا اور اگر ہم امریکہ کی بات نہ مانتے تو ہمیں بھی اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تو اس واضح ''اعتراف'' کے بعد بھی دلیل اور دانش کا نام لینے کی کوئی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟*

O

* روزنامہ پاکستان، ۵ر دسمبر ۲۰۰۱ء۔

امریکہ کے ساتھ تعاون اور وزیر داخلہ کا اعتراف

وفاقی وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر نے گزشتہ دنوں دارالعلوم کورنگی کراچی میں علماے کرام سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مدد کرنا حرام ہے، لیکن مجبوری کی حالت میں حرام کھانا بھی جائز ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح معین الدین حیدر اپنی تمام تر تلخ نوائی اور دھمکیوں کے باوجود اصولی طور پر ہمارے ساتھ اس موقف میں متفق ہو گئے ہیں کہ امارت اسلامی افغانستان کے خلاف امریکہ کا ساتھ دینا مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مدد کرنا ہے۔ ہمیں ''اعتراف حقیقت'' کے اس حصہ سے اتفاق نہیں ہے کہ یہ مجبوری اس درجہ کی تھی کہ اس میں حرام کھانا بھی جائز ہو جاتا، کیونکہ شریعت نے بعض حالات میں ضرورت کی حد تک حرام کھانے کی اجازت دی ہے لیکن اسے صرف مجبوری کی بجائے ''اضطرار'' کی کیفیت کے ساتھ مشروط کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر اضطرار اس درجہ کا ہو کہ فی الواقع ہلاکت کا خطرہ ہو اور دوسرا کوئی متبادل نہ ہو تو حرام کھانے کی اجازت ہے اور حرام بھی صرف اس قدر کہ اس سے جان بچ جائے، اس سے زیادہ اس حالت میں بھی حرام کھانے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں مزید کچھ عرض کرنے سے قبل ایک واقعہ کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ ۷۰ء کے انتخابات اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد جب باقی ماندہ پاکستان میں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اقتدار سنبھالا اور صوبہ سرحد میں نیپ کے تعاون سے مولانا مفتی محمود وزارت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تو انہوں نے وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھاتے ہوئے سب سے

پہلے صوبہ سرحد میں شراب کی تیاری، فروخت اور استعمال پر مکمل پابندی کا اعلان کیا۔ اس پر وفاقی حکومت نے صوبہ سرحد کی حکومت کو لکھا کہ شراب کی مد میں صوبائی حکومت کو لاکھوں روپے کا جو ٹیکس وصول ہوتا ہے، وہ ختم ہو جائے گا جس سے بجٹ میں خسارہ ہوگا اور وفاقی حکومت اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے کوئی تعاون نہیں کرے گی۔ اس کا جواب مفتی صاحب نے یہ دیا کہ ٹھیک ہے، ہم اپنے اخراجات میں کمی کر کے خسارہ پورا کر لیں گے اور اس مد میں وفاق سے کچھ نہیں مانگیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد وفاقی حکومت کا دوسرا خط انہیں موصول ہوا کہ صوبہ سرحد میں غیر مسلم بھی رہتے ہیں جن پر شراب کی پابندی کھلوانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ شراب کے حرام ہونے کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں ہوتا اور اگر غیر مسلم شراب پئیں گے تو ان پر ہمارا قانون لاگو نہیں ہوگا، لیکن انہیں شراب مہیا کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے، اس لیے صوبائی حکومت اس طرح کی دکانیں نہیں کھلوا سکتی۔ تھوڑا عرصہ گزرا تو وفاقی حکومت نے تیسرا خط بھجوا دیا کہ شراب بعض بیماریوں میں علاج کے طور پر استعمال ہوتی ہے، اس لیے اس قسم کی بیماریوں کے لیے شراب کی کچھ دکانیں کھلوانا ضروری ہے۔ اس پر مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد کے ہیلتھ سیکرٹری کی سربراہی میں ایک میڈیکل بورڈ بنا دیا اور اسے یہ کہا کہ ایسی بیماریوں کی نشان دہی کرو جو مہلک ہوں اور شراب کے علاوہ ان کا اور کوئی متبادل علاج نہ ہو۔ میڈیکل بورڈ نے بہت تلاش کیا مگر ایسی کوئی بیماری نہ ملی، مگر اس کی حتمی رپورٹ کی تیاری ابھی جاری تھی کہ صوبہ بلوچستان میں مینگل حکومت کی بلاجواز برطرفی کے خلاف احتجاج کے طور پر مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا، ورنہ یہ گفتگو خدا جانے اور کس کس انداز میں آگے بڑھتی۔

اس لیے یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا حکومت پاکستان کی مجبوری فی الواقع اس درجہ کی تھی کہ اسے شرعی اضطرار قرار دے کر اتنے بڑے حرام کے ارتکاب کا جواز فراہم کر دیا جائے جو افغانستان میں پاکستان کی دوست حکومت کے خاتمہ، افغان عوام پر وحشیانہ بمباری اور کابل پر پاکستان دشمن شمالی اتحاد کے تسلط کی راہ ہموار کرنے کے امریکی اقدامات کے ساتھ تعاون بلکہ ان میں عملاً شرکت کی صورت میں سامنے آ چکا ہے۔ ہمارے خیال میں معاملہ ایسا نہیں تھا اور مجبوری کو جس درجہ میں

حکومت پاکستان نے خود پر مسلط کر لیا تھا، اس سطح کی مجبوری نہیں تھی، کیونکہ اگر ۱۱ستمبر کے واقعات کے بعد جنرل پرویز مشرف شخصی طور پر امریکی دباؤ کا شکار نہ ہوتے اور اس طور پر خود ہی حتمی فیصلہ کرنے کی بجائے حالات کا بروقت اندازہ کرتے ہوئے قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہی خواہوں اور دوستوں سے رابطہ ومشاورت کا اہتمام کر لیتے تو امریکی دباؤ کے آگے سیاسی یا اخلاقی رکاوٹ کھڑی کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آتا، مگر یہاں عملاً یہ ہوا کہ شخص واحد نے خود کو ''عقل کل'' سمجھتے ہوئے فیصلہ صادر کر دیا اور پوری قوم سے یہ تقاضا کیا گیا کہ چونکہ ہم نے فیصلہ کر دیا ہے، اس لیے سب کو ہمارے پیچھے ہر حال میں چلنا ہوگا۔

اس تاریخی لمحہ پر ہم سے جو تاریخی غلطی سرزد ہوئی ہے، اس کے نتائج وعواقب سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں اور جوں جوں امریکی بمباری کی دھول بیٹھے گی اور مستقبل کا منظر مزید واضح نظر آنا شروع ہوگا، ہمارے وزیر داخلہ محترم پر اس ''حرام کام'' کے مزید اسرار ورموز بھی ان شاء اللہ کھلتے چلے جائیں گے، مگر سردست ہم جناب معین الدین حیدر سے ان کے اس ارشادِ گرامی کے حوالے سے دو سوال کرنا چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ درست ہے کہ اضطرار کی حالت میں زندگی بچانے کے لیے ضرورت کی حد تک حرام کھانے کی واقعی شریعت نے اجازت دی ہے، تو کیا افغانستان میں ان کی یہ ضرورت اب تک پوری ہوگئی ہے یا ابھی اور شہروں کی تباہی اور لوگوں کی لاشوں کی ضرورت ابھی باقی ہے یا دوسرے لفظوں میں ہمارے حکمرانوں کو اپنی جانیں بچانے کے لیے اور کتنے افغانوں کا خون درکار ہے؟ اور دوسرا سوال یہ کہ جب وہ خود اس کو حرام کہہ رہے ہیں اور مجبوری کے درجہ میں اس حرام کے استعمال کا اعتراف کر رہے ہیں تو اس عمل کے ساتھ دانش، حکمت اور تدبر کا جوڑ لگا کر ان مقدس الفاظ کی معنویت کو دھندلانے میں آخر کون سی دانش پنہاں ہے؟*

O

---

* روزنامہ اوصاف، ۱۷دسمبر ۲۰۰۱ء۔

پاک فوج صومالیہ کے بعد اب عراق میں

عراق میں پاکستانی فوج بھیجنے کے حوالے سے اخبارات میں بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور جوں جوں عراق میں امریکی فوجیوں پر حملوں اوران کی لاشوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، وہاں پاکستانی فوج بھیجنے کی ضرورت واہمیت بڑھتی جارہی ہے اور ہمارے حکمرانوں کے انداز سے لگتا ہے کہ صومالیہ کی طرح عراق میں بھی امریکی فوجیوں کی ڈھال کے طور پر پاک فوج کے جوانوں کو تعینات کرنے کا اصولی فیصلہ ہو چکا ہے اوراب صرف تفصیلات طے ہونے کا انتظار ہے۔ جہاں تک ملک کی سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لینے کا تعلق ہے، افغانستان کی طرح عراق کے بارے میں بھی کسی روز ان کے لیڈروں کو بلا کر یہ بتا دیا جائے گا کہ یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈر تھوڑا بہت رسمی احتجاج کرنے کے بعد باہر آ کر پریس کانفرنس کریں گے، ایک دو روز اخبارات میں ان کے بیانات چھپیں گے اور اس کے بعد اللہ اللہ خیر صلا، زندگی کی گاڑی حسب معمول رواں دواں ہو جائے گی۔ البتہ گزشتہ دنوں ایک قومی اخبار میں یورپی دفاعی ذرائع کے حوالہ سے یہ رپورٹ شائع ہوئی ہے کہ اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی اور خلیجی تعاون کونسل نے مسلمان ممالک کی جانب سے عراق میں فوج بھیجنے کے معاملے پر تحفظات کا اظہار کیا ہے جبکہ واشنگٹن اور لندن پاکستان کے اس سوال کا تسلی بخش جواب دینے میں ناکام رہے ہیں کہ عراق میں پاکستانی فوج کے اخراجات کون برداشت کرے گا جو دو بریگیڈ فوج بھیجنے کی صورت میں ہتھیاروں اور گولہ بارود کے علاوہ تقریباً ۹ کروڑ روپے ماہانہ تک ہو سکتے ہیں۔ ادھر فرانس نے امریکہ کی یہ تجویز مسترد کر دی ہے کہ جن ممالک

نے عراق پر امریکی حملے کی مخالفت کی ہے، وہ عراق میں حالات کو بہتر بنانے کے لیے فوج بھیجیں۔ فرانسیسی وزیر خارجہ نے واضح کر دیا ہے کہ چونکہ عراق کے خلاف فوجی کارروائی اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر کی گئی ہے، اس لیے وہاں فوج نہیں بھیجی جا سکتی۔ اسی نوعیت کی بات او آئی سی کی طرف سے بھی سامنے آئی ہے اور بعض مسلم ممالک نے کہا ہے کہ اگر مسلمان ممالک کی فوج عراق میں بھیجی جائے تو اسے امریکا یا برطانیہ کی کمان میں کام کرنے کی بجائے اقوام متحدہ کی کمان کے تحت ہونا چاہیے۔ لیکن اس سب کچھ سے قطع نظر ہمارے قومی ذرائع ابلاغ اور آزاد خیال دانش ور مسلسل اس مہم میں مصروف ہیں کہ اگر عراق میں تھوڑی سی فوج بھیج کر ہمیں امریکا کو خوش کرنے اور چار پیسے کمانے کا موقع مل رہا ہے تو اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے اور جس قدر جلد ممکن ہو، عراق میں فوج بھیجنے کے انتظامات کرنے چاہییں۔

عراق میں جا کر ہماری فوج کیا کرے گی؟ صومالیہ کے تجربہ کے بعد اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارے فوجی جوان جنہیں ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کے ماٹو کے تحت جنگی تربیت دی گئی ہے، امریکی فوج کا ہراول دستہ ہوں گے اور امریکیوں کو بچانے کے لیے ان عراقی حریت پسندوں کے خلاف لڑیں گے جنہوں نے اپنے ملک پر امریکا اور برطانیہ کے جارحانہ قبضے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے آزادی کی جنگ شروع کر رکھی ہے۔ ہم اس سے قبل بھی اس تجربے سے گزر چکے ہیں اور اب سے پون صدی قبل جب عرب ممالک کو ترکی کی خلافت عثمانیہ سے ''آزاد'' کرانے کے لیے برطانیہ کو فوجی جوانوں کی ضرورت تھی تو ہم نے ہی برطانوی فوج کو وسیع پیمانے پر بھرتی دے کر مشرق وسطیٰ روانہ کیا تھا۔ اس وقت بھی علمائے کرام اور قوم پرست سیاستدانوں نے انگریزی فوج میں بھرتی کی مخالفت کی تھی اور پانچ سو سرکردہ علمائے کرام کا وہ تاریخی فتویٰ اس موقع پر سامنے آیا تھا کہ انگریزی فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے۔ اس فتویٰ کی پاداش میں خالق دینا ہال کراچی کا بغاوت کیس اور مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور دیگر رہنماؤں کی گرفتاریوں اور سزاؤں کے مراحل بھی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں، لیکن اس فتویٰ کی پروا کیے بغیر برطانوی فوج کو بھرتی دی گئی۔

فتویٰ دینے والوں کا موقف یہ تھا کہ یہ فوج مسلمان کے خلاف استعمال ہوگی، خلافت کے خلاف استعمال ہوگی اور مقامات مقدسہ کے خلاف استعمال ہوگی، اس لیے مسلمانوں کو دینی حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس میں بھرتی نہیں ہونا چاہیے، لیکن اس وقت بھی یہ کہا گیا کہ یہ سرکار کو خوش کرنے اور چار پیسے کمانے کا موقع ہے اور جب بھی ایسا کوئی موقع آتا ہے، مولوی خواہ مخواہ درمیان میں ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ چنانچہ مولوی کی ٹانگ جھٹک دی گئی اور ہمارے ہزاروں بھائی برطانوی فوج میں بھرتی ہو کر اسی عراق، شام اور حجاز میں ترکوں کے خلاف لڑے اور مشرق وسطیٰ میں برطانوی اقتدار کو مستحکم کرنے اور خلافت عثمانیہ کا بوریا بستر سمیٹنے میں انہوں نے ہراول دستہ کا کردار ادا کیا۔

کوئی پرانی عمر کا ریٹائرڈ فوجی جو اس دور میں مشرق وسطیٰ کے کسی ملک میں فوجی خدمات کے لیے گیا ہو، آپ کے علاقے میں ہو تو آپ اس سے خود پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کس شہر میں گیا تھا اور کس کے خلاف اس نے جنگ لڑی تھی۔ اسی عراق پر اس زمانے میں برطانیہ نے تسلط جمایا تھا اور ہمارے بازو استعمال ہوئے تھے اور آج امریکا اور برطانیہ دوبارہ اس پر قابض ہوئے ہیں تو اپنے قبضہ کو برقرار رکھنے کے لیے وہ پھر ہمارے بازوؤں کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، اس لیے جہاں تک ارباب حل وعقد کا تعلق ہے، ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ یہ سب کچھ کر گزریں گے۔ ان کے لیے یہ مسئلہ مشکل نہیں ہے۔ وہ اس کے عادی ہیں اور ان کی تربیت ہی اس انداز میں ہوئی ہے کہ وہ ایسے مراحل سے آسانی سے گزر جاتے ہیں حتیٰ کہ ہماری تاریخ تو یہ ہے کہ مرحوم آغا شورش کاشمیری نے ایک بار ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور میں ان تعویذوں کی داستان شائع کی تھی جو اس دور میں مشرق وسطیٰ جانے والے سپاہیوں کو اس مقصد کے لیے دیے گئے تھے کہ اگر انہیں برطانوی فوج کے حکم پر سرکار کی وفاداری میں خانہ کعبہ اور بغداد میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار پر گولی چلانا پڑی تو ان تعویزوں کی برکت سے وہ اس کے منفی اثرات سے محفوظ رہیں گے۔

باقی رہی بات عراق کے عوام اور عراقی قوم کی تو نہ صرف ہمارے لیے بلکہ دنیا بھر کے حریت پسندوں کے لیے یہ بات قابل اطمینان ہے کہ افغانوں کی طرح عراقیوں نے بھی امریکی جارحیت کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی آزادی سے دست برداری اختیار نہیں کی۔ ننگی طاقت کے سامنے وقتی

طور پر بے بس ہو جانا اور چیز ہے اور حملہ آور کی جارحیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی آزادی اور خود مختاری سے دست بردار ہو جانا اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ زندہ قومیں میدان میں شکست کھا لیا کرتی ہیں، لیکن آزادی اور خود مختاری کے حق سے دست برداری قبول نہیں کیا کرتیں۔ خود ہمارے ہاں سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی شکست و شہادت کے بعد یہ بات تقریباً طے تھی کہ اب برصغیر میں کافی مدت تک انگریزوں کی حکومت رہے گی، لیکن اس کے باوجود ہمارے بزرگوں نے دست برداری قبول نہیں کی تھی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے انگریزی اقتدار کو مسترد کرتے ہوئے مزاحمت جاری رکھنے کا دوٹوک اعلان کیا تھا جو ڈیڑھ سو سال کی طویل جنگ آزادی کی بنیاد بنا اور بالآخر برطانیہ کو اس خطہ سے دست بردار ہو کر واپس جانا پڑا۔

ہمیں معلوم ہے کہ آزادی اور حریت کا یہ راستہ بہت کٹھن ہے اور اس میں دو چار نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ''سخت مقام'' آتے ہیں لیکن اپنے عزم اور ہدف پر قائم رہنے والی قومیں اپنے عزم اور حوصلہ کی بدولت بالآخر آزادی کی اس جنگ میں جلد یا بدیر ضرور کامیاب ہوں گی اور آزادی کی منزل سے ہم کنار ہو کر رہیں گی۔ البتہ ان کے خلاف جارح حملہ آوروں اور غاصبوں کا دست و بازو بننے والوں کو ضرور یہ سوچ لینا چاہیے کہ تاریخ میں ان کا مقام کیا ہوگا اور آنے والی نسلیں انہیں کن الفاظ سے یاد کیا کریں گی۔*

O

* روزنامہ اسلام، ۱۴؍ جولائی ۲۰۰۳ء۔

دینی قیادت کی آواز بھی سنی جائے!

۳۰ / مارچ ۲۰۰۳ء کو مجلس احرار اسلام پاکستان کے مرکزی دفتر لاہور میں ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے شہدا کی یاد میں پیر جی سید عطاء المہیمن شاہ بخاری کی زیر صدارت منعقد ہونے والی ایک تقریب میں کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سے چند اہم معروضات قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

آج ہم ان عظیم شہدائے ختم نبوت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہیں جنھوں نے ۱۹۵۳ء میں عقیدۂ ختم نبوت اور ناموس رسالت کے تحفظ کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور قادیانیت کے بڑھتے ہوئے قدموں کو بریک لگا دی۔ اس تحریک میں، جس کی قیادت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسنات قادریؒ اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ جیسے عظیم بزرگوں کے ہاتھوں میں تھی، دینی جماعتوں کے دو بڑے مطالبات تھے: ایک یہ کہ قادیانیوں کو ملک میں دستوری حوالہ سے غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور دوسرا یہ کہ قادیانی لیڈر چودھری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے برطرف کیا جائے جو قیام پاکستان کے بعد سے ملک کے وزیر خارجہ چلے آرہے تھے اور جن کی وجہ سے نہ صرف ملک کے اندر سرکاری طور پر قادیانیوں کا اثر ورسوخ بڑھ رہا تھا بلکہ بیرون ملک بھی پاکستان کے سفارت خانے قادیانیت کی تبلیغ اور اثر ونفوذ کے اڈے بنتے جارہے تھے۔ ملک کی دینی جماعتوں نے چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی کا مطالبہ کیا لیکن ان کا مطالبہ منظور کرنے کی بجائے تحریک کے راہنماؤں اور کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا جس

کے نتیجے میں ہزاروں افراد شہید ہوئے اور ہزاروں علمائے کرام اور دینی کارکن جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیے گئے۔

میں اس حوالے سے ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آج جس خارجہ پالیسی نے پوری قوم کو بند گلی میں دھکیل دیا ہے اور امریکی غلامی کے ریموٹ کنٹرول شکنجے نے اسے اس بری طرح جکڑ رکھا ہے کہ ہم بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئے ہیں، یہ خارجہ پالیسی چودھری ظفر اللہ خان کی تشکیل کردہ ہے۔ اس قادیانی وزیر خارجہ نے پاکستان کو امریکا نواز پالیسی کی پٹڑی پر چڑھایا اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک پانچ چھ سال کے عرصہ میں ملک کو امریکی مفادات کے چنگل میں اس قدر پھنسایا کہ ہم آج تک اس میں مزید آگے کی طرف دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں پیچھے ہٹنے بلکہ دائیں بائیں دیکھنے کا بھی کوئی راستہ کھائی نہیں دے رہا۔ یہ سارا کرشمہ چودھری ظفر اللہ خان کا ہے اور اس کی بوئی ہوئی فصل آج پوری قوم کو کاٹنی پڑ رہی ہے۔ دینی حلقوں نے تو پاکستان کے بننے کے بعد سے اس پر واویلا مچانا شروع کر دیا تھا لیکن اس طرف کسی نے توجہ نہ دی اور آج اس کا خمیازہ پوری قوم بھگت رہی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ قومی وملی معاملات میں دینی قیادت کے موقف کو نظر انداز کیا ہے اور ہر بار اس کی سزا بھگتی ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے طرز عمل میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آ رہی۔

آج سے ایک صدی قبل جب خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے لیے عرب ممالک میں عرب قومیت کے نام پر اور ترکی میں ترک نیشنلزم کے نام پر جذبات کو ابھارا جا رہا تھا اور خلافت کو بے فائدہ قرار دے کر اس کو ختم کرنے کی سازش کی جا رہی تھی، ہماری دینی قیادت نے اس وقت بھی شور مچایا تھا کہ خلافت کے خاتمہ کی یہ تحریک یہودیوں کی سازش ہے۔ عرب علما نے آواز اٹھائی، ہمارے ہاں جنوبی ایشیا کے طول وعرض میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں زبردست عوامی تحریک خلافت بپا ہوئی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ خلافت کا تحفظ کیا جائے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کے اس ادارے کو بچایا جائے، لیکن نہ ترکوں نے بات سنی اور نہ ہی عربوں نے اس آواز پر توجہ دی، حتیٰ کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کو تو شریف مکہ نے اسی جرم میں گرفتار کر کے

انگریزوں کے حوالے کیا تھا کہ انہوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت کے جواز کے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس موقع پر جنوبی ایشیا کی دینی قیادت نے ایک اور آواز بھی اٹھائی کہ یہاں کے مسلمان برطانیہ کی فوج میں بھرتی نہ ہوں۔ متحدہ ہندوستان کے سینکڑوں علما نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ برطانیہ کی فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے، اس لیے کہ یہ فوج اسلام کے خلاف استعمال ہوگی، مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوگی اور خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے لیے استعمال ہوگی، مگر اس فتویٰ پر کسی نے کان نہ دھرے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ انگریز کی فوج میں بھرتی ہوئے اور پھر یہی فوجی مشرق وسطیٰ لے جائے گئے اور انہی کے ہاتھوں ترک فوجیوں کو شکست دلوا کر خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی راہ ہموار کی گئی۔ اگر آج خلافت کا فورم موجود ہوتا، خواہ کتنی ہی کمزور اور ڈھیلی ڈھالی خلافت ہوتی مگر عالمی سطح پر اپنی بات کہنے کا کوئی فورم تو ہوتا اور یقیناً حالات اس مقام تک نہ پہنچتے جن کا ہم اب سامنا کر رہے ہیں۔ ہم تو اس دور سے کہہ رہے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہے لیکن آج اسرائیلی وزیر دفاع موفاذ نے کھلے بندوں یہ بات کہہ کر ہمارے موقف کی تصدیق کر دی ہے کہ ہمیں عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید دوم نے فلسطین میں آباد ہونے کے لیے انکار کر دیا تھا، اس کے نتیجے میں ہم نے نہ صرف اس کی حکومت ختم کرا دی بلکہ سرے سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کرا دیا۔ جنرل موفاذ نے ایک بات اور بھی کہی ہے کہ عراق پر اب ہمارا قبضہ ہوگا اور اسرائیل کے عزائم میں جو بھی رکاوٹ بنے گا، اس کا یہی حشر ہوگا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسرائیل کے عزائم کیا ہیں اور یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عرق پر امریکا اور برطانیہ کا حملہ دراصل اسرائیل کی توسیع اور عظیم تر اسرائیل کے قیام کے منصوبے کا حصہ ہے جس میں عراق، مصر، شام، لبنان اور دیگر علاقوں کے علاوہ مدینہ منورہ سمیت سعودی عرب کا بھی ایک بڑا علاقہ شامل ہے۔

ہماری دینی قیادت نے اس وقت بھی واویلا کیا تھا جب خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کر کے اپنا گورنر بٹھا دیا تھا اور دنیا بھر کے یہودیوں کو یہ حق دے دیا تھا کہ وہ فلسطین میں آ کر آباد ہو سکتے ہیں اور زمین خرید کر کالونیاں بنا سکتے ہیں۔ اس وقت سرکردہ عرب علما

نے فتویٰ دیا تھا کہ یہودی چونکہ فلسطین میں آباد ہو کر اسرائیل قائم کرنا چاہتے ہیں اور بیت المقدس پر قبضہ بھی ان کے پروگرام میں شامل ہے، اس لیے فلسطین میں یہودیوں کو زمین کا بیچنا شرعاً جائز نہیں۔ یہ فتویٰ ہمارے بزرگوں نے بھی جاری کیا۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فتاویٰ موجود ہیں اور حضرت تھانویؒ کا تفصیلی فتویٰ ان کی کتاب ''بوادر النوادر'' میں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن کسی نے اس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور فلسطینی اپنی زمینوں کو ڈیڑھ گنا اور دو گنا قیمت کے لالچ میں یہودیوں کو فروخت کرتے چلے گئے جس کا نتیجہ آج سب کے سامنے ہے کہ جن یہودیوں کا آج سے ایک صدی قبل شاید ایک گھرانہ بھی نہ تھا، آج وہ نہ صرف وہاں قابض ہیں بلکہ پوری عرب دنیا کے لیے عذاب بنے ہوئے ہیں۔ حالیہ عالمی بحران کے آغاز میں بھی ہماری دینی قیادت نے امت کی بروقت رہنمائی کی کہ امریکی خواہشات اور عزائم کے سامنے گردن جھکانے اور ہاں میں ہاں ملاتے چلے جانے کی بجائے جرات و حوصلہ کے ساتھ اس کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے، لیکن ہماری بات پر بروقت توجہ نہیں دی گئی اور آج وہی بات سارے کہہ رہے ہیں۔

میں اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی سربراہ کانفرنس (او آئی سی) نے آج جو موقف اختیار کیا ہے کہ عراق کی سرحدوں، ملکی سالمیت اور قومی وحدت کا تحفظ ضروری ہے اور اس کے خلاف کسی اقدام کی حمایت نہیں کی جائے گی، یہ موقف آج سے ڈیڑھ سال قبل افغانستان پر امریکا کے حملہ سے پہلے اختیار کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ افغانستان کی قومی وحدت اور سرحدوں کے تقاضے بھی اس نوعیت کے تھے، لیکن ہم نے اس وقت جائز موقف اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح ہمارے عرب بھائیوں نے بھی یہ سوال کھڑا کر دیا کہ کسی عرب ملک پر حملہ نہ کیا جائے، لیکن آج صرف ایک سال کے بعد ایک عرب ملک پر نہ صرف حملہ ہو گیا بلکہ اس کے ساتھ کئی عرب ممالک کی سرحدات اور قومی سلامتی بھی خطرے سے دوچار ہو گئی ہے۔ ہمارے خیال میں او آئی سی اور عرب لیگ نے آج جو موقف اختیار کیا ہے اور جو سٹینڈ لیا ہے، اس کا صحیح وقت افغانستان پر امریکا کی یلغار سے قبل تھا۔ اب بھی غنیمت ہے کہ ہمارے مسلم اور عرب حکمرانوں نے کسی جگہ کھڑے ہونے کی

ضرورت تو محسوس کی، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ موقف اگر افغانستان پر امریکہ کے حملہ سے پہلے اختیار کر لیا جاتا اور مسلم حکمران اس پر سنجیدگی سے کھڑے ہو جاتے تو نہ صرف افغانستان تباہی سے بچ سکتا تھا بلکہ عراق اور اس کے ساتھ دیگر کئی عرب ممالک کی تباہی کو بھی ٹالا جا سکتا تھا۔

بہرحال میری معروضات کا مقصد یہ ہے کہ ہماری دینی قیادت نے ہر دور میں اور ہر مسئلہ پر امت کو حالات کی سنگینی سے خبردار کیا ہے اور صحیح موقف کی طرف راہنمائی کی ہے، لیکن ہم نے قومی اور ملکی سطح پر کبھی اس بات پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی اور ہر بار اس کی سزا بھگتی ہے۔ آج بھی حالات کا تقاضا ہے کہ پاکستان اور عالم اسلام کے حالیہ بحران اور ملکی مسائل کے حوالہ سے دینی قیادت کی آواز کو سنا جائے اور اسے سنجیدہ توجہ دی جائے کیونکہ ملی حمیت اور دینی غیرت کا تقاضا یہی ہے اور مشکلات ومصائب کی دلدل سے نکلنے کا راستہ بھی صرف یہی ہے۔*

O

* روزنامہ اسلام، ۳۰ر اپریل ۲۰۰۳ء۔

امریکی مفادات اور اسلام آباد کی کمٹمنٹ

''آن لائن'' کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس نے اپنی حالیہ رپورٹ میں امریکی مفادات کے حوالے سے اسلام آباد کی کمٹمنٹ کو بعض معاملات پر مشکوک قرار دیا اور اس پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ نائن الیون کے بعد انسداد دہشت گردی کی کوششوں میں پاکستان امریکہ کا اہم اتحادی بنا، تاہم بعض اہم امریکی مفادات کے بارے میں اسلام آباد کی کمٹمنٹ کے بارے میں کچھ شکوک موجود ہیں۔ رپورٹ میں مستحکم پاکستان کو براعظم ایشیا میں امریکہ کے مفاد میں بتایا گیا ہے، مگر دہشت گردی، افغان تعلقات، ہتھیاروں کا پھیلاؤ، مسئلہ کشمیر، پاک بھارت کشیدگی، انسانی حقوق کے تحفظ اور اقتصادی ترقی پر رپورٹ میں تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ امریکی ریسرچ سروس کا کہنا ہے کہ پاکستان میں بڑے پیمانے پر امریکہ مخالف جذبات موجود ہیں جو صرف اسلامی گروپوں تک محدود نہیں ہیں۔ رپورٹ میں پاکستان کی سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی ۲۶ جنوری ۲۰۰۶ء کی پریس کانفرنس کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ فوجی حکومت ملک میں سیکولر جمہوری قوتوں کو سائیڈ لائن کر رہی ہے اور اس اقدام سے پیدا ہونے والے خلا کو انتہا پسند پُر کر رہے ہیں۔

امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس کی رپورٹ کے اس خلاصے کو سامنے رکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ نائن الیون کے بعد پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے اپنی پالیسیوں کے حوالے سے جو یوٹرن لیا تھا، اس سے امریکی حکمران مطمئن نہیں ہیں اور ان کا خیال ہے کہ

پاکستان کو اپنا اتحادی قرار دیتے وقت ان کے ذہنوں میں جو ایجنڈا تھا، وہ پوری طرح آگے نہیں بڑھا اور بعض معاملات میں امریکی مفادات کے ساتھ کمٹمنٹ کے حوالے سے شکوک وشبہات کی فضا ابھی تک موجود ہے۔

سب سے پہلے تو امریکی مفادات کے ساتھ اسلام آباد کی کمٹمنٹ کا تصور ہی توجہ طلب ہے کہ اسلام آباد بہرحال ایک آزاد اور خودمختار ملک کا دارالحکومت ہے جو عالمی اور علاقائی سطح پر اپنے مسائل اور اپنی ترجیحات رکھتا ہے۔ اس کا ایک نظریاتی اور تہذیبی تشخص ہے اور بین الاقوامی تعلقات اور معاملات میں خود اس کے اپنے مفادات کی فہرست موجود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حکومت ہونے کے ناطے اسلام آباد کی کمٹمنٹ اپنے نظریے، تہذیب، مفادات، خودمختاری، اور ترقی واستحکام کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے۔ یہ ''کمٹمنٹ'' کے درجہ کا تعلق ایک آزاد ملک کے دارالحکومت کا کسی اور ملک کے ساتھ عجیب سا لگتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ اور اصطلاحات کے معنی بدل گئے ہیں اور نوآبادی کی جگہ ''اتحادی'' اور غلامی اور وفاداری کی جگہ ''کمٹمنٹ'' نے لے لی ہے۔ امریکہ نے نائن الیون کے بعد، بلکہ اس سے بھی پہلے سوویت یونین کے بکھرنے پر واحد عالمی طاقت کے دعوے کے ساتھ جس ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا اعلان کیا تھا، اس کا اصل مقصد ''واحد عالمی حکومت'' تھا۔ امریکہ تب سے عالمی طاقت کے طور پر نہیں بلکہ عالمی حکومت کے طور پر کردار کو آگے بڑھا رہا ہے اور اسی وجہ سے اسے مختلف دارالحکومتوں سے یہ شکایت پیدا ہو رہی ہیں کہ وہ اس کے مفادات کا پوری طرح تحفظ نہیں کر رہے اور بعض معاملات میں ان کی کمٹمنٹ مشکوک ہوتی جا رہی ہے۔

بات صرف اسلام آباد تک محدود نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے دارالحکومت بھی شکوک وشبہات کی اسی دھند کا شکار ہیں۔ اسلام آباد کی حالت اس حوالے سے سب سے زیادہ قابل رحم ہے کہ ''اسلام'' اس کے نام کا حصہ ہے، اور وہ جس ملک کا دارالحکومت ہے، اس کے نام کا آغاز بھی ''اسلامی'' سے ہوتا ہے، اس لیے اس کے لیے امریکہ کو اپنی وفاداری کا اعتماد دلانا سب سے زیادہ مشکل بات ہے۔ پھر اس نے ''ایٹمی'' ہونے کا روگ بھی پال رکھا ہے جو آج کی عالمی حکومت اور دیگر عالمی قوتوں کے نزدیک ان کے علاوہ کسی اور کے لیے ایک ''روگ'' ہی کی حیثیت رکھتا ہے، اور جب ''ایٹم بم'' کے

روگ کے ساتھ ''اسلام'' کا لفظ بھی شامل ہو جائے تو ''اسلام آباد کا ایٹم بم'' بہت سے لوگوں کے پیٹوں میں مروڑ کا باعث بن جاتا ہے۔

اسلام آباد کی حالت اس پہلو سے بھی قابل رحم ہے کہ ایک طرف ملک کے عوام، سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں کا کہنا ہے کہ اسلام آباد نے امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ ملک کے عوام کو اسلام آباد سے شکوہ ہے کہ اس نے اپنے ملک کے عوام کے جذبات واحساسات اور ملک کے دستوری اور نظریاتی تشخص کی قربانی دیتے ہوئے افغانستان پر امریکی حملے کے لیے ''لاجسٹک سپورٹ'' مہیا کی جسے بعض زندہ دل بندوق چلانے کے لیے اپنا کندھا فراہم کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملک کی آبادی کو شکوہ ہے کہ اسلام آباد نے افغانستان کے بعد اب کشمیر کے مسئلے پر بھی یوٹرن لے لیا ہے اور اس کی نئی پالیسیوں کے باعث کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی سبوتاژ ہوتی نظر آ رہی ہے۔ ملک کے عوام کو گلہ ہے کہ اسلام آباد نے ملک میں اسلامی اقدار وروایات کے تحفظ کے لیے ذمہ داریاں پوری کرنے کی بجائے ملک کی تہذیبی پیش رفت اور کلچرل پیش قدمی کا رخ مغرب کی طرف موڑتے ہوئے ملک وقوم کے تمام ذرائع ووسائل اس کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ ملک کے دینی حلقے شکایت کر رہے ہیں کہ ان کی بہترین نوجوان قوت کو سوویت یونین کے خلاف امریکہ کے مفاد میں استعمال کر لینے کے بعد اسلام آباد اس قوت کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے امریکہ کے دست وبازو کا کردار ادا کر رہا ہے، مگر دوسری طرف امریکہ بھی اسلام آباد سے خوش نہیں ہے اور اسے یہ شکوہ ہے کہ اس نے پاکستان کو ''اتحادی'' ہونے کے صلے میں جو خدمات سونپی تھیں اور جو ایجنڈا اسلام آباد کے سپرد کیا تھا، وہ پورا نہیں ہو رہا۔ اسے جن باتوں پر تشویش ہے، ان میں دہشت گردی، پاک افغان تعلقات، ہتھیاروں کا پھیلاؤ، مسئلہ کشمیر، پاک بھارت کشیدگی، انسانی حقوق اور اقتصادی ترقی جیسے مسائل شامل ہیں۔

دہشت گردی کے خاتمے میں امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعاون کی سطح یہ ہے کہ پاکستان کی قومی خودمختاری اور بین الاقوامی سرحدوں کے احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے امریکی فضائیہ پاکستان کی سرزمین پر بمباری کرتی ہے اور اسلام آباد پوری قوم کے سراپا احتجاج ہونے کے باوجود

نیاز مندی کے ساتھ واشنگٹن کے آگے سر جھکائے کھڑا ہے۔ پاک افغان تعلقات کی صورت حال یہ ہے کہ افغانستان میں پاکستان کے حمایتی اور نیاز مند طالبان حکومت کے خاتمے میں اسلام آباد برابر کا شریک تھا۔ اس کے بعد کابل کے اسلام آباد اور دہلی کے درمیان معاملات میں جھکاؤ کا رخ ساری دنیا پر واضح ہے۔ اس کے ساتھ ہی مغربی سرحدوں پر پاک فوج کا پہلا جیسا اطمینان اور بے فکری بھی باقی نہیں رہی۔ اسلام آباد کی اتنی بڑی قربانی کے باوجود امریکہ کو پاک افغان تعلقات کے حوالے سے تشویش ہے اور اسے شک کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے اور اس معاملے میں مغرب کو مطمئن رکھنے کے لیے اسلام آباد نے پاکستان کے قومی ہیرو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو نظر بندی کی اذیت سے دوچار کر رکھا ہے اور پوری قوم اپنے ہیرو کی اس تذلیل پر بے چین اور مضطرب ہے، مگر امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس کو شبہ ہے کہ اسلام آباد اس بارے میں واشنگٹن کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ مسئلہ کشمیر اور پاک بھارت کشیدگی کے مسئلے پر اسلام آباد وہاں تک آگے جا رہا ہے جہاں کوئی پاکستانی حکومت اب تک سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آزادیٔ کشمیر کی خاطر لڑنے والوں کی بے وقعتی اور بھارت کے ساتھ اعتماد سازی کے یک طرفہ اقدامات پر پوری پاکستانی قوم سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے، مگر واشنگٹن ابھی تک مطمئن نہیں ہے۔ انسانی حقوق کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ جب تک ملک میں اسلامی اقدار کا نام لیا جاتا ہے، قرآن و سنت کے احکام کی بات کی جاتی ہے، پردہ، حیا اور شرم کی حدود کا ذکر ہوتا ہے اور مغربی ثقافت کی کسی بھی بات کو اسلامی اقدار کے منافی قرار دینے کی بات ہوتی ہے، واشنگٹن کا انسانی حقوق کا ہدف پاکستان میں پورا نہیں ہو سکتا۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس کو اس بات کا اعتراف ہے کہ پاکستان میں بڑے پیمانے پر امریکہ کے خلاف جذبات پائے جاتے ہیں اور یہ جذبات صرف اسلامی گروپوں تک محدود نہیں ہیں، اس کے باوجود امریکہ کو اصرار ہے کہ اسلام آباد اپنے ملک کے عوام کے جذبات کے احترام کی بجائے صرف امریکہ کے مفادات کے لیے کام کرے اور پاکستان کے عوام کچھ بھی رائے رکھتے ہوں، اسلام آباد امریکہ کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ پکی رکھے۔ امریکہ کے

نزدیک اسی کا نام جمہوریت ہے اور یہی اس کا انسانی حقوق کا معیار ہے۔

باقی رہی بات محترمہ بے نظیر بھٹو کی تو انہیں بہت دیر سے یاد آیا ہے کہ وہ سیکولر جمہوری قوت کی نمائندگی کر رہی ہیں اور انہیں صرف اس وجہ سے سائیڈ لائن کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ بات بھول گئی ہیں کہ اس ملک کو اسلامی جمہوریہ پاکستان قرار دینے، اسلام کو ملک کے سرکاری دین کا درجہ دینے، دستوری طور پر ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی ضمانت دینے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا سہرا اب تک ان کے والد محترم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے سر پر باندھا جاتا ہے۔ ہمیں ان کے اس اعزاز سے انکار نہیں ہے بلکہ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تدوین میں دستور ساز اسمبلی کی قیادت کرنے کے حوالے سے ہم نہ صرف بھٹو مرحوم کے اس اعزاز کو تسلیم کرتے ہیں، بلکہ ہمیں یہ بھی اعتراف ہے کہ بھٹو مرحوم نے جمعہ کی سرکاری تعطیل کا اعلان کیا تھا اور شراب اور جوئے پر پابندی کا حکم صادر کیا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اسی دستور کے تحت دو بار ملک کی وزیر اعظم رہ چکی ہیں، مگر اب نائن الیون کے بعد ان کی یادداشت نے کام کرنا شروع کیا ہے اور انہیں یاد آ رہا ہے کہ وہ کسی سیکولر جمہوری قوت کی نمائندہ ہیں۔ ہم اس موقع پر محترمہ بے نظیر بھٹو سے صرف یہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ پاکستان کو امریکی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس حد تک آگے نہیں جا سکتیں جہاں تک موجودہ حکومت جا چکی ہے۔ اس کے باوجود امریکہ اسلام آباد سے مطمئن نہیں۔ *

O

* روزنامہ پاکستان، ۲۸ر فروری ۲۰۰۶ء۔

پاکستان کی ایٹمی صلاحیت
اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا کیس

یورپ کا عالم اسلام کے خلاف معاندانہ رویہ کیوں؟

انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے سربراہ محمد البرادعی نے ''رائٹر'' سے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ایٹمی پروگرام میں مختلف ملکوں کی مدد کرنے والے انڈر ورلڈ گروہ کا سراغ لگانے اور اسے ناکارہ بنانے کے لیے اٹامک ایجنسی پاکستان کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے اور انہیں امید ہے کہ وہ چند ہفتوں تک اس قابل ہو جائیں گے کہ ایٹمی پھیلاؤ اور ٹیکنالوجی کی منتقلی میں ملوث گروہ اور اس میں شامل افراد کو سامنے لے آئیں۔ انہوں نے کہا کہ ایٹمی عدم پھیلاؤ کی کوششیں سخت دباؤ کا شکار ہیں، کیونکہ بلیک مارکیٹ نیٹ ورک ایٹمی ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی کی تجارت میں ملوث ہے اور اس وقت ایٹمی ہتھیاروں کی بلیک مارکیٹ وجود میں آ چکی ہے جو حساس ترین انٹیلی جنس نیٹ ورک کے تحت کام کر رہی ہے۔ ایک ملک اس کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور دوسرا ملک ان کی مدد سے ایٹمی ہتھیار تیار کرتا ہے اور پھر یہ ہتھیار کشتی کے ذریعے دنیا کے کسی بھی ملک میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی آخری منزل کوئی بھی جگہ ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم نے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے نئے بین الاقوامی کنٹرول سسٹم پر اتفاق نہ کیا تو ایٹمی جنگ ہم پر کسی وقت بھی تھوپی جا سکتی ہے۔

دوسری طرف پاکستان میں ایٹمی سائنس دانوں کی ڈی بریفنگ جاری ہے اور وفاقی وزیر داخلہ فیصل صالح حیات نے شب قدر میں فرنٹیئر کانسٹیبلری کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقع پر اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ سائنس دانوں کو ڈی بریفنگ مکمل ہونے تک رہا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ پاکستان کے ایٹمی سائنس دانوں کی گرفتاری اور ڈی

بریفنگ کے سلسلے میں ملک بھر میں ہونے والے احتجاج پر نظر ڈالی جائے تو اس کرب اور اضطراب کا ایک حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ایٹمی سائنس دانوں کو ڈی بریفنگ کے لیے زیرِحراست لینے پر عوام کے کم و بیش ہر طبقے میں پایا جاتا ہے۔ دینی، سیاسی اور سماجی راہنماؤں کی طرف سے احتجاجی بیانات کا سلسلہ جاری ہے اور ہر سطح پر جذبات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

بعض راہنماؤں کا کہنا ہے کہ یہ انتہائی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ہمارے حریف بھارت نے، جس کی ایٹمی قوت کے ساتھ اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے ہم نے ایٹمی دھماکہ کیا تھا، اپنے سب سے بڑے ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالکلام کو صدر جمہوریہ کے منصب پر فائز کر رکھا ہے جب کہ ہمارے سب سے بڑے ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کے دیگر رفقا زیرِحراست ہیں اور ڈی بریفنگ کا سامنا کر رہے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ سارا جال پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنے اور اسے نئی پابندیوں اور اقدامات کا نشانہ بنانے کے لیے پھیلایا گیا ہے جس کی تیاریاں ایک عرصے سے جاری تھیں اور پاکستان پر نہ صرف ایٹمی دھماکہ کرنے سے قبل اس حوالے سے شدید دباؤ تھا بلکہ اس کے بعد بھی پاکستان کا ایٹمی پروگرام مسلسل دباؤ کی زد ہے۔ بعض ممالک کو ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے حالیہ الزامات اور ان کے نتیجے میں پاکستان کے ایٹمی سائنس دانوں سے تفتیش اور ڈی بریفنگ کی یہ کارروائی بھی اسی مہم کا حصہ ہے۔

بعض دوستوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ کارروائی پاکستان اور عالمِ اسلام میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم اور اس شعبے میں نوجوانوں کے آگے بڑھنے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کا باعث بن سکتی ہے۔ اس طرح پاکستان اور عالمِ اسلام جو پہلے ہی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ معاصر اقوام سے بہت پیچھے ہیں، اس محاذ پر ان کی تھوڑی بہت نظر آنے والی پیش رفت کو بھی بریک لگ جائے گی۔ بہت سے احباب کو یہ شکوہ ہے کہ جو لوگ کل تک ہمارے محسن اور ہیرو تھے اور جنہیں تمغوں اور اعزازات سے نوازا جا رہا تھا، آج یک لخت ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے کر دیے گئے ہیں جس سے ہمارا قومی وقار مجروح ہوا ہے اور ہماری ساکھ گرتی جا رہی ہے۔ محبِّ وطن شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس بات پر بے چینی اور اضطراب سے دوچار ہے کہ ہم نے دہشت گردوں کے خلاف

جس جنگ میں عالمی برادری کا ساتھ دیا ہے اور جس میں بہت کچھ قربان کر چکے ہیں، اس کا دائرہ مسلسل پھیلتا جا رہا ہے اور خود ہمارے بہت سے حساس اور نازک معاملات اس کی لپیٹ میں آتے جا رہے ہیں جبکہ اس عمل کو بریک لگنے کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔

ہمیں ان میں سے کسی بات سے اختلاف نہیں ہے اور اس معاملے کے یہ سارے پہلو ہمیں بھی اپنے اپنے درجہ میں درست محسوس ہو رہے ہیں، مگر ہم ایک اور حوالے سے اس مسئلے کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جس بین الاقوامی قانون، ضرورت یا مصلحت کی بنیاد پر یہ سب کیا جا رہا ہے، اس کی اصولی اور اخلاقی پوزیشن کیا ہے؟ اس ساری مہم کے پیچھے اس وقت بنیادی طور پر یہ سوچ کارفرما ہے کہ ایٹمی ہتھیار دنیا کے لیے خطرہ ہیں اور نسل انسانی کے لیے تباہی کا باعث بن سکتے ہیں، اس لیے ان کا دائرۂ کار مزید نہیں پھیلنا چاہیے اور کسی ملک کو اجازت نہیں دینی چاہیے کہ اس قوت کے حصول کے لیے کوشش کرے۔ اس مقصد کے لیے بین الاقوامی قوانین کا ایک ڈھانچہ موجود ہے اور اس کے تحت عالمی ادارے بھی کام کر رہے ہیں جن کی پابندی اور تابعداری کے لیے ساری دنیا پر زور دیا جا رہا ہے اور نہ صرف یہ کہ عراق کو ان قوانین کی خلاف ورزی پر سزا دی گئی ہے بلکہ لیبیا اور ایران کو ان کے سامنے سرنڈر کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ پاکستان بھی سرنڈر یا سزا کے انہی مراحل کی طرف تیزی سے بڑھتا نظر آ رہا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سوچ اور اس پر مبنی بین الاقوامی قوانین ہی سرے سے ناانصافی اور جانب داری پر مبنی ہیں، اس لیے ان کے تحت کی جانی کوئی بھی کارروائی نہ نتیجہ خیز ہوگی اور نہ انصاف اور اخلاقیات کے ضروری تقاضوں کو پورا کرنے والی متصور ہوگی۔

اس وقت عالمی سطح پر یہ منظر صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انسانی آبادی کے کم وبیش ایک چوتھائی حصہ پر مشتمل عالم اسلامی کو ایٹمی صلاحیت اور اس حوالے سے ٹیکنالوجی کی جدید ترین مہارت سے دور رکھنے کی عمداً کوشش ہو رہی ہے جس کی ایک واضح دلیل ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی بھارت اور اسرائیل نے بھی کی ہے اور ان کے پاس بھی ایٹمی ہتھیار موجود ہیں، لیکن ان کے خلاف بین الاقوامی دباؤ کی وہ فضا موجود نہیں ہے جو عراق، لیبیا، پاکستان اور ایران کے خلاف قائم کر دی گئی ہے اور جس کی شدت اور سنگینی میں دن بدن

اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پھر عالم اسلام کی رائے عامہ اور اہل دانش کو جب یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ ان کے معاشی وسائل پر قبضہ کرنے والی قوتیں اور ان کے سیاسی معاملات واختیارات کو اپنی مٹھی میں جکڑ لینے والی طاقتیں اپنے لیے تو ایٹمی قوت کا حق محفوظ رکھتی ہیں اور ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے میں خود کوئی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ صرف عالم اسلام اور تیسری دنیا کو ایٹمی صلاحیت سے محروم رکھنا چاہتی ہیں تو ان کے سامنے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کی خواہش، اس کے لیے بنائے گئے قوانین اور ان پر عمل درآمد کے لیے قائم کیے جانے والے عالمی اداروں کی کوئی اصولی اور اخلاقی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ وہ اس سارے عمل کو اپنے خلاف جانب دارانہ، معاندانہ اور غیر اخلاقی طرز عمل تصور کرتے ہیں، اس لیے ان سے سرے سے یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے کہ وہ ان قوانین کا احترام کریں گے اور ان کی پابندی کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ طاقت اور دباؤ کے تحت کسی نظام اور قانون کو مسلط کر دینا اور بات ہے اور نظام وقانون کی اصولی واخلاقی حیثیت کو تسلیم کرا کر ان کی پابندی کے لیے کسی کو آمادہ کرنا اس سے بالکل مختلف امر ہے۔ ان دونوں باتوں میں فرق اتنا پیچیدہ نہیں ہے جو یک طرفہ ٹریفک چلانے والے عالمی راہنماؤں کی سمجھ سے بالاتر ہو، بلکہ اس مرحلہ تک پہنچ کر بات اور سنگین ہو جاتی ہے۔

سب جانتے اور سمجھتے ہوئے کسی یک طرفہ عمل کو جاری رکھنے پر اصرار معروف زبان میں ''ہٹ دھرمی'' کہلاتا ہے اور جب ہٹ دھرمی صاف نظر آ رہی ہو اور اس میں لچک یا نرمی کا کوئی پہلو محسوس نہ ہو رہا ہو تو کسی بھی انسانی سوسائٹی میں اس کا جو فطری ردعمل پیدا ہوتا ہے، اسے چند قوانین یا اداروں کے ذریعے روکنا ممکن نہیں رہتا۔ ایسے ردعمل کو روکنے کی ایک ہی صورت ممکن ہوتی ہے کہ اس عمل پر نظر ثانی کی جائے جس کے ردعمل کو کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا ہو، اس لیے اگر اقوام متحدہ کے ادارے، ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے خواہش مند عالمی لیڈر اور مسلم ممالک پر اس سلسلے میں مسلسل دباؤ بڑھانے والی قوتیں فی الواقع اس معاملے میں سنجیدہ ہیں اور ان کا مقصد واقعتاً یہی ہے کہ ایٹمی ہتھیار مزید نہ پھیلیں تو انہیں عالم اسلام کے شبہات اور شکایات کا ازالہ کرنا ہوگا اور ایٹمی ہتھیاروں کے موجودہ عدم توازن پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ہم غیر ذمہ دار حکومتوں اور

ممالک کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کے چلے جانے کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ باقی ملکوں کے بارے میں تو ابھی صرف امکان یا خطرے کی سطح کی بات ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کو غلط استعمال کر سکتے ہیں جبکہ جو ملک اس غیر ذمہ داری کا عملاً مظاہرہ کر چکا ہے، وہ اس وقت سب سے بڑی ایٹمی قوت ہے اور اس کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کا سب سے بڑا ذخیرہ بھی موجود ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم وطن عزیز کے ان دانش وروں سے بھی عرض کرنا چاہتے ہیں جو پاکستان کے ایٹمی سائنس دانوں کی ڈی بریفنگ کی کارروائی کے جواز پر دلائل دینے میں مصروف ہیں اور اسے وقت کی ضرورت قرار دے رہے ہیں کہ وہ ایٹمی صلاحیت کے بارے میں عالمی سطح پر غیر متوازن اور یک طرفہ نظام کو بھی بے نقاب کریں، کیونکہ فساد کی اصل جڑ وہی ہے اور اسے اکھاڑے بغیر دنیا میں امن کا کوئی بھی پروگرام آگے نہیں بڑھ سکتا۔*

O

* روزنامہ پاکستان، ۲۹/جنوری ۲۰۰۴ء۔

ڈی بریفنگ ـــــ چند گزارشات

ایٹمی سائنس دانوں کی ''ڈی بریفنگ'' جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، عوام کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور تناؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر عبد القدیر خان اور ان کے رفقا کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ انہوں نے ایٹمی راز فروخت کیے اور دوسرے ممالک کو ایٹمی طاقت حاصل کرنے میں مدد دی۔ سائنس دانوں کے خفیہ بینک اکاؤنٹس کا تذکرہ ہو رہا ہے، بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کا حوالہ دیا جا رہا ہے، عدالت عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا ہے، مگر معزز جج صاحبان کو شکوہ ہے کہ انہیں ضروری معلومات فراہم نہیں کی جا رہیں اور انہیں اعتماد میں نہیں لیا جا رہا۔ دینی اور سیاسی راہنما سائنس دانوں کو زیرِ حراست لینے اور ڈی بریفنگ کے عنوان سے ان سے تفتیش پر احتجاج کر رہے ہیں، عوامی مظاہرے ہو رہے ہیں، احتجاجی بیانات میں شدت آ رہی ہے اور تحریک چلانے کا عزم کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ارباب قلم اور اصحاب دانش کی طرف سے ملے جلے ردِ عمل پر مشتمل افکار و خیالات سامنے آ رہے ہیں۔ ایسے ارباب دانش بھی ہیں جو ڈی بریفنگ کے نتائج سامنے آنے سے پہلے ہی سارے الزامات کو درست تسلیم کیے بیٹھے ہیں اور ''مجرم سائنس دانوں'' کو کیفر کردار تک پہنچانے کو قومی مفاد کا سب سے بڑا تقاضا قرار دے رہے ہیں، اور ان اصحاب فکر و دانش کی بھی کمی نہیں جو اس ساری مہم کو پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنے کے لیے مغرب کی منظّم اور مربوط منصوبہ بندی کا ایک حصہ تصور کرتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ مغرب اگر کسی مقصد کے لیے پلاننگ کرتا ہے تو پلاننگ کے نقشے میں وہ تمام ضروری رنگ بڑی مہارت سے بھرتا ہے جو اس

نقشے کو عالمی برادری سے منظور کرانے کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔ خواہ بعد میں وہ رنگ پھیکے ہی پڑ جائیں، لیکن ان کی ابتدائی چمک دمک خاصی چکا چوند کر دینے والی ہوتی ہے، اس لیے اس سارے قضیہ کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

ممکن ہے ان سطور کی اشاعت تک بات بہت آگے بڑھ چکی ہو، لیکن تا دمِ تحریر جو صورت حال ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلے کے اہم پہلو پر کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ اس ساری مہم کی بنیاد اس مبینہ اصول پر ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کا کام جن طاقتوں نے اس سے پہلے کر لیا ہے اور وہ اپنے پاس ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ کر چکی ہیں، ایٹمی صلاحیت کو صرف ان تک محدود رہنا چاہیے۔ ان کے علاوہ کسی ملک کو ایٹمی ہتھیار بنانے کا حق نہیں ہے اور جو اس کی طرف پیش رفت کرے گا، وہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے جرم کا مرتکب ہوگا۔ اس مقصد کے لیے بین الاقوامی قوانین بنائے گئے ہیں اور عالمی ادارے اس کی نگرانی اور تفتیش کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔ ہم اس سے قبل اس بات کو بطور اصول تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے ہیں اور اس سلسلہ میں عملی طور پر ہمارا موقف یہ رہا ہے کہ اقوام متحدہ میں ویٹو کی پاور رکھنے والے پانچ ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک بھی ایٹمی صلاحیت کے حصول کا حق رکھتے ہیں اور خاص طور پر عالم اسلام کا یہ جائز حق ہے، نیز جنوبی ایشیا میں پاکستان اور بھارت کے درمیان طاقت کے عدم توازن کے باعث پاکستان کی یہ دفاعی ضرورت ہے اور اس کی قومی سلامتی کا تقاضا ہے کہ وہ ایٹمی صلاحیت حاصل کرے۔ اسی موقف کی بنیاد پر ہم نے ایٹمی پروگرام تشکیل دیا اور اسے تکمیل پہنچا کر ایٹمی دھماکہ کر دکھایا، ورنہ ایٹمی دھماکے کی منزل تک پہنچنے سے قبل عالمی برادری کے سامنے ہماری پوزیشن یہی تھی جو اس وقت ایران اور لیبیا کی ہے۔ انہی سائنس دانوں پر جنہیں آج دوسرے ملکوں کو ایٹمی راز منتقل کرنے کے جرم کا مرتکب قرار دیا جارہا ہے، اس وقت یہ الزام تھا کہ انہوں نے اپنے ملک کے لیے ایٹمی راز حاصل کیے ہیں اور ایٹمی ٹیکنالوجی اور آلات چوری کیے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر اس حوالے سے باقاعدہ مقدمہ چلا جس میں پاکستان کے ممتاز قانون دان ان کے دفاع میں پیش ہوئے۔ مغرب کے الزامات ایک ایک کر کے سامنے آتے رہے، لیکن ہم نے کان لپیٹ کر انہیں اپنے سر کے اوپر سے گزر جانے دیا۔

یہی مغرب تھا، یہی الزامات تھے اور یہی دباؤ تھا، لیکن ہم نے سنی ان سنی کر دی اور مغرب کے واویلے کی طرف توجہ دیے بغیر ایٹمی دھماکے کی منزل تک جا پہنچے، لیکن آج صورت حال وہ نہیں ہے۔ آج ہم ان الزامات کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں، ہم نے اپنے سائنس دانوں کو ان الزامات کی بنیاد پر حراست میں لے رکھا ہے اور ڈی بریفنگ کے نام سے تذلیل کر رہے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہم نے ایٹمی صلاحیت پر پانچ ملکوں کی اجارہ داری کے بارے میں ان کا موقف تسلیم کر لیا ہے اور اپنے اس موقف سے دستبردار ہو گئے ہیں جس کی بنیاد پر پاکستان عالم اسلام کی پہلی ایٹمی طاقت بنا تھا اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جب ہم چند تسلیم شدہ ایٹمی طاقتوں کے دائرے سے باہر ایٹمی صلاحیت اور ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کا وہ بین الاقوامی قانون تسلیم کر رہے ہیں جسے ہم نے ایٹم بم بنا کر عملاً مسترد کر دیا تھا اور اس قانون کی رو سے ایٹمی ٹیکنالوجی کی منتقلی کو جرم تسلیم کر کے اس کی بنیاد پر اپنے سائنس دانوں کے خلاف کارروائی کے لیے پر تول رہے ہیں تو یہ صرف موقف سے دست برداری نہیں ہے بلکہ ایٹمی صلاحیت سے دست برداری کا فیصلہ بھی ہے، کیونکہ اگر ٹیکنالوجی اور آلات ایران اور لیبیا کو دینا ''جرم'' ہے تو پاکستان کے لیے انہیں حاصل کرنا بھی جرم تھا اور اگر حکومتوں سے ہٹ کر ''افراد'' کا ایران اور لیبیا کے لیے ایٹمی ٹیکنالوجی اور آلات کی فراہمی کے لیے سرگرم عمل ہونا بلیک مارکیٹنگ ہے تو ''افراد'' کی سطح پر پاکستان کے لیے کیا جانے والا یہ عمل بھی ''بلیک مارکیٹنگ'' ہی کہلائے گا، اور جب ہم موقف کے حوالے سے ''یوٹرن'' کے اس مرحلے تک آ جائیں گے تو بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی، ایٹمی ٹیکنالوجی اور آلات کی مجرمانہ منتقلی، اور ایٹمی صلاحیت کی بلیک مارکیٹنگ کی بنیاد پر حاصل ہونے والی ایٹمی صلاحیت کا ہمارے پاس کوئی جواز باقی نہیں رہے گا اور اگر لیبیا کے ایٹمی پلانٹ کے آلات اور مشینوں کی طرح ہمارے ایٹمی اثاثے اور آلات واشنگٹن پہنچانے کے لیے ہوائی جہاز آ پہنچے تو اپنی ایٹمی صلاحیت کے تحفظ کے ہمارے دعوے ان کی پرواز کو روکنے کے لیے کسی سطح پر رکاوٹ نہیں بن سکیں گے۔

ہمارے نزدیک اس معاملے کا سب سے اہم اور نازک پہلو یہی ہے کہ ایٹمی صلاحیت پر چند ملکوں کی اجارہ داری کے نام نہاد اصول اور اس کے لیے بنائے گئے یک طرفہ بین الاقوامی قوانین کو

تسلیم کر کے ہم اب تک کے اپنے قومی اور عملی موقف سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس بات کی وضاحت ممکن نہیں رہے گی کہ اگر ایران یا لیبیا یا کسی اور ملک کو ایٹمی صلاحیت اور آلات فراہم کرنے کے لیے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ''جرم''، چوری اور بلیک مارکیٹنگ ہے تو پاکستان کے لیے بین الاقوامی قوانین اور نیٹ ورک سے ہٹ کر ایٹمی صلاحیت اور آلات کا حصول کیوں چوری اور بلیک مارکیٹنگ نہیں تھا؟ اس لیے ایٹمی سائنس دانوں کے خلاف کارروائی کے اس پس منظر اور جواز کو قبول کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ البتہ اس حوالے سے سامنے آنے والی باتوں میں دو امور ضرور قابل توجہ ہیں: ایک یہ کہ بین الاقوامی قوانین متنازعہ سہی مگر سائنس دانوں کے اس مبینہ عمل سے ملک کے اپنے راز داری کے قوانین کی خلاف ورزی بھی تو ہوئی ہے اور دوسری یہ کہ بعض ایٹمی سائنس دانوں کے حال میں ظاہر ہونے والے مبینہ خفیہ اکاؤنٹس کو کس زمرے میں شمار کیا جائے گا؟

اس بات کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ اگر واقعتاً پاکستان کے اپنے راز داری کے قوانین کی خلاف ورزی ہوئی ہے اور مبینہ خفیہ اکاؤنٹس کا فی الواقع وجود ہے تو اس پر ضرور کارروائی ہونی چاہیے، لیکن وہ کارروائی نارمل اور معمول کے مطابق ہونی ضروری ہے۔ اس کے بارے میں غیر معمولی اور خصوصی کارروائی کا تاثر نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ راز داری کے قوانین کی خلاف ورزی اور خفیہ اکاؤنٹس صرف ان ایٹمی سائنس دانوں کے حوالے ہی سے سامنے نہیں آئے بلکہ اس حمام میں اور بہت سے عزت مآب اور ہز ایکسیلنسی ننگے کھڑے ہیں۔ ان میں سیاست دان بھی ہیں، بیوروکریٹ بھی ہیں اور جرنیلوں کی بھی کمی نہیں، بلکہ یہ ایک لحاظ سے ہمارے مقتدر طبقات کا کلچر بن چکا ہے اور شاید ہی کوئی عزت مآب اس سے محفوظ رہ گیا ہو۔

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایٹمی سائنس دانوں کی ڈی بریفنگ اور ان کے خلاف مبینہ کارروائی کے بارے میں اگر حکومت فی الواقع سنجیدہ ہے اور اسے قومی مفاد میں سمجھتی ہے تو اسے دو باتوں کا واضح طور پر اہتمام کرنا ہوگا: ایک یہ کہ ایٹمی صلاحیت پر چند ملکوں کی اجارہ داری کے مغربی تصور کی ایک بار کھل کر نفی کی جائے اور اعلان کیا جائے کہ اس حوالے سے موجودہ بین الاقوامی قوانین

کو ہم یک طرفہ اور متنازعہ سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں ہم تحفظات رکھتے ہیں۔ یہ اعلان سائنس دانوں کے خلاف موجودہ کارروائی کے قومی مفاد میں ہونے کا تاثر قائم کرنے کے لیے بھی ضروری ہے اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کے تحفظ کا بھی ناگزیر تقاضا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان کے راز داری کے قوانین کی خلاف ورزی اور خفیہ بینک اکاؤنٹس کی تفتیش کو نارمل سطح پر لایا جائے اور اس تاثر کو عملی طور پر ختم کیا جائے کہ یہ کارروائی صرف ایٹمی سائنس دانوں کے خلاف ضروری سمجھی گئی ہے اور اسی جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے افراد اور طبقات کے بارے میں چشم پوشی سے کام لیا جا رہا ہے۔

اگر حکومت ان دو باتوں کا اہتمام کرے تو کسی حد تک یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ قومی مفاد میں ہو رہا ہے اور قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے اب یہ کرنا ضروری ہے، ورنہ یہ ساری کارروائی جنوبی ایشیا کے لیے امریکی ایجنڈے کا ایک حصہ سمجھی جائے گی جس کے ساتھ قومی مفاد اور قانون کی بالادستی کا اتنا ہی تعلق ہوگا جتنا تعلق عراق کے قومی مفاد اور عراقیوں کو بدعنوان حکمران سے نجات دلانے کے نعرے کا عراق پر امریکی اتحاد کی مسلح یلغار سے تھا۔ فہم و دانش کی دنیا میں اسے اس سے زیادہ کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکے گا۔ *

O

* روزنامہ اسلام، ۲ر فروری ۲۰۰۴ء۔

دشمن کو بھی اس کے جرائم یاد دلاتے رہیں

ڈاکٹر عبدالقدیر کے اعتراف جرم اور وفاقی کابینہ کی طرف سے سفارش کے بعد صدر پرویز مشرف نے ان کے لیے جس معافی کا اعلان کیا ہے، اس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اس سے مسئلہ نمٹ جائے گا اور ایٹمی پھیلاؤ کے مبینہ جرم کے ارتکاب کے حوالہ سے پاکستان کے خلاف جو الزامات عالمی سطح پر سامنے آ رہے ہیں، ان کی شدت میں شاید اب کمی آ جائے گی، لیکن دوسری طرف عالمی ایٹمی توانائی ایجنسی کے سربراہ محمد البرادعی نے کہا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر کا مبینہ اعتراف جرم اس وسیع جال کی پہلی کڑی ہے جو ایٹمی پھیلاؤ کے لیے دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے اور جس میں اور بھی بہت سے حقائق سامنے آنے کی توقع ہے۔ گویا جس بات کو ہم اس قضیے کا اختتام سمجھ رہے ہیں، وہ الزام عائد کرنے والوں کے نزدیک نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ابھی صورت حال یہی ہے کہ :

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

یہ اتفاق کی بات ہے کہ آج جمعۃ المبارک کے خطاب کے لیے جب میں منبر پر بیٹھا اور قرآن کریم کی ورق گردانی کی کہ آج کے حالات کے مناسب کوئی آیت کریمہ تلاش کر کے اس کی روشنی میں کچھ معروضات پیش کروں تو چند اوراق آگے پیچھے کرتے ہوئے نظر سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۱۷ پر ٹک گئی جس میں اللہ تعالیٰ نے اسی نوعیت کے ایک واقعے کا تذکرہ فرمایا ہے اور ایسے واقعات سے نمٹنے کے لیے ہدایات بھی دی ہیں۔

دور جاہلیت میں قمری سال کے چار مہینوں رجب، ذی قعدہ، ذی الحج اور محرم کو حرمت والے

مہینے سمجھا جاتا تھا اور ان مہینوں میں باہمی قتل وقتال اور دشمنیاں عارضی طور پر موقوف ہو جاتی تھیں جبکہ سال کے باقی آٹھ مہینوں کے دوران قبائلی معاشرہ میں باہمی لڑائیوں کا بازار گرم رہتا تھا، دشمن قبیلوں کے علاقہ سے گزرنا ممنوع ہوتا تھا اور دشمن قبائل کے درمیان عملاً حالت جنگ رہتی تھی۔ قبائل کا یہ قانون اور رواج ابتدا میں مسلمانوں کے ہاں بھی قابل احترام تھا جبکہ بعد میں ان مہینوں کی حرمت والا قانون منسوخ ہو گیا، لیکن منسوخی سے قبل مسلمانوں کے ہاں بھی ان مہینوں کی حرمت کے بارے میں عرب روایات اور ضابطوں کی پابندی کا اہتمام ہوتا تھا۔

اس دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر جہاد کے لیے روانہ کیا۔ یہ لشکر جب اپنے ہدف پر پہنچا تو جمادی الاخریٰ کے آخری ایام تھے اور رجب کا آغاز ہونے والا تھا۔ امیر لشکر حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے یہ سمجھ کر کہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن ہے، دشمن پر حملہ بول دیا۔ قتل وقتال بھی ہوا اور دشمن سے مال غنیمت بھی ہاتھ آیا، مگر اصل واقعہ یہ تھا کہ رجب کا چاند نظر آ چکا تھا اور یہ حملہ رجب میں ہوا تھا۔ اس پر مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا کہ انہوں نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور عرب روایات میں سے اس روایت کو توڑ دیا ہے جس کو وہ خود بھی تسلیم کرتے آ رہے ہیں۔ انہوں نے رجب کی حرمت توڑی ہے اور حرمت کے ضابطوں کو پامال کر دیا ہے۔ مشرکین مکہ نے اس بات کو بطور خاص اچھالا کہ ان کی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ براہ راست دشمنی تھی۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ جب واپس آئے تو ان کی ''ڈی بریفنگ'' ہوئی اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے صورت حال کے بارے میں تفتیش کی تو انہوں نے پورے حالات سے آگاہ کر دیا اور عذر بھی پیش کر دیا کہ اس خلاف ورزی کی اصل وجہ غلط فہمی تھی۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تنبیہ فرما کر معاملہ نمٹا دیا لیکن مشرکین مکہ کی طرف سے طعن اور اعتراض کا سلسلہ جاری رہا جس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں چند اصولی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حرمت والے ماہ رجب میں لڑائی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ اس کا کیا حکم ہے تو اے پیغمبر آپ

ان سے کہہ دیجیے کہ حرمت والے مہینہ میں جنگ کرنا بڑی بات ہے، یعنی یہ غلطی ہے جس کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ اعتراض کرنے والے اور طعنہ دینے والے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے جرائم تو اس سے کہیں زیادہ بڑے ہیں اور انہیں اس غلطی کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے بڑے بڑے جرائم کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں ان کے جرائم کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو روکنا، اللہ تعالیٰ کے دین کا انکار کرنا، مسجد حرام سے لوگوں کو روکنا، اور مکہ والوں کو ظلم و جبر کے ساتھ وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دینا حرمت والے مہینہ میں لڑائی کی غلطی سے کہیں زیادہ بڑے جرم ہیں اور وہ فتنہ وفساد جو مشرکین مکہ نے مسلمانوں کے خلاف ہر طرف بپا کر رکھا ہے، وہ قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔

قرآن کریم کے اس اسلوب سے ہمیں یہ راہنمائی ملتی ہے کہ جہاں کسی غلطی کی نشان دہی ہوتی ہو اور اس وقت کے معروضی حالات میں اس کا اعتراف کرنا ضروری ہو تو اسے تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ غلطی کا الزام لگانے والوں کو ان کے جرائم بھی یاد دلائے جائیں اور تقابل کر کے انہیں بتایا جائے کہ ان کے جرائم انسانیت کے حوالہ سے، امن کے حوالہ سے اور اصول واخلاقیات کے حوالہ سے زیادہ بڑے جرائم ہیں، اس لیے انہیں دوسروں پر اعتراض کرنے سے قبل اپنے گریبان میں بھی جھانکنا چاہیے۔

اس کے بعد اسی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے عالم کفر اور عالم اسلام کی باہمی کشمکش اور تنازع واختلاف کے حوالہ سے ایک اور حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ کافر قومیں جب مسلمانوں کے خلاف معرکہ آرا ہوتی ہیں تو ان کا اصل ہدف وہ اعتراضات اور شکایات نہیں ہوتیں جن کا وہ اظہار کرتی ہیں بلکہ ان کا حقیقی ہدف اور حتمی مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کسی نہ کسی طرح اپنے دین سے پھر جائیں اور اپنے عقائد اور اپنی روایات سے دست بردار ہو جائیں اور جب تک عالم کفر کا یہ آخری ہدف حاصل نہیں ہو جاتا، ان کی یہ جنگ مسلمانوں کے خلاف جاری رہے گی۔ چنانچہ آیت مبارکہ کے اس حصے کا ترجمہ یہ ہے کہ ''یہ کافر تم مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے واپس نہ پلٹا دیں، اگر یہ بات ان کے بس میں ہو۔'' اور پھر آیت کریمہ کا

اختتام اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے اس تنبیہ پر کیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین سے پھر گیا تو اس کے اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہو جائیں گے اور یہ اس کے لیے سراسر خسارے کا سودا ہوگا۔ اس آیت کریمہ کے پس منظر میں ہم آج کے حالات، بالخصوص ایٹمی سائنس دانوں کے حوالہ سے صورت حال کا جائزہ لیں تو ہمیں چند امور کی واضح رہنمائی ملتی ہے:

o بین الاقوامی عرف و تعامل کا احترام ضروری ہے مگر اس وقت تک جب تک اس کے بارے میں قرآن وسنت کی کوئی ہدایت اس کے خلاف سامنے نہ آجائے۔ ایٹمی صلاحیت کے بارے میں بین الاقوامی عرف و تعامل کے احترام میں ہمیں تامل نہیں ہے، مگر یہ دو وجہ سے اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ یہ بین الاقوامی عرف و تعامل یا قوانین ایٹمی صلاحیت پر چند ملکوں کی اجارہ داری کو تسلیم کرنے کے اصول پر قائم ہیں جو انصاف اور قوموں کی برابری کے مسلمہ ضوابط کے منافی ہے اور دوسرا اس وجہ سے کہ قرآن کریم نے سورۃ الانفال کی آیت ۶۰ میں مسلمانوں کو واضح حکم دیا ہے کہ وقت کی جدید ترین عسکری قوت کو حاصل کرو اور تمہاری عسکری صلاحیت اس درجہ کی ہونی چاہیے کہ عالمی تناظر میں قوت کا توازن تمہارے ہاتھ میں ہو، اس لیے ایسے کسی بین الاقوامی عرف و تعامل اور قانون کی پابندی ہم پر ضروری نہیں ہے جو قرآنی احکام سے متصادم ہو۔

o اگر کسی معاملہ میں کوئی غلطی سامنے آجائے جو اس وقت کے عالمی ماحول میں غلطی تصور کی جاتی ہو تو اس کو تسلیم کر لینے میں قباحت نہیں ہے مگر اس کے ساتھ دشمن کو اس کے جرائم یاد دلاتے رہنا بھی ضروری ہے اور اعتراض و طعن کی زبان دراز کرنے والوں کے سامنے ان کے اعمال کا آئینہ رکھنا بھی ناگزیر ہے۔

o مسلمانوں کو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ اسلام پر ان کے قائم رہتے ہوئے عالم کفر ان کے ساتھ کوئی رواداری اور مصالحت برت سکتا ہے اور اسلام سے دست برداری اختیار کیے بغیر مسلمانوں کے خلاف کافروں کی محاذ آرائی میں کوئی کمی آسکتی ہے، اس لیے ان کی ہر پالیسی اور حکمت عملی کا تعین اس بنیادی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے طے ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جس ''جرم'' کا اعتراف کیا ہے، وہ فی الحقیقت جرم ہے یا نہیں، اس

کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے، لیکن دومنٹ کے لیے اسے جرم تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس جرم کی سنگینی اور حجم اس قدر نہیں جو اسے جرم قرار دینے والوں کے اپنے جرائم میں پائی جاتی ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں اس سے بڑا جرم کون سا ہوگا کہ مٹھی بھر افراد نے دنیا بھر کے وسائل پر قبضہ جمایا ہوا ہے، اقوام و ممالک کی آزادی اور خودمختاری پر پہرے بٹھا رکھے ہیں، سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری قوت و صلاحیت پر اجارہ داری قائم کی ہوئی ہے، انسانی سوسائٹی پر آسمانی تعلیمات کی عمل داری کو قوت کے بل پر روک رکھا ہے اور آسمانی تعلیمات کی نمائندگی کرنے والی ظاہری علامتیں بھی ان کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہیں، اور انھوں نے ملکوں اور قوموں کے خلاف فرد جرم عائد کرنے، تفتیش کرنے، فیصلہ سنانے اور اسے نافذ کرنے کے تمام اختیارات خود سنبھال لیے ہیں۔ تاریخ انسانی کے اس سب سے بڑے استحصال، اجارہ داری، جبر و تشدد اور جنگل کے قانون کے بارے میں بھی کسی کو حرکت میں آنا چاہیے، ان کی بھی ڈی بریفنگ ہونی چاہیے اور ان کی بھی نقاب کشائی ہونی چاہیے اور اگر یہ کام ہم نے نہ کیا تو قانون فطرت تو بہرحال حرکت میں آئے گا اور جب وہ حرکت میں آتا ہے تو جرم کرنے والے اور اس پر خاموش رہنے والے، دونوں اس کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ *

O

* روزنامہ اسلام، ۹رفروری ۲۰۰۴ء۔

مغرب کے سامنے صرف سپر اندازی کا مشورہ کیوں؟

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے اعتراف ''جرم'' اور صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے ان کے لیے ''معافی'' کے بعد ایٹمی پھیلاؤ کے حوالے سے قیاس آرائیوں نے جو نیا رخ اختیار کر لیا ہے، اس سے ان حضرات کے خدشات کو تقویت حاصل ہو رہی ہے کہ جس انداز سے اس معاملہ کو ڈیل کیا گیا ہے، اس سے مسئلہ سمٹنے کے بجائے پھیلاؤ کا زیادہ شکار ہو گیا ہے اور اس کا امکان بڑھتا جا رہا ہے کہ ایٹمی پھیلاؤ کے معاملے میں پاکستان کے بعض سائنس دانوں کے مبینہ طور پر ملوث ہونے کا مسئلہ پاکستان کا داخلی معاملہ نہیں سمجھا جائے گا اور اسے عالمی تناظر میں دیکھتے ہوئے متعلقہ حلقے اور ادارے انکوائری کے اس عمل کو آگے بڑھانے کے لیے یقیناً پیش رفت کریں گے۔

صدر محترم نے اپنی کانفرنس میں اس سلسلے میں اخبار نویسوں پر جس غصے کا اظہار کیا ہے، وہ اس مسئلے کی سنگینی اور اس کی پشت پر کارفرما عوامل کی سطح اور وسعت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے، کیونکہ صدر صاحب خود بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اخباری نمائندوں، کالم نویسوں اور تجزیہ نگاروں کے قلم سے جو باتیں قومی پریس کے ذریعے سامنے آ رہی ہیں، وہ ان تجزیوں اور قیاسات کے دائرے سے ہٹ کر نہیں ہیں جن کا اظہار بین الاقوامی پریس میں مسلسل ہو رہا ہے اور آج کے دور میں، جبکہ عام آدمی تک عالمی پریس اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کی خبریں اور تجزیے قومی پریس سے پہلے پہنچ جاتے ہیں، کسی ملکی اخبار نویس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ انہیں جھٹلا کر یا نظرانداز کر کے قوم کے سامنے کوئی ایسی بات کہہ سکے جو واقعات سے مطابقت نہ رکھتی ہو یا معروضی حقائق ان کا ساتھ نہ

دے رہے ہوں۔ اس لیے صدر محترم کا یہ کہنا کہ بالفرض اگر کوئی بات درست بھی ہو تو اخبار نویسوں کو قومی مفاد کے لیے اسے نظر انداز کر دینا چاہیے، کسی درست طرزِ فکر کی نمائندگی نہیں کرتا۔ کسی دور میں ایسا ہو جاتا تھا کہ قومی مفاد کے پیشِ نظر حکومتیں اور ان کے کہنے پر قومی پریس کے ذمہ دار حضرات بعض باتوں کو عام لوگوں سے اوجھل رکھ لیا کرتے تھے، لیکن آج کے دور میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس واقعہ یا حقیقت کو آپ چھپا رہے ہیں یا نظر انداز کر رہے ہیں، اسے منظرِ عام پر لانے کے لیے درجنوں ایسے ذرائع ہر وقت موجود رہتے ہیں جو قومی پریس سے زیادہ موثر اور اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار بھی ہیں، اس لیے آج کے دور میں ''قومی مفاد'' کسی معاملے میں کسی واقعہ یا حقیقت کو چھپانے میں نہیں بلکہ اسے اصل صورت میں منظرِ عام پر لا کر ملک کے عوام کو اعتماد میں لینے اور معروضی حقائق کا کھلی آنکھوں سے سامنا کرنے میں ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر عبد القدیر کے اعتراف اور صدر کی طرف سے ان کی معافی کا تعلق ہے، ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قربانی دی ہے اور ان کی اسی قربانی کی بنیاد پر صدر محترم نے مسئلے کو نمٹانے کی کوشش کی ہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور ہماری دلی دعا ہے کہ ڈاکٹر عبد القدیر کا یہ ایثار ایٹمی پھیلاؤ کے اس ''پنڈورا باکس'' کو کھلنے سے روک لے جس کا بھارتی حکومت کی طرف سے تقاضا کیا گیا ہے اور جس کی طرف عالمی ایٹمی توانائی ایجنسی کے سربراہ محمد البرادعی کے اس بیان سے اشارہ ملتا ہے کہ ڈاکٹر عبد القدیر کا یہ اعتراف صرف برف پگھلنے کا آغاز ہے، وگرنہ خدانخواستہ یہ پنڈورا باکس کھل گیا تو اس حمام کا کوئی ننگا پس منظر میں نہیں رہ سکے گا اور پھر عالمی سطح پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور صلاحیت کے خلاف جو دھما چوکڑی مچے گی، اس کا تصور ہی ایک محبِّ وطن پاکستانی کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔

ہماری ایک الجھن یہ ہے کہ ہم نے اپنے سارے معاملات اور مسائل کو صرف ''پاکستان'' کی سطح پر فیس کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تنہائی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور عالمِ اسلام کے مسائل کو اجتماعی طور پر ڈیل کرنے کا رجحان کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے، وگرنہ ایٹمی صلاحیت اور ہتھیاروں کو چند ممالک تک محدود رکھنے کے لیے بین الاقوامی قوانین اور سسٹم کے اصولی

اور اخلاقی جواز کو عالم اسلام کے اجتماعی استحقاق کے حوالے سے چیلنج کیا جائے اور ان مبینہ قوانین کے بارے میں عالمی سطح پر مسلمانوں کے تحفظات کا دوٹوک انداز میں اظہار کیا جائے تو اس دباؤ کا بہت حد تک سامنا کیا جا سکتا ہے جس کا ہمیں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت اور دوسرے مسلم ممالک کی ایٹمی صلاحیت کے حصول کی خواہش اور کوشش کے حوالے سے سابقہ درپیش ہے، مگر بدقسمتی سے اس جائز، اصولی اور اخلاقی موقف کی طرف دنیا کو متوجہ کرنے کے بجائے مسلمان حکومتوں نے اپنے اپنے بچاؤ کے لیے ضروری سمجھتے ہوئے ایٹمی صلاحیت پر اجارہ داری کی دعویدار قوتوں کے ہر فیصلے اور قانون کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی روش اختیار کر لی ہے۔

چند سال قبل برطانیہ میں ایک کانفرنس کی رپورٹ بعض اخبارات میں شائع ہوئی تھی جس میں اسکولوں اور کالجوں کی طالبات کے بعض مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا تھا اور نوعمر لڑکیوں کی جنسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ایک دانش ور نے کہا تھا کہ ہماری طالبات کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انہیں ''NO'' کہنے کی عادت نہیں ہے، اس لیے انہیں ''نو'' کہنا سکھایا جائے اور اس کی مشق کرائی جائے۔ کچھ اس قسم کا مسئلہ ہمارا بھی ہے۔ ہمارے مسلم حکمرانوں کو ''نو سر'' کہنے کی عادت نہیں ہے اور ''یس سر'' کچھ اس طرح ان کا تکیہ کلام بن گیا ہے کہ وہ کہیں ''نو'' کہنا بھی چاہیں تو بے ساختہ ان کی زبان سے ''یس سر'' ہی نکل جاتا ہے۔

یہ صرف پاکستان کا نہیں، دنیا کے تمام مسلمان ممالک کا مسئلہ ہے۔ ہر ملک الگ الگ تحفظات کا شکار ہے اور جداگانہ طور پر آج کی عالمی قوت کے ساتھ اپنے معاملات طے کرنا چاہتا ہے۔ جب کسی برادری کا ہر فرد دوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنے لیے تحفظات اور بچاؤ تلاش کرنے پر آجاتا ہے تو قانون فطرت یہی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ یک دوسرے سے کٹ جانے والے لوگ اکیلے اکیلے فنا کے گھاٹ اتر جایا کرتے ہیں۔ آج عالم اسلام کا اصل المیہ ہی یہی ہے اور اس مخمصے سے نکلنے کے لیے کہیں سے کوئی جاندار آواز بھی نہیں اٹھ رہی۔ آج ہمارے اکثر وبیشتر اہل دانش کی طرف سے یہ بات کہی جا رہی ہے اور اصولی طور پر ہمیں بھی اس سے اختلاف نہیں ہے کہ محض جوش وجذبہ کے اظہار اور ردعمل پر مبنی طرز عمل ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے اور

دشمن ہمارے غصے اور جذبات کو ہمارے ہی خلاف استعمال کر رہا ہے، اس لیے جذبات کی بنیاد پر قائم ہونے والی تحریکوں اور تشدد کے حوالے سے اپنے ردعمل کا اظہار کرنے والے حلقوں کو اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور جدوجہد کے لیے پرامن ذرائع کو ترجیح دینی چاہیے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ پرامن ذرائع کون سے ہیں اور ان کی طرف ہمارے دانش ور کیا راہنمائی کر رہے ہیں؟

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جبر اور استحصال کی کارروائیاں بڑھتی جا رہی ہیں ان کے اردگرد حصار کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے، ہر شعبہ میں ان کی پیش رفت کی راہ میں ''بریکر'' کھڑے کر دیے گئے ہیں، مسلم اکثریت کی درجنوں آبادیوں پر غیر مسلم قوتوں کا قبضہ ہے، انہیں جبر و تشدد کے ذریعے مسلسل دبایا جا رہا ہے اور ان کی کردار کشی کی مہم دن بدن زور پکڑتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف اپنے جذبات اور جوش و خروش کے ساتھ ان کارروائیوں کے خلاف ردعمل کا اظہار کرنے والے وہ نوجوان ہیں جو جانیں دے رہے ہیں، گھر بار کی قربانی دے رہے ہیں اور اپنی جوانیاں نچھاور کر رہے ہیں، جب کہ تیسری طرف ہمارے بہت سے محترم دانشور ہیں جو ان نوجوانوں کو کوسنے میں مصروف ہیں اور انہیں جذباتیت اور سطحیت کے طعنے دے کر ان کی حوصلہ شکنی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ ہمارے محترم دانشور اگر تو ان جذباتی نوجوانوں کو کوئی متبادل راستہ بتا رہے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی استعمار کی موجودہ یلغار کا سامنا کرنے کا کوئی عملی فارمولا دے رہے ہیں اور پرامن جدوجہد کی کوئی ''لائن آف ایکشن'' ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں تو ان کی بات یقیناً قابل توجہ اور سمجھ میں آتی ہے، لیکن کسی متبادل راستے کی طرف عملی راہنمائی کیے بغیر اور پرامن جدوجہد کا کوئی خاکہ ان کے سامنے رکھے بغیر صرف جذباتیت اور جوش و خروش کے طعنے دے کر انہیں کوستے چلے جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ انہیں عالمی استعمار کے سامنے سپر انداز ہو جانے اور ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

ہماری گزارش دونوں حوالوں سے ایک ہی ہے، یعنی عالم اسلام کی جذباتیت اور جہادی تحریکات کے حوالے سے بھی اور ایٹمی پھیلاؤ کے بارے میں پاکستان اور عالم اسلام کے اصولی

استحقاق اور موقف کے حوالے سے بھی کہ یک طرفہ بات نہ کی جائے اور ون وے ٹریفک نہ چلائیے۔ جہادی تحریکات کو تشدد کا راستہ ترک کرنے کا مشورہ ضرور دیجیے۔ ہم اس مشورے میں آپ کے ساتھ ہیں، لیکن انہیں اسلام اور ملت اسلامیہ کے اجتماعی مفاد اور آزادی کے لیے جدوجہد کا راستہ بھی بتائیے اور پرامن جدوجہد کی ''لائن آف ایکشن'' بھی ان کے سامنے رکھیے۔ اسی طرح ایٹمی پھیلاؤ کے بارے میں عالمی برادری کی تشویش کو دور کرنے کی کوشش ضرور کیجیے اور بین الاقوامی قوانین کو یکسر مسترد بھی بے شک نہ کیجیے، لیکن ایٹمی صلاحیت پر چند ممالک کی اجارہ داری اور عالم اسلام کی یکسر محرومی کی صورت حال پر اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیجیے اور مغرب کے یک طرفہ اور جانبدارانہ طرز عمل کے خلاف عالم اسلام کا اجتماعی احتجاج بھی ریکارڈ کرائیے، ورنہ اس وقت ان دونوں حوالوں سے جو یک طرفہ باتیں کی جا رہی ہیں، وہ اپنے مقاصد اور اہداف کے حوالے سے مسلمانوں کو مغرب کے سامنے سپر انداز ہو جانے کا مشورہ ہے اور مغرب کی رضا پر راضی ہو جانے کی تلقین ہے جس کے لیے کوئی غیرت مند مسلمان تیار نہیں ہوگا۔*

O

---

* روزنامہ پاکستان، ۱۵ ؍فروری ۲۰۰۴ء۔

مملکت کا نظریاتی تشخص

اور پرویز حکومت کے اقدامات

مصطفیٰ کمال اتاترک اور ان کی قومی خدمات

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے بارے میں یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے کہ انہوں نے زندگی کے چند برس ترکی میں گزارے ہیں اور وہ ترکی زبان پر عبور رکھتے ہیں۔ ان سے منسوب یہ بات بھی بعض اخبارات نے شائع کی ہے کہ ان کے آئیڈیل لیڈر مصطفیٰ کمال اتاترک ہیں۔

ان کی طرف سے ترکی کے قومی رہنما مصطفیٰ کمال اتاترک کو اپنا آئیڈیل قرار دیے جانے پر بعض مذہبی رہنماؤں نے ردعمل کا اظہار کیا ہے اور اسے جنرل پرویز مشرف کے ذہنی رجحانات کا آئینہ دار قرار دیا ہے۔ معلوم نہیں کہ جنرل پرویز مشرف نے یہ بات کہی ہے یا نہیں، اور کہی ہے تو کس پس منظر میں کہی ہے۔ ان کے بارے میں جنرل صاحب موصوف کی طرف سے کوئی وضاحت نہ بھی آئی تو ان کی پالیسیوں سے ظاہر ہو جائے گا کہ ان کے ذہن میں مصطفیٰ کمال اتاترک کی شخصیت کا خاکہ کیا ہے اور وہ ترکی کے قومی لیڈر کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، تاہم ہماری نئی نسل کی اکثریت چونکہ مصطفیٰ کمال اتاترک کے بارے میں معلومات نہیں رکھتی، اس لیے مختلف معلوماتی مضامین بالخصوص پنجاب یونیورسٹی کے شائع کردہ ''دائرہ معارف اسلامیہ'' (اسلامی انسائیکلو پیڈیا) میں شامل، مصطفیٰ کمال اتاترک کی شخصیت اور خدمات پر طویل مقالہ کو سامنے رکھتے ہوئے چند تعارفی باتیں قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

مصطفیٰ کمال اتاترک جدید ترکیہ کے بانی اور معمار ہیں جنہوں نے اب سے پون صدی قبل

جمہوریہ ترکی کی بنیاد رکھی اور ترکی اس کے بعد سے انہی کے متعین کردہ خطوط پر پوری سختی کے ساتھ گامزن ہے انہوں نے ایک طرف یورپی ملکوں بالخصوص یونان کا مقابلہ کرتے ہوئے ترکی کی داخلی خودمختاری کی حفاظت کی اور بیرونی حملہ آوروں کو نکال کر ترکی کی وحدت کا تحفظ کیا اور دوسری طرف خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے ترکی کو عالم اسلام سے بھی الگ کرلیا وہ ترک قوم پرستی کے علم بردار تھے اور انہوں نے اس بنیاد پر ترک قوم کو بیدار کرنے اور اس کے جداگانہ تشخص کو دنیا کے نقشے پر نمایاں کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا جس کی وجہ سے انہیں اتاترک کا خطاب ملا اور وہ تاریخ میں ترک قوم کے ہیرو کی شکل اختیار کر گئے۔

دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق مصطفیٰ کمال ۱۸۸۱ء میں کاسلونیکا میں پیدا ہوئے ۸۶ء میں والد کا انتقال ہوگیا اور انہوں نے تعلیم و تربیت کا دور والدہ اور ننھیال کی سرپرستی میں بسر کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۹۵ء میں ناستر کے فوجی کالج میں داخلہ لیا۔ ۹۹ء میں استنبول کے مدرسہ حربیہ اور ۱۹۰۲ء میں فوجی اکیڈمی میں داخل ہوئے اور تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزر کر ۱۹۰۵ء میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کے طور پر فوجی خدمات کا آغاز کر دیا۔

یہ دور سلطان عبدالحمید ثانی کی خلافت کا تھا جب یورپ کے صنعتی اور فکری وثقافتی انقلاب سے متاثر ہوکر ترکی میں وطنی قومیت کے رجحانات کے ساتھ ساتھ جمہوری طرز زندگی اختیار کرنے کا ذوق بھی ابھر تھا اور خلافت عثمانی کے نظام کو جس نے سیاسی طور پر خاندانی بادشاہت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ جمہوری اصولوں کے دائرہ میں لانے اور کسی باضابطہ دستور کا پابند بنانے کے لیے مختلف اطراف سے کوششیں ہو رہی تھیں ان کوششوں میں ایسے افراد اور حلقے بھی شریک تھے جو خلوص دل سے یہ چاہتے تھے کہ خلافت کا نظام خاندانی بادشاہت کے دائرہ سے نکل کر ایک باضابطہ دستور نظام کی حیثیت اختیار کر لے تاکہ وہ زیادہ استحکام اور اعتماد کے ساتھ عالم اسلام کی قیادت کر سکے اور ایسے افراد اور گروہ بھی اس میں سرگرم تھے جو ان قومی رجحانات کی آڑ میں یورپ کے سیاسی فلسفہ اور ثقافتی ڈھانچے کو مکمل طور پر ترکی میں کارفرما دیکھنے کے خواہش مند تھے چنانچہ اس ماحول میں مصطفیٰ کمال نے فوجی خدمات کے آغاز میں ہی ''جمعیت وطن وحریت'' کے نام سے ایک خفیہ تنظیم قائم کر لی

اور ہم خیال فوجی افسروں کے ساتھ رابطے شروع کر دیئے جو آگے چل کر انجمن اتحاد و ترقی'' کے نام سے ایک مضبوط سیاسی قوت کی حیثیت اختیار کر گئی اور خلافت کو جمہوریت میں تبدیل کرنے میں سب سے اہم کردار اسی پارٹی نے ادا کیا۔

مصطفیٰ کمال کو اس مہم میں دو فوجی افسروں عصمت پاشا اور انور پاشا کی حمایت حاصل تھی مگر آگے چل کر انور پاشا ان کے ساتھ نہ رہے اور عصمت پاشا نے یہ رفاقت آخر دم تک نبھائی حتیٰ کہ جب ۱۹۲۴ء میں جمہوریہ ترکیہ کا اعلان ہوا تو اس کے صدر مصطفیٰ کمال اتاترک بنے اور وزیراعظم عصمت پاشا بنے جو اب عصمت انونو کا لقب اختیار کر چکے تھے۔

مصطفیٰ کمال رفتہ رفتہ ترک افواج کے کمانڈر انچیف کے منصب تک پہنچے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی در پردہ سیاسی جدوجہد بھی جاری رہی انہوں نے مختلف محاذوں پر جنگی خدمات سرانجام دیں اور ایک کامیاب جرنیل اور مدبر کے طور پر ان کا تعارف نمایاں ہوتا گیا انہوں نے خلافت عثمانیہ کے مرکز استنبول کی بجائے انقرہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور پورے استقلال کے ساتھ اپنے مشن میں سرگرم رہے۔

پہلی عالمی جنگ میں خلافت عثمانیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا چنانچہ جرمنی کی شکست کے اثرات اس پر بھی پڑے اور یورپی قوتوں نے شکست خوردہ ممالک کے حصے بخرے کیے تو اسی بندر بانٹ میں استنبول پر بھی قبضہ کر لیا اس وقت کے عثمانی خلیفہ سلطان عبدالوحید بھی بے بسی کے عالم میں اس میں ان کے ساتھ شریک تھے اس لیے مصطفیٰ کمال نے ان کے خلاف انقرہ میں علم بغاوت بلند کر دیا اور یورپی ملکوں سے مطالبہ کیا کہ ان کی فوجیں ترکی کی حدود سے باہر نکل جائیں اور ترکی کی خودمختاری اور وحدت و آزادی کو تسلیم کیا جائے اس مقصد کے لیے انہوں نے یونان کے ساتھ دوبدو جنگ بھی لڑی اس جنگ میں مصطفیٰ کمال نے اس مہارت کے ساتھ ترک فوجیوں کی کمان کی کہ یونانی فوج کو پسپائی اختیار کرنا پڑی اور مصطفیٰ کمال ترک قوم کے نجات دہندہ اور آزادی کی علامت کے طور پر ترک قوم کے ہیرو بن گئے۔

اس دوران نومبر ۱۹۲۲ء میں ترکی کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے یورپی ملکوں کی کانفرنس

ہوئی جس میں مصطفیٰ کمال اتاترک کی طرف سے عصمت انونو نے شرکت کی۔اس کانفرنس میں برطانوی وفد کے لیڈر لارڈ کرزن نے ترکی کی آزادی اور خودمختاری کو تسلیم کرنے کے لیے چار شرائط پیش کیں۔

۱۔خلافت کے نظام کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔

۲۔خلیفہ کو ملک بدر کر دیا جائے۔

۳۔خلیفہ کے تمام اموال قومی تحویل میں لے لیے جائیں۔

۴۔ترکی کے سیکولر ریاست ہونے کا اعلان کیا جائے۔

اس وقت انونو ان شرائط کو تسلیم کیے بغیر کانفرنس سے واپس آ گئے مگر بعد میں ترکی کی نئی قومی لیڈرشپ نے ان تمام شرائط کو تسلیم کر لیا چنانچہ تین مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کا نظام ختم کر کے خلیفہ کے خاندان کو جلاوطن کر دیا گیا اور جمہوریہ ترکیہ کے قیام کا اعلان کر کے اسے سیکولر ریاست بنانے کے لیے جو اہم اقدامات کیے گئے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔دستور سے سرکاری مذہب اسلام کی شق خارج کر دی گئی۔

۲۔ ملک بھر میں دینی مدارس اور خانقاہوں پر پابندی لگا کر مذہبی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

۳۔عورتوں کو تمام معاملات میں مردوں کے مساوی قرار دے کر پردہ کو قانوناً جرم قرار دے دیا گیا۔

۴۔یورپی لباس پہننا اور ننگے سر رہنا ضروری قرار دے دیا گیا۔

۵۔ پیری مریدی ممنوع قرار دی گئی اور مزاروں پر جانے اور دعائیں مانگنے پر پابندی لگا دی گئی۔

۶۔ہجری تقویم ختم کر کے شمسی کیلنڈر رائج کر دیا گیا۔

۷۔ جمعہ کی چھٹی ختم کر کے اتوار کی چھٹی کا اعلان کیا گیا۔

۸۔عربی زبان میں قرآن کریم کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی اور ترکی زبان کا عربی رسم الخط

منسوخ کر کے رومن رسم الخط اختیار کر لیا گیا۔

۹۔نماز، دعا اور قرآن کریم کی تلاوت ترکی زبان میں لازمی قرار دے دی گئی۔

مصطفیٰ کمال اتاترک نے پیپلز پارٹی کے نام سے سیاسی جماعت ۱۹۲۳ء میں قائم کر لی تھی جس کے ذریعے وہ اقتدار میں آئے اور ۲۹ اکتوبر کو جمہوریہ ترکیہ کے پہلے صدر منتخب ہوئے انہوں نے جدید ترکی کے راہنما اور حکمران کی حیثیت سے پندرہ برس تک حکومت کی اور ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو اس جہاں فانی سے رخصت ہو گئے۔ *

O

* روزنامہ اوصاف ۱۱/نومبر ۱۹۹۹ء۔

صدر پرویز مشرف کے دس سوالات کا جائزہ

صدر جنرل پرویز مشرف کے جس خطاب کا پورے ملک میں بلکہ دنیا بھر میں انتظار کیا جا رہا تھا، وہ چند دن پہلے سن لیا گیا ہے اور اس پر مختلف اطراف سے تبصروں کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔ ہم اس خطاب کے مختلف پہلوؤں پر کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں مگر پہلے ایک فنی کوتاہی کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو ٹی وی پر صدر پرویز مشرف کا خطاب سنتے ہوئے ہمیں محسوس ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ صدر صاحب کی تقریر کے ساتھ ساتھ نشر ہونے والے انگلش ترجمہ کا نظم معیاری نہیں تھا۔ میں انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے یہ تو نہیں بتا سکتا کہ ترجمہ مکمل تھا یا نہیں اور اس کی زبان معیاری تھی یا نہیں؟ البتہ یہ بات میں نے محسوس کی ہے کہ ترجمہ کرنے والے صاحب کی آواز صدر صاحب کی آواز سے بلند تھی اور اس بلند آواز کے سائے میں صدر صاحب کی آواز کو صاف طور پر سننے کے لیے مجھے ضرورت سے زیادہ توجہ سے کام لینا پڑا۔ اس کے علاوہ ایک دو جگہ مجھے محسوس ہوا کہ ترجمہ میں بعض الفاظ پہلے بول دیے گئے ہیں جبکہ صدر صاحب کے خطاب میں وہ الفاظ بعد میں سنے گئے ہیں جس سے یہ تاثر کسی درجہ میں ہو رہا تھا کہ شاید وہ صاحب صدر محترم کے خطاب کا ترجمہ نہیں کر رہے بلکہ صدر پرویز ان صاحب کے الفاظ کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ پھر آخر میں ترجمہ کرنے والے صاحب کو کھانسی کا جو دورہ پڑا، اس نے بات اور بدمزہ کر دی۔ اس موقع کے لیے کوئی متبادل انتظام ٹی وی والوں کو موجود رکھنا چاہیے تھا۔ سربراہ مملکت کے خصوصی خطاب کی بات تھی اور خطاب بھی وہ جس کا پوری دنیا کو انتظار تھا۔ اس موقع پر اس قدر غیر معیاری پن کے مظاہرہ کی کم از کم مجھے پاکستانی ٹی وی

سے توقع نہیں تھی۔

اس کے بعد صدر محترم کے خطاب کے حوالہ سے پہلے مرحلہ میں ان کے ان دس سوالات پر ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے خطاب کے دوران ''انتہا پسندوں'' سے کیے ہیں اور ایک قومی روزنامہ نے انہیں ''صدر پرویز کے انتہا پسندوں سے دس سوالات'' کے عنوان سے ترتیب وار شائع کیا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ:

''ہزاروں پاکستانیوں کو گمراہ کر کے افغانستان میں مروانے کا ذمہ دار کون ہے؟''

ہمیں صدر محترم کی اس بات سے اتفاق ہے کہ افغانستان کی سرزمین پر ہزاروں پاکستانی جاں بحق ہوئے ہیں، البتہ اس عمل کا دورانیہ ہمارے نزدیک گزشتہ پندرہ سال پر محیط ہے۔ پاکستانیوں کو صدر پرویز مشرف کے بقول ''گمراہ کر کے'' افغانستان لے جانے اور وہاں مروا دینے کا عمل گزشتہ پندرہ سال سے جاری ہے۔ یہ عمل اس وقت شروع ہوا تھا جب افغانستان میں سوویت یونین نے فوجیں اتاری تھیں اور افغان علما اور عوام نے روسی افواج کی آمد کو اپنے ملک کی آزادی اور قومی خودمختاری کے خلاف حملہ تصور کرتے ہوئے مزاحمت شروع کی تھی اور جہاد کا فتویٰ دے کر گوریلا کارروائیوں کا آغاز کر دیا تھا۔اس وقت پاکستان کے دینی حلقوں نے اس جدوجہد میں افغان عوام کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور ہزاروں پاکستانی وہاں جا کر اس عسکری مزاحمت میں شریک ہوئے تھے جن میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں نے جام شہادت بھی نوش کیا تھا۔اس وقت پاکستان کی حکومت، فوج اور امریکہ سمیت تمام مغربی ممالک پاکستانیوں کے افغانستان جا کر روس کے خلاف لڑنے کو ''گمراہ کر کے افغانستان میں مروانے'' کا عمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے ''جہاد'' کہا جاتا تھا۔امریکہ اسے سپورٹ کرتا تھا، دنیا بھر کی مسلمان حکومتیں اس کی حمایت کرتی تھیں، پاک فوج اور آئی ایس آئی اس جہاد کی پشت پر تھیں اور روسی فوجوں کے خلاف افغان عوام کی اس عسکری جدوجہد میں ''دہشت گردی'' کے جراثیم کا کوئی سراغ نہیں پایا جاتا تھا، اس لیے جو لوگ پاکستانیوں کو افغانستان لے جا کر روس کے خلاف مرواتے تھے، وہ امریکہ کے خلاف جنگ میں پاکستانیوں کو وہاں لے جانے کو بھی

جہاد سمجھتے رہے۔ انہیں استعماری مقاصد کے حوالہ سے روس اور امریکہ میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیا اور وہ اپنی اسی پالیسی کے تسلسل پر قائم رہے۔ وہ دراصل یہ فرق نہیں سمجھ پائے کہ روس کے خلاف لڑنا ''جہاد'' اور اس میں مرنا ''شہادت'' ہے جبکہ امریکہ کے خلاف لڑنا ''دہشت گردی'' اور اس میں جان دینا ''مروا دینا'' ہوتا ہے۔ اس لیے صدر کو اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ان عوامل کو تلاش کرنا چاہیے جو پاکستان کے دینی حلقوں کے ـــــ صدر پرویز مشرف کے بقول ـــــ انتہا پسندوں کے لیے اس جہاد اور دہشت گردی کے درمیان فرق کا صحیح ادراک کرنے میں رکاوٹ بنے ہیں۔

جنرل پرویز مشرف کا دوسرا سوال ہے کہ:

''کیا پاکستان کو نظریاتی اسٹیٹ بنانا چاہیے؟''

صدر محترم سے گزارش ہے کہ ''بنانا چاہیے'' کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور اس کا مطلب ہم یہ سمجھے ہیں کہ شاید صدر پرویز مشرف پاکستان کے بارے میں از سرِ نو فیصلہ کرنے جا رہے ہیں کہ اسے نظریاتی ریاست ہونا چاہیے یا سیکولر اسٹیٹ بنا دینا چاہیے؟ حالانکہ یہ فیصلہ پاکستان بننے سے پہلے ہو چکا تھا اور فیصلہ کرنے والے خود قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے جنہوں نے اس خطہ کے کروڑوں مسلمانوں کی حمایت سے اعلان کیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگا اور اس کا دستور قرآن وسنت کے مطابق ہوگا۔ پھر پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد کی صورت میں پاکستان کی نظریاتی حیثیت کا واضح طور پر تعین کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس مسئلہ کو ''ری اوپن'' کرنا پاکستان کے قیام کے نظریاتی اور اخلاقی جواز کو چیلنج کرنا ہے اور قیامِ پاکستان کو جائز، اصولی اور منطقی سمجھنے والے کسی شخص سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

جنرل پرویز مشرف نے تیسرا سوال یہ کیا ہے کہ:

''کیا مذہبی تعلیم حکومت چلانے کے لیے کافی ہے؟''

جنابِ صدر کی خدمت میں عرض ہے کہ اس بات کا آج تک کسی نے بھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی عقل و دانش سے بہرہ ور شخص ایسا کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں صدر صاحب نے دینی مدارس سے جو شکایات کی ہیں، وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں اور بے محل ہیں کیونکہ دینی مدارس تو صرف مساجد

و مدارس کے لیے امام، قاری اور استاذ مہیا کرنے کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ وہ اس شعبہ میں رجال کار فراہم کرنے کا کام صحیح طریقہ سے جاری رکھ سکیں، مگر صدر صاحب کا اصرار ہے کہ ایک مسجد میں امام بننے کے لیے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ امام مسجد کو سائنس دان اور انجینئر بھی ہونا چاہیے اور کسی مدرسہ میں قرآن پاک پڑھانے والے کو قاری کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھی بننا چاہیے، ورنہ اگر اسی سوال کو اصل تناظر میں دیکھا جائے تو وہ اس طرح بنتا ہے کہ جو کچھ ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جا رہا ہے، کیا یہ تعلیم ایک اسلامی فلاحی ریاست کا نظام چلانے کے لیے کافی ہے؟

صدر محترم کا چوتھا سوال ہے کہ:

''کیا آپ پاکستان کو ترقی پسند اسلامک ویلفیئر اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں؟''

جناب صدر! ہم بلاشبہ پاکستان کو ترقی پسند اسلامک ویلفیئر اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور مغربی حکومتوں کی پالیسیوں کی تابع داری کر کے کبھی ترقی پسند اسلامک ویلفیئر اسٹیٹ نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے خلفاے راشدینؓ کے طرز حکومت اور نظام حکومت کو اپنانے کی ضرورت ہے اور صدر پرویز مشرف اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ جس روز انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نظام حکومت اور ریاستی ڈھانچے کو پاکستان میں عملی طور پر اپنانے کا فیصلہ کیا، امریکی بمبار طیاروں کا رخ ان کی طرف بھی اسی طرح ہو جائے گا جس طرح اسی ''جرم'' میں ملا محمد عمر کو امریکی بمباری کا نشانہ بننا پڑا ہے۔

صدر محترم کا پانچواں اور چھٹا سوال یہ ہے کہ:

''کیا مذہبی انتہا پسندوں نے افغانستان کی بھلائی کا سوچا ہے؟ کیا پیسے جمع کر کے افغانستان کی تعمیر نو کا سوچا ہے؟''

میرے خیال میں صدر محترم کو حقائق سے اس حد تک چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے ورنہ دیگر سینکڑوں اداروں اور ہزاروں اصحاب خیر کے علاوہ ''امہ تعمیر نو'' اور ''الرشید ٹرسٹ'' نے افغانستان

کے مفلوک الحال عوام کی امداد اور افغانستان کی تعمیر نو کے لیے جو مسلسل خدمات سرانجام دی ہیں، ان سے صدر پرویز یقیناً بے خبر نہیں ہوں گے، لیکن چونکہ امریکہ بہادر نے ان رفاہی اور تعمیری اداروں کو بھی دہشت گرد قرار دے دیا ہے، اس لیے ہمارے صدر محترم کو ان کی خدمات ہی سرے سے دکھائی نہیں دے رہیں۔

صدر محترم کا ساتواں سوال ہے کہ:

''کیا اسلام توڑ پھوڑ، نفرتیں پھیلانے کا کام سکھاتا ہے؟''

یقیناً اسلام توڑ پھوڑ اور نفرتوں کا سبق نہیں دیتا اور اگر کہیں اسلام کے حوالہ سے ایسا ہو رہا ہے تو وہ بلاشبہ غلط ہے، لیکن پاکستان میں قومیتوں اور زبانوں کے عنوان سے جو نفرتیں موجود ہیں اور ان کے لیے جو قتل و قتال سالہا سال سے جاری ہے، انہیں صدر پرویز مشرف کس کھاتے میں ڈالیں گے اور ان کے بارے میں کچھ کہنا انہوں نے کیوں ضروری نہیں سمجھا؟

صدر محترم کا آٹھواں اور نواں سوال یہ ہے کہ:

''کیا ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال بھول گئے ہیں؟ انہوں نے اپنی مثال سے اسلام پھیلایا تھا۔ اور کیا بزرگان دین نے جبر سے اسلام پھیلایا تھا؟''

بالکل درست ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین نے دین پھیلانے اور اسلام کی دعوت دینے میں کبھی جبر سے کام نہیں لیا اور نہ اس کی اجازت دی ہے بلکہ اخلاقی برتری اور اصلاحی عمل کے ذریعہ اسلام کی دعوت کو عام کیا ہے، لیکن اگر کسی مقام پر کفر و ظلم کے کسی گروہ نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے اور ان پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی ہے تو وہاں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف اخلاق کے ساتھ کافروں کے سامنے نہیں آئے بلکہ تلوار ہاتھ میں لے کر ان کا مقابلہ کیا ہے اور کافر دشمن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین نے کبھی نرمی کا معاملہ نہیں فرمایا۔

صدر محترم کا آخری اور دسواں سوال یہ ہے کہ:

''کیا جہالت، پس ماندگی اور بھوک کے خلاف جہاد کا سوچا ہے؟''

صدر جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دینی مدارس کسی قسم کی سرکاری امداد کے بغیر لاکھوں نادار بچوں کو خوراک اور ہاسٹل کی بلا معاوضہ سہولتیں فراہم کر رہے ہیں اور انہیں مفت تعلیم بھی دے رہے ہیں اور خود صدر کے بقول یہ کام کوئی بڑی سے بڑی این جی او بھی نہیں کر سکتی، تو محدود ترین وسائل رکھنے والے دینی مدارس سے وہ بھوک اور جہالت کے خلاف اس کے علاوہ اور کون سے جہاد کی توقع کر رہے ہیں؟*

O

* روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔

’’اسلامی جمہوریہ پاکستان‘‘ یا ’’پاکستان‘‘

بارہ اکتوبر ۹۹ء کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف کی طرف سے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے ملک کا نظم و نسق سنبھالنے اور ۷۳ء کا دستور معطل کرنے کے اعلان کے بعد ملک کے دینی حلقے مسلسل ایک تشویش سے دوچار ہیں اور مختلف حوالوں سے اس کا اظہار ہو رہا ہے کہ دستور کی معطّلی کے بعد دستور کی اسلامی دفعات بالخصوص قرارداد مقاصد اور عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ سے متعلقہ شقوں کی کیا حیثیت باقی رہ گئی ہے؟ اور یہ تشویش اس پس منظر میں اور زیادہ شدت اختیار کر جاتی ہے کہ بین الاقوامی سیکولر لابیاں اور ادارے ایک عرصہ سے دستور پاکستان کی اسلامی دفعات کے خلاف رائے کا اظہار کرتے آ رہے ہیں اور پاکستان پر بین الاقوامی حلقوں کی طرف سے جن مسائل کے حوالہ سے دباؤ موجود ہے ان میں دستور پاکستان کی اسلامی دفعات اور بعض مروجہ اسلامی قوانین کے علاوہ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے دستوری فیصلہ کی شقیں بھی شامل ہیں جبکہ قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا طاہر احمد گزشتہ پندرہ برس سے لندن میں بیٹھے دستور پاکستان کے خلاف زہر افشانی کر رہے ہیں اور کئی بار کھلے بندوں کہہ چکے ہیں کہ انہیں دستور کے خاتمہ کا انتظار ہے۔

۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات کے بارے میں دینی حلقوں کی تشویش کے اس پس منظر کے ساتھ ساتھ بارہ اکتوبر کے بعد پیش آنے والے بعض واقعات ایسے ہیں جن سے اس تشویش میں اضافہ ہوا ہے اور اب اس میں اضطراب کا پہلو نمایاں ہوتا جا رہا ہے مثلاً بارہ اکتوبر کے اس اعلان کے بعد ملک میں قادیانیوں کی سرگرمیوں اور این جی اوز کے دائرہ کار میں وسعت دکھائی دے رہی ہے اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ دونوں حلقے دستور پاکستان کی اسلامی دفعات کے

خلاف ایک عرصہ سے سرگرم عمل ہیں اسی طرح چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے ملک کا نظام چلانے کے لیے جو ٹیم بنائی ہے اس کے متعدد افراد کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ ان کا تعلق اسی قسم کے بین الاقوامی اداروں، لابیوں اور این جی اوز سے ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ جبکہ بعض حضرات کے قادیانی ہونے کے بارے میں بھی افواہیں منظر عام پر آرہی ہیں اور حال ہی میں اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان سے پی سی او کے تحت جو نیا حلف لیا گیا ہے اس میں ملک کے دستوری نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کی بجائے صرف ''پاکستان'' کی وفاداری کا حلف شامل ہے اور حلف نامہ سے ''اسلامی جمہوریہ'' کے الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں جس سے ملک کی نظریاتی اسلامی حیثیت بھی بظاہر مشکوک ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی صورت حال پر غور وغوض کرنے کے لیے ہیومن رائٹس فاؤنڈیشن آف پاکستان کے چیئرمین چوہدری ظفر اقبال ایڈووکیٹ نے چھ فروری کو لاہور میں چند دینی جماعتوں کے رہنماؤں اور قانونی ماہرین کا ایک مشاورتی اجلاس طلب کیا جس میں راقم الحروف نے بھی شرکت کی جبکہ دیگر شرکاء میں مولانا سید عطاء المہیمن شاہ بخاری، چوہدری نذیر احمد غازی ایڈووکیٹ، ملک رب نواز ایڈووکیٹ، مولانا سید کفیل بخاری، مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر، مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی، عبداللطیف خالد چیمہ، چوہدری ثناء اللہ بھٹہ اور دیگر حضرات بھی شامل ہیں۔

اجلاس میں شرکا کی طرف سے جن خدشات کا اظہار کیا گیا ان میں سے بعض کا تذکرہ قارئین کی معلومات کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے مثلاً ایک قانون دان دوست نے کہا کہ ملک کی پچاس سالہ دستوری جدوجہد کے نتیجے میں جن امور پر قوم کا اجماع منعقد ہوا ہے ان میں یہ بات شامل ہے کہ ملک کے سربراہ یعنی صدر مملکت اور وزیر اعظم دونوں مسلمان ہوں گے اور وہ اپنے عہدہ کا حلف اٹھاتے ہوئے حلف نامہ میں عقیدہ ختم نبوت سے وفاداری کا اظہار کریں گے جبکہ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے عملاً وزیر اعظم کا منصب چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے سنبھال لیا ہے اور یہ مقام انہیں چیف آف آرمی سٹاف کے طور پر حاصل ہوا ہے جس کے لیے مسلمان ہونا شرط نہیں ہے اور انہوں نے نئی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے کوئی نیا حلف بھی نہیں لیا اس لیے ملک کے منتظم اعلیٰ کا مسلمان ہونا اور عقیدہ ختم نبوت کے ساتھ اس کا وفادار ہونا مشکوک ہو کر رہ گیا ہے اسی طرح اعلیٰ

عدالتوں کے ججوں کے حلف نامہ میں ''اسلامی جمہوریہ'' کا جملہ ملک کے نام سے الگ کر دیا گیا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ پی سی او کی رو سے پاکستان کی حیثیت ایک سیکولر ملک کی ہوگئی ہے اور اس حوالہ سے بین الاقوامی حلقوں کی خواہش کم از کم پی سی او کی حد تک پوری ہوتی دکھائی دے رہی ہے اجلاس میں بتایا گیا کہ ۱۹۷۷ء میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے دستور کو معطل کرنے کا اعلان کیا تو اس وقت بھی اسی طرح کی صورت حال پیدا ہوگئی تھی جس پر ملک کے دینی حلقوں نے جنرل موصوف کی توجہ دلائی تو انہوں نے دستور کی اسلامی دفعات اور ختم نبوت سے متعلقہ شقوں کو معطل ہونے سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا بلکہ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے تو آئین میں ترمیم کا اختیار استعمال کرتے ہوئے اسلامی دفعات کو اور زیادہ مضبوط کیا تھا جس کے تحت قرارداد مقاصد کو دستور کے دیباچہ کی بجائے واجب العمل قرار دیا گیا۔ مروجہ قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی اور عقیدہ ختم نبوت کے دستوری فیصلے پر عمل درآمد کے لیے امتناع قادیانیت آرڈیننس نافذ کیا گیا۔

اجلاس کے بعض شرکا کی رائے میں اب بھی اسی نوعیت کی صورت حال پیدا ہوگئی ہے اور اس کا حل بھی وہی ہے کہ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے ملک کے دینی حلقوں کی اس تشویش واضطراب کو محسوس کریں اور پی سی او کے ایک مستقل فرمان کے ذریعہ ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات بالخصوص قرارداد مقاصد، عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کی دفعات اور ملک کے دستوری نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کی بحالی کا اعلان کریں تاکہ اس سلسلہ میں پائے جانے والے شبہات کا خاتمہ ہو۔ اجلاس کے شرکاء نے ملک کی دینی جماعتوں کے قائدین سے بھی گزارش کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس کریں اور ملک کی اسلامی نظریاتی حیثیت اور دستور پاکستان کی اسلامی دفعات کے تحفظ کے لیے مشترکہ طور پر ٹھوس لائحہ عمل اختیار کریں۔ امید ہے کہ جنرل پرویز مشرف اور ملک کے دینی حلقے دونوں اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے قوم کو اعتماد میں لیں گے۔*

---

* روزنامہ اوصاف ۱۷ فروری ۲۰۰۰ء۔

آ ئین کی معطّلی اور دستور کی اسلامی دفعات

دستور پاکستان کے معطل ہونے کے بعد دستور کی اسلامی دفعات، بالخصوص قرارداد مقاصد اور عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ سے متعلقہ شقوں کے حوالے سے دینی حلقے مسلسل تشویش واضطراب کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں گزشتہ دنوں دو وضاحتیں سامنے آئی ہیں۔ ایک وزارت قانون کے ترجمان کی طرف سے اس طرح ہے کہ

''قادیانیوں کے بارے میں آ ئین کے آرٹیکل ۲۶۰ کی کلاز ۳ بدستور نافذ العمل ہے جس کے تحت قادیانی گروپ اور خود کا احمدی کہنے والے لاہوری گروپ کو غیر مسلم قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات وزارت قانون کے ایک ترجمان نے گزشتہ روز بتائی۔ ترجمان نے کہا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آ ئین سے متعلقہ اسلامی دفعات بشمول آرٹیکل ۲۶۰ کی کلاز ۳ کی دفعات ۱۴را کتوبر ۱۹۹۹ء کے آرڈر اور عبوری آ ئینی حکم نمبر ۱، ۱۹۹۹ء سے ہرگز متصادم نہیں بلکہ یہ تمام دفعات اس وقت بھی نافذ العمل ہیں۔ وزارت قانون کے ترجمان نے بعض حلقوں کی طرف سے پھیلائے جانے والے اس تاثر کو قطعی غلط قرار دیا کہ ۱۴را کتوبر ۱۹۹۹ء کو ہنگامی حالات کے نفاذ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آ ئین کو معطل قرار دینے کے بعد قادیانیوں سے متعلقہ آ ئینی دفعات نافذ العمل نہیں رہیں۔ ترجمان نے کہا کہ اس بارے میں پھیلائے گئے شکوک وشبہات بلا جواز ہیں۔ ترجمان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۹۹ء کے عبوری آ ئین کے حکم نمبر ۱ کے آرٹیکل ۲ میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی دفعات معطل ہونے کے باوجود پاکستان کو ہر ممکن طور پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آ ئین کے مطابق ہی چلایا جائے گا۔''

دوسری وضاحت ہمارے محترم دوست اور بزرگ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے نیشنل سکیورٹی کونسل کے رکن کی حیثیت سے کی ہے اور ۲۷ر فروری کو لاہور میں مولانا امین احسن اصلاحی کی یاد میں منعقد ہونے والی تقریب سے خطاب کے بعد اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا ہے کہ

> ''نیشنل سکیورٹی کونسل اسلامی عقائد اور قرارداد مقاصد کو سامنے رکھ کر ہی کوئی کام کرے گی۔ اس کے علاوہ کسی چیز پر عمل نہیں ہوگا۔ دستور میں اسلامی شقیں معطل نہیں ہیں، قادیانی غیر مسلم ہیں اور غیر مسلم ہی رہیں گے، پاکستان میں شریعت ہی سپریم لاء ہے۔ کسی بھی اعلیٰ عدالت نے آج تک شریعت کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ پی سی او کے تحت آئین کی محض مخصوص دفعات کو معطل کیا گیا ہے، سارا آئین معطل نہیں ہے۔ عدالتیں بدستور کام کر رہی ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم نہیں کیا جا رہا۔ یہ ساری غلط فہمیاں ہیں۔ اس کے ممبران کی کم از کم تعداد ۵ موجود ہے۔ آئندہ چند دنوں میں نئے ارکان کی تقرری بھی کر دی جائے گی۔ ان کی سمری چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے پاس ہے۔ موجودہ حکومت پر قادیانی ازم پھیلانے کا الزام درست نہیں۔ یہ افواہیں ہیں۔ جن تین اہم شخصیات کے بارے میں قادیانی ہونے کا کہا گیا ہے، اس کے بارے میں تحقیقات کی گئیں تو وہ درست ثابت نہ ہوا۔''

حکومتی حلقے کی دو ذمہ دار شخصیتوں کی طرف سے اس وضاحت پر جہاں اطمینان کے اس پہلو کا اظہار ضروری ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں دینی حلقوں کے اضطراب کو محسوس کیا ہے اور اس کا نوٹس لیا ہے، وہاں اس قدر تفصیلی وضاحت کے باوجود یہ عرض کرنا بھی نامناسب نہیں ہوگا کہ آئینی بحران اور خلا کے حوالے سے مسئلہ ابھی جوں کا توں ہے اور دستور پاکستان کی مذکورہ اسلامی دفعات اصولی طور پر بدستور ابہام کا شکار ہیں۔ مثلاً یہ بات ڈاکٹر غازی صاحب نے بھی فرمائی ہے اور وزارت قانون کے ترجمان کے بیان میں بھی اس طرح اشارہ موجود ہے کہ دستور پاکستان کی بعض دفعات کو معطل کیا گیا ہے اور ان کے سوا باقی دستور موجود ہے اور ملک کا نظام اس کے مطابق چلانے کی کوشش ہو رہی ہے، لیکن جہاں تک ہمیں یاد ہے، جنرل پرویز مشرف نے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت

سے ملک کا نظم ونسق سنبھالنے کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے بارے میں جو اعلان کیا تھا، وہ یہی تھا کہ دستور پاکستان معطل کر دیا گیا ہے اور جنرل صاحب کے کسی دستوری فرمان میں دستور کی معطل ہونے والی دفعات اور بحال رہنے والی دفعات کی کوئی تفصیل موجود نہیں ہے اور نہ ہی کسی اعلان میں معطل ہونے سے مستثنیٰ قرار پانے والی دستوری دفعات کا کوئی ذکر ہے، اس لیے جب یہ کہا گیا ہے کہ ''دستور معطل ہے'' تو اس کا مطلب یہی ہے کہ پورے کا پورا دستور معطل ہے، ورنہ اس تعطل کے دائرے میں نہ آنے والی دفعات کا علیحدہ طور پر ذکر ضروری تھا، بلکہ وزارت قانون کے ترجمان کی مذکورہ وضاحت کے اس جملہ کو دوبارہ دیکھ لیں کہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی دفعات معطل ہونے کے باوجود پاکستان کو ہر ممکن طور پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے مطابق ہی چلایا جائے گا۔'' اس جملے میں ہمیں دو باتیں واضح طور پر کھٹک رہی ہیں۔ ایک یہ کہ بات ''دستور کے معطل ہونے'' یا ''دستور کی دفعات'' معطل ہونے میں اٹکی ہوئی ہے۔ اگر ''دستور'' معطل ہوا ہے تو اس کی اسلامی دفعات کیسے باقی ہیں اور اگر ''دستور کی دفعات'' معطل ہوئی ہیں تو معطل ہونے والی اور بحال رہنے والی دستوری دفعات کی تفصیل کہاں ہے؟ دوسری بات ''ہر ممکن طور پر'' کا جملہ ہے جو دستور کے مطابق ملک کا نظام چلانے کی گارنٹی کو کمزور کر رہا ہے اور الجھن یہ ہے کہ اس ''ہر ممکن طور پر'' کے تعین کا فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہے اور اس کی چابی کس کے پاس ہے؟

اس ضمن میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دستور کی معطّلی یا اس کی بعض دفعات کی معطّلی یا دستور کی اسلامی دفعات کی بحالی کا تعلق چیف ایگزیکٹو کے دستوری فرمان سے ہے اور جو کچھ بھی خلا یا بحران نظر آ رہا ہے، وہ اسی سے پیدا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وزارت قانون کے ترجمان کی وضاحت یا نیشنل سکیورٹی کونسل کے ایک رکن (ڈاکٹر محمود احمد غازی کے تمام تر احترام کے باوجود ان سے معذرت کے ساتھ) کے ارشاد سے دستور کا خلا پر ہو جاتا ہے اور ان کے فرمودات کو عبوری آئین کے فرمان کا قائم مقام یا اس کا متبادل ہونے کی صلاحیت وحیثیت حاصل ہے؟ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو ہمارے لیے بہت خوشی کی بات ہے اور اس پر اطمینان کا اظہار کرنے اور اس پر حکومت کا شکریہ ادا کرنے میں ہمیں کوئی باک نہیں ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور دستور کے ابہام یا خلا کو دستوری

فرمان نے ہی دور کرنا ہے تو ہم اپنی اس سابقہ درخواست پر بدستور قائم ہیں کہ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف عبوری دستور کے ایک مستقل فرمان کے ذریعے قرارداد مقاصد سمیت دستور کی تمام اسلامی دفعات اور قادیانیوں سے متعلقہ شقوں کی بحالی کا اعلان کریں، کیونکہ اس کے بغیر اس حوالے سے دینی حلقوں کے اضطراب اور تشویش میں کمی نہیں ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی سے ایک اور بات کی وضاحت کی درخواست بھی کررہا ہوں کہ انھوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں تو یہ خوش آئند وضاحت کردی ہے کہ اس کا وجود قائم ہے اور بہت جلد اس کی تکمیل ہونے والی ہے، لیکن اگر سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلٹ بنچ کے بارے میں بھی تازہ صورت حال کی وضاحت فرمادیں تو ان کی بے حد نوازش ہوگی کیونکہ ہمارے خیال میں پی سی او کے تحت اعلیٰ عدالتوں کے نئے حلف کے بعد سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ کے بارے میں بھی شکوک وشبہات ابھر رہے ہیں۔ اب تک سامنے آنے والی صورت حال یہ ہے کہ شریعت اپیلٹ بنچ کے جسٹس خلیل الرحمٰن خان اور جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی نے حلف نہیں اٹھایا تھا اور اس کے بعد کسی نئے ''شریعت اپیلٹ بنچ'' کی تشکیل ہماری نظر سے نہیں گزری، اس لیے ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ دستور پاکستان کی صراحت کے مطابق اس سپریم کورٹ کے ''شریعت اپیلٹ بنچ'' کا ڈھانچہ کیا ہے؟ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے اس دوست کی بات کہیں سچ نہ ہو جائے جس نے سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ کی طرف سے سودی قوانین کے خاتمہ کے تاریخی فیصلے کے بعد کہا تھا کہ ''مولوی صاحب! کیا یہ بنچ اب اپنا وجود قائم رکھ سکے گا؟'' *

O

* روزنامہ اوصاف، ۱۲/مارچ ۲۰۰۰ء۔

نیا قانونی سیٹ اپ اور آئین کی اسلامی دفعات

چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ دنوں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ آئین کی اسلامی دفعات کو ختم نہیں کیا جا رہا ہے اور توہین رسالت کی سزا کے قانون میں بھی کوئی ترمیم نہیں کی جا رہی ہے جبکہ دینی جماعتوں نے پشاور میں مولانا شاہ احمد نورانی کی زیر صدارت منعقد ہونے والے سربراہی اجلاس میں حکومت سے ایک بار پھر مطالبہ کیا ہے کہ آئین کی اسلامی دفعات کو عبوری آئین میں شامل کرنے کے ساتھ ساتھ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں پر عملدرآمد، جمعہ کی چھٹی بحال کرنے، سودی نظام کے خاتمہ، این جی اوز پر پابندی اور دینی مدارس کے معاملات میں مداخلت بند کرنے کا اعلان کیا جائے ورنہ وہ ایک ہفتہ بعد نیا لائحہ عمل طے کرنے پر مجبور ہوں گے۔ دینی جماعتوں اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان یہ آنکھ مچولی کافی دنوں سے جاری ہے اور اس کے پیچھے دینی جماعتوں کا یہ احساس پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہے کہ چونکہ جنرل پرویز مشرف کے گرد ایسی این جی اوز کے عہدیداروں کا گھیرا ہے جو اب تک پاکستان کو سیکولر ریاست کی شکل دینے، آئین کی اسلامی دفعات کو ختم کرانے، توہین رسالت کی سزا کا قانون بدلوانے، عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کی دستوری دفعات کو غیر موثر بنانے اور اسلامی قانون کے نفاذ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے ایجنڈے پر کام کرتی آ رہی ہیں، اس لیے عبوری آئین میں ان امور کو تحفظ فراہم نہ کرنے سے شکوک وشبہات بڑھتے جا رہے ہیں اور دینی جماعتوں کی قیادت ان معاملات کو عبوری آئین کے مستقل فرمان کے ذریعے تحفظ دینے سے کم کسی بات پر مطمئن ہوتی نظر نہیں آتی، جبکہ

دوسری طرف جنرل پرویز مشرف بار بار کہہ رہے ہیں کہ ان کا اسلامی دفعات کو چھیڑے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور اس سلسلے میں دینی جماعتوں کے خدشات بے بنیاد ہیں۔

اس سلسلے میں جنرل پرویز مشرف صاحب کی توجہ کے لیے اس معاملہ کے ایک پہلو پر کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو میرے خیال میں شکوک وشبہات کو بدستور برقرار رکھنے کا باعث بنا ہوا ہے اور اگر جنرل پرویز مشرف اس فضا کو صاف کرنے میں سنجیدہ ہیں تو انہیں اس پہلو پر فوری طور پر توجہ دینا ہوگی۔ وہ پہلو یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف کے وزرا کے بیانات اور ان کے عملہ کی بعض معاملات میں کارکردگی ان کے اعلانات سے مطابقت نہیں رکھتی جس کی وجہ سے دینی حلقوں کی بے اعتمادی میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی ہے۔ مثلاً جنرل پرویز مشرف نے اعلان کیا تھا کہ توہین رسالت کی سزا کے قانون کے نفاذ کا طریق کار تبدیل نہیں کیا جا رہا اور اس سلسلے میں مجوزہ ترمیم واپس لی جا رہی ہے مگر اس اعلان کے تین روز بعد خود ان کی کابینہ کے وزیر جناب عمر اصغر خان کا یہ ارشاد گرامی قومی اخبارات کی زینت بنا ہے کہ توہین رسالت کی سزا کے قانون کے غلط استعمال کی روک تھام کے لیے کوئی متبادل صورت ضرور اختیار کی جائے گی۔

اس قانون کے نفاذ کے طریق کار میں تبدیلی اور اس کی ایف آئی آر کے اندراج کو ڈپٹی کمشنر کی منظوری کے ساتھ مشروط کرنے کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اس قانون میں سزا بہت سخت یعنی موت کی سزا ہے اور عام طور پر اس قانون کا غلط استعمال ہوتا ہے، اس لیے قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے طریق کار میں تبدیلی ضروری ہے، لیکن ایک عام آدمی جب یہ سوچتا ہے کہ موت کی سزا تو اور بھی بہت سے جرائم میں ہمارے قوانین کا حصہ ہے اور ان قوانین کا غلط استعمال بھی ہمارے معاشرے میں عام طور پر ہوتا ہے، پھر ان میں سے طریق کار کی تبدیلی کی بات صرف توہین رسالت کی سزا کے قانون کے حوالہ سے کیوں کی جاتی ہے تو اس عام شہری کے ذہن میں تشویش پیدا ہوتی ہے کہ قانون کے غلط استعمال کی بات محض ایک بہانہ ہے اور اصل مقصد توہین رسالت کی سزا کے قانون کو غیر موثر بنانا ہے۔ پھر ایک قانون دان اس سے آگے بڑھ کر دیکھتا ہے کہ ہمارے ہاں قتل کے جرم میں یہ طریق کار پہلے رائج تھا کہ مقدمہ سیشن کورٹ میں پیش ہونے اور ملزم

پر فردِ جرم عائد ہونے سے پہلے مجسٹریٹ درجہ اول کے ذریعہ کیس کی چھان بین ہوتی تھی اور اس کے بعد اسے سیشن کورٹ میں پیش کیا جاتا تھا مگر اس طریق کار کو قتل کے مقدمات میں غیر ضروری قرار دے کر ختم کر دیا گیا تو اب وہی طریقہ کار توہین رسالت کے مقدمات میں واپس کیوں لایا جا رہا ہے؟ اب اس سلسلہ میں ایک طرف جنرل پرویز مشرف کا اعلان ہے کہ اس قسم کی کوئی ترمیم نہیں کی جا رہی اور دوسری طرف ان کے اس اعلان کے بعد ان کے وزیر عمر اصغر خان اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے کوئی متبادل طریق کار ضرور اختیار کیا جائے گا تو جنرل پرویز مشرف خود سوچ لیں کہ ان کے اعلان پر عوام اور دینی حلقوں میں اعتماد اور اطمینان کی فضا کس طرح قائم ہو سکتی ہے؟

اسی طرح جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ روز کہا کہ وہ جمعہ کی چھٹی بحال کرنے پر غور کر رہے ہیں لیکن ان کے وزیر داخلہ جنرل (ر) معین الدین حیدر کا یہ ارشاد بھی قومی پریس کے ذریعہ عوام کی نظر سے گزرا ہے کہ جمعہ کی چھٹی کا فیصلہ چونکہ منتخب پارلیمنٹ نے کیا تھا، اس لیے ہم اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ اس پر عام لوگوں کی یہ سوچ ایک طرف کہ منتخب پارلیمنٹ کا دیا ہوا پورے کا پورا آئین لپیٹ کر ایک طرف رکھ دینے والوں کو صرف جمعہ کی چھٹی کے بارے میں منتخب پارلیمنٹ کا فیصلہ کس طرح یاد رہ گیا، مگر اس سے قطع نظر جنرل پرویز مشرف اتنی بات ضرور سوچیں کہ جمعہ کی چھٹی کے بارے میں ان کے اعلان اور ان کے وزیر داخلہ کے بیان کو سامنے رکھتے ہوئے عوام اور دینی حلقوں میں اعتماد اور اطمینان کی لہر آخر کدھر سے آئے گی؟

اسی طرح جنرل پرویز مشرف کی حکومت کی طرف سے بار بار اعلان کیا جا رہا ہے کہ دینی مدارس کے معاملات میں مداخلت نہیں کی جائے گی مگر عملاً صورت حال یہ ہے کہ مدارس کے مختلف معاملات کا سروے ملک بھر میں جاری ہے، طلبہ کی چھان بین ہو رہی ہے اور حسابات کی پڑتال کے حوالہ سے مداخلت کا راستہ کھولنے کی کوشش جاری ہے۔ اس سلسلے میں بطور مثال ایک کیس کا حوالہ دینا چاہوں گا کہ ملک کی معروف دینی درس گاہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے انتظامات کا گزشتہ سال تنازعہ ہوا۔ مہتمم صاحب نے شہر کے علما، مدرسہ کے معاونین اور مسجد کے نمازیوں کے تعاون

سے مدرسہ کے نظام کو کنٹرول کر لیا اور نئی انتظامیہ قائم ہو گئی جس کے تحت کسی خلل اور نقصان کے بغیر مدرسہ کا نظام چل رہا ہے، جبکہ دوسرا فریق سول کورٹ میں چلا گیا ہے جہاں ملک کے مروجہ قانون کے مطابق کیس کی سماعت ہو رہی ہے، مگر یہ کیس اب ملٹری مانیٹرنگ سیل گوجرانوالہ کے انچارج کی میز پر پڑا ہوا ہے، مدرسہ کے منتظمین کی دو دفعہ ان کے سامنے پیشی ہو چکی ہے اور ملٹری مانیٹرنگ سیل کے انچارج صاحب کی خواہش یہ دکھائی دے رہی ہے کہ معروضی حقائق اور سول کورٹ کے مقدمہ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ کسی نہ کسی طرح مصلحت کے نام پر مدرسہ کی سابقہ انتظامیہ کو پھر سے مدرسہ کے معاملات میں دخیل کر دیں جو ظاہر ہے کہ دباؤ اور مداخلت ہی کی ایک شکل تصور ہو گی۔

جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ ان کے اعلانات اپنی جگہ، مگر انہیں اپنے ساتھیوں کے بیانات اور اپنی مشینری کی کارکردگی پر بھی نظر رکھنی چاہیے کیونکہ اگر ان میں آپس میں تضاد ہو گا تو ان کا کوئی واضح سے واضح اعلان بھی عوام اور دینی حلقوں میں اعتماد کی فضا بحال نہیں کر سکے گا اور دینی حلقوں کی بے چینی کو کم کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو گی۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۲/جون ۲۰۰۰ء۔

کیا اسلامی نظام صرف مولویوں کا مسئلہ ہے؟

وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر نے یہ کہہ کر اسلامی نظام اور اس کی علم بردار دینی قوتوں کے خلاف ایک بار پھر وہی گھسی پٹی دلیلیں دہرائی ہیں جو اس سے قبل پچاس سال سے ہم سن رہے ہیں کہ ''الگ الگ جھنڈے اٹھا کر مذہبی جماعتیں ملک میں کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتی ہیں اور اگر دینی جماعتیں واقعی موزوں، مفید اور مناسب طور پر یہ کام کر رہی ہیں تو وہ اب تک کے الیکشنوں میں اچھے نتائج کیوں نہیں دکھا پائیں؟''

یہ بات پاکستان کے قیام کے بعد ہی سیکولر حلقوں نے کہنا شروع کر دی تھی کہ ملک میں مختلف دینی مکاتب فکر ہیں اور اسلام کی الگ الگ تعبیر وتشریح کر رہے ہیں، اس لیے یہاں کون سا اسلام نافذ کیا جائے گا؟ لیکن تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علمائے کرام نے تحریک پاکستان کے عظیم راہنما علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت اسلامی نظام کی ۲۲ متفقہ دستوری بنیادیں طے کر کے اس بات کو رد کر دیا تھا اور قوم کو یہ بتا دیا تھا کہ مختلف مکاتب فکر اور فقہی مذاہب میں فروعات، جزئیات اور تعبیرات میں جو اختلافات موجود ہیں، ان کا اسلامی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسلامی نظام کے اصولوں، طریق کار اور احکام وقوانین کے ضوابط پر وہ سب متفق ہیں۔ اس اتفاق واجتماع مس اہل السنۃ والجماعۃ اور اہل تشیع دونوں شامل تھے۔ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کے اکابر شریک تھے اور کوئی مسلمہ مذہبی مکتب فکر اس سے باہر نہیں تھا۔ اس لیے یہ دلیل اسی وقت دم توڑ گئی تھی کہ ملک میں کون سا اسلام نافذ کیا جائے اور کس مذہبی

مکتب فکر کی تعبیر وتشریح کو نفاذِ اسلام کی بنیاد بنایا جائے۔ جناب معین الدین حیدر کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ان دستوری نکات اور خاکہ پر آج بھی ملک کے تمام مکاتب فکر متحد ہیں اور کسی مذہبی فرقہ کو ان سے کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لیے اگر جناب معین الدین حیدر اور ان کے رفقا ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے اصولوں سے متفق ہیں تو انھیں ''کون سا اسلام؟'' کی بے جا رٹ چھوڑ کر تمام مکاتب فکر کے متفقہ ۲۲ دستوری نکات کو دستور پاکستان میں سمو کر ان کی بنیاد پر نفاذ اسلام کا آغاز کر دینا چاہیے۔

پھر یہ دلیل اس وقت بھی دہرائی گئی تھی جب ۱۹۷۳ء کے دستور کے لیے دستور ساز اسمبلی میں بحث ہو رہی تھی اور دستور ساز اسمبلی میں مولانا مفتی محمود، مولانا عبد الحق، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبد المصطفیٰ ازہری، مولانا محمد ذاکر اور پروفیسر غفور احمد سمیت تمام بڑے مکاتب فکر کے نمائندے موجود تھے۔ اس وقت حکمران کیمپ کی طرف سے چیلنج کیا گیا تھا کہ یہ علما تو ''مسلمان کی قانونی تعریف'' پر متفق نہیں ہو سکتے، اس لیے اسلامی نظام کی متفقہ تعبیر کہاں سے لائی جائے گی، مگر ان علمائے کرام نے دستور ساز اسمبلی میں نہ صرف ''مسلمان کی متفقہ تعریف'' پیش کی بلکہ دستور میں اسلامی نکات کی شمولیت کے لیے متحد ہو کر پارلیمانی جنگ لڑی جس کے نتیجے میں حکمران کیمپ کو اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینا پڑا اور ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھال دینے کی ضمانت دینا پڑی۔ اسمبلی میں موجود علما کے اس موقف کو اسمبلی سے باہر کے تمام علمائے کرام اور مکاتب فکر کی تائید حاصل تھی اور پوری قوم اس پر متفق تھی، لیکن دستوری ضمانت کے باوجود ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا یہ وعدہ ابھی تک پورا نہیں ہوا اور قوم بدستور انتظار میں ہے۔

جناب معین الدین حیدر سے گزارش ہے کہ اسی دستور نے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' قائم کی ہے جس میں نہ صرف تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علمائے کرام شامل ہیں بلکہ عصری قانونی نظام کے نمائندے بھی موجود ہیں۔ اس کونسل نے ملک کے قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جو مسودات مرتب کیے ہیں اور جو سفارشات پیش کی ہیں، ان پر تمام مکاتب فکر کے علمائے

کرام کا اجماع اور اتفاق ہے اور ۲۲ دستوری نکات کی اصولی اور آئینی دستاویز کے بعد ملکی قوانین کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ جامع اور مکمل رپورٹ دوسری بڑی دستاویز ہے جو متفقہ ہے جس سے ملک کے کسی مسلمہ مذہبی مکتب فکر کو اختلاف نہیں اور اس میں تمام مروجہ قوانین کے بارے میں تفصیلی تجزیہ اور سفارشات موجود ہیں، اس لیے جب ''دستور'' اور ''قانون'' دونوں معاملات میں تمام مذہبی جماعتوں کا اتحاد موجود ہے اور ریکارڈ پر ہے تو ہمارے وزیر داخلہ محترم علمائے کرام سے اور کس قسم کے اتحاد کا تقاضا کر رہے ہیں اور انھیں مذہبی جماعتوں کے الگ الگ جھنڈوں میں کون سا ایسا اختلاف نظر آ رہا ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ میں رکاوٹ بن سکتا ہو؟

جناب معین الدین حیدر نے دوسری بات یہ کی ہے کہ اگر مذہبی جماعتیں مفید ہیں تو انھیں الیکشن میں عوامی حمایت حاصل کیوں نہیں ہوتی؟ ہمارا ان سے سوال یہ ہے کہ اگر عوامی حمایت ہی واحد معیار ہے اور انھوں نے سارے فیصلے اس کی کسوٹی پر پرکھ کر کرنے ہیں تو ان کے پاس بھاری عوامی مینڈیٹ رکھنے والی حکومت اور قومی اسمبلی کو توڑنے کا کیا جواز ہے؟ بے شک عوام نے مولویوں کی حمایت نہیں کی تھی مگر اس اسمبلی کو تو ووٹ دیے تھے۔ اسے توڑ کر جناب معین الدین حیدر وزارت داخلہ کا قلم دان کس اصول کے تحت سنبھالے ہوئے ہیں؟ ہماری گزارش کا مطلب یہ نہیں کہ ہم موجودہ حکومت کے قانونی اور اخلاقی جواز کو چیلنج کر رہے ہیں بلکہ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حکومت کا وجود اور اس میں جناب معین الدین حیدر کا وزارت داخلہ کے منصب کو سنبھالنا اس بات کی دلیل ہے کہ قومی معاملات میں عوامی حمایت اور ووٹنگ پاور واحد معیار نہیں ہے بلکہ اس کے ہوتے ہوئے بھی بعض دیگر امور کی طرف دیکھنا اور انھیں ملحوظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے اور بسا اوقات قومی مفاد کے دیگر معاملات عوامی حمایت اور ووٹنگ پاور سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کی خاطر عوامی ووٹوں سے منتخب ہونے والی اسمبلیوں اور حکومتوں کو برطرف کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا معاملہ بھی ان اہم ترین قومی امور اور ملی معاملات میں سے ہے جنھیں صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا پرچم اٹھانے والی جماعتوں کو الیکشن میں ووٹ نہیں ملتے۔ یہ ہمارے ایمان کا معاملہ ہے، پاکستان کی نظریاتی بنیاد کا مسئلہ ہے اور ملکی بقا

واستحکام کا تقاضا ہے اور اسے اسی حوالے سے دیکھنا ہوگا۔ ہم مانتے ہیں کہ دینی جماعتوں میں اختلافات موجود ہیں جو اسلامی دستور اور قوانین کے کسی مسئلہ یا ان کے نفاذ کے طریق کار پر نہیں ہیں بلکہ غیر متعلقہ امور اور قیادت کی ترجیحات پر ہیں اور ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دینی جماعتوں اور ان کی قیادتوں کی یہ باہمی معاصرت اور ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچ کر آگے بڑھنے کی کشمکش نفاذ اسلام کی جدوجہد کے لیے سخت نقصان دہ ہے اور اسی وجہ سے انتخابات میں انھیں عوامی حمایت حاصل نہیں ہوتی، ورنہ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی دینی قوتیں متحد ہوئی ہیں، عوام نے ان کے پرچم تلے مجتمع ہونے میں کبھی دیر نہیں لگائی، لیکن اس سب کچھ سے قطع نظر ہم جناب معین الدین حیدر سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ الگ الگ جھنڈے اٹھانے والی مذہبی جماعتوں کو ایک طرف رہنے دیں، انھیں آپس میں لڑنے جھگڑنے دیں، انھیں بھول جائیں اور صرف یہ دیکھیں کہ اسلام ہماری ملی ضرورت اور قومی تقاضا ہے۔ آپ خود مسلمان ہیں، قرآن وسنت پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلامی نظام وقوانین کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، اس لیے جب آپ کے پاس اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت جیسے دستوری اداروں کے مرتب کردہ اسلامی قوانین کے مسودات موجود ہیں تو پھر آپ کو انتظار کس بات کا ہے؟ آپ انھیں نافذ کیوں نہیں کر دیتے اور دنیا کو یہ کیوں نہیں بتا دیتے کہ یہ مذہبی جماعتیں تو خود کو اس کا اہل ثابت نہیں کر سکیں مگر ہم نے پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کر دیا ہے اور نوآبادیاتی دور کے استحصالی نظام سے ملک کی جان چھڑا کر قرآن وسنت کے عادلانہ قوانین واحکام کی عملداری قائم کر دی ہے؟ اور اگر جناب معین الدین حیدر ناراض نہ ہوں تو ڈرتے ڈرتے ان سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا اسلامی نظام صرف مولویوں اور مذہبی جماعتوں کا مسئلہ ہے، آپ کا مسئلہ نہیں ہے؟ اور اگر یہ آپ کا مسئلہ بھی ہے تو پھر بال کو مولویوں کی کورٹ میں پھینک کر آپ خود کو ہر ذمہ داری سے بری ظاہر کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟*

---

* روزنامہ اوصاف، ۴ نومبر ۲۰۰۰ء۔

پاکستان ''آئیڈیل ازم'' کے لیے بنا ہے

صدر جنرل پرویز مشرف نے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے بہت کچھ فرمایا ہے اور ریفرنڈم مہم کے لیے جن پبلک جلسوں کا حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے، ان میں بھی صدر محترم بہت کچھ فرمائیں گے۔ انہوں نے آئندہ سیاسی نظام کے لیے اپنی ذات کو محور بنانے اور آئینی ترامیم کے حوالہ سے اپنی سوچ کو واحد بنیاد قرار دینے کا اعلان کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اپنی روایات کی پاس داری معروضی حالات میں ان کا ''حق'' بنتا ہے کیونکہ پاکستان کے ہر چیف آف آرمی سٹاف کو عملاً ملک میں سب سے بڑے ''پاور بروکر'' کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جن دوسرے دو افراد کو صدر محترم نے

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

کے مصداق ''پاور بروکر'' ہونے کا الزام دیا ہے، وہ غریب تو صرف ''بروکری'' کرتے ہیں اور ان میں سے جس نے بھی کبھی ''پاور'' کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی، ایک ہی جھٹکے نے اس کا کام نمٹا دیا ہے۔ مگر اس سے ہٹ کر ہم صدر محترم کے طویل خطاب کے صرف ایک حصہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جس میں انہوں نے ''آئیڈیل ازم'' اور ''رئیل ازم'' کو موضوع بحث بنایا ہے اور قوم کو یہ سبق دیا ہے کہ ''آئیڈیل ازم'' کے پیچھے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ''رئیل ازم'' ہی سب کچھ ہے جس کے بغیر ہم قوموں کی موجودہ برادری میں جگہ حاصل نہیں کر سکتے، اس لیے عالمی برادری کی خواہشات اور مطالبات پر وہ جو کچھ کر رہے ہیں یا جو کچھ کرنا چاہ رہے ہیں، اس پر صاد کیا

جائے اور ان کا اس میں ساتھ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ''کالم نویسوں'' کو بھی طعنہ دیا ہے کہ وہ ان کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر بہت کچھ لکھتے جا رہے ہیں اور ان کو حالات کا کچھ علم نہیں ہے۔

جہاں تک ''کالم نویسوں'' کا تعلق ہے، ان کے حوالہ سے ہم صدر محترم سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ ''کالم نویسوں'' کی ایک بڑی مجبوری ہے۔ وہ یہ کہ انہیں لکھنے سے قبل پڑھنا بھی پڑتا ہے اور جو کچھ وہ پڑھتے ہیں، اس کے بارے سوچنا بھی ان کی ایک مجبوری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو پڑھے گا اور اس کے بارے میں کچھ سوچے گا بھی، وہ صرف ''معروضی حالات'' پر قناعت نہیں کرے گا۔ وہ ان حالات کے پس منظر کا جائزہ لے گا اور ان کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔ پھر وہ ''رئیل ازم'' ہی کو سب کچھ قرار دے کر مستقبل سے آنکھیں بند نہیں کرلے گا بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ لوگ کرنے جا رہے ہیں، ان کے نتائج وعواقب کا بھی اندازہ لگائے گا اور ان کے مثبت ومنفی ثمرات تک فکری رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے گا اور یہ بات طے ہے کہ جو ''کالم نویس'' ان سب مراحل سے گزرے گا، وہ یقیناً وہ کچھ نہیں لکھے گا جس کی صدر محترم کالم نویسوں سے توقع کر رہے ہیں، البتہ صدر محترم کو مکمل مایوسی نہیں ہوگی کیونکہ ان کی توقعات پر پورا اترنے والے قلم کاروں کی بھی کسی دور میں کمی نہیں رہی۔ نہ اب اس کا میدان خالی ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی اس کا خلا پیدا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب دھند چھٹے گی تو انہیں اپنا نیا قبلہ تلاش کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا، صرف اتنا وقت جتنا کسی پریس کے مشین مین کو روشنائی کا رنگ تبدیل کرنے میں لگتا ہے۔

باقی رہی بات ''آئیڈیل ازم'' یا ''رئیل ازم'' میں سے کسی ایک کے انتخاب کی تو ہم بصد ادب واحترام یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے حوالہ سے یہ بات اسی روز طے ہوگئی تھی جب مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے معروضی حالات اور ان کے منطقی نتائج کو قبول کرنے سے قطعی انکار کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے جنوبی ایشیا میں الگ سلطنت کا تصور پیش کیا تھا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس تصور کی تکمیل کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سیاسی مشن قرار دے کر پاکستان کے نام سے ایک الگ اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ یہ ''رئیل ازم''

سے ''آئیڈیل ازم'' کی طرف سفر تھا اور اس سفر کے ''بیس کیمپ'' کے طور پر ''پاکستان'' کی الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ہم اس سے قبل بھی اس کالم میں عرض کر چکے ہیں کہ گزشتہ صدی کے آغاز میں عالم اسلام کو دو لیڈر ملے تھے: ایک مصطفیٰ کمال اتاترک جنہوں نے ''آئیڈیل ازم'' کا راستہ اختیار کیا تھا اور خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے عالمی برادری کے تقاضوں اور خواہشات کے مطابق ''رئیل ازم'' کے تحت ترکی کو سیکولر جمہوریہ قرار دیا تھا، اور دوسرے قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے جنہوں نے ''رئیل ازم'' کو مسترد کر کے ''آئیڈیل ازم'' کی طرف قدم بڑھایا اور جدوجہد کرتے ہوئے عین اس دور میں اسلام کے نام پر ایک ریاست بنا ڈالی جب پوری دنیا میں نفس مذہب کو ریاستی معاملات سے الگ کیا جا رہا تھا اور مذہبی اقدار وروایات کو حکومتی معاملات سے لاتعلق کرنے کا عمل عالمی سطح پر آخری مراحل میں داخل ہو گیا تھا۔

اس وقت کا ''رئیل ازم'' وہی تھا جس کا اظہار مصطفیٰ کمال اتاترک نے کیا تھا اور جس کو اپنا کر عربوں نے خلافت کا ادارہ ختم کرنے کے بعد مغربی اتحاد کی سرپرستی میں علاقائی قومیتوں کے عنوان سے الگ الگ ریاستی تشخصات قائم کر لیے تھے۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ بھی ''رئیل ازم'' پر صاد کر دیتے تو اس سارے بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نہ برصغیر تقسیم ہوتا، نہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہوتا، نہ کروڑوں مسلمان بے گھر ہوتے، نہ جنوبی ایشیا میں پاکستان اور بھارت کے نام سے کشیدگی اور تصادم کے دو الگ الگ کیمپ قائم ہوتے، نہ کشمیر کا مسئلہ ہوتا، نہ اسلحہ کی دوڑ لگتی، نہ غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی سے دونوں طرف جرنیلوں کی فوج ظفر موج وجود میں آتی اور نہ ہی دونوں طرف بڑی بڑی فوجیں ملکی وسائل اور عوامی دولت کے ایک بڑے حصے پر ہاتھ صاف کر کے دونوں ملکوں کی معاشی ترقی اور عوامی خوش حالی کا راستہ روکتیں۔ یہ سب کچھ ''رئیل ازم'' سے دست بردار ہونے اور ''آئیڈیل ازم'' کو منزل مقصود قرار دینے کا نتیجہ ہے اور جنوبی ایشیا کے کروڑوں مسلمان گزشتہ پون صدی سے یہ ساری قربانیاں صرف اور صرف ''آئیڈیل ازم'' کے لیے دے رہے ہیں جس ''آئیڈیل ازم'' کی وضاحت خود قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ جلسہ میں ان الفاظ کے ساتھ کی تھی کہ:

''مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت کیا ہوگا؟ پاکستان کا طرزِ حکومت متعین کرنے والا میں کون؟ یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے اور میرے خیال میں مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے تیرہ سو برس قبل قرآن کریم نے فیصل کر دیا تھا۔''

اس لیے ہم صدر جنرل پرویز مشرف سے اس حوالہ سے دو گزارشات کرنا چاہتے ہیں: ایک یہ کہ ''آئیڈیل ازم'' سے قوم کی توجہ ہٹا کر اسے ''رئیل ازم'' پر لانے کے لیے انہیں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی گزشتہ پون صدی کی جدوجہد، قربانیوں اور ملی سفر کی نفی کرنا ہوگی کیونکہ پاکستان ''رئیل ازم'' کے لیے نہیں بلکہ ''آئیڈیل ازم'' کے لیے وجود میں آیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جب ان کے ذہن میں ایجنڈا مصطفیٰ کمال اتاترک والا ہے تو اس کے اظہار اور اعتراف میں وہ حجاب کیوں محسوس کر رہے ہیں اور اس کے لیے انہیں قائد اعظمؒ کا نام لینے اور ان کی چھتری استعمال کرنے کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے؟*

O

* روزنامہ اوصاف، ۱۲/اپریل ۲۰۰۲ء۔

اتاترک کی تقلید سے کچھ حاصل نہیں ہوگا

صدر جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالتے ہی مصطفیٰ کمال اتاترک کو اپنا آئیڈیل قرار دے کر کسی ابہام کے بغیر اپنی پالیسی ترجیحات کا جو دوٹوک اعلان کیا تھا، وہ اس پر بدستور قائم ہیں اور ان کی اب تک کی پالیسیوں اور اعلانات کا تسلسل اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ ان کی زبان پر اقتدار کے پہلے روز مصطفیٰ کمال اتاترک کا نام محض اتفاقی طور پر نہیں آ گیا تھا، بلکہ اس کے پیچھے شعور اور عزائم کا ایک بھرپور پس منظر کارفرما تھا، اس لیے دینی اقدار و شعائر اور اسلام کے روایتی ڈھانچے کے حوالے سے وہ وقتاً فوقتاً جو کچھ بھی کہتے ہیں، ہمارے لیے غیر متوقع نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمیں اس پر کسی قسم کی حیرت ہوتی ہے۔

مصطفیٰ کمال اتاترک جدید ترکیہ کے بانی ہیں اور برادر ترکی قوم کے محترم لیڈر کے طور پر ہم ان کا احترام کرتے ہیں، بلکہ اس تاریخی حقیقت کا پوری طرح ادراک بھی رکھتے ہیں کہ آج جمہوریہ ترکی ایک ملک کے طور پر اگر موجود ہے اور اس کا شمار آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو اس کا کریڈٹ مصطفیٰ کمال اتاترک کا جائز حق ہے جنھوں نے ترک نیشنلزم کے نام پر ایک طرف خلافت عثمانیہ کا بوریا بستر سمیٹ کر عثمانی ایمپائر کو تاریخ کی نذر کر دیا تھا جبکہ دوسری طرف اسی ترک نیشنلزم کے ہتھیار سے یورپی مداخلت کاروں کا مقابلہ کر کے ترک قوم اور ملک کو ان کی دست برد سے بچا لیا تھا، ورنہ خلافت عثمانیہ کے خلاف صدیوں جنگ لڑنے والے یورپی ممالک نے جس طرح ترکی کے حصے بخرے کر کے ڈکار لیے بغیر ہضم کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا، اگر مصطفیٰ کمال اتاترک ان

کے کباب میں ہڈی نہ بنتے تو ترکی آج ایک آزاد اور خودمختار ملک اور قوم کے طور پر موجود نہ ہوتا۔

ہمیں مصطفیٰ کمال اتاترک کے اس کردار کا نہ صرف اعتراف ہے، بلکہ ہم اس کا پوری طرح احترام بھی کرتے ہیں، لیکن ہمیں شکایت ہے کہ انھوں نے یورپی برادری میں شامل ہونے کے شوق میں اسلامی اقدار و روایات اور دینی شعائر کی جو قربانی دی اور جس بے دردی کے ساتھ ترکی میں اسلام کی دینی و ثقافتی علامات کا یکے بعد دیگرے خاتمہ کیا، اس نے ترکی کو کسی طرف کا نہیں رہنے دیا۔ دینی احکام و روایات اور شعائر کو مسلسل مٹاتے چلے جانے کے باوجود ترکی کو ابھی تک یورپی یونین کا رکن بننے کا جائز حق دار تصور نہیں کیا جا رہا اور اس کے یورپی برادری میں شامل ہونے کی راہ میں موجود رکاوٹیں ہنوز ناقابلِ عبور دکھائی دے رہی ہیں۔ ہمیں بھی وہی مسئلہ درپیش ہے، صرف تناظر میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ ترکی کو یورپی برادری میں شامل ہونے کا شوق تھا جس کے لیے اسے اتنا پاپڑ بیلنے پڑے اور خدا جانے کب تک ان پاپڑوں سے اس کا واسطہ رہے گا، جبکہ ہمیں عالمی برادری کا قابلِ قبول حصہ بننے کا شوق تنگ کر رہا ہے اور ہمارے صدرِ محترم اس شوق کی تکمیل کے لیے مصطفیٰ کمال اتاترک کے نقشِ قدم پر مسلسل پیش رفت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تمام تر کوششوں اور پروگراموں کا مرکز و محور یہی ہے کہ ہمیں آج کی عالمی برادری اور ورلڈ سسٹم میں ایسا مقام حاصل ہو جائے کہ ہماری کسی بات پر عالمی برادری کو اعتراض نہ ہو اور ہمارا کوئی معاملہ ورلڈ سسٹم کے لیے ناقابلِ قبول نہ ہو۔ ترکی کی یہ الجھن یورپی برادری کے حوالے سے تھی، مگر ہماری الجھن عالمی برادری کے حوالے سے ہے اور ہم یہ دیکھے بغیر کہ گزشتہ پون صدی میں ترکی کو اس طرزِ عمل سے کیا حاصل ہوا ہے، اسی راہ پر چلنے کے لیے بے چین ہیں۔

گزشتہ دنوں صدر جنرل پرویز مشرف نے ڈاڑھی اور برقعے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے قبل وہ چور کے ہاتھ کاٹنے کی قرآنی سزا کا جس انداز سے ذکر کر چکے ہیں اور اس سے بھی پہلے ایک موقع پر نماز کے ضروری ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے انھوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ ملک کے عام دینی حلقوں کے لیے ضرور حیرت کا باعث ہوگا، مگر ہمارے لیے غیر متوقع نہیں ہے، اس لیے کہ جمہوریہ ترکیہ کی گزشتہ پون صدی کی ہر تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ ترکی کے قوم

پرست لیڈروں کو یورپی برادری کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کے لیے کیا کچھ کہنا پڑا تھا، کیا کچھ کرنا پڑا تھا اور کس کس چیز سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح عالم اسلام کا جو لیڈر بھی آج کی عالمی برادری اور ورلڈ سسٹم کو آئیڈیل قرار دے کر اس کے ساتھ ایڈجسٹ ہونا چاہے گا، اسے یہ سب کچھ کہنا پڑے گا اور اس سے کہیں زیادہ کرنا بھی پڑے گا۔ اس کے بغیر کسی مسلمان لیڈر کو آج کا ورلڈ سسٹم پسندیدگی اور قبولیت کی سند دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

صدر جنرل پرویز مشرف کی خدمت میں ان کے مذکورہ بالا ارشادات کے حوالے سے ہم دو گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی شعائر واقدار اور اسلام کے چودہ سو سال سے چلے آنے والے روایتی ڈھانچے سے لاتعلقی کے اظہار کے لیے بے چارے مولوی کو رگیدنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی جواز ہے، اس لیے کہ مولوی ان میں سے کوئی بات بھی اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ وہ ہر مسلمان کے لیے پانچ وقت کی نماز کی روزانہ ادائیگی کو ضروری قرار دیتا ہے تو یہ اس کا کوئی خود ساختہ مسئلہ نہیں بلکہ قرآن کریم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح حکم ہے کہ ہر عاقل و بالغ مسلمان کے لیے روزانہ پانچ وقت نماز کی ادائیگی اس کے فرائض میں سے ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان اور کافر کے درمیان فرق و امتیاز کی علامت ہی نماز کی ادائیگی کو قرار دیا ہے۔ مولوی اگر یہ کہتا ہے کہ قرآن کریم کے حکم کے مطابق چور کے لیے ہاتھ کاٹنے کی شرعی سزا ملک میں نافذ کی جائے تو یہ سزا اس نے مقرر نہیں کی، قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ مولوی جب یہ کہتا ہے کہ مرد اور عورت کا آزادانہ اختلاط شرعاً درست نہیں ہے اور عورت کے لیے حجاب کی پابندی اسلام کی رو سے ضروری ہے تو یہ ضابطہ بھی مولوی نے وضع نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اسی طرح مولوی اگر ڈاڑھی کو سنت نبوی قرار دیتا ہے تو یہ اس کا خود ساختہ مسئلہ نہیں ہے، بلکہ احادیث کے ذخیرے میں بہت سی روایات موجود ہیں جن میں ڈاڑھی کو مرد کے لیے زینت اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بتایا گیا ہے۔

ان میں سے کوئی مسئلہ بھی مولوی کا وضع کردہ نہیں ہے۔ وہ اس حوالے سے صرف دو باتوں کا ''مجرم'' ہے۔ ایک یہ کہ وہ جو کچھ قرآن کریم میں پڑھتا ہے یا سنت نبوی میں دیکھتا ہے، اسے بیان کر

دیتا ہے اور ان میں سے کسی بات کو صرف اس لیے چھپاتا نہیں ہے کہ یہ بات ورلڈ سسٹم کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے یا عالمی برادری اس بات کو پسند نہیں کر رہی، جبکہ اس کا دوسرا ''جرم'' یہ ہے کہ وہ قرآن سنت کے احکام وقوانین کی کوئی ایسی تعبیر وتشریح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذخیرے اور امت کے چودہ سوسالہ اجتماعی تعامل سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسے اس بات کا کوئی شوق نہیں ہے کہ آج کا ورلڈ سسٹم اور عالمی برادری اسے پسندیدگی کا سرٹیفکیٹ جاری کرے، کیونکہ وہ پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ آج کے ورلڈ سسٹم اور عالمی برادری کو اسلام کی جس جس بات پر اعتراض ہے، اس میں اسلام کا موقف صحیح ہے اور عالمی برادری کا موقف غلط ہے۔ یہ بات بھی اس کے ایمان ویقین کا حصہ ہے کہ بالآخر اس حوالے سے عالمی برادری اور ورلڈ سسٹم کو ہی اپنے موقف سے ہٹنا پڑے گا اور اسلام کے فطری اصولوں کی طرف واپس آنا پڑے گا۔

طاقت کے مراکز پر قبضہ کر لینا اور دولت کے وسائل پر اجارہ داری قائم کر لینا اور بات ہے جبکہ کسی فکر و فلسفہ اور نظام وثقافت کا صحیح اور حق ہونا اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ حق اور باطل ہونے کا فیصلہ کبھی طاقت اور دولت کی بنیاد پر نہیں ہوا۔ تاریخ میں اس سے قبل بھی بہت سے مراحل آئے ہیں جب طاقت اور دولت نے محض طاقت کے بل پر خود کو حق ثابت کرنے اور دنیا سے منوانے کی کوشش کی ہے، لیکن اسے کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اب بھی نہیں ہوگی، اس لیے جس کو بھی اسلام کے روایتی ڈھانچے اور دینی شعائر وروایات سے دست بردار ہونا ہے، اسے اخلاقی جرات سے کام لینا چاہیے اور مولوی کو آڑ بنا کر اسلام پر چاند ماری کی مشق نہیں کرنی چاہیے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ اگر ہمارے صدر محترم نے مصطفیٰ کمال اتاترک کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو انھیں اسلامی اقدار وروایات سے لاتعلقی کے حوالے سے ترک قوم کی پون صدی کی کوششوں کے نتائج پر بھی ایک نظر ضرور ڈال لینی چاہیے اور یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کیا وہ اس کام میں اس حد تک آگے جا سکیں گے جہاں تک مصطفیٰ کمال اتاترک چلے گئے تھے اور اگر خدانخواستہ انھوں نے ایسا کر بھی لیا تو انھیں اس کے نتیجے میں ترکی سے مختلف کیا نتیجہ حاصل ہو سکے گا؟*

* روزنامہ پاکستان لاہور، ۲۳ر دسمبر ۲۰۰۴ء۔

پاکستان کا نظریاتی تشخص اور صدر مشرف کی وضاحت

متحدہ مجلس عمل کے اعلیٰ سطحی وفد سے بات چیت کرتے ہوئے صدر جنرل پرویز مشرف نے کہا ہے کہ پاکستان اسلامی ریاست ہے اور اسلامی رہے گا۔ اس کے دستور کی بنیاد اسلام پر ہے، اس لیے کوئی چاہے بھی تو پاکستان کو سیکولر ریاست نہیں بنا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے دستوری ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی جا رہی اور نہ ہی اس کی اسلامی دفعات سے کوئی تعرض کیا جا رہا ہے۔ صدر نے یہ بھی کہا کہ اگر متحدہ مجلس عمل الیکشن میں کامیابی حاصل کر لیتی ہے تو وہ اسے اقتدار منتقل کر دیں گے کیونکہ پاکستان ترکی یا الجزائر نہیں ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکی وزیر خارجہ جنرل کولن پاول نے گزشتہ دنوں پاکستانی معاشرے کو سیکولر بنانے اور انتہا پسند دینی قوتوں کا اثر و رسوخ ختم کرنے کے لیے جنرل پرویز مشرف کی پالیسی کی حمایت جاری رکھنے کا جو اعلان کیا ہے، متحدہ مجلس عمل کے وفد کے کسی رکن کی طرف سے اس کے حوالے سے سوال کے جواب میں صدر پرویز مشرف نے یہ وضاحت کی ہے۔ جہاں تک صدر جنرل پرویز مشرف کی اس وضاحت کا تعلق ہے، ہمیں اس سے خوشی ہوئی ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے صدر محترم کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے جنرل کولن پاول کے اعلان کو زیادہ طول نہیں پکڑنے دیا اور جلد ہی ضروری وضاحت کر کے اصولی حد تک بات کو صاف کر دیا ہے، لیکن پاکستان کے اسلامی ریاست ہونے کے عملی تقاضوں کے حوالے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ صدر پرویز مشرف کی پالیسیاں ان تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتیں اور یہ صرف پرویز حکومت کی بات نہیں بلکہ

پاکستان کی ہر حکومت کا اب تک یہی طرز عمل رہا ہے کہ دستور پاکستان کی ان اسلامی دفعات پر عملدرآمد کی جب بھی باری آئی ہے جن سے مروجہ نظام میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نظر آیا ہے تو دستور کی ایسی اسلامی دفعات کو فریز کر دیا گیا ہے اور مروجہ نظام کو ہر قسم کی تبدیلی سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمارے خیال میں پاکستان کے بارے میں بااختیار قوتوں نے ترکی اور الجزائر سے مختلف حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے اور پاکستان کی اسلامی حیثیت کے تحفظ سے دلچسپی رکھنے والے تمام حلقوں کو اس حکمت عملی کا صحیح طور پر ادراک کرنا چاہیے کیونکہ یہی وہ نکتہ یا ریڈ لائن ہے جہاں نفاذ اسلام کی ہر عملی کوشش دم توڑ جاتی ہے اور عملی پیش رفت میں ناقابل عبور رکاوٹ سامنے آجانے سے لوگوں کے ذہنوں میں پاکستان کی نظریاتی اسلامی حیثیت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

عالم اسلام میں اجتماعی اور معاشرتی زندگی سے اسلامی احکام وتعلیمات کی بے دخلی کا تجربہ ترکی میں اس انداز سے کیا گیا کہ ترکی میں نیشنل ازم کی لہر ابھار کر اور عربوں کے خلاف منافرت کے جذبات بھڑکا کر اس کی آڑ میں قومی زندگی میں قرآن وسنت کے احکام کی عملداری سے ہی انکار کر دیا گیا اور اس انکار کو مملکت کا مذہب قرار دے کر ہر اس کوشش کو سختی کے ساتھ رد کر دیا گیا جو ترکی معاشرہ کو اسلامی تعلیمات کی طرف واپس لے جانے کا باعث بن سکتی ہو حتیٰ کہ عدنان میندرس شہید اور نجم الدین اربکان کی حکومتوں کو صرف اسی وجہ سے برداشت نہیں کیا گیا کہ ان کی پالیسیوں میں اسلامی رجحانات کے نمایاں ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، حالانکہ وہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آئے تھے اور انہیں پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل تھی لیکن محض اسلامی رجحانات کی وجہ سے عدنان میندرس پھانسی کے تختے پر لٹک گئے اور نجم الدین اربکان جیل کی کال کوٹھڑی میں بند ہیں۔ الجزائر میں نفاذ اسلام کا داعی ''اسلامک سالویشن فرنٹ'' عام انتخابات میں بھاری اکثریت سے جیتا اور زبردست عوامی مینڈیٹ لے کر سامنے آیا، لیکن صرف اس خطرہ کی وجہ سے فوجی قوت کے بل پر اس کا راستہ روک دیا گیا کہ اس کے برسر اقتدار آنے سے الجزائر میں فرانسیسی دور سے چلے آنے والے نوآبادیاتی

نظام میں تبدیلی رونما ہونے کا امکان نظر آنے لگا تھا، اس لیے نہ صرف انتخابات منسوخ کر کے اسلامک فرنٹ کا راستہ روک دیا گیا بلکہ فوج اور دینی قوتوں کو آپس میں لڑا کر ہزاروں الجزائری مسلمانوں کو دونوں طرف سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور دینی قوتوں کو فوجی طاقت کے ذریعہ ریاستی جبر کا شکار بنا کر کچل دیا گیا۔

پاکستان میں اس سے مختلف حکمت عملی اپنائی گئی ہے۔ یہاں اسلام سے انکار ممکن نہیں اور قرآن وسنت کی تعلیمات سے دست برداری کا ہلکا سا اظہار بھی عوامی غیظ وغضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، اس لیے ترکی والا تجربہ پاکستان میں ناقابل عمل سمجھا گیا ہے اور یہ پالیسی اب تک چلی آ رہی ہے کہ اسلام کی کسی بات سے انکار نہ کیا جائے بلکہ دستور اور پالیسی اصولوں کی حد تک اسلام اور قرآن وسنت کا بار بار تکرار کیا جائے، لیکن جب مروجہ نظام کے کسی شعبہ میں تبدیلی کا کوئی امکان سامنے آئے تو ''ریڈ لائن'' لگا دی جائے اور اسلامی احکامات پر عمل درآمد کو روک دیا جائے۔ اس سلسلہ میں اعلیٰ سطح پر ہم تین بڑے تجربات کا شکار ہو چکے ہیں:

۱۔ قرارداد مقاصد کو دستور کا حصہ بنایا گیا جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے ملک کا نظام قرآن وسنت کے دائرہ میں چلانے کا عہد کیا گیا ہے، لیکن جب دستور کی دوسری دفعات پر اس اصولی دفعہ کی بالادستی کا مسئلہ طے کرنے کی بات آئی تو سپریم کورٹ آف پاکستان نے دستور کے باقی حصوں پر قرارداد مقاصد کی بالادستی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس سے قرارداد مقاصد پر عمل درآمد کا معاملہ 'لازمی' کے بجائے 'اختیاری مضمون' کی حیثیت اختیار کر گیا۔

۲۔ ''شریعت بل'' میں قرآن وسنت کو ملک کا ''سپریم لاء'' قرار دینے کی بات آئی تو پارلیمنٹ نے قرآن وسنت کو ملک کے بالاتر قانون کے طور پر قبول کرنے کے لیے یہ شرط لگا دی کہ اس سے ملک کا سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہیں ہوگا۔

۳۔ سودی نظام کے بارے میں یو بی ایل کی حالیہ رٹ کے دوران وفاق پاکستان کے وکیل ڈاکٹر سید ریاض الحسن گیلانی ایڈووکیٹ نے عدالت عظمیٰ میں صاف طور پر کہہ دیا کہ معاشی نظام میں تبدیلی کی صورت میں اسلامائزیشن کا عمل قابل قبول نہیں ہے اور عدالت عظمیٰ نے نہ صرف ریاستی

وکیل کے ان ریمارکس کو کسی اعتراض کے بغیر عدالتی ریکارڈ کا حصہ بنا لیا بلکہ فیصلہ بھی حکومت کے حق میں ہوا۔

اس لیے یہ درست ہے کہ پاکستان کو ترکی کی طرز پر چلانا ممکن نہیں ہے اور الجزائر والا تجربہ بھی پاکستان میں دہرانا مشکل نظر آتا ہے کیونکہ بعض ملکی اور عالمی قوتوں کی بھرپور کوششوں کے باوجود پاکستان کے دینی حلقے ہر قسم کی اذیتیں برداشت کرتے ہوئے بھی فوج کے ساتھ محاذ آرائی کے لیے تیار نہیں ہیں جو ان کی اعلیٰ درجے کی حب الوطنی کی علامت ہے لیکن پاکستان میں جس تیسری حکمت عملی کو اختیار کیا گیا ہے اور اسلام اسلام پکارتے ہوئے اسلامی احکام کی عمل داری کو ہر حالت میں روکے رکھنے کا جو طرز عمل گزشتہ نصف صدی سے چلا آ رہا ہے، اس کے بارے میں صدر جنرل پرویز مشرف کیا فرماتے ہیں؟ پاکستان کو اسلامی ریاست کے طور پر باقی رکھنے کے بارے میں صدر جنرل پرویز مشرف کے اعلانات اسلامیان پاکستان کے لیے یقیناً اطمینان کا باعث ہیں لیکن ملک کو صرف اسلام کی وردی پہنا دینا اور دو چار بیج لگا دینا کافی نہیں ہے۔ اس وردی اور بیجز کے جو عملی تقاضے ہیں، وہ بھی پورے ہونے چاہییں کیونکہ اپنے فنکشن اور اختیارات سے محرومی کے ساتھ خالی وردی پہننے سے پاکستان کی اسلامی حیثیت اسی کیفیت میں نظر آنے لگتی ہے جس سے خود جنرل پرویز مشرف اس وقت دوچار ہو گئے تھے جب کھٹمنڈو سے واپس آتے ہوئے ان کے طیارے کو کراچی اترنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی اور انہیں اس مخمصے سے نجات دلانے کے لیے پاک فوج کو حرکت میں آنا پڑا تھا۔ کیا صدر محترم پاکستان کی ''اسلامی حیثیت'' کو اس مخمصے سے نکالنے کے لیے بھی کوئی راستہ نکالیں گے؟*

O

* روزنامہ اوصاف، ۲۷ جولائی ۲۰۰۲ء

ایل ایف او اور متحدہ مجلس عمل کی شرائط

ایل۔ایف۔او پر حکومت اور متحدہ مجلس عمل سمیت اپوزیشن کے تنازع نے مولانا فضل الرحمٰن کی طرف سے ان شرائط کے اعلان کے بعد ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے کہ اگر حکومت ملک میں

۱۔قرآن وسنت کو سپریم لاء تسلیم کر لے،

۲۔اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کا اہتمام کرے،

۳۔جمعہ کی چھٹی بحال کر دے،

۴۔بلاسود بینکاری کا آغاز کرے اور

۵۔تعلیمی اداروں کی نج کاری روک دے

تو متحدہ مجلس عمل ایل ایف او کے بارے میں اپنے موقف میں لچک پیدا کر سکتی ہے۔مولانا فضل الرحمٰن نے یہ اعلان کوئٹہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کیا ہے، جبکہ اس سے قبل صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے شرعی قوانین کے نفاذ کے عملی اعلانات کا آغاز کر دیا ہے جس پر بین الاقوامی نشریاتی اداروں کے تبصروں اور حکومتی حلقوں کے بعض ذمہ دار حضرات کے ردعمل کے تناظر میں قومی سطح پر اس وقت جاری سیاسی کشمکش ایک نیا رخ اختیار کرتی نظر آ رہی ہے۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں بھی ملک کے دینی حلقوں کو اسی قسم کی صورت حال کا سامنا تھا۔صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے مارشل لاء کے دور میں سپریم کورٹ آف پاکستان کی اجازت سے دستور میں بہت سی ترامیم کر رکھی تھیں جن میں صدر کے اختیارات میں اضافہ اور ملکی

نظام کو عملی طور پر صدارتی طرز پر ڈھالنے کے ساتھ ساتھ بعض اسلامی ترامیم کے اقدامات بھی شامل تھے۔ جب انہوں نے ۸۵ء میں غیر جماعتی الیکشن کرائے تو انھوں نے قومی اسمبلی سے اپنی آئینی ترامیم کی منظوری حاصل کرنے اور انہیں باضابطہ دستوری حیثیت دینے کا راستہ اختیار کیا۔ انہیں اس سلسلے میں خاصی محنت کرنا پڑی اور مختلف حربوں سے کام لینا پڑا۔ اس وقت قومی اسمبلی میں ''شریعت گروپ'' کے نام سے ایک گروپ قائم ہو گیا تھا جس نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے جو آئینی ترامیم کی ہیں، ان میں اسلامائزیشن سے متعلقہ ترامیم متاثر نہ ہوں بلکہ انہیں یقینی بنانے کے لیے پارلیمنٹ سے قرآن وسنت کو دستوری طور پر ملک کا سپریم لاء قرار دلوایا جائے۔

صدر ضیاء الحق مرحوم کی آئینی ترامیم میں جہاں صدارتی اختیارات میں اضافہ اور اس نوعیت کی دیگر سیاسی دفعات شامل تھیں، وہاں خدا تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے اعلان پر مشتمل قرارداد مقاصد کو دستور کا واجب العمل حصہ قرار دینے کی ترمیم، وفاقی شرعی عدالت کے قیام اور حدود آرڈیننس کے نفاذ کی ترامیم بھی موجود تھیں۔ یہ تمام دستوری ترامیم اسلامائزیشن کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھیں، اس لیے ان کا تحفظ ضروری تھا۔ چنانچہ قومی اسمبلی کے بہت سے ارکان نے شریعت گروپ کی صورت میں صدر ضیاء الحق مرحوم کی طرف سے کی جانے والی دستوری ترامیم کو دستور کا باضابطہ حصہ بنانے کے لیے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ اسلامائزیشن سے تعلق رکھنے والی ترامیم کو بھی تحفظ دیا جائے اور اس کے ساتھ قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دیا جائے۔ چنانچہ آٹھویں ترمیمی بل کی صورت میں قرارداد مقاصد، وفاقی شرعی عدالت، حدود آرڈیننس اور صدارتی اختیارات سمیت صدر ضیاء الحق مرحوم کی تمام ترامیم کو دستور کا حصہ بنا دیا گیا اور قرآن وسنت کو سپریم لاء قرار دینے کے لیے قومی اسمبلی نے ایک الگ قرارداد کی صورت میں قوم سے وعدہ کیا کہ جلد ایک مستقل آئینی ترامیم کے ذریعے سے قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دے دیا جائے گا۔

اس کے بعد سینٹ آف پاکستان میں مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبداللطیف نے قومی اسمبلی کے اسی متفقہ وعدہ کی بنیاد پر ''شریعت بل'' پیش کیا جس کی سب سے اہم دفعہ قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کی تھی۔ اس شریعت بل پر کئی برس تک بحث جاری رہی، ملک بھر میں

اس کے حق میں اور مخالف وسیع پیمانے پر قومی مباحثہ ہوا۔ بہت سی مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے اس کی مخالفت بھی کی۔ اس کے لیے سینٹ آف پاکستان کے چیئرمین غلام اسحاق خان نے ملک میں رائے عامہ معلوم کرنے کا حکم دیا جس کے جواب میں اس قدر خطوط موصول ہوئے کہ سینٹ کے ریکارڈ کے مطابق اس سے قبل کسی سوال نامے پر اتنی تعداد میں جوابات موصول نہیں ہوئے تھے۔ ہر سطح پر وسیع تر قومی مباحثے کے بعد ملک کی اہم سیاسی و دینی جماعتیں اس کی حمایت میں متحد ہوئیں اور راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل میں مولانا فضل الرحمٰن اور میاں نواز شریف سمیت بڑے بڑے رہنماؤں نے شریک ہو کر اس کی حمایت کا اعلان کیا اور بالآخر سینٹ آف پاکستان نے شریعت بل منظور کر لیا۔ اس کے بعد ضابطہ کے مطابق شریعت بل کو قومی اسمبلی میں نوے دن کے اندر پیش ہونا تھا مگر اس سے قبل اسمبلی ٹوٹ گئی اور اس قدر طویل اور ہمہ گیر جدوجہد کے بعد سینٹ آف پاکستان سے منظور ہونے والا شریعت بل، جس کا سب سے بڑا مقصد قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینا تھا، ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

یہ دور بے نظیر بھٹو کا تھا جن کے بعد میاں نواز شریف برسر اقتدار آئے اور ان کے دور میں قومی اسمبلی میں ایک شریعت بل پیش ہوا جو منظور بھی ہو گیا مگر اس میں قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کی بنیادی دفعہ کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر کے غیر موثر کر دیا گیا کہ ''اس سے ملک کا سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہیں ہوگا۔'' ظاہر بات ہے کہ اس شرط کے بعد قرآن وسنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کے اس فیصلے کی کوئی افادیت باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے اس کا بھی کوئی عملی نتیجہ سامنے نہ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کے سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچے کو قرآن وسنت کی بالادستی کے دائرہ سے باہر رکھنے میں سب سے زیادہ دلچسپی اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ نے ظاہر کی اور اس کی درپردہ مساعی سے یہ سب کچھ ظہور پذیر ہوا۔

اس کے بعد مختلف مواقع پر قرآن وسنت کی دستوری بالادستی کے لیے آواز اٹھائی جاتی رہی مگر کسی طرف سے شنوائی نہیں ہوئی۔ اب اگر متحدہ مجلس عمل نے صدر جنرل پرویز مشرف کے ساتھ سیاسی بارگیننگ کے دوران اس مسئلہ کو دوبارہ اعلیٰ سطح پر اٹھایا ہے تو اگرچہ میرے جیسے نظریاتی

کارکنوں کے لیے یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ اسلامائزیشن کی طرف کسی بھی پیش رفت کا موقع آخر سیاسی سودے بازی کے حوالہ سے ہی کیوں سامنے آتا ہے اور ملک کے مقتدر سیاسی حلقے اسے خود اپنی دینی وملی ذمہ داری سمجھنے کے لیے کیوں تیار نہیں ہیں، مگر اس کے باوجود ہماری خواہش ہے کہ متحدہ مجلس عمل کو اس مہم میں کامیابی حاصل ہو اور خدا کرے کہ وہ صدر جنرل پرویز مشرف کو اس بات کا قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ اگر وہ اپنی ذات، صدارت اور وردی کو ملک کے لیے ناگزیر تصور کرتے ہیں تو اسلام اس سے کہیں زیادہ ملک کے لیے ناگزیر ہے۔ پاکستان کی بنیاد ہی اسلام پر ہے اور اسلام کے بغیر پاکستان کے جداگانہ تشخص اور ایک الگ ملک کے طور پر اس کے وجود کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

متحدہ مجلس عمل کی دیگر شرائط بھی اسی نوعیت کی ہیں۔ مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل ملک کا دستوری ادارہ ہے جس نے دستور پاکستان کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے ملک کے تمام مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سفارشات مکمل کر کے انہیں حکومت کو پیش کر دیا ہے اور حکومت دستوری طور پر انہیں قومی اسمبلی میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کی پابند ہے۔ اس صورت میں یہ شرط یا تجویز کوئی نیا مطالبہ نہیں بلکہ حکومت کو اس کی دستوری ذمہ داری کی طرف توجہ دلانے کی ایک کوشش ہے اور ہمارے خیال میں حکومت کو اس میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم اور جنرل پرویز مشرف کی دستوری ترامیم میں دو فرق موجود ہیں۔ ایک یہ کہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کی دستوری ترامیم میں اسلامائزیشن سے متعلقہ اہم ترامیم بھی شامل تھیں جن کے تحفظ میں ملک کے دینی حلقوں کی اپنی دلچسپی موجود تھی جبکہ جنرل پرویز مشرف کی تمام ترامیم سیاسی نظام اور صدارتی اختیارات کے حوالہ سے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ صدر ضیاء الحق مرحوم نے اپنی ترامیم کو حرف آخر قرار نہیں دیا تھا بلکہ انہیں منتخب قومی اسمبلی سے منظور کرانے کا راستہ اختیار کیا تھا جو ایک جائز اور معقول بات تھی مگر صدر جنرل پرویز مشرف اپنی دستوری ترامیم کو حرف آخر قرار دے کر قومی اسمبلی کو ان پر غور تک کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور خود اپنی ذات کو ہی دستور اور دستوری اداروں کے مترادف قرار دینے پر مصر

ہیں۔ اس پس منظر میں متحدہ مجلس عمل کی یہ مہم زیادہ کٹھن اور صبر آزما ہے اور اس کے آگے بڑھنے میں کامیابی کے محدود امکانات کے ساتھ ساتھ خطرات و خدشات کا ایک خطرناک صحرا بھی سامنے دکھائی دے رہا ہے۔

قرآن و سنت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دینے اور اسلامائزیشن کی طرف کسی بھی حوالے سے پیش رفت کی کوئی بھی کوشش ہو تو اسے بہر حال ملک کے دینی حلقوں اور نفاذ اسلام کی خواہش رکھنے والے عوام کی حمایت حاصل ہوگی۔ خدا کرے کہ کوئی کوشش اس سلسلے میں بھی بار آور ہو اور ملک صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کر سکے، آمین یا رب العالمین۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۴/جون ۲۰۰۳ء۔

جنرل مشرف سے قادیانیوں کی توقعات

مرزا طاہر احمد اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ جنرل پرویز مشرف کی صورت میں انہیں ایک ایسا حکمران میسر آ گیا ہے جس کے ذریعے وہ پاکستان کے حوالہ سے اپنے عزائم کی تکمیل کر سکیں گے اور اسی لیے مرزا طاہر احمد اور ان کے ساتھ قادیانی جماعت مختلف دائروں میں پہلے سے زیادہ متحرک اور سرگرم دکھائی دے رہے ہیں۔

جنرل پرویز مشرف کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان کو مذہبی انتہا پسندی سے پاک کرنا چاہتے ہیں اور مذہبی دہشت گردوں کے خلاف مہم کے عنوان سے جنوبی ایشیا میں امریکہ اور اس کی قیادت میں عالمی اتحاد کی سرگرمیوں کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے جس سے سیکولر حلقوں اور قادیانیوں کو یہ امید ہونے لگی ہے کہ پاکستان کے بارے میں ان کے ایجنڈے کی طرف عملی پیش رفت کا وقت آ گیا ہے۔

مرزا طاہر احمد کا ایجنڈا یہ ہے کہ پاکستان کے دستور میں بھٹو حکومت کے دور میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا جو فیصلہ عوام کی منتخب پارلیمنٹ نے کیا تھا وہ ختم ہو جائے اور اسی دستوری فیصلے پر عمل درآمد کے دستوری تقاضے پورے کرنے کے لیے ۸۴ء میں صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے صدارتی آرڈیننس کی صورت میں قادیانیوں کو اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے اور مسلمانوں کی مخصوص مذہبی اصطلاحات و علامات کے استعمال سے روکنے کا جو قانون نافذ کیا گیا تھا وہ منسوخ کر دیا جائے۔ مرزا طاہر احمد نے ان دو فیصلوں کے خلاف طویل

جنگ لڑی ہے۔ اور گزشتہ اٹھارہ برس سے لندن میں بیٹھ کر بین الاقوامی لابیوں اور مغربی حکومتوں کو مسلسل لابنگ کے ذریعہ حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لے تیار کیا ہے۔ مرزا طاہر کی قیادت میں قادیانی جماعت نے پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کے جمہوری اور دستوری فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر رکھا ہے اور اسی مقصد کے لیے قادیانی جماعت نے جداگانہ بنیادوں پر ہونے والے عام انتخابات کا بھی مسلسل بائیکاٹ کیا ہے کہ جداگانہ الیکشن میں حصہ لینے کی صورت میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کی حیثیت عملاً قبول کرنا پڑتی ہے۔

شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کے اضافے کی قادیانیوں نے اسی وجہ سے مخالفت کی تھی اوراس کے لیے انہوں نے بین الاقوامی لابیوں کے ذریعہ پاکستان کی مسیحی اقلیت کو شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے میں اضافے کے خلاف متحرک کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی جب کہ ووٹروں کی فہرست بھی قادیانیوں نے اب تک اپنے ناموں کا اندراج صرف اس لیے نہیں کرایا کہ مسلم ووٹروں کے خانے میں اندراج کے لیے ووٹر کو عقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ پر کرنا پڑتا ہے جس میں قادیانیوں کے لیے خود کو مسلمانوں میں شامل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مرزا طاہر احمد نے بین الاقوامی سیکولر لابیوں اور مغربی حکومتوں کے ان رجحانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے جو پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے خلاف پہلے دن سے واضح طور پر موجود ہیں کیونکہ مغربی حلقوں کے نزدیک پاکستان کے دستور میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلق کو تسلیم کرنے، اسلام کو ریاست کا دستوری مذہب قرار دینے اور اسلامی نظام کے عملی نفاذ کی ضمانت دینے کی دستوری دفعات کے ساتھ ساتھ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا دستوری فیصلہ بھی ''بنیاد پرستی'' کی علامت ہے اور مغربی حلقے اس کے خلاف نہ صرف ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں بلکہ پاکستان پر اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے دباؤ بھی ڈال رہے ہیں۔ مرزا طاہر احمد کا خیال ہے کہ جداگانہ الیکشن ختم کر کے مخلوط الیکشن کا اعلان ان کے ایجنڈے کی تکمیل کی طرف پہلا قدم ہے کیونکہ اس صورت میں وہ عملی طور پر مسلمانوں سے الگ حیثیت اختیار کیے بغیر انتخابات میں شریک ہو سکیں گے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ بھی ان کے لیے مفید ثابت ہوا ہے کہ نئے انتظامات کے تحت شناختی کارڈ کے فارم اور مسلم

ووٹروں کی فہرست میں نام شامل کرنے کے فارم میں عقیدہ ختم نبوت کے حلف نامہ کو ختم کر دیا گیا ہے حالانکہ یہ حلف نامہ بھٹو مرحوم کے دورِ حکومت میں دستوری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان فارموں میں شامل کیا گیا تھا جب کہ مخلوط انتخابات کا نظام رائج تھا لیکن جداگانہ الیکشن کا طریق کار ختم کرنے کی آڑ میں یہ حلف نامہ بھی ختم کر دیا گیا ہے جس سے مسلمانوں کی فہرستوں میں قادیانیوں کے اندراج کی راہ ہموار ہوگئی ہے اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا دستوری فیصلہ عملاً غیر موثر ہو کر رہ گیا ہے۔ مخلوط نظام انتخابات کے اعلان اور شناختی کارڈ کے فارم میں عقیدہ ختم نبوت کے حلف نامہ کو ختم کرنے کے بعد جناب محمد رفیق تارڑ کے اس انکشاف کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو مرزا طاہر احمد کے ایجنڈے کی تکمیل کی طرف ہونے والی پیش رفت کا تسلسل مزید واضح ہو جاتا ہے کہ جس میں تارڑ صاحب نے کہا ہے کہ مرزا طاہر احمد نے بعض پاکستانی شخصیات کو چند ماہ قبل ہی لندن میں تارڑ صاحب کی صدارتی منصب سے برطرفی کے بارے میں بتا دیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ تحریک ختم نبوت کے ساتھ تارڑ صاحب کے ماضی کی وابستگی اور اس محاذ پر ان کی خدمات کے پس منظر میں ایوان صدر میں ان کی موجودگی کو ان کے ایجنڈے کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا گیا اور اس رکاوٹ کو دور کرنا ضروری سمجھا گیا۔

قادیانی جماعت ان واقعات اور اقدامات کے حوالے سے خوش دکھائی دیتی ہے اور گزشتہ دو برس سے مرزا طاہر احمد کے خطبات و بیانات کا انداز یہ بتا رہا ہے کہ وہ صورت حال میں اس تبدیلی کو اپنی کاوشوں کا نتیجہ سمجھ رہے ہیں دوسری طرف ملک کے دینی حلقوں کی تشویش و اضطراب میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب آف کندیاں شریف کی قیادت میں کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت نے از سر نو متحرک ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے مرکزی مجلس عمل رابطہ کمیٹی کا ایک اہم اجلاس آج ہفتہ کو ۴:۰۰ بجے دن دفتر مجلس تحفظ ختم نبوت --سٹریٹ نیو مسلم ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوا اور اس کے لیے تحریک ختم نبوت کے سرگرم راہنما مولانا منظور احمد چنیوٹی اور مولانا اللہ وسایا مسلسل سرگرم عمل ہیں لیکن میں اس سے ہٹ کر ایک اور حوالہ سے قادیانیوں کی اس خوش فہمی کا جائزہ لینا چاہتا ہوں کہ وہ جنرل پرویز مشرف کو اپنے مقاصد

کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اس سے قبل مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کو بھی ایک سیاستدان اور سوشلسٹ لیڈر تصور کرتے ہوئے قادیانیوں نے ان سے یہ امید وابستہ کر لی تھی کہ وہ پاکستان کے حلقوں کے مسلسل دباؤ کے خلاف قادیانیوں کے مفاد کا تحفظ کریں گے اور ان کے عزائم کی تکمیل میں معاون ہوں گے لیکن مرحوم بھٹو کی تمام تر روشن خیالی اور لبرل خیالات کے باوجود قادیانیوں کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی تھی اور مختلف مواقع پر بھٹو مرحوم کے ساتھ بھر پور تعاون کے باوجود قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے دستوری فیصلے کا سامنا بھٹو کے دور حکومت میں ہی کرنا پڑا تھا۔

اس سلسلہ میں بھٹو مرحوم کے اپنے خیالات کیا تھے؟ اس کے لیے میں ان کی زندگی کے آخری ایام میں جیل میں قید کے دوران ان کے تاثرات و جذبات کا حوالہ دینا چاہوں گا جو ان کی نگرانی پر مامور کرنل (ر) رفیع الدین نے کتاب ''بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن'' میں ان الفاظ میں نقل کیے ہیں کہ ''احمد یہ مسئلہ! یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر بھٹو صاحب نے کئی بار کچھ نہ کچھ کہا ایک دفعہ کہنے لگے'' رفیع یہ لوگ چاہتے تھے کہ میں ان کو پاکستان میں وہ مرتبہ دوں جو یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہے یعنی ہماری پالیسی ان کی مرضی کے مطابق چلے''

ایک بار انہوں نے کہا کہ ''قومی اسمبلی نے ان کو غیر مسلم قرار دیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' ایک دن اچانک مجھ سے پوچھا کہ ''کرنل رفیع کیا احمدی آج کل یہ کہہ رہے ہیں کہ میری موجودہ مصیبتیں ان کے خلیفہ کی بددعا کا نتیجہ ہیں کہ میں کال کوٹھڑی میں پڑا ہوں؟'' ایک مرتبہ کہنے لگے کہ ''ان کے اعتقاد کو دیکھا جائے تو وہ حضرت محمد ﷺ کو آخری پیغمبر ہی نہیں مانتے اور اگر وہ مجھے اپنے آپ کو غیر مسلم قرار دینے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو کوئی بات نہیں'' پھر کہنے لگے ''میں تو بڑا گناہ گار ہوں اور کیا معلوم کل یہ عمل ہی میرے گناہوں کی تلافی کر جائے اور اللہ تعالیٰ میرے تمام گناہ اس نیک عمل کی بدولت معاف فرما دے''

میں بھٹو صاحب کی ان باتوں سے یہ اندازہ لگایا کرتا تھا کہ شاید ان کو گناہ وغیرہ کا کوئی خاص احساس نہیں تھا لیکن اس دن مجھے احساس ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

کرنل رفیع الدین کی ان باتوں سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بھٹو مرحوم کا یہ فیصلہ صرف مسلمانوں کے دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ان کے داخلی دینی جذبات اور حب نبی کا آئینہ دار بھی تھا، اس لیے مجھے مرزا طاہر احمد اور ان کی جماعت کی اس خوش فہمی پر حیرت ہو رہی ہے جو انہوں نے جنرل پرویز مشرف سے وابستہ کر رکھی ہے حالانکہ جس دن بھٹو کی طرح جنرل پرویز مشرف کے اندر کا مسلمان جاگ اٹھا تو قادیانیوں اور ان کی سرپرست بین الاقوامی لابیوں کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جائے گی۔*

O

---

* روزنامہ اوصاف، ۷؍مئی ۲۰۰۲ء۔

قادیانیت ہدف کیوں؟

صدر جنرل پرویز مشرف کے پرسنل سیکرٹری اور نیشنل سیکیورٹی کونسل کے سیکرٹری جناب طارق عزیز کے حوالے سے ایک بار پھر قادیانیت کا مسئلہ منظر عام پر آیا ہے اور لاہور کے بعض علمائے کرام کی طرف سے اس مطالبہ نے اب تک زیرلب ہونے والی باتوں کو باقاعدہ خبر کی زبان دے دی ہے کہ جناب طارق عزیز کے والد بزرگوار کا جنازہ پڑھنے والے مسلم حکام کو تجدید ایمان کرنی چاہیے کیونکہ وہ قادیانی تھے۔ اس کے جواب میں طارق عزیز صاحب کے فرزند شعیب عزیز کا بیان آیا ہے کہ ان کی فیملی کا قادیانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور انھیں قادیانیت کے ساتھ ملوث کرنا افسوس ناک ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ ان کے پردادا قادیانی ہو گئے تھے لیکن ان کے دادا عزیز احمد نے، جن کے جنازے کے حوالے سے علما کا مذکورہ بیان شائع ہوا ہے، قادیانیت سے توبہ کر لی تھی۔

یہ کم وبیش ہر حکومت کے دور میں ہوتا رہا ہے کہ حکومت یا اس کے پس پردہ کام کرنے والے اہم حکام کے بارے میں اس قسم کے شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے کہ وہ قادیانی ہیں اور ان میں سے بہت سے حضرات کو اپنی پوزیشن کی کھلے بندوں وضاحت کرنا پڑی ہے۔ بعض حضرات کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ایسا صرف قادیانیت کے بارے میں کیوں ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔

اصولی طور پر تو یہ مسئلہ سب اقلیتوں کے بارے میں ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں کسی کلیدی

منصب پر، جس کا تعلق پالیسی سازی سے ہو، کسی غیر مسلم کو مقرر کرنا درست نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی پالیسیوں کی بنیاد قرآن وسنت پر ہوتی ہے اور غیر مسلموں کے لیے قرآن وسنت کی تعلیم حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔ نیز کسی غیر مسلم کو اس کے عقیدہ اور دین کے خلاف پالیسی سازی کے عمل میں شریک کرنا خود اس کی مذہبی آزادی کے منافی اور اس پر مذہبی جبر کے مترادف ہے، اس لیے اسلام نے انھیں کسی بھی ایسی ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جس میں انھیں اپنے مذہب اور عقیدہ کے خلاف دوسرے دین اور عقیدہ کی بنیاد پر کام کرنا پڑے۔اسی لیے پاکستان میں دینی حلقوں کی طرف سے مسلسل یہ مطالبہ چلا آ رہا ہے کہ ملک کی کلیدی آسامیوں پر غیر مسلموں کے تقرر کو ممنوع قرار دیا جائے۔ یہی صورت حال فوج اور دفاع کی بھی ہے کہ اسلامی ریاست میں جنگ، دفاع اور فوج کا تعلق اسلام کے فریضہ جہاد سے ہے حتیٰ کہ پاکستانی فوج کا ماٹو بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔اب ظاہر بات ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا دینی فریضہ تو صرف مسلمان پر لاگو ہوتا ہے، کسی غیر مسلم کو اس کے لیے بھرتی کیا جائے گا تو یہ اس سے اس کے عقیدہ کے خلاف کام لینے کے مترادف ہوگا اور اسلام اس کا روادار نہیں ہے، اس لیے اسلام نے اسلامی ریاست کے تمام غیر مسلم باشندوں کو ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے ایک معمولی سے ٹیکس کے عوض ہر قسم کی فوجی ذمہ داری سے مستثنیٰ کر دیا ہے اور فوجی ڈیوٹی سے استثنا پر عائد کیا جانے والا ٹیکس ہی شرعی اصطلاح میں جزیہ کہلاتا ہے۔

مگر اس اصولی مسئلہ اور موقف سے قطع نظر پاکستان میں بہت سے کلیدی عہدوں حتیٰ کہ فوج میں بھی غیر مسلم افسران کو ہر دور میں برداشت کیا جاتا رہا ہے اور علمائے کرام نے اصولی موقف کے اظہار کے باوجود سول یا فوج کے کسی غیر مسلم افسر کو شخصی طور پر کبھی اپنی مہم اور مطالبات کا ہدف نہیں بنایا، البتہ قادیانیوں کا معاملہ اس سے الگ ہے اور پاکستان بننے کے بعد سے ہی اس مہم اور جدوجہد کا آغاز ہو گیا تھا کہ کسی قادیانی کو ملک کے کسی اہم منصب پر برداشت نہ کیا جائے۔اس سلسلے میں دینی حلقوں کی تنقید کا سب سے پہلا ہدف وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان تھے جو کھلم کھلا قادیانی تھے بلکہ قادیانیت کے پرچارک تھے اور ۵۳ء کی مشہور تحریک ختم نبوت میں دینی حلقوں کے مطالبات میں

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے ساتھ ساتھ وزارت خارجہ سے ان کی برطرفی کا مطالبہ بھی شامل تھا۔

قادیانیوں کے بارے میں مسلمانوں کی حساسیت کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مثلاً ایک وجہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نہ صرف نبوت کا دعویٰ کیا اور نئی وحی اور نبوت کا ڈھونگ رچایا بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر حضرات انبیاے کرام علیہم السلام کی شان میں ایسی ایسی گستاخیاں کی ہیں کہ کوئی مسلمان ان سے واقف ہوتے ہوئے کسی قادیانی کو اپنے افسر کے طور پر قبول نہیں کر سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قادیانیوں نے متحدہ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کو قبول نہیں کیا اور ان کے تیسرے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کی یہ پیشین گوئی اب بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ پاکستان ختم ہوگا اور دوبارہ اکھنڈ بھارت قائم ہوگا، چنانچہ اس وصیت یا پیشین گوئی کی موجودگی میں پاکستان کی سالمیت اور وجود کے ساتھ قادیانیوں کی دلچسپی اور وفاداری مشکوک ہو جاتی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ متعدد اہم مواقع پر قادیانی افسران کا یہ کردار قومی تاریخ کے ریکارڈ پر ہے کہ انھوں نے ہمیشہ بیرونی وفاداریوں اور ہدایات کو ترجیح دی ہے اور یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ قادیانیوں کا کردار پاکستان میں استعماری قوتوں کے آلہ کار کا کردار چلا آ رہا ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ قادیانیوں نے اپنے بارے میں پاکستان کی سپریم کورٹ، وفاقی شرعی عدالت اور منتخب پارلیمنٹ کے اس متفقہ فیصلے کو قبول کرنے سے صراحتاً انکار کر رکھا ہے جس میں انھیں عالم اسلام کے تمام دینی حلقوں کے مشترکہ فتویٰ کی رو سے غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا ہے اور اس طرح قادیانی جماعت وہ واحد گروہ ہے جو دستور پاکستان کو تسلیم کرنے سے صاف طور پر منحرف ہے۔

ان کے علاوہ اور وجوہ بھی ہیں جن کی وجہ سے پاکستان کے عوام بالخصوص دینی حلقے قادیانیوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہیں اور وہ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ فوج یا سول کے کسی بھی اہم عہدے پر کسی قادیانی کی موجودگی اسلامیان پاکستان کے دینی جذبات کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ ملکی سالمیت اور قومی خودمختاری کے تقاضوں کو بھی نظر انداز کرنے کے مترادف ہے اور خاص طور پر موجودہ علاقائی اور عالمی صورت حال میں اس قسم کے خطرہ اور رسک کا ملک کسی طرح بھی متحمل

نہیں ہوسکتا۔ جناب طارق عزیز صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کے پرسنل سیکرٹری ہیں، نیشنل سیکیورٹی کونسل کے سیکرٹری بھی ہیں۔ انھیں عملی طور پر صدر پاکستان کے دست راست کی حیثیت حاصل ہے اور قومی معاملات میں ان کا متحرک کردار سب واقفان حال کے سامنے ہے۔ اس کے ساتھ ہی اب ان کا نام پنجاب کے نئے گورنر کے طور پر لیا جا رہا ہے اور بین الاقوامی میڈیا کے حوالے سے یہ خبر آ چکی ہے کہ جناب طارق عزیز جنرل خالد مقبول کی جگہ پنجاب کے آئندہ گورنر ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک ان کے قادیانی ہونے کا تعلق ہے، اب تک ہمارا سامنا صرف افواہوں اور قیاس آرائیوں سے تھا اور اسی وجہ سے ہم نے اس سلسلے میں ابھی تک کچھ عرض نہیں کیا، حتیٰ کہ گزشتہ دنوں لاہور اور اسلام آباد کی بعض محافل میں کچھ ذمہ دار دوستوں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا کہ جناب طارق عزیز کا قادیانی ہونا ایک قطعی بات ہے، لیکن ہم نے گزارش کی کہ جب تک اس کا ثبوت فراہم نہیں ہوگا، ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے، لیکن اب طارق عزیز کے فرزند شعیب عزیز نے اپنے وضاحتی بیان میں یہ کہہ کر معاملہ کو خود مشکوک بنا دیا ہے کہ ان کے پردادا قادیانی ہو گئے تھے مگر دادا نے قادیانیت سے توبہ کر لی تھی۔ پھر یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ بات طارق عزیز کی ہو رہی ہے اور وہ خود اس کی وضاحت کرنے کے بجائے بیٹے کا سہارا لے رہے ہیں، اس لیے ہمارے خیال میں شعیب عزیز کے وضاحتی بیان سے مسئلہ صاف ہونے کے بجائے مزید الجھ گیا ہے اور طارق عزیز صاحب کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ خود اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے صاف طور پر بتائیں کہ قادیانیوں کے بارے میں خود ان کا عقیدہ کیا ہے؟ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے۔ اس سے قبل صدر محمد ایوب خان مرحوم، صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم اور سابق وزیر اعلیٰ پنجاب میاں منظور وٹو عوامی مطالبہ پر اپنے قادیانی نہ ہونے کی وضاحت کر چکے ہیں اور انھوں نے اپنے اوپر قادیانی ہونے کا الزام نہ لیتے ہوئے کھلے بندوں اپنے عقیدہ کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا جناب طارق عزیز بھی اگر اپنے عقیدہ کی خود وضاحت کریں گے تو اس سے ان کی عزت اور اعتماد میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوگا۔*

O

* روزنامہ اسلام، ۱۲/مارچ ۲۰۰۳ء۔

آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس کے مطالبات

۲۸ رمئی ۲۰۰۲ کو فلیٹیز ہوٹل لاہور میں جمعیۃ علماے اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمٰن کی طلب کردہ ''آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس'' دینی اور سیاسی راہ نماؤں کا ایک اہم اجتماع ثابت ہوئی اور اس سے قومی سیاست اور دینی جماعتوں کی جدوجہد کے مستقبل کے حوالے سے بہت سے نئے رجحانات سامنے آئے۔ کانفرنس میں دینی جماعتوں کی بھرپور نمائندگی تھی اور تمام مذہبی مکاتب فکر کے سرکردہ حضرات موجود تھے۔ دیوبندی مکتب فکر سے خود مولانا فضل الرحمٰن کے علاوہ مولانا سمیع الحق، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مفتی نظام الدین شامزئی، مولانا منظور احمد چنیوٹی، مولانا محمد حنیف جالندھری اور مولانا صاحبزادہ عزیز احمد آف کندیاں شریف سمیت بیسیوں سرکردہ حضرات شریک تھے۔ بریلوی مکتب فکر کی نمائندگی دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ جنرل (ر) کے ایم اظہر، پیر اعجاز احمد ہاشمی، ڈاکٹر سرفراز نعیمی، انجینئر سلیم اللہ خان اور صاحبزادہ حاجی فضل کریم نے کی۔ اہل حدیث مکتب فکر کی نمائندگی کے لیے مولانا معین الدین لکھوی، پروفیسر ساجد میر، حافظ زبیر احمد ظہیر، حافظ عبدالرحمٰن مکی اور عبدالقدیر خاموش تشریف فرما تھے، جبکہ اہل تشیع کی طرف سے علامہ ساجد نقوی اور علامہ علی غضنفر کراروی نے نمائندگی کی۔ ان کے علاوہ جماعت اسلامی سے جناب سید منور حسن، جناب لیاقت بلوچ، مولانا عبدالمالک خان، جمعیۃ اشاعت التوحید والسنۃ کی طرف سے مولانا اشرف علی، تنظیم اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کے ساتھ ساتھ ملت پارٹی، جمہوری وطن پارٹی کے راہنماؤں اور اے آر ڈی کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خان نے بھی کانفرنس میں شرکت

کی۔اس طرح یہ کانفرنس دینی وسیاسی جماعتوں کے سرکردہ راہ نماؤں کے ایک اہم اجتماع کی حیثیت اختیار کر گئی۔

''آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس'' کا ایجنڈا ایک نکتہ پر مشتمل تھا کہ حکومت نے مخلوط انتخاب کی آڑ میں ووٹرز فارم سے ''عقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ'' خارج کرنے کا جو اقدام کیا ہے، وہ قادیانیوں کو چور دروازے سے مسلمانوں کی صف میں شامل ہونے کا موقع دینے کی کوشش ہے اور دستور پاکستان کی خلاف ورزی ہے، اس لیے حکومت اس فیصلے کو واپس لیتے ہوئے ووٹرز فارم میں ختم نبوت کے عقیدہ کا حلف نامہ بحال کرے۔

اجلاس کے تمام شرکا نے اس یک نکاتی ایجنڈے سے اتفاق کرتے ہوئے مذکورہ مطالبہ کی حمایت کی، البتہ اس موقع پر صحافی برادری کی نمائندگی کرتے ہوئے جناب سعید آسی نے کانفرنس کے شرکا کی اس پہلو کی طرف توجہ دلائی کہ ووٹرز فارم سے عقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ ختم کرنے کے مقاصد تو پورے ہو چکے ہیں اور اس دوران نئے ووٹروں کا اندراج مکمل ہو چکا ہے جو حلف نامہ کے بغیر ہے اور اس طرح جن قادیانیوں نے اپنے ووٹ مسلم ووٹر کے طور پر درج کرانے تھے، وہ درج ہو چکے ہیں۔اب اگر حکومت اس حلف نامہ کو دوبارہ ووٹر فارم میں شامل کرنے کا مطالبہ منظور کر بھی لے تو اس سے عملاً کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ حلف نامہ خارج کرنے کے اقدام کے ذریعے قادیانی جو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ انھوں نے حاصل کر لیے ہیں۔

اس نکتے کا کانفرنس کے شرکا نے بطور خاص نوٹس لیا اور کانفرنس کے متفقہ مطالبات میں اس بات کو شامل کرنے پر متعدد مقررین نے زور دیا کہ حلف نامہ خارج کرنے کے بعد جو نئے ووٹ درج کیے گئے ہیں، ان کے اندراج پر نظر ثانی کی جائے اور تحریک ختم نبوت کے قائدین کو اعتماد میں لے کر اس مسئلہ کا حل نکالا جائے۔

مولانا منظور احمد چنیوٹی اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ ووٹرز فارم میں عقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ دوبارہ شامل کرنے کے علاوہ شناختی کارڈ میں مذہب کے خانہ کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جب پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ موجود ہے تو جس شناختی کارڈ

کی بنیاد پر پاسپورٹ جاری ہوتا ہے، اس میں مذہب کا خانہ بڑھانے میں کیا رکاوٹ ہے؟

کانفرنس میں یک نکاتی ایجنڈے کے حوالے سے طے ہوا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر ووٹرز فارم میں عقیدۂ ختم نبوت کا حلف نامہ دوبارہ شامل کیا جائے، ورنہ اس کے علاوہ عوامی تحریک کا آغاز کیا جائے گا۔ اس تحریک کے لیے کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کو دوبارہ متحرک کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور تحریک کا طریق کار اور دیگر تفصیلات طے کرنے کے لیے ''آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس'' میں شریک تمام جماعتوں کے سربراہوں پر مشتمل ''سٹیئرنگ کمیٹی'' قائم کی گئی جو ۶ جون کے فوراً بعد اجلاس کر کے لائحہ عمل طے کرے گی۔ اس یک نکاتی ایجنڈے کے علاوہ کانفرنس میں اور بھی بہت سے امور زیر بحث آئے اور اگرچہ اسٹیج کی طرف سے بار بار توجہ دلائی جاتی رہی کہ گفتگو کو کانفرنس کے ایجنڈے تک محدود رکھا جائے مگر مقررین نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف مسائل پر جذبات کا اظہار کیا اور اپنا موقف پیش کیا۔

نواب زادہ نصر اللہ خان نے قادیانیت کا سیاسی پس منظر بیان کیا اور کہا کہ یہ فتنہ انگریزوں نے جہاد کے حوالے سے مسلمانوں کے عقیدہ اور جذبہ کو کمزور کرنے کے لیے جنم دیا تھا۔ انھوں نے قادیانیوں کے بارے میں علامہ اقبال کے بہت سے اشعار اور ارشادات کا حوالہ دیا کہ وہ قادیانیت اور اس کی دعوت و تعلیم کو مسلمانوں کے لیے غلامی کا پیغام سمجھتے تھے۔ نواب زادہ نصر اللہ خان نے کہا کہ صرف ختم نبوت کے حلف نامہ کا مسئلہ نہیں بلکہ ملک کا پورا دستور سازشوں کی زد میں ہے اور اسے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں اس موقع پر انتباہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ ۷۳ء کا دستور ختم کر دیا گیا تو اس ملک میں نیا دستور نہیں بن سکے گا اور جو دستور بنے گا، وہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کا دستور نہیں ہوگا۔

مولانا سمیع الحق نے کہا کہ اصل بات امریکہ کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کی ہے کیونکہ جب تک غلامی کا یہ طوق ہماری گردن سے نہیں اترتا، اس قسم کے جزوی مسائل پیدا ہوتے رہیں گے اور ہم ان کے حل میں لگے رہیں گے۔ اصل مسئلہ قومی آزادی کی بحالی کا ہے اور ہمیں عالمی استعمار سے مکمل آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کے لیے ایک نئی جنگ آزادی کا آغاز کرنا ہوگا۔

راقم الحروف نے توجہ دلائی کہ عقیدہ ختم نبوت کے علاوہ اور مسائل بھی بیرونی دباؤ کی زد میں ہیں۔ امریکی کانگریس کی قرارداداد کے بعد قادیانیوں کو مسلمانوں کی صف میں دوبارہ شامل کرنے کی کوشش شروع ہوگئی ہے جس کی پہلی قسط ووٹرز فارم سے عقیدہ ختم نبوت کے حلف نامہ کا اخراج ہے۔ تحفظ ناموس رسالت کے قانون پر نظر ثانی کی راہ ہموار کی جا رہی ہے، حدود آرڈیننس پر نظر ثانی کے لیے سرکاری کمیٹی نے کام مکمل کرلیا ہے، خاندانی نظام اور نکاح وطلاق ووراثت کے قوانین میں رد وبدل کے لیے مسودات تیار ہیں اور سودی نظام کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلے پر نظر ثانی کے حوالے سے اسے معطل کرنے کی تیاریاں مکمل ہوچکی ہیں، اس لیے دینی حلقوں کو اس صورت حال پر نظر رکھنی چاہیے اور اگر تحفظ ختم نبوت کے فورم سے مناسب نہ ہو تو متحدہ مجلس عمل یا کسی اور فورم سے ان مسائل پر سنجیدہ کام ہونا چاہیے۔

ملت پارٹی اور جمہوری وطن پارٹی کے نمائندوں نے بہت عمدہ بات کی کہ ختم نبوت کا عقیدہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے، اس لیے تحفظ ختم نبوت کا مسئلہ صرف دینی جماعتوں کا نہیں بلکہ پوری قوم کا مسئلہ ہے۔*

O

---

* روزنامہ اوصاف، ۲ جون ۲۰۰۲ء۔

پاسپورٹ سے مذہب کا خانہ ختم کرنے کی خبر

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے رہنما مولانا اللہ وسایا صاحب نے آج صبح فون پر یہ افسوسناک اطلاع دی کہ حکومت پاکستان نے پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ختم کر دیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ۲۵ رنومبر جمعرات کو لاہور میں مختلف دینی جماعتوں کے رہنماؤں کا مشترکہ اجلاس طلب کیا جا رہا ہے۔ میں نے گزارش کی کہ میں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بدھ اور جمعرات کو اسلام آباد میں ہوں گا، اس لیے اجلاس میں شرکت نہیں کر سکوں گا مگر مشترکہ اجلاس میں باہمی مشورہ سے جو پروگرام بھی طے ہوگا، اس میں بہرحال حسب سابق شریک ہوں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مولانا اللہ وسایا نے بتایا کہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب دامت برکاتہم کی طرف سے، جو کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے سربراہ بھی ہیں، ایک اپیل جاری کی جا رہی ہے کہ ۲۶ رنومبر کو پورے ملک میں علمائے کرام جمعۃ المبارک کے خطاب میں اس مسئلے پر روشنی ڈالیں اور پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ختم کرنے پر احتجاج کرتے ہوئے اس کی دوبارہ بحالی کا مطالبہ کریں۔ انہوں نے بطور مشورہ دریافت کیا کہ ہمیں اس سلسلہ میں کیا کرنا چاہیے؟ میری گزارش ہے کہ ہمارے پاس ہمیشہ ایک ہی ہتھیار رہا ہے کہ ہم عوام کو اعتماد میں لیتے ہیں اور رائے عامہ کو بیدار کر کے اس کے ذریعے حکمرانوں کو آمادہ کرتے ہیں کہ وہ ہمارے مطالبات پر توجہ دیں۔ اب بھی ہمیں یہی کچھ کرنا ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ ہم اگر اپنے اس جائز اور اصولی مطالبہ

کے لیے تمام مکاتب فکر کی جماعتوں اور رہنماؤں کو حسب سابق اعتماد میں لیتے ہوئے رائے عامہ کو بیدار اور منظم کرنے کے لیے سنجیدہ محنت کریں تو حکومت کے لیے اس مطالبہ کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جائے گا۔

پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کی موجودگی یا اسے ختم کرنے کے مسئلہ کا تعلق موجودہ اور معروضی حالات میں دو امور سے ہے اور یہ صرف اتنا مسئلہ ہی نہیں کہ ایک سرکاری دستاویز میں مذہب کا خانہ موجود تھا جسے اب مبینہ طور پر ختم کر دیا گیا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل پس منظر ہے جسے ذہن میں رکھے بغیر اس کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ایک بات کا تعلق ملک کی اسلامی نظریاتی شناخت سے ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے اس بات کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے کہ پاکستان کی اسلامی شناخت کو ختم کر دیا جائے اور ایسی ہر علامت کو مٹا دیا جائے جس کا تعلق اسلام سے ہے اور جسے دیکھ کر یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ ملک ان مسلمانوں کا ہے جو اپنے مذہب کی بنیادوں پر نہ صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ اپنے ملک، قوم اور سوسائٹی کی تشکیل میں بھی ان مذہبی بنیادوں کو کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بات آج کے عالمی حلقوں اور ان کے فکر و فلسفہ کے سامنے سپر انداز ہو جانے والے عناصر کے لیے قابل قبول نہیں ہے اور ان کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ جس طرح مغرب نے قومی زندگی میں مذہب کا لبادہ اتار دیا ہے، ہم بھی ان کی طرح مذہب کا لباس اتار کر اس حمام میں ننگے ہو جائیں اور مذہب کو فرد کا اختیاری معاملہ قرار دے کر قومی اور معاشرتی زندگی میں اسلام اور کفر یا مسلمان اور کافر کے فرق کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ پاکستان کے دستور میں موجود اسلامی دفعات اسی لیے قابل اعتراض ٹھہرتی ہیں، حدود کے شرعی قوانین اسی وجہ سے موردِ الزام بنتے رہتے ہیں، توہین رسالت پر موت کی سزا کا قانون صرف اسی وجہ سے انسانی حقوق کے منافی دکھائی دینے لگتا ہے، قرآن و سنت کے بہت سے خاندانی احکام و قوانین اسی بنیاد پر مساوات کے خلاف اور امتیازی قوانین قرار پاجاتے ہیں اور دینی مدارس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں اسلام اور کفر کے فرق کا ذہن باقی رکھے ہوئے ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمان اور کافر کا امتیاز ابھی تک موجود ہے، جبکہ ہمارے بارے میں عالمی استعمار کا ایجنڈا یہ ہے کہ یہ سارے فرق اور امتیاز ختم کر کے

مسلمانوں اور کافروں کی ایسی مخلوط سوسائٹی قائم کر دی جائے جس میں نہ کوئی کسی کو مسلمان نظر آئے اور نہ کوئی کسی کو کافر دکھائی دے، لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کی بنیاد ہی مسلمان اور کافر کے فرق پر ہے اور جس دو قومی نظریہ کو پاکستان کی اساس قرار دیا جاتا ہے، اس کی اس کے سوا کوئی توجیہ ہی ممکن نہیں ہے کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں۔ دونوں کی تہذیب اور تمدن ایک دوسرے سے الگ ہے اور دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے، اس لیے مسلمانوں کا ایک الگ وطن قائم ہونا ضروری ہے جس میں وہ اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل کر سکیں اور اپنے کلچر اور تہذیب کو آزادانہ طور پر اپنا سکیں۔

پاکستان کے قیام کا سب سے بڑا جواز یہی ہے اور اسی جواز کے سہارے پاکستان اب تک ایک الگ ملک کے طور پر کھڑا ہے، ورنہ اگر خدانخواستہ اس فلسفہ اور اصول کی نفی کر دی جائے تو پاکستان کے وجود کا اخلاقی اور سیاسی طور پر کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا اور غالباً پاکستان کی اسلامی شناخت کی علامتوں کو ایک ایک کر کے ختم کرتے چلے جانے والے حضرات چاہتے بھی یہی ہیں تا کہ جنوبی ایشیا کے بارے میں عالمی استعمار کے اس ایجنڈے کو آگے بڑھانے کی راہ ہموار کی جائے جس کا مقصد جنوبی ایشیا کو پھر سے ایک سیاسی وحدت کے دائرے میں سمیٹ کر اس خطے کے مسلمانوں کو اس صلاحیت اور اس کے اظہار کے مواقع سے محروم کر دینا ہے کہ وہ جداگانہ تشخص کے ساتھ اسلام اور عالم اسلام کے بہتر مستقبل کے لیے کوئی کردار ادا کر سکیں۔ اس سے قبل شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ شامل کرنے کا فیصلہ کر کے اسے واپس لینے کا پس منظر بھی یہی تھا، شناختی کارڈ اور ووٹر فارم میں مذہب کا خانہ اور عقیدۂ ختم نبوت کا حلف نامہ ختم کرنے کی وجہ بھی یہی تھی اور اب پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ختم کرنے کا پس منظر بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پاکستان میں مسلمان اور کافر کا فرق مٹا دیا جائے تا کہ نہ کوئی امتیاز موجود رہے اور نہ ہی اس امتیاز اور فرق کو قانونی اور معاشرتی طور پر ملحوظ رکھنے کے مطالبات کا کوئی جواز باقی رہے۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو قادیانیت کے حوالے سے ہے کہ جب قادیانیوں کو دستوری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا اور انہیں اسلام کا نام اور مسلمانوں کی مخصوص علامات وشعائر کے استعمال سے

روک دیا گیا تو آل پارٹیز ختم نبوت ایکشن کمیٹی نے یہ مطالبہ کیا کہ چونکہ قادیانیوں کے نام مسلمانوں جیسے ہیں اور چونکہ قادیانی گروہ اپنے غیر مسلم ہونے کے دستوری فیصلہ کو تسلیم نہیں کر رہا اور چونکہ قادیانی گروہ کے افراد بیرون ملک جا کر مسلمانوں والے ناموں اور اسلام کے دعویٰ کے ساتھ اسلام اور پاکستان کے خلاف کام کرتے ہیں، اس لیے پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کی موجودگی ضروری ہے تا کہ کوئی قادیانی دستور پاکستان سے انحراف کرتے ہوئے بیرون ملک خود کو مسلمان ظاہر کر کے ایسی سرگرمیوں کا ارتکاب نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ شناختی کارڈ، ووٹر فارم یا پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کی موجودگی پر سب سے زیادہ قادیانی جز بز ہوتے ہیں اور ان کی مسلسل کوشش چلی آ رہی ہے کہ انہیں غیر مسلم قرار دینے والے دستوری اور قانونی فیصلے ختم ہو جائیں یا کم از کم عملی امتیازات یا علامتیں قانونی طور پر باقی نہ رہیں جن کی وجہ سے ان کی شناخت مسلمانوں سے الگ ہو جاتی ہے، اور اگر پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ختم کرنے کا فی الواقع فیصلہ ہو گیا ہے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ قادیانیوں کو ہوگا اور اس کی سب سے زیادہ خوشی بھی انہی کو ہوگی۔

قادیانیوں کو اگر جائز طور پر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ ہم تو انہیں مسلسل یہ دعوت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں ملک کی منتخب پارلیمنٹ کا جمہوری اور اصولی فیصلہ تسلیم کرتے ہوئے وہ تمام حقوق حاصل کریں جو معروف اور مسلم طور پر انہیں حاصل ہونے چاہئیں لیکن قوم اور اس کی پارلیمنٹ کے جمہوری فیصلہ کو مسترد کر کے وہ جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ نہ ان کا حق بنتا ہے اور نہ ہی وہ اس طرح ہٹ دھری کے ساتھ قوم سے وہ کچھ لے سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ختم کرنے سے قادیانیوں کو جو فائدہ مل رہا ہے، اس کا تعلق ان کے مسلمہ اور جائز حقوق سے نہیں بلکہ پارلیمنٹ اور دستور کے فیصلے سے ان کے کھلم کھلا انحراف سے ہے اور ہماری کوئی بھی حکومت جب بھی مسلمانوں اور قادیانیوں میں فرق قائم رکھنے والی کسی علامت کو ختم کرتی ہے تو گویا وہ قادیانیوں کی اس ہٹ دھرمی کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے جو وہ پوری قوم اور دستور کے خلاف اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے جنرل پرویز مشرف اور وزیر اعظم جناب شوکت عزیز سے ہماری مودبانہ گزارش ہے کہ وہ اس مسئلہ کو صرف چند این جی اوز کی

قراردادوں یا کچھ بین الاقوامی لابیوں کی خواہشات کے حوالے سے نہ دیکھیں بلکہ اس کے وسیع تر پس منظر اور عمومی تناظر میں اس کا جائزہ لیں اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان یہ معاشرتی فرق قائم کرنے کا مطالبہ سب سے پہلے مفکر پاکستان علامہ سر محمد اقبالؒ نے کیا تھا۔ یہ ان کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کی شناخت کو الگ الگ رکھا جائے، اس لیے اگر مولوی کی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو مفکر پاکستان سے ہی پوچھ لیں کہ وہ قادیانیوں کے بارے میں کیا خیال رکھتے تھے اور ان کی شناخت کو مسلمانوں سے الگ کرنے کے کیوں درپے تھے؟*

O

* روزنامہ اسلام، ۲۴ نومبر ۲۰۰۴ء۔

پاسپورٹ کا مسئلہ اور آل پارٹیز کانفرنس

جمعیۃ علماے اسلام پاکستان کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن نے ۱۸ر دسمبر ہفتہ کو اسلام آباد میں آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس طلب کر لی ہے جس کا مقصد پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ختم کرنے کے بارے میں حکومتی کارروائی کا جائزہ لینا ہے اور دینی حلقوں کے اس مطالبہ کی حمایت کرنا ہے کہ حسب سابق پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ بحال کیا جائے۔ مولانا موصوف نے مختلف جماعتوں کے راہ نماؤں کو اس سلسلے میں جو دعوت نامہ جاری کیا ہے، اس کا متن یہ ہے:

''مسئلہ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے منکرین ختم نبوت (قادیانیوں) کو آئین پاکستان میں متفقہ طور پر پارلیمنٹ نے غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ اس کے قانونی تقاضے کی تکمیل اور حرمین شریفین میں قادیانیوں کا داخلہ روکنے کے لیے پاسپورٹ میں مذہب کے خانے کا اضافہ کیا گیا۔ ۲۵ سال سے یہ خانہ پاسپورٹ میں موجود تھا۔ اب حکومت نے نئے کمپیوٹرائزڈ پاسپورٹ سے اسے حذف کر دیا ہے جو اسلامیان پاکستان کے لیے سخت پریشانی کا باعث ہے۔ اس پر ملک بھر میں شدید احتجاج جاری ہے لیکن تاحال حکومت نے اصلاح احوال کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس حساس دینی وقومی مسئلہ پر سوچ بچار اور لائحہ عمل طے کرنے کے لیے جمعیت علماے اسلام نے تمام مکاتب فکر کی آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس ۱۸ر دسمبر کو طلب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کے حوالے سے کافی دنوں سے دینی وقومی حلقوں میں بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور اس بات پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ پاسپورٹ میں مذہب کا یہ خانہ

جو تحریکِ ختم نبوت کے ایک طویل دور کے بعد دینی حلقوں کے مسلسل مطالبہ اور عوامی دباؤ پر پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلہ کے منطقی تقاضوں کی تکمیل کے لیے آج سے پچیس برس قبل پاسپورٹ میں شامل کیا گیا تھا، اسے ختم کرنے میں اس قدر خاموشی سے کارروائی کی گئی ہے کہ نہ تو پارلیمنٹ کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور نہ ہی ان حلقوں کو اس سلسلے میں کچھ بتانے کی زحمت گوارا کی گئی ہے جن کی جدوجہد کے نتیجے میں یہ خانہ پاسپورٹ کے اندراجات کا حصہ بنا تھا۔ اس لیے ملک کے دینی حلقے یہ اندازہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کوئی مخصوص لابی اندر ہی اندر ملک کی اسٹیبلشمنٹ میں اس مقصد کے لیے متحرک ہے جو قادیانیوں کے بارے میں پارلیمنٹ کے فیصلے کو غیر موثر بنانے کے لیے جب بھی کوئی موقع ملتا ہے، خاموشی کے ساتھ ہاتھ دکھا جاتی ہے۔

اس سے قبل جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دورِ حکومت میں ایسا ہوا تھا کہ مسلم ووٹروں کے فارم میں عقیدہ ختم نبوت کا حلف نامہ اچانک ختم کر دیا گیا تھا جس کا فائدہ صرف قادیانیوں کو تھا کہ وہ اپنے نام مسلم ووٹروں کی فہرست میں درج کرا کے اپنے بارے میں پارلیمنٹ کے فیصلے کو غیر موثر بنا سکتے تھے۔ صورت حال معلوم ہونے پر جب دینی حلقوں نے احتجاج کیا تو کہا گیا کہ اب تو لاکھوں فارم شائع ہو چکے ہیں اور دوبارہ فارم چھپوانے میں وقت اور رقم دونوں کا ضیاع ہوگا۔ اس وقت پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمود نے اس مسئلہ کو ہاتھ میں لیا اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم سے دوٹوک طور پر کہہ دیا کہ ہم الیکشن کے التوا سمیت ہر بات قبول کرنے کو تیار ہیں مگر عقیدۂ ختم نبوت کے حلف نامہ کے بغیر ووٹر فارم کسی صورت میں قبول نہیں ہوں گے جس پر حکومت کو دوبارہ یہ حلف نامہ ووٹر فارم میں شامل کرنا پڑا۔

چند سال قبل ایک بار پھر یہ ڈرامہ دہرایا گیا اور ووٹر فارم سے عقیدۂ ختم نبوت کا حلف نامہ خاموشی کے ساتھ غائب کر دیا گیا جس پر دینی حلقے ایک بار پھر سراپا احتجاج ہوئے۔ جمعیۃ علماء اسلام کے قائد مولانا فضل الرحمٰن نے لاہور میں آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس طلب کی جس پر حکومت کو اپنا یہ اقدام واپس لینا پڑا۔

اب یہ کھیل پاسپورٹ کے ساتھ کھیلا گیا ہے اور انتہائی خاموشی کے ساتھ اسلام آباد سے

جاری ہونے والے نئے مشینی ریڈ ایبل کمپیوٹرائزڈ پاسپورٹ سے مذہب کا خانہ نکال دیا گیا ہے۔ یہ کارروائی اس قدر منظّم انداز میں کی گئی کہ اس کا پتہ اس وقت چلا جب ہزاروں پاسپورٹ جاری ہو چکے تھے اور پاسپورٹ کی لاکھوں کاپیاں طبع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جب اس سلسلے میں رابطہ کیا گیا تو وہی عذر دہرایا گیا کہ اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ لاکھوں کاپیاں چھپ چکی ہیں اور بین الاقوامی معیار کے مطابق ریڈ یبل سسٹم مذہب کے خانہ کو قبول نہیں کرتا، اس لیے کمپیوٹر کے اندراج میں مذہب کا خانہ شامل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ الگ سے پاسپورٹ پر یہ مہر لگائی جا سکتی ہے کہ ''حامل ہذا مسلمان ہے''، مگر یہ عذر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اس حوالے سے حکومت کا جو موقف سامنے آیا ہے اور وفاقی وزرا نے ایوان میں اس کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کی روشنی میں دو تین سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ ایک یہ کہ پاسپورٹ سے مذہب کے خانہ کے خاتمہ کی خاموش کارروائی کس کے حکم سے کی گئی ہے؟ اگر یہ خود حکومت کا فیصلہ ہے تو اس نے اس سلسلے میں قومی اسمبلی اور متعلقہ فریقوں کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟ اور اگر افسر شاہی کی کسی لابی نے از خود اتنی بڑی کارروائی کر دی ہے تو اس کے ذمہ دار افراد کے خلاف کیا ایکشن لیا گیا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی سسٹم پاسپورٹ کے خانے میں مذہب کے خانے کو قبول نہیں کر رہا اور اسے نارمل کارروائی کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے تو کل اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ساتھ ''اسلامی'' کے لفظ کو قبول کرنے سے بین الاقوامی سسٹم نے ہچکچاہٹ سے کام لینا شروع کر دیا تو کیا ہماری حکومت کا اس پر بھی یہی ردعمل ہوگا؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ جب پاسپورٹ کے باقاعدہ اندراجات میں مذہب کا ذکر نہیں ہوگا اور صرف مہر لگائی جائے گی کہ ''حامل ہذا مسلمان ہے''، تو اگر کوئی شخص جعلی مہر لگا کر خود کو مسلمان ظاہر کرے تو اس کے اس فراڈ کو چیک کرنے کی کیا صورت ہوگی، خصوصاً اس حوالے سے کہ قادیانیوں کی ایک عرصہ سے یہ کوشش چلی آ رہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے خود کو سرکاری دستاویزات میں مسلمان ظاہر کریں تو ان کی اس کوشش کا توڑ کیا ہوگا؟

ادھر سعودی عرب کے ممتاز رہنما اور موتمر عالم اسلامی کے صدر ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کے اس خط نے بھی پاکستان کے دینی حلقوں کے خدشے کی تصدیق کر دی ہے جو انھوں نے اس سلسلے میں سعودی حکومت کو لکھا ہے اور ''آن لائن'' کی رپورٹ کے مطابق انھوں نے پاکستان کے پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ختم کیے جانے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے حرمین شریفین میں قادیانیوں کے داخلہ کی راہ ہموار ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حرمین شریفین میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے مگر قادیانی گروہ کئی دفعہ چکمہ دے کر حرمین شریفین میں داخل ہونے کی کوشش کر چکا ہے۔ اس گروہ کے زیادہ تر لوگوں کا تعلق پاکستان سے ہے اور ان کو حرمین شریفین میں داخلے سے باز رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پاسپورٹ پر مذہب کا اندراج کیا جائے۔ ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کے اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں صرف پاکستان میں نہیں بلکہ سعودی عرب میں بھی تشویش پائی جاتی ہے اور اس کارروائی کے منفی اثرات وخطرات کو وہاں بھی پوری طرح محسوس کیا جا رہا ہے۔

اس پس منظر میں جمعیۃ علماے اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمٰن کی طلب کردہ آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تمام دینی جماعتیں اس میں پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ شریک ہوں گی اور حسب سابق تمام دینی جماعتوں کا یہ مشترکہ فورم سرکاری حلقوں میں چھپی ہوئی قادیانی نواز لابی کی اس سازش کا سد باب کرنے میں بھی کامیاب ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔*

O

* روزنامہ اسلام، ۱۵ر دسمبر ۲۰۰۴ء۔

پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ اور ختم نبوت کانفرنس

آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس کی رابطہ کمیٹی نے، جو جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان کے راہنما حافظ حسین احمد ایم این اے کی سربراہی میں کام کر رہی ہے، ۹ مارچ بدھ کو اسلام آباد میں کل جماعتی تحفظ ختم نبوت کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے جس کے لیے ملک بھر میں کال دی گئی ہے اور جس کے بارے میں تحریک ختم نبوت کے راہنما مختلف جلسوں میں اعلان کر رہے ہیں کہ اگر اس روز قومی اسمبلی کا اجلاس ہوا تو کانفرنس کے شرکا رابطہ کمیٹی کے ارکان کی قیادت میں قومی اسمبلی کے باہر اپنے مطالبات کی حمایت میں عوامی مظاہرہ کریں گے۔ ۹ مارچ کی اس کانفرنس کے لیے ملک بھر میں علمائے کرام اور دینی کارکن تیاریاں کر رہے ہیں اور اندازہ ہے کہ مختلف علاقوں سے ہزاروں افراد اس روز اسلام آباد پہنچ کر کانفرنس میں شریک ہوں گے اور پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کی بحالی کے مطالبہ کی حمایت میں اپنے جذبات اور یک جہتی کا اظہار کریں گے۔

مجوزہ پروگرام کے مطابق جامع مسجد دارالسلام جی سکس ٹو میں صبح ۱۱ بجے کانفرنس کا آغاز ہوگا جس سے مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام خطاب کریں گے اور اس موقع پر اگر پروگرام طے پا گیا تو کانفرنس کے اختتام پر اس کے شرکا قومی اسمبلی کی طرف مارچ کر کے اس مطالبہ کے حق میں مظاہرہ کریں گے۔ اس سے قبل کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام مختلف شہروں میں ختم نبوت کانفرنسوں کا سلسلہ جاری ہے اور مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام ان سے خطاب کر رہے ہیں۔ مجھے بھی گزشتہ دنوں گوجرانوالہ شہر اور وزیر آباد میں منعقد ہونے والے تین چار اجلاسوں میں شرکت کا

موقع ملا ہے جبکہ ۲ مارچ کو خود ہمارے ہاں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں علماء کرام اور دینی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور متعدد راہنماؤں نے اس سے خطاب کیا۔

راقم الحروف نے اس موقع پر عرض کیا کہ پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کو ختم کرنے کا معاملہ اس قدر سادہ اور معمولی نہیں ہے کہ اسے اس طرح خاموشی کے ساتھ نمٹا لیا جائے۔ اس لیے کہ اس کے پیچھے ایک سو سال کی جدوجہد ہے اور اس مسئلہ کے قادیانی پس منظر کے حوالے سے یہ معاملہ انتہائی حساس اور نازک ہے جس کا تعلق مسلمانوں کے عقیدہ اور جذبات کے ساتھ ہے۔ پاسپورٹ میں مذہب کے خانے کا اضافہ اب سے ربع صدی قبل قادیانی پس منظر میں ہی کیا گیا تھا جب پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے جمہوری طریقے سے مکمل بحث و تمحیص اور قادیانی راہ نماؤں کو صفائی کا موقع دینے کے بعد مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال کی اس پرانی تجویز کو دستور میں شامل کر لیا تھا کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک نئی امت شمار کیا جائے کیونکہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت کے بعد اسے اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کر کے امت مسلمہ سے الگ ہو چکے ہیں اور ملت اسلامیہ کا حصہ نہیں رہے۔

علامہ اقبال کی یہ تجویز ایک درمیانی راستہ کی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ علماء کرام اور دینی حلقوں کا موقف تو یہ تھا کہ ایک مسلمان حکومت کو نبوت کے دعوے داروں اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہیے جو یمن کے مدعی نبوت اسود عنسی کے ساتھ خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بنوحنیفہ کے مسیلمہ کذاب، بنواسد کے طلیحہ اور بنوتغلب کی خاتون مدعیہ نبوت سجاح کے ساتھ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق نے کیا تھا۔ کسی مسلمان ریاست میں نبوت کے مدعی کے ساتھ شرعی معاملہ یہی بنتا ہے، لیکن علامہ محمد اقبال کا خیال یہ تھا کہ یہ بات آج کے دور میں بوجوہ قابل عمل نہیں ہے، اس لیے قادیانیوں کو دیگر غیر مسلم اقلیتوں کے زمرہ میں شمار کر کے ان کے اقلیتی حقوق تسلیم کیے جائیں، چنانچہ پاکستان بننے کے بعد قادیانیوں کی سرگرمیوں میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہونے لگا تو دینی حلقوں نے اپنے مطالبہ کی بنیاد علامہ محمد اقبال ہی کے موقف پر رکھی اور قادیانیوں کو پاکستان

میں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک شروع کی جو ۱۹۷۴ء میں پارلیمنٹ کے دستوری فیصلے پر منتج ہوئی کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں قادیانیوں کے دونوں گروہوں کو غیر مسلم اقلیت کی حیثیت حاصل ہوگی، مگر قادیانیوں نے یہ فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، حالانکہ امت مسلمہ کے دنیا بھر کے علمی و دینی مراکز اس سے قبل انھیں غیر مسلم قرار دے چکے تھے اور بعد میں پاکستان کی سپریم کورٹ نے بھی یہی فیصلہ صادر کیا، لیکن قادیانی گروہ پارلیمنٹ، حکومت اور عدلیہ اور دنیا بھر کے اسلامی مراکز اور دینی حلقوں کے اس متفقہ فیصلے کے علی الرغم خود کو مسلمان کہلانے پر مصر رہا اور اب تک اس کا یہ اصرار جاری ہے اور قادیانیوں کے اسی اصرار بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے پاسپورٹ میں مذہب کے خانے کا اضافہ کرنا پڑا تا کہ قادیانی خود کو دنیا میں مسلمان ظاہر کر کے اسلام کے نام پر اپنے نئے مذہب کا تعارف نہ کرا سکیں۔ اسی وجہ سے پاسپورٹ کے فارم میں عقیدۂ ختم نبوت کا حلف نامہ شامل کیا گیا کہ اس حلف نامہ کو پر کرنے والے کو پاسپورٹ میں مسلمان لکھا جائے گا اور جو اس حلف نامہ کو پر نہیں کرے گا، وہ غیر مسلموں میں شمار ہوگا، لیکن اب حکومت نے اچانک یہ خانہ ختم کر دیا ہے اور ملک بھر سے ہمہ گیر احتجاج کے باوجود اس کی بحالی کے لیے ابھی تک وہ تیار نہیں ہے۔ اس لیے میں اس حوالے سے حکومت کے ذمہ دار حضرات سے یہ اصولی اور سنجیدہ سوال کرنا چاہتا ہو کہ اس صورت حال میں آخر کیا تبدیلی آئی ہے کہ حکومت نے یک لخت اور خاموشی کے ساتھ مذہب کے خانے کو پاسپورٹ سے نکال باہر کیا ہے؟ کیا قادیانیوں نے ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر اپنے بارے میں پارلیمنٹ اور عدالت عظمیٰ کا فیصلہ تسلیم کر لیا ہے؟ اگر ایسا ہے ت کسی درجے میں یہ بات سوچی جا سکتی ہے کہ اب وہ ضرورت باقی نہیں رہی جس کی وجہ سے پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ شامل کیا گیا تھا، لیکن قادیانی بدستور اپنی ضد پر قائم ہیں اور ہٹ دھرمی پر پوری طرح اڑے ہوئے ہیں اور ان کی یہ ضد اور ہٹ دھرمی صرف مولویوں کے خلاف نہیں بلکہ دستور، قانون، پارلیمنٹ، عدالت عظمیٰ اور حکومت کے خلاف بھی ہے کیونکہ وہ ان سب کے فیصلوں کو مسترد کر رہے ہیں، لیکن ان کی اس ضد اور ہٹ دھرمی کے باوجود حکومت نے مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان امتیاز رکھنے والا یہ قانون ختم کر دیا ہے اور پاسپورٹ سے مذہب کے خانے کے اخراج کو ضروری سمجھا ہے تو پھر اس کا دوسرا

مطلب یہ بنتا ہے کہ حکومت نے قادیانیوں کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور ان کے بارے میں پارلیمنٹ، عدالت عظمیٰ اور حکومت کے سابقہ موقف اور فیصلوں کو منسوخ کر دیا ہے، مگر اس کا زبان سے اعتراف کرنے کے بجائے عملی طور پر ان فیصلوں کو غیر موثر بنانے کے لیے اس طرح کے اقدامات کر رہی ہے۔

اس لیے یہ بات اس قدر آسان نہیں ہے بلکہ حکومت کو اس دو باتوں میں کسی ایک بات کا اعتراف ضرور کرنا پڑے گا کہ قادیانیوں نے ضد چھوڑ دی ہے اور خود کو غیر مسلم تسلیم کر لیا ہے، اس لیے اب پاسپورٹ میں مذہب کے خانے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور یا پھر حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا فیصلہ منسوخ کر دیا ہے اور اب اس کے نزدیک قادیانی گروہ کا شمار مسلمانوں میں ہونے لگا ہے، اس لیے اب پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ غیر ضروری ہے۔ ان دو کے سوا تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے اور حکومت کو اس سلسلے میں اپنی پوزیشن بہر حال واضح کرنا ہوگی اور اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو حکومت ہٹ دھرمی چھوڑ دے اور کسی تاخیر اور ٹال مٹول کے بغیر پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ بحال کرنے کا اعلان کرے۔

یہ تو وہ گزارشات ہیں جو میں نے گوجرانوالہ اور وزیر آباد کی ختم نبوت کانفرنسوں میں پیش کیں۔ ان کے علاوہ دو باتیں اور ہیں جو میں اس کالم کے ذریعے اپنے قارئین کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ بعض حکومتی حلقوں کی طرف سے کہا گیا ہے کہ پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ تو سعودی عرب کے پاسپورٹ میں بھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میری معلومات کے مطابق اس سال حج کے موقع پر پاکستانی علمائے کرام کا ایک وفد، جس میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد حنیف جالندھری بھی شامل تھے، سعودی عرب کے وزیر داخلہ سے ملا اور ان سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو سعودی وزیر داخلہ نے انھیں بتایا کہ ہمارے ہاں تو کسی غیر مسلم کو سرے سے نیشنلٹی ہی نہیں دی جاتی، اس لیے سعودی عرب کا پاسپورٹ کسی غیر مسلم کو جاری نہیں ہوتا اور سعودیہ کا پاسپورٹ ہی اس کے مسلمان ہونے کا ثبوت ہوتا ہے، البتہ ملک کے اندر باہر سے کام کے لیے آنے والوں کو ہم اقامہ کا جو کارڈ جاری کرتے ہیں، اس میں مسلمانوں کے لیے الگ رنگ کا کارڈ

ہوتا ہے اور غیر مسلموں کے لیے الگ رنگ کا کارڈ جاری کیا جاتا ہے، اس لیے اس سلسلے میں سعودی عرب کے پاسپورٹ کو دلیل کے طور پر پیش کرنا درست نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پاسپورٹ میں مذہب کے خانے کی بحالی کا مطالبہ شروع ہوتے ہی حکومتی حلقوں نے اس کا اپنی طرف سے متبادل پیش کیا تھا کہ باقاعدہ اندراج کی بجائے مسلمانوں کے پاسپورٹ میں مذہب کے خانے کی مہر لگا دی جائے۔ میری معلومات کے مطابق اس وقت سے یہ مہر لگائی جا رہی ہے اور شاید حکومت کی طرف سے اب بھی اسی کو متبادل حل کے طور پر سامنے لایا جائے، لیکن یہ بات قابل قبول نہیں ہے اور آل پارٹیز ختم نبوت کانفرنس نے اس کو پہلے ہی مسترد کر دیا ہے، اس لیے کہ اصل مسئلہ پاسپورٹ کے کمپیوٹرائزڈ اندراجات کا ہے کیونکہ جب تک اصل اندراجات میں مذہب کا خانہ نہ ہو، وہ دھوکہ دہی ختم نہیں ہوسکتی جس کے سدباب کے لیے پاسپورٹ میں مذہ کا خانہ شامل کیا گیا تھا۔ ہمارا اصل مطالبہ قادیانیوں کی دھوکہ دہی کو ختم کرنے کا ہے اور وہ باقاعدہ کمپیوٹرائزڈ اندراجات میں مذہب کا خانہ شامل کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے حکومت سے گزارش ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرح کی باتوں میں الجھانے اور بہلانے کی بجائے عوام کا مطالبہ تسلیم کرے اور پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کی باضابطہ بحالی کا اعلان کرے۔*

O

* روزنامہ اسلام، ۹/مارچ ۲۰۰۵ء۔

'حدود آرڈیننس' میں ترامیم کا پس منظر

[۶ر دسمبر ۲۰۰۶ء کو بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے عمر بن الخطابؓ ہال میں جمعیۃ طلباء اسلام کے زیر اہتمام ایک نشست میں کیے جانے والے خطاب کا ایک حصہ]

پاکستان میں حدود قوانین کی مخالفت کا سلسلہ ان کے نفاذ کے بعد سے جاری ہے اور ملک کے سیکولر حلقوں کے ساتھ سینکڑوں این جی اوز اور انسانی حقوق کے حوالہ سے کام کرنے والی بیسیوں تنظیمیں اس مقصد کے لیے ربع صدی سے متحرک ہیں۔ ان کی اس مہم کا اصل مقصد تو وہی ہے جو بین الاقوامی حلقوں کا ہے اور ملک کے اندرونی سیکولر حلقوں کی جدوجہد کے اہداف مذکورہ بالا بین الاقوامی اہداف سے مختلف نہیں ہیں، لیکن ان کے اعتراضات میں کچھ داخلی امور بھی ہیں جن میں سے ایک دو کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے وقت یہ کہا جا رہا تھا کہ اس سے جرائم کنٹرول ہوں گے اور معاشرہ میں امن قائم ہو گا لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا بلکہ حدود کے نفاذ کے بعد جرائم میں اضافہ ہوا ہے اور قانون شکنی کا دائرہ مزید وسیع ہوا ہے۔ اس معروضی حقیقت سے انکار ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی کسی باشعور شخص کو معروضی حقائق سے انکار کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ہمارے معاشرے میں جرائم کنٹرول نہیں ہوئے بلکہ ان میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس کے اسباب کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے، اس لیے کہ آج کے دور میں ہمارے سامنے یہی قوانین سعودی عرب جرائم میں کنٹرول کرنے کا ذریعہ بنے ہیں اور یہ عام مشاہدے کی بات ہے۔ جو حضرات اب سے پون صدی قبل کے سعودی معاشرہ کی صورت حال سے آگاہ ہیں،

وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ سعودی عرب کے قیام سے قبل حجاز مقدس میں چوری، قتل ،ڈاکہ اور دوسرے جرائم اس قدر عام تھے کہ حج بیت اللہ کے لیے جانے والے لوگ بھی اس سے محفوظ نہیں تھے بلکہ اس کا نشانہ زیادہ تر وہی بنتے تھے، لیکن شاہ عبدالعزیز آل سعود مرحوم نے سعودی عرب کے قیام کے بعد اس کا اقتدار سنبھالتے ہی شرعی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا اور ان پر موثر عملدرآمد کا اہتمام کیا تو وہاں جرائم پر نہ صرف یہ کہ کنٹرول حاصل ہوا بلکہ جرائم کی شرح کے حوالہ سے سعودی عرب کو آج بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی آج کے دور کی ایک مشاہداتی حقیقت ہے کہ ہمارے پڑوسی افغانستان میں جب طالبان نے زمام اقتدار سنبھالی اور شرعی قوانین کے نفاذ کا اہتمام کیا تو ان کے پانچ سالہ دور میں ان کے دائرہ اختیار میں جرائم کنٹرول ہوئے جسے بین الاقوامی حلقوں میں تسلیم کیا گیا حتیٰ کہ وار لارڈز کے خاتمہ اور پوست کی کاشت پر پابندی کے حوالہ سے طالبان حکومت کی کامیابی کا عالمی اداروں کی باقاعدہ رپورٹوں میں کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ قوانین اگر سعودی عرب میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور افغانستان میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے تو پاکستان میں ان کے غیر موثر ہونے کی وجہ کہیں اور تلاش کرنی پڑے گی، اس لیے کہ ایک بیج اگر ایک زمین میں پھل دیتا ہے، دوسری زمین میں بھی پھل دیتا ہے لیکن تیسری زمین میں پھل نہیں دیتا تو قصور بیج کا نہیں گنا جائے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یا تو زمین درست نہیں ہے یا اس میں بیج ڈال کر پانی، کھاد اور گوڈی کا اہتمام کرنے والوں کے عمل میں کوتاہی ہے۔ ہمارے خیال میں فرق کا اصل نکتہ یہ ہے کہ سعودی عرب نے حدود شرعیہ نافذ کر کے ان پر عملدرآمد کے لیے قضا کا شرعی نظام فراہم کیا، اس لیے یہ قوانین کامیاب ہوئے۔ طالبان نے بھی افغانستان میں صرف حدود شرعیہ کے نفاذ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان قوانین پر موثر عملدرآمد کے لیے قضاے شرعی کا عدالتی نظام بھی قائم کیا جس کی وجہ سے وہ ان قوانین کے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر ہم نے یہ کیا کہ قوانین تو شریعت اسلامیہ کے نافذ کیے، مگر عدالتی سسٹم وہی پرانا برطانوی نوآبادیاتی دور کا باقی رکھا اور حدود قوانین کو اس سسٹم کے حوالہ کر دیا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ میں اس کی مثال یوں دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ہنڈا کار کے انجن میں سوزوکی کا گیئر بکس فٹ کر دیا جائے یا چاول

چھڑنے والی مشین سے گندم پیسنے کا کام لیا جائے۔ ہمارے ہاں اگر حدود قوانین موثر نہیں ہوئے تو اس کی وجہ قوانین نہیں بلکہ عدالتی سسٹم ہے جسے تبدیل کیے بغیر کسی بھی اسلامی قانون کے موثر نفاذ کا مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

حدود قوانین پر دوسرا بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان قوانین کا غلط استعمال ہوتا ہے اور بہت سی بے گناہ عورتوں کو پھنسا دیا جاتا ہے، لوگ انتقام میں اور دشمنی میں عورتوں کے نام لکھوا دیتے ہیں اور وہ جیلوں میں بلاوجہ پڑی رہتی ہیں۔ اس حوالہ سے بہت پروپیگنڈا کیا گیا اور کچھ عرصہ قبل ایک آرڈیننس بھی جاری کیا گیا کہ جو عورتیں جیلوں میں ہیں، انہیں رہا کر دیا جائے مگر اس آرڈیننس کے نتیجے میں ملک بھر میں جو عورتیں جیلوں سے رہا کی گئیں، ان میں تیس فیصد بھی ایسی نہیں تھیں جو حدود قوانین کے تحت جیل میں ہوں، لیکن اس کی آڑ میں سب کو رہا کر دیا گیا ہے اور اب صورتحال یہ ہے کہ عورتوں کو کسی بھی جرم میں گرفتار نہ کرنے کی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ بات بجائے خود قابل غور ہے کہ مرد اگر جرم کرتا ہے تو گرفتار ہوگا اور جیل میں بھی جائے گا مگر عورت جرم کرتی ہے تو اسے جیل میں نہیں بھیجا جائے گا۔ کیا یہ امتیازی قانون نہیں ہے؟ اور کیا عورتوں کو جیل سے مستثنیٰ کر کے جنس کی بنیاد پر امتیاز نہیں برتا جا رہا؟ بہرحال حدود قوانین کے خلاف مسلسل یہ پروپیگنڈا جاری ہے کہ ان کا غلط استعمال ہوتا ہے اور اس بات کو ان قوانین کو ختم کرنے یا ان میں ردوبدل کا جواز بنایا جا رہا ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنی نشری تقریر میں زور دے کر کہا ہے کہ عورتوں پر ۲۷ سال سے یہ ظلم ہو رہا تھا کہ ایک عورت زنا بالجبر کا کیس درج کراتی ہے مگر جس پر اس کا الزام ہے، وہ اس کے خلاف چار گواہ پیش نہیں کر سکتی تو اسے خود گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے حوالہ سے تو زنا کا اعتراف کر ہی لیا ہے۔ صدر صاحب نے کہا ہے کہ یہ بہت بڑا ظلم ہے جو حدود آرڈیننس کے تحت پاکستان میں عورتوں پر روا رکھا جا رہا ہے، اس لیے انہوں نے حدود میں ترامیم کو ضروری سمجھا ہے۔ دوسری طرف مولانا محمد تقی عثمانی نے علی الاعلان اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ وہ وفاقی شرعی عدالت کے جج اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ کے رکن کے طور پر سترہ سال تک یہ مقدمات سنتے رہے ہیں، ان سترہ سالوں کے دوران میں ایک کیس بھی اس نوعیت کا ان کے سامنے نہیں آیا

جس کی صدر صاحب بات کر رہے ہیں۔ پھر بالفرض اگر پروسیجر کی کسی کمزوری کی وجہ سے اس کا امکان موجود بھی ہے تو اس کا حل قانون کو ختم کرنا نہیں بلکہ پروسیجر کو تبدیل کر کے اس کا سدِ باب کرنا ہے لیکن یہاں سرے سے زنا بالجبر پر شرعی حد کی سزا ہی ختم کر دی گئی ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ حدود قوانین کا غلط استعمال ہوتا رہا ہے تو سوال یہ ہے کہ کون سا قانون ہمارے ملک کا ایسا ہے جس کا غلط استعمال نہیں ہوتا؟ قتل اور اقدام قتل کی دفعات ۳۰۲ اور ۳۰۷ کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا پچاس فیصد بھی صحیح استعمال ہو رہا ہے اور ان دفعات کے تحت ملک بھر میں جو لوگ جیلوں میں ہیں، ان کے بارے میں کون گارنٹی دے سکتا ہے کہ ان میں سے پچاس فیصد بھی اصل ملزم ہیں؟ تو کیا ان دفعات کے غلط استعمال کی وجہ سے ۳۰۲ اور ۳۰۷ کی دفعات کو ختم کر دیا جائے گا؟ اور اگر کوئی شخص اس کا مطالبہ کر دے تو کیا کوئی بھی باشعور شہری اس کی حمایت کے لیے تیار ہوگا؟ کسی قانون کے غلط استعمال کا تعلق قانون کے صحیح یا غلط ہونے سے نہیں بلکہ ہمارے معاشرتی رویہ سے ہے، ہمارے بدعنوان معاشرتی مزاج سے ہے۔ ہمارے ہاں ہر قانون کا کسی نہ کسی طرح غلط استعمال ضرور ہوتا ہے۔ قانون تو قانون ہے، ہمارے ہاں دستور غریب کا یہ حال ہے کہ جب کسی جنرل کا جی چاہتا ہے، اس کے ناک کان مروڑ کر اس کا رخ بدل دیتا ہے اور اسے اپنی خواہش کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے تو بے چارے قانون کا کیا قصور ہے اور اس کا کون پرسان حال ہے؟ قانون کے غلط استعمال کو روکنے کا طریقہ قانون کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ معاشرتی رویے کو تبدیل کرنے کی جدوجہد ہے۔ اس کے بغیر کوئی قانون بھی اس طرح کے غلط استعمال سے نہیں بچ سکتا جس کا الزام مسلسل حدود آرڈیننس کے حوالہ سے دہرایا جا رہا ہے اور اسی الزام پر حدود آرڈیننس کا جھٹکا کر دیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ پس منظر جس کے نتیجے میں تحفظ حقوق نسواں بل سامنے آیا ہے جو اب منظوری کے مراحل سے گزر کر ایکٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ بل جب قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا تو اس پر خاصا ہنگامہ کھڑا ہوا اور قومی اسمبلی میں موجود علمائے کرام نے اسے قرآن وسنت کے منافی قرار دیتے ہوئے شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ اس احتجاج کی شدت کو کم کرنے کے لیے حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن میں اس بات پر اتفاق ہوا کہ

کچھ ایسے سرکردہ علمائے کرام سے اس سلسلہ میں رائے لے لی جائے جو سیاسی کشمکش میں فریق نہ ہوں اور خالصتاً علمی اور دینی حوالہ سے اس بل کی خلاف شریعت باتوں کی نشاندہی کر دیں۔ چودھری صاحب نے اسمبلی کے فلور پر اعلان کیا کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی دفعہ بھی اس بل میں ہوئی تو اسے تبدیل کیا جائے گا اور قرآن وسنت کے منافی کوئی بل کسی صورت میں منظور نہیں کیا جائے گا، چنانچہ جن علمائے کرام کو سیاسی طور پر غیر جانبدار تصور کرتے ہوئے اس مقصد کے لیے اسلام آباد بلایا گیا، ان میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا حسن جان، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی غلام الرحمٰن اور مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی کے ساتھ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ ہم چودھری شجاعت حسین کی دعوت پر اسلام آباد میں جمع ہوئے اور طویل مذاکرات اور گفت وشنید کے بعد بعض نکات پر ہم متفق ہوگئے۔ ان مذاکرات میں مذکورہ بالا علمائے کرام کے ساتھ چودھری شجاعت حسین صاحب، چودھری پرویز الٰہی صاحب اس بل کے بارے میں قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے چیئر مین سردار نصر اللہ دریشک صاحب، وفاقی وزیر قانون وصی ظفر صاحب، وفاقی سیکرٹری اور اٹارنی جنرل کے علاوہ دیگر افسران بھی شریک ہوئے۔ ہم نے اس سلسلہ میں کئی ملاقاتیں کیں اور ایک موقع پر تو ہم صبح ۹ بجے سے نماز اور کھانے کے وقفے کے ساتھ رات تین بجے تک بحث ومباحثہ کرتے رہے جس کے نتیجے میں تین باتوں پر اتفاق رائے ہوگیا۔ ایک یہ کہ اس نئے قانون میں زنا بالجبر کو شرعی حد کے دائرے سے نکال کر تعزیری قانون بنا دیا گیا ہے جو درست نہیں ہے، اس لیے حسب سابق زنا بالجبر پر شرعی حد کی سزا بحال کی جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ زنا بالرضا کے مقدمہ میں زنا کا شرعی ثبوت مکمل نہ ہونے پر اس سے نچلے درجے کے جو جرائم اسی کیس میں ثابت ہوگئے ہیں، ان پر حدود آرڈیننس میں تعزیری سزا رکھی گئی تھی مگر نئے بل میں ان تعزیری سزاؤں کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ تعزیری سزائیں بحال کی جائیں گی، البتہ ان کا عنوان زنا کی بجائے فحاشی میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں طویل بحث ومباحثہ کے بعد ایک نئی دفعہ کا متن طے ہوا جس کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ اسے تحفظ حقوق نسواں بل کا حصہ بنایا جائے گا اور تیسری بات یہ کہ حدود آرڈیننس کی اس دفعہ کو نئے مسودہ قانون میں حذف کر دیا گیا تھا کہ کسی دوسرے

قانون کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں حدود قوانین کو بالادستی حاصل ہوگی۔ اس پر ایک نئی دفعہ قانون میں شامل کرنے پر اتفاق ہوا کہ ان قوانین کی تعبیر واطلاق میں قرآن وسنت کی تشریحات کو فوقیت حاصل ہوگی اور اس دفعہ کا متن بھی باہمی اتفاق رائے سے طے ہوا۔

ان کے علاوہ ہم نے اور بھی بہت سی تجاویز دیں جو قومی پریس کے ریکارڈ میں آ چکی ہیں مگر مذکورہ تین باتیں صرف ہماری تجاویز نہیں بلکہ متفقہ فیصلہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے کہ اگر ہم نے صرف تجاویز اور رائے دینا ہوتی تو وہ ہم دوسری تجاویز کی طرح لکھ کر حوالہ کر سکتے تھے، لیکن ان تین امور کو طویل مذاکرات کے بعد متفقہ فیصلے کے طور پر تحریر کیا گیا۔ اس پر علمائے کرام کے علاوہ چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی اور سردار نصر اللہ دریشک صاحب نے بھی دستخط کیے اور پھر ان کو چودھری صاحبان نے ہی پریس کے حوالے بھی کیا، لہٰذا ان تین امور کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ علمائے کرام کی تجاویز تھیں جنہیں قبول نہیں کیا گیا بلکہ یہ متفقہ فیصلہ تھا جس سے انحراف کیا گیا ہے اور یہ بہت بڑے ظلم اور ناانصافی کی بات ہے۔ بہرحال ان مراحل سے گزر کر تحفظ حقوق نسواں بل کو جس شکل میں قومی اسمبلی اور سینٹ نے منظور کیا ہے اور جس انداز میں صدر جنرل پرویز مشرف نے اس کی منظوری کو ایک تاریخی واقعہ قرار دیتے ہوئے اس پر دستخط کر کے اسے ایکٹ کی شکل دی ہے، وہ ایک الگ المیہ ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ قرآن وسنت کے صریح احکام اور علمائے کرام کے ساتھ متفقہ معاہدہ سے انحراف کرنے کے باوجود اس ایکٹ کو قرآن وسنت کے عین مطابق قرار دیا جا رہا ہے اور ملک بھر کے علمائے کرام کی تحقیر اور کردار کشی کرتے ہوئے قرآن وسنت کی من مانی تشریحات کے ذریعے سے شریعت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

اس پس منظر اور معروضی صورت حال کے تذکرہ کے بعد اب میں آتا ہوں اس بات کی طرف کہ تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے ذریعے سے حدود آرڈیننس میں کیا تبدیلیاں کی گئی ہیں اور اس نئے قانون کی منظوری کے بعد قانونی صورتحال میں کیا تغیر آیا ہے۔ اس سلسلے میں میرے تبصرہ کی بنیاد چار رپورٹیں ہیں جن کی روشنی میں اس قانون کے ذریعے رونما ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ پہلی رپورٹ جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی کا وہ تجزیاتی مضمون ہے جس میں انہوں

نے جامعیت اور اختصار کے ساتھ اس ایکٹ کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ دوسری رپورٹ وہ یادداشت ہے جس میں تمام مکاتب فکر کے سترہ اکابر علمائے کرام نے مشترکہ طور پر چودھری شجاعت حسین صاحب کو مخاطب کیا ہے اور خود ان کے گھر جا کر وہ یادداشت ان کے حوالہ کی ہے۔ تیسری رپورٹ سرکردہ اہل حدیث علمائے کرام کا وہ تجزیاتی جائزہ ہے جو قومی اخبارات کے ذریعے سے منظرِ عام پر آ چکا ہے اور چوتھی رپورٹ محترمہ ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی صاحبہ کا تجزیاتی مضمون ہے جو حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی ہمشیرہ ہیں اور جمعیۃ علمائے پاکستان کے شعبہ خواتین کی سربراہ ہیں۔ ان رپورٹوں کے حوالہ سے میں ان چند تبدیلیوں کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں جو تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے ذریعے سے سامنے آئی ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر اس سلسلہ میں سب سے بڑی تبدیلی اور خرابی یہ نظر آتی ہے کہ اس قانون میں زنا کے علاوہ کوئی اور مسئلہ شامل نہیں ہے مگر اسے عنوان ''حقوق'' کا دیا گیا ہے اور اس طرح زنا کو حقوق کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ بات صدر جنرل مشرف صاحب نے بھی اپنی نشری تقریر میں کہی ہے کہ ہم اس ایکٹ میں زنا کے سوا کسی مسئلہ کو نہیں چھیڑا اور امر واقعہ بھی یہ ہے کہ اس میں زنا ہی کے قوانین بیان کیے گئے ہیں لیکن اسے حقوق کا عنوان دے کر یہ تاثر دیا گیا ہے کہ ہمارے ہاں زنا اب جرائم میں نہیں بلکہ حقوق میں شمار ہوگا، اس لیے اس قانون کے حوالہ سے میرا سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ زنا حقوق میں کب سے شامل ہو گیا ہے؟ اس پس منظر میں اس سوال کی سنگینی اور سنجیدگی میں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ مغربی دنیا میں زنا حقوق میں شمار ہوتا ہے۔ وہاں انسانی حقوق کے نام سے عورتوں کے اسقاط حمل کے مطلق حق اور ہم جنس پرستوں کی شادیوں کو قانونی تحفظ دینے کے جو مطالبات ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں جو قانون سازی ہو رہی ہے، وہ ''زنا'' کو حقوق میں شامل کرنے کا ہی نتیجہ ہے، جبکہ اسلامی شریعت میں یہ عمل جرائم میں بلکہ سنگین ترین جرائم میں شمار کیا جاتا ہے۔

میرا دوسرا اعتراض اس قانون پر یہ ہے کہ زنا کو حقوق کا عنوان دیا گیا ہے اور حقوق بھی عورتوں کے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دنیا کے سامنے پاکستانی عورت کی یہ تصویر پیش کر رہے ہیں کہ وہ زنا کی

سہولت مانگ رہی ہے اور ہمارے معاشرہ میں عورت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے زنا کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہونے چاہییں۔ یہ پاکستانی عورت کی بہت غلط تصویر ہے جو ہم اس قانون کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور واقعہ کے بھی خلاف ہے کیونکہ پاکستانی عورتوں کی غالب اکثریت عصمت وعفت پر یقین رکھتی ہے اور اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات پر ان کا پختہ ایمان ہے۔

اس قانون میں ایک بہت بڑی زیادتی یہ کی گئی ہے کہ زنا کی دونوں صورتوں یعنی زنا بالرضا اور زنا بالجبر کو نا قابل دست اندازی پولیس قرار دے دیا گیا ہے جس کی سادہ سی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس طرح پولیس کے عمل دخل کو کم کر دیا گیا ہے تا کہ وہ لوگوں کو پریشان نہ کر سکے لیکن اس ٹیکنیکل تبدیلی کے حقیقی اور عملی نتیجہ کو لوگوں کی نظر سے اوجھل رکھا جا رہا ہے کہ اس طرح زنا کا جرم ریاست کا جرم نہیں رہا اور محض شکایت کا کیس بن گیا ہے، یعنی اس جرم کے ارتکاب پر ریاست کو کوئی شکایت نہیں ہے، کیونکہ جن جرائم کو ریاست اور سوسائٹی کا جرم تصور کیا جاتا ہے، ان میں مدعی خود ریاست ہوتی ہے اور اس کی طرف سے پولیس اس جرم کے کیس کو ڈیل کرتی ہے۔ پولیس کو اس معاملے میں بے دخل کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ اب زنا ریاست کا جرم نہیں رہا۔ کسی شہری بلکہ متاثرہ فریق کو کوئی شکایت ہے تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے اور اگر اس جرم کے ارتکاب پر کسی شہری کو اعتراض نہیں ہے تو ریاست کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ بات شرعی اصولوں سے متصادم ہے اس لیے کہ اسلامی شریعت میں زنا صرف حقوق العباد کا جرم نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ کی بھی اس سے خلاف ورزی ہوتی ہے اور یہ صرف افراد کی حق تلفی نہیں بلکہ ریاست کی بھی حق تلفی ہے۔

اس قانون کے ذریعے سے ایک تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ ''زنا بالجبر'' کو حدود کے دائرہ سے نکال کر تعزیری جرم بنا دیا گیا ہے جو صراحتاً حد شرعی کو تبدیل کرنے کی صورت ہے۔

تحفظ حقوق نسواں ایکٹ میں ایک اور ظلم یہ کیا گیا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں عدالت کی طرف سے حتمی فیصلہ سنائے جانے کے بعد اس سزا میں کمی یا معافی کا کسی شخص کو اختیار نہیں ہے مگر اس قانون میں یہ نا جائز اختیار صوبائی حکومت کو دے دیا گیا ہے۔

ایک اور خرابی یہ پیدا کی گئی ہے کہ قذف کے قوانین میں یہ گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ اگر عورت

عدالت میں رضا کارانہ طور پر زنا کے جرم کے ارتکاب کا اعتراف بھی کرتی ہے تو وہ سزا سے مستثنیٰ ہوگی۔

ایک اور ٹیکنیکل واردات اس قانون کے ذریعے سے یہ کی گئی ہے کہ بلوغت کی حد سولہ سال کی عمر مقرر کر کے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ نابالغ لڑکی اگر رضامندی کے ساتھ بھی زنا کی مرتکب ہوتی ہے تو اس کے ساتھ زنا کو ''زنا بالجبر'' تصور کیا جائے گا اور لڑکی کو کوئی سزا نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سولہ سال کی عمر تک لڑکی پر زنا کا الزام ثابت ہو جانے کے بعد بھی اسے اس جرم میں کوئی سزا نہیں ہوگی۔ اس سے معاشرہ میں بدکاری کے فروغ کی جو صورت حال سامنے آ سکتی ہے، اسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی نئے قانون میں یہ بات بھی شامل کر دی گئی ہے کہ اگر خاوند خود اپنی بیوی کے ساتھ جماع میں زبردستی کرتا ہے تو اسے ''زنا بالجبر'' تصور کیا جائے گا۔ میں اس حوالہ سے جبر کی حمایت نہیں کر رہا لیکن اسے اس درجہ کا جرم قرار دینا بھی ناانصافی اور ظلم ہے کہ اس پر ''زنا بالجبر'' کا اطلاق کر دیا جائے اور جن حضرات کو قانون کے غلط استعمال سے بہت زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے، میں ان سے دریافت کرنا چاہوں گا کہ کیا اس قانون کا غلط استعمال نہیں ہوگا اور کیا ہر خاوند کے سر پر یہ تلوار مستقل طور پر نہیں لٹکی رہے گی کہ اس کی بیوی جب کسی بات پر ناراض ہو، عدالت میں اس کے خلاف ایک درخواست دے کر اسے ''زنا بالجبر'' کے کیس میں جیل بھجوا دے؟

ان کے علاوہ اور بھی مسائل ہیں میں نے بطور نمونہ صرف چند کا ذکر کیا ہے تا کہ آپ یہ اندازہ کر سکیں کہ اس قانون کو قرآن وسنت کے عین مطابق قرار دینے کے جو دعوے کیے جا رہے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے؟ اب آخر میں ایک گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہوں اور علمائے کرام اور دینی قیادتوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا کیا دھرا ہے اور یہاں تک جو حالات پہنچے ہیں، ان کی سب سے بڑی وجہ خود ہماری غفلت اور کوتاہیاں ہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستانی معاشرہ میں عورت بہت سے حوالوں سے مظلوم ہے اور اس کے بہت سے شرعی حقوق یہاں دبائے جا رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک دینی حلقوں نے عورتوں کے حقوق بحال کرانے اور ان کی مظلومیت کے حق میں آواز بلند کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی ہے؟ ملک

میں جتنے ادارے اور این جی اوز عورتوں کے حقوق کے حوالہ سے کام کر رہی ہیں، کیا ان میں کوئی ایک بھی دینی حلقوں کی نمائندگی کرتی ہے؟ ہم نے خود اتنا بڑا محاذ سیکولر اداروں، حلقوں اور این جی اوز کے حوالے کر رکھا ہے، گزشتہ نصف صدی سے وہ اس شعبہ میں مسلسل کام کر رہی ہیں اور آج جبکہ وہ اپنی نصف صدی کی محنت کو کیش کرا رہی ہیں تو ہمیں تکلیف ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے اس شعبہ میں کیا ہی کیا ہے اور سیکولر این جی اوز کو کارنر کرنے کے لیے ان کے مقابلہ میں ہماری کارکردگی اور جدوجہد کا تناسب کیا ہے؟ ہمیں ان زمینی حقائق کا سامنا کرنا ہوگا اور ان کے منطقی تقاضوں کو سنجیدگی کے ساتھ پورا کرنا ہوگا، ورنہ مجھے کم از کم اس سلسلہ میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگلے مراحل میں جو اس سے بھی زیادہ سخت ہوں گے، ہم پسپائی اور شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔

دوسری گستاخی جو میں ضروری طور پر کرنا چاہ رہا ہوں، یہ ہے کہ خاندانی قوانین اور دیگر شرعی احکام کے حوالہ سے مغرب کے ساتھ ہماری جو فکری، علمی اور ثقافتی کشمکش ہے، اس میں ہمارے علمی اور دینی حلقوں کا رول کیا ہے؟ اور ہم اس کشمکش کی نوعیت، اس کے دائرہ کار اور مغربی حلقوں کے طریق کار کو سمجھنے اور حالات کے تناظر اور تقاضوں کا صحیح طور پر ادراک حاصل کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ مغرب اپنا کام تیزی کے ساتھ آگے بڑھا رہا ہے۔ اس کے ایجنڈے میں مسلسل پیش رفت کا عمل جاری ہے، اس کا نیٹ ورک مضبوط ہے اور اس کا طریق کار انتہائی سائنٹفک اور مربوط ہے مگر ہمارے کیمپ میں (چند شخصیات کے استثنا کے ساتھ) جذباتی نعروں، سطحی معلومات اور فرسودہ دفاعی ہتھکنڈوں کے سوا کیا ہے؟ ہمارے ہاں تو اس کے بارے میں سوچنے کو بھی وقت کا ضیاع تصور کیا جاتا ہے اور اس طرف توجہ دلانے والے چند سر پھرے لوگ ہمارے حلقوں میں بے وقوف سمجھے جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں اس ثقافتی، نظریاتی اور فکری جنگ کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ ہمارے شیخ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ ترکی میں سیکولرازم کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کے علما اور مشائخ کے پاس ان کاموں کے لیے وقت نہیں تھا اور نہ ہی وہ ان باتوں کی کوئی اہمیت سمجھتے تھے۔ خاکم بدہن یوں لگتا ہے کہ شاید ہم نے بھی ترکی کے علما و مشائخ کی طرح خدانخواستہ ایک نئے اتاترک کو راستہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

O

تحفظ نسواں بل اور دینی حلقے

سینیٹر مولانا سمیع الحق نے سینٹ آف پاکستان میں ''تحفظ نسواں بل'' میں دس ترامیم پیش کر کے ان اہم امور کی آن ریکارڈ نشان دہی کر دی ہے جو مذکورہ بل میں دینی نقطہ نظر سے متنازع ہیں اور جن کی موجودگی میں ملک بھر کے دینی حلقے اس بل کو قرآن وسنت کے منافی قرار دے کر اس کے خلاف مسلسل احتجاج کر رہے ہیں۔ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کا جو مسودہ قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی نے منظور کیا تھا، اس پر پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے سرکردہ علماے کرام سے رائے لی تھی۔ اس میں علماے کرام نے واضح طور پر چند اہم امور کی نشاندہی کر دی تھی کہ ان میں ترامیم اور ردوبدل ضروری ہے اور علماے کرام کی مجوزہ سفارشات اور تجاویز کو بل میں شامل کیے بغیر اسے شرعی طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان سفارشات اور ترامیم کو قطعی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس بل کو متنازع صورت میں قومی اسمبلی سے منظور کرانے کے بعد ملک بھر کے ذرائع ابلاغ، این جی اوز اور لابیوں کو اس کام پر لگا دیا گیا ہے کہ وہ قومی اسمبلی کے منظور کردہ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کو قرآن وسنت کے عین مطابق ثابت کرنے اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ناگزیر قرار دینے کے لیے دن رات ایک کر دیں، لیکن خدا بھلا کرے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کا کہ انہوں نے ایک جامع تجزیاتی مضمون کے ذریعے سے اس بل کی شرعی حیثیت کو واضح کر دیا اور مولانا سمیع الحق نے بھی سینٹ میں دس ترامیم پیش کر کے اتمام حجت کا اہتمام کیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ تعجب کا باعث چودھری شجاعت حسین کا رویہ بن رہا ہے کہ

انہوں نے نہ صرف یہ کہہ کر قومی اسمبلی کے اسپیکر کو مشروط استعفا پیش کیا کہ اگر اس بل میں کوئی بات شریعت کے خلاف ہے تو قومی اسمبلی کی رکنیت سے ان کا استعفا منظور کیا جائے بلکہ اس کے بعد سے وہ مسلسل ملک بھر کے علمائے کرام کو چیلنج دیے جا رہے ہیں کہ اگر کوئی اس بل کی کسی شق کو قرآن وسنت سے متصادم ثابت کر دے تو وہ مستعفی ہو جائیں گے، مگر ہمارے خیال میں چودھری صاحب موصوف کو یہ فیصلہ کرانے کے لیے کہ بل میں کوئی دفعہ قرآن وسنت کے خلاف موجود ہے یا نہیں، نہ قومی اسمبلی کے اسپیکر سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی علمائے کرام کو چیلنج پر چیلنج دیے جانے کی کوئی تک ہے، اس لیے کہ اس امر کا فیصلہ خود ان کی جیب میں موجود ہے جسے صرف جیب سے نکال کر پڑھنے کی ضرورت ہے اور یہ وہ فیصلہ ہے جس پر چودھری شجاعت حسین نے خود اپنے طلب کردہ علمائے کرام کے ساتھ صبح نو بجے سے رات تین بجے تک مسلسل مذاکرات کے بعد دستخط ثبت کیے تھے اور پھر خود اپنے ہاتھوں سے اسے قومی پریس کے حوالے کیا تھا۔ اگر چودھری صاحب کو وہ دن اور رات یاد ہے اور اپنے دستخطوں کو وہ پہچانتے ہیں تو پھر کسی اور کو انھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ خود اس بل کی متعدد دفعات کو قرآن وسنت سے متصادم تسلیم کر چکے ہیں، بلکہ اس پر انہوں نے اپنی حلیف جماعتوں کو قائل کرنے کی مسلسل کوشش بھی کی ہے۔ ہمیں اس بات پر چودھری شجاعت حسین سے ہمدردی ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا موقف اپنی حلیف سیاسی جماعتوں سے نہیں منوا سکے اور ملک کے اصل حکمرانوں کو اس کے لیے اپنا ہمنوا نہیں بنا سکے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ الٹا علمائے کرام پر غصہ نکالنے اور انہیں بلاوجہ موردِ الزام ٹھہرانے میں شب و روز مصروف ہو جائیں۔ ہم چودھری صاحب کا احترام کرتے ہیں، لیکن ان سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنے غصے پر کنٹرول نہیں کر پا رہے تو وہ اسے اس کی صحیح جگہ پر نکالیں جہاں ان کی بات نہیں مانی گئی اور انہیں آخر وقت تک قومی اسمبلی میں پیش کیے جانے والے مسودے سے بے خبر رکھ کر ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے لیے ان کی ساری تگ ودو کو ناکام بنا دیا گیا ہے۔ اس کے لیے علمائے کرام کو چاند ماری کی مشق کا نشانہ بنانا ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے'' کے سوا اور کوئی تاثر پیدا نہیں کر رہا۔

''تحفظ حقوق نسواں بل'' کو دینی حلقوں اور علمائے کرام کی رائے کے علی الرغم بین الاقوامی

سیکولر لابیوں کی خواہش کے مطابق منظور کرا کے اسے روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی فتح قرار دیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ اب ملک میں انتہا پسندوں کی بات نہیں چلنے دی جائے گی، مگر یہ بات خوش فہمی اور خود فریبی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے کہ حکومت اور طاقت کے زور سے کسی قانون کو ملک پر مسلط کر دینا اور بات ہے، اور قوم سے اسے ذہنی طور پر قبول کرانا اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس کا تجربہ اب سے کم وبیش نصف صدی قبل بھی کیا جا چکا ہے جو ناکام ثابت ہوا ہے، مگر ہمارے حکمران اس تجربہ کی ناکامی سے کوئی سبق حاصل کرنے کے بجائے اسے ایک بار پھر دہرانے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ صدر محمد ایوب خان کے دور میں جب عائلی قوانین کے نام سے نکاح، طلاق اور وراثت کے شرعی قوانین کو ردوبدل کا نشانہ بنایا گیا تھا، تب بھی مغرب کا فکرو فلسفہ اور مغربی قوتوں اور لابیوں کے تقاضے ہی پیش نظر تھے۔ اس کے لیے ایک ''عائلی کمیشن'' بنا تھا جس میں دینی حلقوں کی نمائندگی صرف ایک عالم دین مولانا احتشام الحق تھانوی کی صورت میں تھی۔ اس کمیشن نے خاندانی نظام کے قوانین وضوابط کو مغربی سسٹم کے قریب لانے کے لیے قرآن وسنت کے کچھ احکام کا جھٹکا کرنا چاہا تو حضرت مولانا تھانوی نے رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی اور کمیشن پر واضح کیا کہ قرآن وسنت کے واضح احکام میں ردوبدل کی اجازت نہیں دی جا سکتی، مگر کمیشن کے ارکان نہیں مانے تو کمیشن کے اس واحد عالم دین رکن نے کمیشن کی رپورٹ پر دوٹوک اختلافی نوٹ لکھ کر اپنا فرض پورا کیا۔

حکومت نے مولانا احتشام الحق تھانوی کے اس اختلافی نوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے قانون اور حکومت کے زور پر عائلی قوانین ملک میں نافذ کر دیے، مگر ساری دنیا اس حقیقت کا مشاہدہ کر رہی ہے کہ نصف صدی کے قریب عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ قوانین اب بھی قوم میں متنازعہ ہیں۔ جہاں تک قانون کا جبر کام کرتا ہے، اس سے زیادہ عائلی قوانین کا کوئی اثر معاشرے میں نہیں ہے۔ لوگ اب بھی نکاح، طلاق اور وراثت کے احکام میں مسائل علمائے کرام ہی سے پوچھتے ہیں اور انہی پر عمل کرتے ہیں۔ قوم نے ان قوانین کو آج تک سنجیدگی سے نہیں لیا اور نہ ہی انہیں ذہنی طور پر قبول کیا ہے اور اس سلسلے میں صرف ایک مثال سے معروضی صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ

عائلی قوانین کے تحت نکاح کے رجسٹریشن فارم میں ''تفویض طلاق'' کے خانہ کا اضافہ کیا گیا تھا جس میں نکاح کے وقت خاوند سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اس نے اپنی ہونے والی بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے؟ اس سوال کو نکاح فارم میں درج کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ مغرب کو مطمئن کیا جائے کہ ہم نے بھی عورت کو طلاق کا حق دے دیا ہے، لیکن آپ ملک کے کسی بھی حصے میں نکاح کی کسی تقریب میں نکاح فارم پُر کرنے والے نکاح رجسٹرار اور اس پر دستخط کرنے والے ایک درجن کے لگ بھگ افراد سے پوچھ لیں کہ کیا انہوں نے تفویض طلاق کے اس خانہ کو پر کرنے کے لیے کوئی سوال وجواب یا مشاورت کی ہے؟ عام طور پر نکاح رجسٹرار ہی اس خانہ میں 'ہاں' یا 'نہ' لگانے کا فریضہ اپنی طرف سے انجام دے دیتا ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے عائلی قوانین کے بارے میں قوم کی سنجیدگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس لیے ہمیں اس بارے میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' حکومت کی طاقت سے نافذ ہو جانے کے باوجود عوام میں ایک ''جائز قانون'' کے طور پر کبھی قبولیت حاصل نہیں کر سکے گا اور جب تک علمائے کرام کی سفارشات اور تجاویز کے مطابق اس بل کو دوبارہ مرتب کر کے منظور نہیں کرایا جاتا، یہ شرعی طور پر متنازعہ ہی رہے گا، البتہ اس بل کے ذریعے سے فحاشی اور بے حیائی کو فروغ دینے کا جو راستہ اختیار کیا گیا ہے، وہ ضرور قابل تشویش ہے اور اس کی روک تھام کے لیے دینی حلقوں کو اپنا کردار موثر طریقے سے ادا کرنا ہوگا۔

قومی اسمبلی میں اس بل کے پیش ہونے کے بعد امریکی وزارت خارجہ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اسلام آباد کا امریکی سفارتخانہ پاکستان میں تحفظ ختم نبوت کے قوانین، تحفظ ناموس رسالت کے قانون اور حدود آرڈیننس کو ختم کرانے کے لیے حکومت اور ارکان اسمبلی سے مسلسل رابطے میں ہے اور اب جبکہ تحفظ حقوق نسواں بل کو متنازعہ صورت میں منظور کر لیا گیا ہے، امریکی حکومت کے افسر نے اس پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ باقی دو قوانین کے بارے میں بھی جلد پیش رفت ہوگی۔ اس کے بعد اس بل کے مقاصد اور اس سلسلے میں حکومت کے آئندہ پروگرام کے بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا اور اس عمل کو موثر بریک لگانے کے لیے اب اس کے سوا اور

کوئی راستہ باقی نہیں رہا کہ جس طرح ملک کے دینی حلقوں نے ماضی میں تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت کے لیے فرقہ وارانہ تفریق اور سیاسی گروہ بندی سے بالاتر ہو کر مکمل دینی اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ پوری قوم کی رہنمائی اور نمائندگی کی تھی، اب اس فضا کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور پاکستان کے اسلامی تشخص اور اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے متحد ہو کر نئی جدوجہد کی داغ بیل ڈالی جائے۔

گزشتہ روز جامعہ اشرفیہ لاہور میں سرکردہ علمائے کرام نے مجتمع ہو کر اس مقصد کے لیے ''مجلس تحفظ حدود اللہ'' کے نام سے جو غیر سیاسی فورم قائم کیا ہے اور ۲۷ر نومبر کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہی ملک گیر سطح پر علمائے کرام اور دینی کارکنوں کا قومی کنونشن طلب کرنے کا فیصلہ کیا ہے، وہ صحیح سمت میں بروقت فیصلہ ہے جسے کامیاب بنانے کے لیے ملک کے تمام مکاتب فکر کے رہنماؤں، علمائے کرام، دانشوروں اور کارکنوں کو بھرپور تعاون کرنا چاہیے۔ یہ دینی جدوجہد کا ناگزیر تقاضا اور وقت کی آواز ہے جسے علمائے کرام اور دینی کارکنوں نے بروقت محسوس کر لیا تو امید ہے کہ پاکستان کے دینی تشخص اور پاکستانی معاشرے کی دینی اقدار کو طاقت کے زور سے بلڈوز کرنے کی تازہ کوشش بھی ان شاء اللہ ان کے ایمان اور عزم کا سامنا نہیں کر سکے گی۔ *

O

* روزنامہ اسلام، ۲۴ر نومبر ۲۰۰۶ء۔

داخلی پالیسیاں: چند اہم پہلو

ٹیکس وصولی کا نیا نظام اور عوامی رجحانات

ملک بھر میں تاجروں کی ہڑتال تادم تحریر جاری ہے اور حکومت اور تاجروں کے درمیان کشیدگی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان سطور کی اشاعت تک ممکن ہے حالات میں کوئی مثبت تبدیلی آئی ہو، مگر ابھی تک اس کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کو مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے حضرات سے تبادلہ خیالات کا موقع ملا ہے وراس حوالے سے جو تاثرات سامنے آئے ہیں، ان میں سے کچھ امور کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

o تاجر برادری کی اکثریت اپنی آمدنی کے مطابق ٹیکس دینے کی عادی نہیں ہے بلکہ آمدنی کے بیشتر حصے کو خفیہ رکھنا اور اس کا ٹیکس اور دیگر واجبات کا ادا نہ کرنا ہمارے کلچر کا حصہ بن چکا ہے جسے کوئی عیب کی بات نہیں سمجھا جاتا، اس لیے تاجر برادری اس صورت حال میں کسی اچانک اور انقلابی تبدیلی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہے۔

o حکومتی اخراجات، ترقیاتی کاموں، بیرونی قرضوں کی ادائیگی اور دیگر قومی ضروریات کے لیے بجٹ کے موجودہ وسائل قطعی طور پر ناکافی ہیں اور ٹیکسوں میں اضافہ کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

o ٹیکس وصولی کا نظام انتہائی غلط اور پریشان کن ہے۔ رشوت اور بدعنوانی کی بھرمار نے اس نظام کا اعتماد بالکل ختم کر دیا ہے۔ اس لیے اس نظام کے ذریعے ٹیکسوں کی وصولی کے نئے پروگرام کا حشر بھی سابقہ تجربات سے مختلف نہیں ہوگا۔

o گوشواروں کے بارے میں تاجروں پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور ان کے تحریر کردہ اعداد و شمار کو کئی گنا بڑھا کر اس اضافے کی بنیاد پر ٹیکس تجویز کیا جاتا ہے، اس لیے جو تاجر صحیح اعداد و شمار لکھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے بھی ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔

o ٹیکسوں کی وصولی کی موجودہ مہم کے نتیجے میں جو رقوم حاصل ہوں گی، وہ قومی خزانے کے بجائے ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی قسطوں میں چلی جائیں گی جن کے عوض نئے قرضوں کا اجرا ہوگا، اس لیے نئے ٹیکسوں کا نفاذ اور ان کی وصولی کی یہ ساری تگ ودو پاکستان کے گرد بیرونی قرضوں کے حصار کو مزید مستحکم کرنے کا ذریعہ بنے گی جو ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔

o نئے ٹیکسوں کی بھرمار اور ہڑتالوں کے تسلسل کا نتیجہ ملکی صنعت وتجارت کے خاتمہ کی صورت میں سامنے آ سکتا ہے اور یہ بھی پاکستان کے بارے میں عالمی طاقتوں کے ایجنڈے کا حصہ ہے کہ پاکستان صنعت وتجارت میں آگے بڑھنے کے بجائے صرف زرعی ملک کی حیثیت پر قناعت کرے اور صنعتی ترقی سے دست بردار ہو کر بڑے صنعتی ممالک کی منڈی بن جائے، جبکہ تجارت ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے ہو اور پاکستانی تاجر آزادانہ طور پر تجارت کرنے کے بجائے بین الاقوامی تجارتی نظام میں سیلز مین کی حیثیت قبول کر لیں۔ اس پس منظر میں یوں لگتا ہے کہ حکومتی حلقوں اور تاجر برادری دونوں میں بین الاقوامی اداروں کی نمائندگی کا مضبوط عنصر موجود ہے جو ملکی صنعت وتجارت کو تباہی کے مطلوبہ ہدف تک پہنچانے کے لیے باہمی انڈرسٹینڈنگ کے ساتھ پیش رفت کر رہا ہے۔

o مشرق وسطیٰ میں اسرائیلی مفادات اور جنوبی ایشیا میں بھارتی مفادات کے ساتھ امریکہ کی ہم آہنگی واضح طور پر نظر آ رہی ہے اور ان مفادات کی تکمیل تک پہنچنے کی راہ میں کوئی ادارہ اگر رکاوٹ بن سکتا ہے تو وہ صرف پاک فوج اور پاکستان کی عسکری بالخصوص ایٹمی صلاحیت ہے اور پاک فوج کو غیر موثر اور کمزور کرنے کا سب سے بڑا اور شارٹ کٹ ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے ملک کے عوام کے خلاف مختلف محاذوں پر صف آرا کر کے قوم کے اعتماد سے محروم کر دیا جائے، اس لیے اگر موجودہ صورت حال اسی طرح قائم رہی تو کشمیر رہا ایک طرف، بھارت کی متوقع جارحیت کے مقابلے میں خود پاکستان کا دفاع کرنا پاک فوج کے لیے خدانخواستہ مشکل ہو جائے گا اور شاید متوقع

پاک بھارت جنگ سے پہلے حالات کو اس نہج پر لانے کے لیے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کام ہو رہا ہے۔

o قومی زندگی کے سول شعبوں میں واپڈا، بھل صفائی اور ٹیکس وصولی جیسے معاملات میں پاک فوج کے جوانوں اور افسروں کی شرکت اگر اسی طرح بڑھتی رہی تو مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک کی طرح پاکستان میں بھی قومی فوج ''حکمران پارٹی'' کی حیثیت اختیار کر جائے گی جس سے اس کی عسکری اور دفاعی صلاحیت متاثر ہوگی۔ رشوت اور بدعنوانی کے جراثیم اس میں سرایت کرتے چلے جائیں گے، فوج کے جوانوں اور افسروں میں جفاکشی کے بجائے تعیش اور سہولت پسندی کے رجحانات فروغ پائیں گے اور پاک فوج کی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں دشمن کے خلاف صرف ہونے کے بجائے اپنی قوم کو قابو میں رکھنے کے لیے وقف ہو جائیں گی۔

ان تاثرات واحساسات اور مختلف طبقوں کے ذہنی رجحانات سے مجموعی طور پر جو خیال ذہن میں ابھرتا ہے، وہ یہ ہے کہ بلاشبہ قومی زندگی کے اخراجات کو باوقار طریقہ سے چلانے کے لیے ٹیکس بہت ضروری ہیں، ان میں ضرورت کے مطابق اضافہ ہونا چاہیے اور تاجر برادری بلکہ کسی بھی طبقہ کے افراد کو اپنے حصہ کے جائز ٹیکس کی ادائیگی سے نہیں ہچکچانا چاہیے، کیونکہ ملک کا نظام اسی طرح مل جل کر چلایا جا سکتا ہے اور قومی ترقی کا کوئی بھی کام اس کے بغیر ممکن نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ٹیکس وصولی کے نظام کو درست کیا جائے، ٹیکسوں میں اضافہ اور ان کی وصولی کے لیے یک لخت تمام تبدیلیوں کو لاگو کرنے کے بجائے بتدریج نفاذ کا طریق کار اختیار کیا جائے، ٹیکس وصول کرنے والے اداروں کی رپورٹوں کی بنیاد پر تاجر کو جھوٹا سمجھنے کی پالیسی ترک کی جائے اور تاجروں کو اعتماد میں لے کر ان کی مشاورت کے ساتھ ٹیکس وصولی کا نیا طریق کار اور ترجیحات طے کی جائیں، ٹیکس وصولی بلکہ کسی بھی سول شعبے میں فوجی جوانوں کو شریک کار کرنے سے حتی الوسع گریز کیا جائے، فوج اور عوام کے درمیان بے اعتمادی کی فضا کو آگے بڑھنے سے روکا جائے اور بیرونی قرضوں کے شکنجے سے قوم کی گردن کو چھڑانے کے لیے مضبوط حکمت عملی اختیار کی جائے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جو پالیسی مجموعی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے اجتماعی پیکج کے طور پر تیار کی جائے گی، اس کی افادیت وضرورت سے کوئی انکار نہیں کر سکے گا اور وہ موثر اور دیرپا بھی ہوگی، مگر باقی تمام معاملات کو نظر انداز کر کے صرف ایک ضرورت کی بنیاد پر کوئی پالیسی طے کی گئی تو اسے کسی صورت میں قومی اعتماد حاصل نہیں ہوگا اور نہ ہی اس سے ملک کے حالات میں کوئی مثبت تبدیلی رونما ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۶/جون ۲۰۰۰ء۔

مولانا محمد اکرام اعوان کا پرویز مشرف کے نام خط

امریکہ کے صدارتی انتخابات میں جارج ڈبلیو بش اور الگور کی تاریخی کشمکش اور پاکستان کے سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف کی خاندان سمیت جلاوطنی نے بہت سے موضوعات کو نگاہوں سے وقتی طور پر اوجھل کر دیا تھا۔ اب کچھ دھند چھٹی ہے تو بعض باتیں یاد آنے لگی ہیں۔ امریکی انتخابات میں تو سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد مسٹر الگور نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے جارج ڈبلیو بش کو مبارک باد دے کر بات صاف کر دی ہے، مگر میاں نواز شریف کی جلاوطنی کے حوالے سے الجھنوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور حکومت، شریف خاندان اور مسلم لیگ تینوں میں سے کوئی بھی ایسی واضح بات نہیں کہہ پا رہا جو معاملہ کی اصل حیثیت کو عوام کے سامنے واضح کر دے۔

بہت سے دوست اس بات کے منتظر ہوں گے کہ ''نوائے قلم'' میں اس صورت حال پر کیا تبصرہ ہوتا ہے، مگر راقم الحروف کے لیے سر دست مجبوریاں ہیں۔ ایک یہ کہ رمضان المبارک کے معمولات اور مصروفیات ایسی ہیں کہ ان سے ہٹ کر کسی اور بات پر سنجیدگی سے توجہ دینے کا موقع نہیں مل رہا اور دوسری یہ کہ ابھی تک صورت حال خود میرے سامنے بھی واضح نہیں ہے اور سر دست معلومات کا دائرہ اس سطح کا نہیں کہ اس پر تفصیل سے کچھ عرض کیا جا سکے۔ البتہ اتنی بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ ''طاقت'' اور ''دولت'' کے دنگل میں ''ریفری'' نے برابر کا چھوڑ چھڑوا دیا ہے مگر یہ طاقت یہ سمجھ رہی ہے کہ اس نے ''دولت'' کو چاروں شانے چت کر دیا ہے جبکہ ''دولت'' مطمئن ہے کہ اس نے بہت کچھ گنوا کر بھی کچھ نہیں گنوایا اور بات کسی اور موقع پر جا پڑی ہے۔

طاقت اور دولت کی اس کشمکش کا پس منظر بھی بہت دلچسپ ہے اور مستقبل کے امکانات وتوقعات کا دامن بھی بڑا وسیع ہے مگر اس پر بعد میں بات ہوگی۔ ابھی مولانا محمد اکرم اعوان کی اس تحریک کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کرنا مناسب نظر آ رہا ہے جس کے لیے انھوں نے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کو باقاعدہ خط پہنچایا ہے، اپنے موقف سے آگاہ کیا ہے، اس کی تفصیلات پر گفتگو کی دعوت دی ہے اور اسے منوانے کے لیے اپنے کارکنوں اور رفقا کو چکوال کے قریب ''خیمہ زن'' کرلیا ہے جہاں سے وہ ''اللہ ہو'' کا ورد کرتے ہوئے اسلام آباد کی طرف مارچ کرنے والے ہیں۔

مولانا اکرام اعوان کی یہ تحریک کامیاب ہوتی ہے یا نہیں، یہ وقت بتائے گا۔ اپنے مطالبات کے لیے انھوں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے، وہ مناسب ہے یا نہیں، اس پر ایک سے زیادہ رائے اور بحث وتمحیص کی گنجایش ہے اور خود ہمارے ذہن میں بھی اس سلسلے میں تحفظات موجود ہیں، لیکن جہاں تک ان کے موقف کا تعلق ہے، اس سے اختلاف کی کوئی گنجایش نہیں ہے اور ان کا یہ ارشاد بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اب ملک کے حالات اس آخری انتہا کو پہنچ چکے ہیں کہ ان کے اس موقف کو جو دراصل پوری قوم کا موقف اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا مقصد قیام ہے، قبول اور عملاً نافذ کیے بغیر ملک کو مزید تباہی سے بچانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اس گزارش کے ساتھ مولانا محمد اکرم اعوان کے موقف کی تائید کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف کے نام ان کے خط کا اہم حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

> ''جنرل صاحب! میں آپ پر واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک کی زمام کار آپ نے سنبھال کر اسلامیان پاکستان کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھا رکھی ہے تو ان کے حقوق کی بازیابی آپ کا فرض بنتا ہے اور ان کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ انھیں فرنگی کے غلامانہ نظام کے جہنم سے نکال کر اسلامی نظام کی برکات سے نوازا جائے۔
>
> جنرل صاحب! اسلام صرف نماز، روزے، عبادات کا نام نہیں۔ یہ تو مسلمان فرد کا اللہ کے ساتھ ذاتی معاملہ ہے۔ ہم تو اسلام کے حوالے سے قوم کے اجتماعی معاملات اور حقوق العباد کی

بات کرتے ہیں۔ ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو ملک کے ہر شہری کے حقوق کی بات کرتے ہیں، آزادیٔ رائے کی بات کرتے ہیں، انسانی ضمیر کی بات بھی کرتے ہیں، بھوکے انسان کے خالی پیٹ کی بات بھی کرتے ہیں، غربت اور مہنگائی کے پسے ہوئے لوگوں کو معاشی آسودگی دینے کی بات کرتے ہیں، ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی بات کرتے ہیں، بے روزگاروں کے روزگار کی بات کرتے ہیں، بیماروں کے لیے دوا کی بات کرتے ہیں اور آپ کے لیے دعا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو توفیق دے کہ آپ اسلام کا وہ عادلانہ نظام نافذ کردیں کہ ایوان صدر اور چیف ایگزیکٹو ہاؤس میں بھی وہی معیارِ زندگی ہو جو اس ملک کے عام شہری کا ہے۔ اراکین سلطنت عیش و عشرت اور عیاشی کی بجائے سادہ طرزِ زندگی اپنائیں۔

جنرل صاحب! آپ نے اپنے ایجنڈے میں معیشت کی بحالی پر بڑا زور دیا تھا۔ معیشت، معیشت کرتے آپ کا پہلا سال حکمران اس حال میں گزرا کہ معاشی بدحالی کے سائے مزید گہرے ہو گئے۔

جنرل صاحب! آپ کی یہ خوش فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ ''امریکی ہرکارے'' مملکت اسلامیہ پاکستان کو خوش حال کر سکتے ہیں۔ وہ تو ہمیں گروی رکھنے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ یہودی مالیاتی اداروں کا بھکاری بنے رہنا ہی معاشی کمال ہے تو پھر زوال کیا ہے؟ اب بھیک مانگنے کا یہ سلسلہ بند ہو جانا چاہیے۔

جنرل صاحب! یہودی معیشت کے جال سے جان چھڑائیے۔ ملک کی رگوں سے بہت خون نچوڑا جا چکا ہے، اب مزید گنجایش نہیں ہے۔ اب اسے حیات بخش توانائی کی ضرورت ہے جو اسلامی معاشی، فلاحی نظام سے ہی ممکن ہے۔ ہمارے ماہرین نے ۲۰۰۱-۲۰۰۲ کے سرکاری بجٹ کا تجزیہ کر کے اسلامی محاصل کا اعداد و شمار کے ساتھ اجمالی خاکہ تیار کیا ہے جو اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ اسلامی محاصل کے اس پروگرام کو عملی طور پر بروئے کار لا کر بیرونی قرضوں کی بھیک مانگنے سے بھی نجات مل سکتی ہے اور عوام کو بھی بھاری ٹیکسوں کے بوجھ سے نجات دلا کر ٹیکس فری سوسائٹی قائم کی جا سکتی ہے۔

اسلامی نظام معیشت کا صرف ایک جزو اسلامی محاصل نافذ کرنے سے ہی عام معاشی گراف

غربت سے نکل کر خود کفالت میں آ جائے گا اور ملک کا سٹیٹس ویلفیئر اسٹیٹ میں بدل جائے گا۔ پاکستان اسلامی فلاحی مملکت بن جائے گا۔ ہر شخص کو آسودگی اور طمانیت حاصل ہوگی۔ اسلامی محاصل نافذ کرنے سے ملک کے مالیاتی وسائل میں اس قدر اضافہ ہوجائے گا کہ بیماروں کے لیے علاج معالجہ فری ہوسکتا ہے، بچوں کی تعلیم فری ہوسکتی ہے، بیوہ عورتوں، یتیموں کے وظیفے مقرر ہو سکتے ہیں، بے روزگاروں کو الاؤنس دیا جا سکتا ہے، ہر گاؤں، ہر دیہات میں تمام شہری سہولتیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

جنرل صاحب! میں پورے یقین کے ساتھ آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ ہمارے پیش کردہ اسلامی محاصل کے پروگرام پر عمل کر کے متذکرہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ اس بارے میں آپ ہمارے ماہرین سے بالمشافہہ discuss کریں، point to point ہر پہلو پر کھل کر بات کریں، تجزیہ کریں اور اپنے ماہرین کے نسخوں سے موازنہ کریں۔ یقیناً ہمارا پیش کردہ اسلامی فلاحی نظام ہی ملک کو درپیش معاشی مسائل کا عملاً حل کرسکتا ہے۔

جنرل صاحب! آپ یہ بات فراموش نہ کریں کہ اقتدار بھی چند روزہ ہے اور زندگی بھی چند روزہ۔ ان میں سے کسی کو دوام نہیں۔ صرف کردار کے حوالے سے نام زندہ رہتا ہے۔ آپ کو موقع ملا ہے کہ اسلامی نظام نافذ کر کے تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہ سکتے ہیں، ورنہ یاد رکھیں ایک دن نہ صرف بے اختیار بلکہ بے حس وحرکت چند گز ان سلے کپڑے میں لپٹے پڑے ہوں گے۔ وہاں کوئی سرکاری گارڈ، اسپیشل اسکواڈ نہیں ہوگا۔ دائیں بائیں منکر نکیر جواب طلب کر رہے ہوں گے۔

جنرل صاحب! ہم چاہتے ہیں کہ آپ اللہ کی دی ہوئی حیات اور حکومت واختیار سے فائدہ اٹھائیں اور دین ودنیا کی سرخروئی حاصل کرنے کے لیے اسلامی نظام نافذ کر دیں۔ امریکہ اور مغرب کو خوش کرنے کی بجائے اللہ کو خوش کریں جو مشرق ومغرب کا مالک ہے۔'' *

O

* روزنامہ اوصاف، ۲۲ دسمبر ۲۰۰۰ء۔

آئی ایم ایف کی چھری اور سرکاری ملازمین کی گردن

صدر مملکت نے ایک آرڈیننس کے ذریعے سرکاری محکموں کے بالاتر افسران کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ جس سرکاری ملازم کو بدعنوان سمجھیں، جسے منصبی ذمہ داریوں میں کوتاہی کرنے والا قرار دیں اور جس کے بارے میں ان کی رائے قائم ہو جائے کہ محکمہ کو اس کی ضرورت نہیں رہی، وہ اسے ملازمت سے فارغ کر سکتے ہیں اور اس برطرفی کے خلاف کسی کورٹ کے پاس دادرسی کے لیے جانے کا کوئی حق اب سرکاری ملازمین کے پاس اس آرڈیننس کی رو سے باقی نہیں رہا۔ ملک کے عام قانونی حلقوں میں اس آرڈیننس کو بنیادی شہری حقوق کے منافی قرار دیا جارہا ہے اور اس کے خلاف مختلف اطراف سے احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ ورلڈ بنک، آئی ایم ایف اور دیگر عالمی اداروں کی طرف سے حکومت پر ایک عرصہ سے دباؤ تھا کہ وہ سرکاری محکموں کی ''ڈاؤن سائزنگ'' کر کے عملہ کی تعداد میں کمی کرے، فوج کی تعداد کو محدود کر کے دفاعی اخراجات کم کرے اور اس طرح اپنے اخراجات کو گھٹائے تاکہ وہ بجٹ کو متوازن بنانے کے ساتھ ساتھ ملک کے ذمے بین الاقوامی قرضوں کی قسطیں بروقت ادا کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ آئی ایم ایف کا یہ سارا منصوبہ اپنے قرضوں کی قسطوں کی بروقت وصولی کو یقینی بنانے کے لیے ہے اور پاکستان میں قائم ہونے والی ہر حکومت اس قسم کی شرائط کو پورا کرنے پر مجبور ہے۔

اگر بات صرف اس حد تک محدود ہوتو ساری خرابیوں کے باوجود اس حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آئی ایم ایف سے ہم نے قرضے لے رکھے ہیں اور اسے معاہدوں کے مطابق قرضوں کی قسطیں واپس نہیں مل رہیں، اس لیے وہ اپنے قرضوں کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے حکومت پاکستان

پر سرکاری اخراجات کو کم کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے تاکہ حکومت پاکستان اس کے قرضوں کی قسطیں بروقت ادا کر سکے، لیکن بدقسمتی سے اصل صورت حال یہ نہیں ہے اور اس کے پس پردہ عوامل کی نوعیت قطعی طور پر اس ظاہری منظر سے مختلف ہے کیونکہ اگر صرف اتنا قصہ ہوتا تو اخراجات کم کرنے کے لیے ملازمین کی تعداد میں کمی اور سرکاری محکموں کے غریب اہل کاروں کو قربانی کا بکرا بنانے کے بجائے کوئی متبادل بلکہ اس سے بہتر تجاویز بھی پیش کی جا سکتی تھیں، مثلاً سرکاری اخراجات میں کمی کا فطری طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ سطح پر پروٹوکول، پرسٹیج اور بالاتری کے اظہار، عشرت وتعیش اور نمود ونمایش پر جو بے بنیاد فضول اخراجات ہوتے ہیں، انھیں ختم کیا جائے، اعلیٰ حلقوں کے معیار زندگی کو درمیانی سطح پر لانے کی کوشش کی جائے، سادگی اور قناعت کو عملاً اختیار کیا جائے، معیار زندگی میں مسابقت کے رجحان کو کنٹرول کرنے کے لیے قانون سازی کی جائے، بیرونی ممالک سے غیر ضروری عشرت اور تعیش کے سامان کی درآمد پر پابندی لگائی جائے اور خلافت راشدہ کے دور کو سامنے رکھتے ہوئے قوم کے مختلف طبقات کے درمیان پائے جانے والے معیار زندگی کے ہوش ربا تفاوت کو ایک معقول سطح پر کم کرنے کی مہم چلائی جائے، مگر آئی ایم ایف اور دیگر عالمی ادارے اس قسم کی کوئی تجویز دینے کے بجائے غریب ملازمین کی گردنوں پر چھری پھیرنے کے منصوبے پیش کر رہے ہیں جس سے صورت حال میں کوئی بہتری نہیں ہوگی بلکہ بے روزگاری میں اضافہ ہوگا اور نچلی سطح پر معاشی بحران کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتا چلا جائے گا۔

پھر ملازمین کی ایک بڑی تعداد کو فارغ کرنے سے جو رقم بچے گی، اسے قرضوں میں ادا کرنے کی کوئی گارنٹی موجود نہیں ہے بلکہ انھی محکموں اور اداروں میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے کہنے پر بھاری مشاہروں اور مراعات پر مشیر رکھے جا رہے ہیں جو مجموعی طور پر ان ملازمین کی تنخواہوں سے زیادہ رقوم وصول کر لیں گے جنھیں اخراجات میں کمی کے بہانے برطرف کرنا مقصود ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ سارا چکر اخراجات میں کمی اور قرضوں کی قسطوں کی بروقت ادائیگی کے لیے نہیں بلکہ ملک کے معاشی بحران میں اضافے اور سرکاری محکموں اور اداروں پر ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کا قبضہ مزید مستحکم کرنے کے لیے چلایا جا رہا ہے اور اس کو مکمل کرنے کے لیے وفاقی حکومت میں موجود بین الاقوامی مالیاتی

اداروں کے مطابق ملازمین کی کھیپ اور ملک بھر میں بیرونی امداد سے چلنے والی این جی اوز کا ایک مربوط نیٹ ورک مسلسل مصروف عمل ہے، اس لیے ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں کو اس کے خلاف موثر طور پر آواز اٹھانی چاہیے اور اس کا راستہ روکنے کے لیے مضبوط حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک اس صدارتی آرڈیننس کے ذریعے برطرف کیے جانے والے ملازمین سے اپیل کا حق چھیننے کا تعلق ہے، وہ سراسر ناانصافی اور حق تلفی ہے اور ہمیں ایک قانون دان کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ نے شیطان کے بارے میں بھی اختیار نہیں کیا تھا جس نے کھلم کھلا حکم عدولی کرتے ہوئے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا، بلکہ اسے راندۂ درگاہ قرار دینے سے قبل اس سے اس حکم عدولی کی وجہ دریافت کرتے ہوئے اسے صفائی کا موقع دیا تھا اور اس کے ساتھ ہم اس بات کا اضافہ کرنا چاہیں گے کہ قیامت کے دن جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہوں گے، ان کے جرم کے بارے میں مکمل اور یقینی علم رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ صرف اپنے علم کی بنیاد پر ان میں سے کسی کے مقدمہ کا فیصلہ نہیں کریں گے، بلکہ باقاعدہ عدالتی کارروائی ہوگی، فردِ جرم عائد ہوگی، وضاحت کا موقع دیا جائے گا، جرم سے انکار پر شہادتیں پیش کی جائیں گی، شہادتوں پر جرح ہوگی، ان کی صفائی اور توثیق کا مرحلہ آئے گا اور یہ سارا عدالتی پراسس مکمل ہونے کے بعد کسی مجرم کو دوزخ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا جائے گا، حالانکہ خود اللہ تعالیٰ کو اپنے ذاتی علم اور اطمینان کے لیے اس سارے عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ تو ہر بات کو یقینی طور پر اور سب سے بہتر جانتا ہے مگر اس سارے عدالتی عمل کو صرف اس لیے پورا کیا جائے گا تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں اور مجرم اور اس کے ساتھ دیگر سب لوگوں کو انصاف ہوتا ہوا نظر آئے۔ اس لیے صدرِ مملکت جناب محمد رفیق تارڑ اور چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا یقینی اور حتمی علم کسی مقدمے کے فیصلے کی بنیاد نہیں بن سکتا تو کسی بالا افسر اور مجاز اتھارٹی کے ذاتی علم اور اطمینان کو کسی سرکاری ملازم کے خلاف فیصلہ کی بنیاد بنانا بھی درست نہیں ہے۔*

---

* روزنامہ اوصاف، ۲۰ رفروری ۲۰۰۱ء۔

جنرل صاحب! ''عذر گناہ بدتر از گناہ''

سقوط ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عظیم سانحہ کے بارے میں جسٹس حمود الرحمٰن مرحوم کی سربراہی میں قائم کیے گئے کمیشن کی مبینہ رپورٹ بھارت کے کسی اخبار میں شائع ہوئی اور اس کے بعد پاکستان میں اس کی باضابطہ اشاعت کے مطالبہ نے زور پکڑ لیا تو چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے یہ کہہ کر دامن چھڑا لیا کہ یہ بات پرانی ہو چکی ہے، اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ ماضی کو بھول جائیں اور پچھلے واقعات کی کرید میں پڑنے کی بجائے مستقبل کی فکر کریں۔ مگر ہمارے خیال میں جنرل صاحب کا یہ مشورہ قرین انصاف نہیں ہے اور اس کی نرم سے نرم الفاظ میں بھی تعبیر کی جائے تو اس کے لیے ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کے سوا کوئی متبادل عنوان ذہن میں نہیں آ رہا، اس لیے کہ مستقبل کی عمارت ہمیشہ ماضی کی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے اور ماضی کی بنیادیں کھودے بغیر صرف حال کی زمین پر کھڑی کی جانے والی کسی عمارت کے مستقبل کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ماضی سے آنکھیں بند کرنا زندہ قوموں کا شعار نہیں ہوتا اور اپنی غلطیوں اور حماقتوں کو یاد رکھ کر ان سے سبق حاصل نہ کرنے والے افراد، گروہ اور قومیں اس کارگاہ حیات میں مستقبل کی طرف کامیاب پیش رفت نہیں کر پاتیں، اس لیے جنرل صاحب موصوف حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ شائع نہ کرنے کی کوئی اور وجہ بیان کر دیتے یا کم از کم ''وسیع تر قومی مفاد و مصلحت'' کے سکہ بند عذر کا حوالہ دے دیتے تو شاید خاموشی کا کوئی جواز نکل آتا، مگر ماضی کو بھول جانے کا مشورہ دے کر رپورٹ شائع نہ کرنے کے اعلان نے نہ صرف یہ کہ قوم کی مایوسی میں اضافہ کیا ہے بلکہ ان حساس دلوں کے زخموں کو بھی ایک

بار پھر کرید ڈالا ہے جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دولخت ہو جانے کے عظیم سانحہ پر ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود دل گرفتہ ہیں اور اس کے اسباب وعوامل اور ذمہ دار طبقات وافراد سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں۔

اور پھر ماضی کو بھول جانے کا سبق تو اسلامی تعلیمات کے بھی منافی ہے، کیونکہ قرآن کریم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو پیغام دیا ہے، اس کا بہت بڑا حصہ ماضی کے واقعات پر مشتمل ہے اور ماضی بھی تیس چالیس پہلے والا نہیں بلکہ ہزاروں سال پہلے والا ماضی قرآن کریم نے بار بار ہمارے سامنے رکھا ہے اور ساتھ یہ ہدایت بھی کی ہے کہ اس سے عبرت پکڑو، اس سے سبق حاصل کرو، اس کی روشنی میں اپنے حال کو سنوارو اور اسی کو سامنے رکھ کر مستقبل کے منصوبے بناؤ۔

قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام سے بھول ہوئی کہ شجر ممنوعہ کا ذائقہ چکھ لیا تو انہیں جنت چھوڑنا پڑی۔ یہ سبق ہمارے لیے ہے کہ جنت میں دوبارہ جانا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرنا ہوگی اور جن کاموں اور جن چیزوں سے تمہیں منع کیا گیا ہے، ان سے باز رہنا ہوگا۔

قرآن کریم نے ہمیں بتایا کہ خدائی کا دعویٰ کرنے والے نمرود اور فرعون نے جب اہل ایمان اور اہل حق کی بات ماننے کی بجائے ان سے ٹکر لینے کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ کی غیبی قوتوں نے انہیں پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ اس میں بھی سبق ہے کہ اقتدار اور قوت پر گرفت رکھنے والے حضرات ظاہری طاقت اور اسباب کو ہی سب کچھ نہ سمجھ لیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ان غیبی قوتوں اور تدبیروں کو ذہن میں رکھیں جو اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے لیے حرکت میں آ جائیں تو تمام تر ظاہری شکوہ وجلال پانی میں ڈبکیاں کھانے لگتا ہے۔

قرآن کریم نے ہمیں قوم لوط کے حشر سے آگاہ کیا ہے کہ جب وہ شہوت پرستی کی انتہا کو چھونے لگے اور فطرت کے تمام تر دائروں کو توڑتے ہوئے آسمانی تعلیمات اور اللہ تعالیٰ کے فرستادہ نیک بندوں سے الجھنے پر آ گئے تو آسمان نے ان پر پتھروں کی بارش کر دی اور سدوم اور عمورہ کی بستیوں کی بربادی پر اللہ تعالیٰ نے بحیرۂ مردار کو قیامت تک کے لیے نشان عبرت بنا دیا۔

قرآن کریم نے ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ اور ماضی سے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ روشناس کرایا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو نبوت ملی، بادشاہت ملی، دنیاوی جاہ وجلال ملا، انسانوں اور بحر و بر پر حکومت ملی اور اقوام عالم پر برتری اور بالادستی حاصل ہوئی مگر یہ عظیم خاندان جب آسمانی تعلیمات کی پابندی کرنے کی بجائے اپنی خواہشات کی پیروی پر اتر آیا اور اس نے ''خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں'' کے مصداق تورات کے احکام کی من مانی تشریحات شروع کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت اور غیظ وغضب کا مستحق قرار پا گیا۔

قرآن کریم نے ہمیں حضرت ابراہیم کی اولاد اور ان سے نسبت پر فخر کرنے والے عربوں کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے ''بیت اللہ'' کو بت پرستی اور شرک کی آماجگاہ بنا دیا اور زنا، شراب، جوا، بدکاری، نسل پرستی، سود اور ناچ گانے جیسی جاہلانہ اقدار کو اپنی زندگیوں کا معمول بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے کس طرح انہیں ان کی ''جاہلانہ تہذیب'' سمیت صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ یہ سب کچھ ہمارے سبق کے لیے ہے اور ہمیں اپنے حال کی اصلاح اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے فکری بنیادیں فراہم کی گئی ہیں، ورنہ قرآن کریم نعوذ باللہ کوئی ''قصہ گوئی'' کی کتاب تو نہیں ہے کہ اس کا اتنا بڑا حصہ ماضی کے واقعات اور قصوں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منافقانہ تعلق رکھنے والے جس گروہ کی سازشوں اور حرکتوں کے بارے میں بتایا ہے، وہ بھی ہمارے لیے ماضی کی حیثیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اسلام اور ایمان کے دعوے کے ساتھ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں رہتے ہوئے بھی قرآنی احکام اور نبوی تعلیمات سے روگردانی کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دق کرنے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کس طرح اس وقت کی عالمی قوت ''سلطنت روما'' سے ساز باز کر کے پرائیویٹ سوسائٹی (این جی او) تشکیل دی اور مسجد کے نام سے خود مدینہ منورہ کے اندر مسلمانوں کے خلاف اڈہ قائم کرنا چاہا تو قرآن کریم نے اسے ''مسجد ضرار'' قرار دے کر نذر آتش کروا دیا۔

یہ سب واقعات ہمارے لیے سبق کی حیثیت رکھتے ہیں، اتنا مقدس سبق کہ ہم انہیں اللہ تعالیٰ کا

کلام مان کر تلاوت کرتے ہیں اور ایک ایک حرف پر کم از کم دس دس نیکیوں کے مستحق قرار پاتے ہیں، اس لیے جنرل پرویز مشرف صاحب سے بڑے ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ اگر جنت سے نسل انسانی کے اخراج کے واقعہ پر حضرت آدم علیہ السلام کی بھول اور خطا کی رپورٹ قیامت تک کے لیے شائع ہو سکتی ہے تو ''سقوط ڈھاکہ'' جیسے عظیم سانحہ پر پاک فوج کے جرنیلوں، سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کی غلطیوں، حماقتوں اور بدعنوانیوں کی رپورٹ شائع ہونے سے بھی کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔*

O

* روزنامہ اوصاف، ۲۶؍ستمبر ۲۰۰۰ء۔

حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ پر ایک نظر

حکومت نے آخر کار ''حمود الرحمٰن کمیشن'' کی رپورٹ کا ایک اہم حصہ عوام کی معلومات کے لیے کیبنٹ ڈویژن کی لائبریری میں رکھ دیا ہے اور اس کے اقتباسات قومی اخبارات میں شائع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ملک سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد مغربی پاکستان کے باقی ماندہ حصے میں قائم ہونے والی بھٹو حکومت نے عوامی مطالبہ پر اس وقت کے سپریم کورٹ آف پاکستان کے سربراہ جسٹس حمود الرحمٰن مرحوم کی سربراہی میں ایک اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن قائم کیا تھا جس میں پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب جسٹس انوار الحق مرحوم اور سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کے سربراہ جسٹس طفیل علی عبد الرحمٰن مرحوم بھی شامل تھے۔ کمیشن کے ذمہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب وعوامل کی نشاندہی اور اس کے ذمہ دار افراد کے تعین کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ میں ضروری کارروائی کے لیے سفارشات اور تجاویز پیش کرنا تھا۔

کمیشن نے دوسو سے زیادہ افراد کے بیانات اور ستر کے لگ بھگ شہادتیں قلمبند کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی جو ''ٹاپ سیکرٹ'' قرار دے دی گئی اور ملک کے عوام کو اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔ مختلف حلقوں کی طرف سے اس رپورٹ کی اشاعت کا مسلسل مطالبہ کیا جاتا رہا، مگر اس رپورٹ کے بعد ملک میں قائم ہونے والی کسی حکومت نے بھی اس مطالبہ پر توجہ نہ دی حتیٰ کہ اس رپورٹ کے کچھ حصے مبینہ طور پر چوری ہوئے اور بھارت کے بعض اخبارات نے گزشتہ دنوں انہیں شائع کر دیا جس پر اس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ ایک بار پھر منظر عام پر آیا اور وزیر

داخلہ جناب معین الدین حیدر کی سربراہی میں ایک کمیٹی نے رپورٹ کا از سرِنو جائزہ لے کر اس کے ایک حصے کی اشاعت کی سفارش کر دی جس پر اسے کیبنٹ ڈویژن کی لائبریری میں عوام کے مطالعہ کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق رپورٹ کے آٹھ حصوں میں سے صرف دو حصے ''اوپن'' کیے گئے ہیں جبکہ باقی چھ حصے بدستور ''صیغہ راز'' میں ہیں اور اس کے مندرجات کو خارجہ تعلقات کے ''حساس امور'' قرار دے کر حسب سابق نا قابل اشاعت کے زمرے میں رکھا گیا ہے، تاہم جو حصہ شائع ہوا ہے، وہ بھی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے اور اس نے ان تمام شبہات' خدشات اور الزامات کی تصدیق کر دی ہے جو اس عظیم سانحہ کے حوالہ سے اس وقت کی فوجی و سیاسی قیادت اور نوکر شاہی کے بارے میں عوامی حلقوں میں وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں۔

روزنامہ جنگ لاہور' نوائے وقت لاہور اور اوصاف اسلام آباد نے ۳۱ ر دسمبر ۲۰۰۰ء کے شماروں میں حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کی جو تفصیلات شائع کی ہیں، ان میں سے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

o جنرل یحییٰ خان' جنرل عبدالحمید خان' جنرل پیرزادہ' جنرل مٹھا اور ان کے رفقا نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو صدر محمد ایوب خان مرحوم کو اقتدار سے ہٹانے کی سازش کی جس پر ان کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔

o جنرل یحییٰ خان سمیت ۱۵ ر اعلیٰ فوجی افسران اپنی نا اہلی' کرپشن' بدعنوانی اور بدکرداری کی وجہ سے تقسیم ملک کے ذمہ دار ہیں' ان کا کورٹ مارشل کیا جائے۔

o ان فوجی افسران نے اپنے مشترکہ مفاد کی خاطر سیاسی جماعتوں پر دباؤ ڈالنے اور انہیں دھمکانے کے علاوہ روپے پیسے کا لالچ دے کر انتخابات کے نتائج اپنے حق میں کرانے کی کوشش کی۔

o پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے منتخب اسمبلی میں عوامی لیگ کا سیاسی طور پر مقابلہ کرنے کی بجائے ڈھاکہ میں ۳ مارچ کو بلائے جانے والے اجلاس کا بائیکاٹ کیا اور اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانے والے ارکان اسمبلی کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی

دے کر انتہائی غیر جمہوری طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔

o مسٹر بھٹو نے دو اکثریتی جماعتوں کی تھیوری اور ''گرینڈ کولیشن'' کی تجویز پاکستان کے وفاق کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ کنفیڈریشن کے لیے پیش کی۔

o لیفٹیننٹ جنرل عمر نے سیاسی جماعتوں کو قومی اسمبلی کا اجلاس جلد بلانے کی مخالفت کرنے پر اکسایا۔

o ڈھاکہ میں بلایا جانے والا قومی اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ عرصہ کے لیے ملتوی کرنے پر عوامی لیگ نے سول نافرمانی شروع کر دی جو اس قدر بھرپور تھی کہ جنرل ٹکا خان مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر ہو کر ڈھاکہ پہنچے تو انہیں حلف اٹھانے کے لیے کوئی جج میسر نہیں تھا۔

o یحییٰ خان نے عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن پر دباؤ ڈالا کہ وہ دستور سازی اور چھ نکات کو نظر انداز کر کے حکومت سازی میں پیپلز پارٹی سے تعاون کریں۔

o شیخ مجیب الرحمٰن واجبی سطح کے لیڈر تھے' چھ نکات ان کے مرتب کردہ نہیں تھے اور نہ ہی ان میں اتنی اہلیت وصلاحیت تھی بلکہ یہ چھ نکات جو ملک کے سب سے بڑے سیاسی تنازعہ کی بنیاد بنے، مشرقی پاکستان کے ینگ سی ایس پی افسران کے ایک گروپ نے مرتب کیے تھے اور انہیں بیرونی عوامل کی پشت پناہی حاصل تھی جنہوں نے ان چھ نکات کی تشہیر اور مشرقی پاکستان کے عوام کو ان کے حق میں تیار اور متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

o تین مارچ کو ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے احتجاجی جلسہ پر فوج کی فائرنگ سے ہزاروں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔

o ۲۵ مارچ کو فوج نے ڈھاکہ میں آدھی رات کو پوزیشن سنبھال کر فوجی ایکشن شروع کیا جس کے نتیجے میں پچاس ہزار کے لگ بھگ افراد جاں بحق ہوئے۔

o جنرل یحییٰ خان اور ان کے ساتھی جرنیلوں کا اکثر وقت عورت اور شراب کے ساتھ مصروف گزرتا تھا اور اس مقصد کے لیے راولپنڈی صدر میں صدر یحییٰ خان کا ذاتی بنگلہ بدکاری کا اڈہ بن گیا تھا۔

o رپورٹ میں ایک درجن سے زائد عورتوں کی فہرست اور کوائف دیے گئے ہیں جن کے شب وروز

یحییٰ خان اور ان کے ساتھی جرنیلوں کے ساتھ گزرتے تھے اور وہ دوسری عورتیں بھی سپلائی کرتی تھیں۔

o یحییٰ خان اکثر اوقات رات سات آٹھ بجے ڈنر کے بہانے ایوان صدر سے نکلتے اور صبح واپس آتے۔

o صدر یحییٰ خان نے صدارتی آفس میں جانا بھی ترک کر رکھا تھا اور بھارت کے ساتھ جنگ کے دوران جی ایچ کیو کے آپریشن روم میں وہ صرف دو تین بار گئے۔

o نومبر ۱۹۷۱ء میں عین حالت جنگ کے دوران یحییٰ خان نے گورنر ہاؤس لاہور میں تین روز ملکہ ترنم نور جہاں کے ساتھ بسر کیے۔

o جنرل نیازی پان سمگل کرتے تھے، رشوت لیتے تھے اور رقاصاؤں کے گھروں میں جاتے تھے۔

o بریگیڈیئر حیات اللہ نے مقبول پور کے محاذ جنگ میں عورتیں بنکرز اور مورچوں میں طلب کر لیں۔

o بریگیڈیر جہاں زیب ارباب نیشنل بینک کی سراج گنج شاخ سے ایک کروڑ پینتیس لاکھ روپے لوٹنے کی واردات میں اپنے دوسرے چھ فوجی افسر ساتھیوں سمیت ملوث ہیں۔

o جی ایچ کیو نے جنرل نیازی کو بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم نہیں دیا۔ یہ فیصلہ جنرل نیازی کا ذاتی تھا۔

یہ ہے وہ ایک ہلکا سا خاکہ اس پس منظر کا جو مملکت خداداد پاکستان کے دو حصوں میں بٹ جانے اور سقوط ڈھاکہ جیسے عظیم ملی سانحہ کا باعث بنا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم نے اس سے کیا سبق حاصل کیا؟ اور ۱۹۷۱ء کے بعد ربع صدی سے زائد عرصہ میں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے، اس طرح کے اسباب و عوامل کو روکنے اور حالات کو بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے؟ کیا ایسا تو نہیں کہ ہم نے ''جرم'' اور ''مجرم'' دونوں پر پردہ ڈال کر خود کو اندرونی و بیرونی سازشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور حالات کی اصلاح کے لیے (خاکم بدہن) سقوط ڈھاکہ جیسے کسی اور سانحہ کا انتظار کر رہے ہیں؟*

O

* ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۲۰۰۱ء۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ اور جنرل مشرف سے دو سوال

''حمود الرحمٰن کمیشن'' کی رپورٹ کا ایک حصہ بالآخر حکومت نے شائع کر دیا ہے اور اس طرح ملک کے عوام کو کم و بیش تیس سال بعد وطن عزیز کے دولخت ہونے اور مشرقی پاکستان کی جگہ بنگلہ دیش کے قیام کے اسباب و عوامل کو براہ راست جاننے اور ان کا تجزیہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ کمیشن سقوط ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی ملک سے علیحدگی کے المناک سانحہ کے بعد اس کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کے لیے سپریم کورٹ کے سربراہ جسٹس حمود الرحمٰن مرحوم کی سربراہی میں قائم کیا گیا تھا جس میں ان کے ساتھ پنجاب ہائی کورٹ کے سربراہ جسٹس انوار الحق اور سندھ و بلوچستان ہائی کورٹ کے سربراہ جسٹس طفیل علی عبد الرحمٰن بطور رکن شامل تھے۔ کمیشن نے پچاس سے زائد اجلاسوں میں ۲۱۳ افراد کے بیانات اور ۲۷۰ افراد کی شہادتیں قلم بند کرنے کے بعد اپنی رپورٹ اس وقت کی حکومت کو پیش کر دی تھی جسے انتہائی خفیہ قرار دے کر اس کی اشاعت کی ممانعت کر دی گئی۔ ملک کے سیاسی حلقوں کی طرف سے اس رپورٹ کو منظر عام پر لانے کا مسلسل مطالبہ کیا جاتا رہا مگر ملکی مفاد کے منافی قرار دیتے ہوئے اس کی اشاعت سے اب تک گریز کیا گیا۔ گزشتہ دنوں بھارت کے بعض اخبارات نے اس رپورٹ کے کچھ حصے شائع کیے تو ملک میں ایک نئے زاویے سے اس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ زور پکڑ گیا کہ جب اسے غیر ملکی ذرائع سے مخفی نہیں رکھا جا سکا تو اپنے ملک کے عوام کو اس کے مندرجات سے باخبر کرنے میں آخر کیا رکاوٹ ہے؟ چنانچہ اس کے بعد حکومت نے وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر کی سربراہی میں کمیٹی قائم کی تاکہ رپورٹ کا از سر نو جائزہ لے کر اسے

منظر عام پر لایا جا سکے۔ اس کمیٹی نے رپورٹ کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کو کلاسیفائیڈ اور نان کلاسیفائیڈ حصوں میں تقسیم کیا اور ایک حصے کی اشاعت کی سفارش کر دی جبکہ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کی ہدایت پر اسے کیبنٹ ڈویژن کی لائبریری میں عوام کے مطالعہ کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق حمود الرحمٰن کمیشن کی اس رپورٹ کی صرف دو جلدیں منظر عام پر لائی گئی ہیں جبکہ چھ جلدوں کو انتہائی خفیہ قرار دے کر بدستور صیغہ راز میں رکھا گیا ہے اور ان کے مندرجات تک رسائی حسب سابق شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ رپورٹ کا جو حصہ منظر عام پر آیا ہے، اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس سے قبل کسی نہ کسی حوالے سے عوام میں نہ آ چکی ہو، البتہ رپورٹ نے ان بیشتر باتوں کی تصدیق وتوثیق کر دی ہے جو پاکستان کے دولخت ہونے کے بارے میں اب تک مختلف حلقوں کی طرف سے کہی جاتی رہی ہیں، لیکن اس سے قبل ان کی حیثیت شبہات، قیاس آرائیوں اور الزامات کی تھی لیکن اب ایک اعلیٰ سطحی کمیشن کی رپورٹ کے حصہ کے طور پر وہ حقائق وشواہد کا درجہ اختیار کر گئی ہیں اور ہمارے نزدیک رپورٹ کے اس حصے کی اشاعت کا سردست یہی فائدہ ہوا ہے۔ ہم اپنی سہولت کے لیے اخبارات میں شائع ہونے والی تفصیلات کی روشنی میں اس رپورٹ کو تین حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں:

ایک حصہ صدر ایوب خان مرحوم کے دور حکومت سے متعلق ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ ایوب خان کے دور میں صنعتی ترقی ہوئی اور زراعت کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے، لیکن سیاسی طور پر ان پالیسیوں سے ملک کو نقصان پہنچا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ان کے دور میں بالواسطہ جمہوریت کا فلسفہ پیش کر کے جو بی ڈی سسٹم رائج کیا گیا اور عوام کو ان کے حقوق سے محروم کر کے تمام اختیارات کو مرکز میں سمیٹ لینے کا جو طرز عمل اپنایا گیا، اس نے مشرقی پاکستان کے باشندوں کے دلوں میں نوآبادیاتی ہونے کا احساس پیدا کیا اور اس احساس کو اندرونی وبیرونی سازشی عناصر نے اجاگر کر کے ملک کے دونوں حصوں کے درمیان نفرت کی خلیج پیدا کر دی جس کا آخری نتیجہ سقوط ڈھاکہ اور بنگلہ دیش کا قیام تھا۔

رپورٹ کا دوسرا حصہ ان سیاسی عناصر کے بارے میں ہے جو حمود الرحمٰن کمیشن کی رائے میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنے۔ ان میں سے شیخ مجیب الرحمٰن کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ وہ واجبی سطح کے لیڈر تھے اور ان کے پیش کردہ چھ نکات جو ملک میں سیاسی تنازعہ کی بنیاد بنے، وہ ان کی تخلیق نہیں تھے اور نہ ہی ان میں اتنی صلاحیت واہلیت تھی، بلکہ یہ نکات مشرق پاکستان کے ینگ سی ایس پی افسران کے ایک گروپ نے ترتیب دیے تھے اور ان کی پشت پر بیرونی عوامل تھے جنہوں نے ان چھ نکات کی بنیاد پر مغربی پاکستان کے خلاف مہم کو آگے بڑھایا اور مشرقی پاکستان کے عوام کو ان کے لیے منظم و متحرک کر دیا۔ رپورٹ میں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے منتخب پارلیمنٹ میں عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمٰن کا سیاسی مقابلہ کرنے کی بجائے پارلیمنٹ کے اجلاس کا بائیکاٹ کر کے اور اجلاس کے لیے ڈھاکہ جانے والے ارکان اسمبلی کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی دے کر محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے قومی اسمبلی کا طلب کیا ہوا اجلاس ملتوی کر دیا گیا اور اس کے ردعمل میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جو بالآخر ملک کی تقسیم پر منتج ہوئی۔ رپورٹ کے مطابق مسٹر بھٹو مرحوم نے دو اکثریتی پارٹیوں اور گرینڈ الائنس کا تصور وفاق کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ کنفیڈریشن کے قیام کے لیے پیش کیا تھا اور انتہائی غیر جمہوری طرز عمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

رپورٹ کا تیسرا حصہ جنرل صاحبان کے بارے میں ہے جو سب سے زیادہ شرمناک اور ہوش ربا ہے۔ اس میں جنرل یحییٰ خان، جنرل عبدالحمید خان، جنرل پیرزادہ، جنرل عمر، جنرل مٹھا اور ان کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے پہلے صدر ایوب خان کو اقتدار سے الگ کرنے کی سازش کی جس پر ان کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہیے۔ اس کے بعد انہوں نے انتخابات میں اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کے لیے دباؤ، رقم اور دیگر ذرائع کا بے دریغ استعمال کیا۔ منتخب اسمبلی کو کام کرنے کا موقع دینے کی بجائے طاقت کا استعمال کر کے مشرقی پاکستان میں عوام کا قتل عام کیا اور نفرت کی خلیج اور زیادہ گہری کر دی۔ رپورٹ میں ان سمیت پندرہ جنرل صاحبان کا کورٹ مارشل کرنے کی سفارش کی گئی ہے اور ان کے بارے میں الزامات کی ایک

طویل فہرست دی گئی ہے جو پیشہ ورانہ نااہلی اور بدعنوانی کے ساتھ ساتھ ذاتی کردار کے حوالے سے بھی شرمناک تفصیلات پر مشتمل ہے۔

رپورٹ کے مطابق جنرل یحییٰ خان اوران کے رفقا شراب اورعورت کے اس قدر رسیا تھے کہ اس مقصد کے لیے انہوں نے راولپنڈی میں صدر یحییٰ خان کے بنگلہ کو بدکاری کا اڈا بنا رکھا تھا۔ رپورٹ میں ان ایک درجن سے زائد عورتوں کی فہرست اور کوائف بھی دیے گئے ہیں جو یحییٰ خان اور ان کے ساتھیوں کا دل بہلاتی تھیں اور یحییٰ خان ان میں اس قدر مگن رہتے تھے کہ انہوں نے صدارتی آفس جانا چھوڑ دیا تھا اور جنگ کے دوران جی ایچ کیو کے آپریشن روم میں صرف دو تین مرتبہ ہی جا سکے۔ حتیٰ کہ عین حالت جنگ میں نومبر ۱۹۷۱ء کے دوران وہ لاہور کے گورنر ہاؤس میں ملکہ ترنم نور جہاں کے ساتھ تین دن مقیم رہے۔ جنرل نیازی پان کی سمگلنگ کرتے تھے، کریمنل کیسوں کے حوالے سے انہوں نے لاکھوں روپے کمائے اور وہ رقاصاؤں کے گھروں میں جایا کرتے تھے۔ بریگیڈیئر حیات نے عین حالت جنگ میں مقبول پور کے محاذ پر عورتیں بنکر میں طلب کر لیں اور اس کے لیے باقاعدہ احکامات جاری کیے اور بریگیڈیئر جہاں زیب ارباب اوران کے ساتھ دوسرے چھ فوجی افسر نیشنل بنک کی سراج گنج شاخ سے ایک کروڑ ۳۵ لاکھ روپے لوٹنے کی واردات میں ملوث تھے۔

رپورٹ کے ان حصوں کو جن میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بیرونی ممالک کے کردار کا ذکر ہے، خارجہ تعلقات کے ''حساس معاملات'' قرار دے کر ان کی اشاعت سے گریز کیا گیا ہے، لیکن جس طرح شائع ہونے والے حقائق عوام سے مخفی نہیں تھے اور رپورٹ کے شائع شدہ حصوں نے عوام کو پہلے سے حاصل شدہ معلومات کی تصدیق کر دی ہے، اسی طرح بیرونی ممالک کا کردار بھی عوام سے اوجھل نہیں ہے بلکہ انہیں ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا ہے کہ اندرونی عوامل کی طرح بیرونی عوامل کے بارے میں بھی ان کی معلومات بے بنیاد نہیں ہیں اور رپورٹ کا باقی ماندہ حصہ جب بھی شائع ہوا، وہ ان کی تصدیق پر ہی مشتمل ہوگا۔

اس رپورٹ پر مختلف سیاسی حلقوں کی طرف سے ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا جا رہا ہے، مگر ہم

موجودہ حکومت کے سربراہ جنرل پرویز مشرف سے، جو آرمی چیف بھی ہیں، صرف دو باتوں کی وضاحت کرنے کی درخواست کر رہے ہیں:

☆ ملک توڑنے کے سنگین جرم میں ملوث پائے جانے والے فوجی اور سول افسروں اور سیاست دانوں کے خلاف اب تک کیا کارروائی کی گئی ہے؟

☆ فوج کی اعلیٰ قیادت کو شراب، عورت اور رقص و سرود کے جال سے بچانے کے لیے کیا عملی اقدامات کیے گئے ہیں؟

کیونکہ اگر ان حوالوں سے کوئی پیش رفت ہوئی ہے تو اطمینان رکھنا چاہیے کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق حاصل کر کے آئندہ اس سے محفوظ رہنے کے لیے مناسب بندوبست کر لیا گیا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو قوم پوچھنا چاہتی ہے کہ ۱۹۷۱ء کے جی ایچ کیو اور ۲۰۰۱ء کے جی ایچ کیو میں آخر فرق ہی کیا ہے؟*

O

* روزنامہ اوصاف، ۵/جنوری ۲۰۰۱ء۔

وزیر داخلہ کی سفارشات اور حقیقت حال

وفاقی وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر نے گزشتہ روز ایک پریس کانفرنس میں اس ٹاسک فورس کی سفارشات کا اعلان کیا ہے جو ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بارے میں قائم کی گئی تھی۔ روزنامہ ایکسپریس کراچی کے ۳۰ ستمبر کے ادارتی نوٹ کے مطابق وزیر داخلہ نے جن سفارشات کا اعلان کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

☆ سرکاری انتظامیہ کا موثر احتساب۔

☆ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قوانین میں ترامیم۔

☆ عدالتی کارروائیاں اردو میں کرنا۔

☆ کسی کو کافر کہنے پر قانون کے مطابق کارروائی۔

☆ ہر قسم کی وال چاکنگ پر پابندی۔

☆ مذہبی جلوسوں کو اوقات اور مقررہ روٹس کا ہر حال میں پابند بنانے اور تعلیمی اداروں میں مذہبی جماعتوں کی سرگرمیوں پر پابندی۔

جہاں تک سرکاری انتظامیہ کے موثر احتساب کی سفارش کا تعلق ہے، یہ ملک کے ہر باشعور شہری کے دل کی آواز ہے کیونکہ سرکاری اہل کاروں میں رشوت، بدعنوانی، نااہلی اور سفارش کی مذموم روایات جس طرح سرایت کیے ہوئے ہیں، انھوں نے ملک کے پورے نظم ونسق کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے، حتیٰ کہ اوپر سے نیچے تک کسی بھی سطح پر عوام کے جائز کام وقت پر اور سفارش ورشوت کے بغیر

ہونے کے تمام امکانات معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور اس نے عوام کی مایوسی کو انتہا تک پہنچا دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ پاکستان میں برسرِ اقتدار آنے والی ہر حکومت نے انتظامیہ کے احتساب کا اعلان کیا ہے، مگر عملاً یہ کارروائی کسی دور میں بھی حکومت مخالف اہل کاروں کی چھانٹی اور باقی ماندہ کو خوف زدہ کر کے حکومتی ترجیحات کا پابند بنانے کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں دے سکی، اس لیے احتساب کے ان نعروں اور اعلانات پر اب کوئی بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارا انتظامی ڈھانچہ فرنگی استعمار کے نوآبادیاتی دور کی یادگار ہے جس کی تشکیل ہمارے قومی مفادات اور ملی ضروریات کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ غیر ملکی آقاؤں کے مفادات ومقاصد کی تکمیل کے لیے کی گئی تھی اور اب اس کی جگہ لوکلائزیشن اور ضلعی حکومتوں کے نام سے جو نیا انتظامی ڈھانچہ لانے کی باتیں ہو رہی ہیں، اس میں بھی ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور عالمی استعمار کے گلوبلائزیشن کے سامراجی منصوبے پیش نظر ہیں جبکہ ہمارا قومی ذہن استعماری قوتوں کے دائرۂ اثر سے آزاد ہو کر اپنے مفادات اور قومی ضروریات کے حوالے سے سوچنے کے لیے ابھی تک تیار ہی نہیں۔ اس لیے ملک کو ایک صحت منداور باوقار انتظامی ڈھانچہ دینے اور انتظامی افسران کے موثر احتساب کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہنوں کو مغرب کی مرعوبیت سے آزاد کریں اور ملی مفادات کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد بنائیں، ورنہ احتساب کے نام پر باہمی انتقام کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا اور انتظامی مشینری مزید خلفشار اور انارکی کا شکار ہوگی۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانونی ترامیم اور اردو کو عدالتی زبان بنانے کی سفارش بھی بہت اہم ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک کے دستور کے مطابق اپنے ذمے ڈیوٹی کو مکمل کرتے ہوئے ملک کے تمام رائج الوقت قوانین کا جائزہ لے کر قرآن وسنت کی روشنی میں ان میں ترامیم کی سفارشات بلکہ متبادل قوانین کے مسودات تک مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر دیے ہیں اور اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی جامع اور مکمل رپورٹ وزارت قانون کے ڈیپ فریزر میں منجمد پڑی ہے۔ اگر ان سفارشات کو قانون سازی کی بنیاد بنا کر ملک کے مروجہ قوانین میں ضروری ترامیم کر دی جائیں تو نہ صرف ملک کے

عدالتی اور قانون ڈھانچے میں صحت منداور انقلابی تبدیلی رونما ہوگی بلکہ دستور میں قوم سے اسلامی قوانین کے عملی نفاذ کا جو وعدہ کیا گیا ہے، اس کی بھی تکمیل ہو جائے گی اور اگر موجودہ حکومت یہ کام کر گزرے تو دیگر تمام تر مسائل کے باوجود تاریخ میں اس کا یہ کارنامہ ایک شاندار اور روشن باب کی صورت میں ہمیشہ کے لیے یادگار رہے گا۔

البتہ کسی کو ''کافر'' کہنے پر پابندی کی سفارش کے بارے میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ صرف کافر کہنے پر پابندی کافی نہیں ہوگی بلکہ ان امور کے کھلے بندوں اظہار پر پابندی لگانا بھی ضروری ہوگا جو کفر کا باعث بنتے ہیں، کیونکہ اگر کفریہ باتوں کے اظہار پر پابندی نہ ہو اور صرف کافر کہنے پر پابندی لگادی جائے تو یہ یک طرفہ بات ہوگی جو سراسر ناانصافی ہے اور کوئی معقولیت پسند شخص اس کو قبول نہیں کر پائے گا۔ یہ منطقی اور بدیہی بات ہے کہ کفر کی باتوں کا علانیہ اظہار ہوگا تو اسے کفر قرار دینے پر پابندی کا کوئی عقلی اور اخلاقی جواز نہیں رہ جائے گا۔ اس لیے اس ضمن میں ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وفاقی شرعی عدالت یا اسلامی نظریاتی کونسل کے آئینی اداروں کے ذریعے ان امور کا تعین کیا جائے جو کفر کا موجب بنتے ہیں اور جن کے اظہار کی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کسی کو اجازت نہیں ہونی چاہیے اور اس قانون ضابطہ اور حدود کے تعین اور اعلان کے بعد بلاجھجک یہ پابندی لگادی جائے کہ اس سے ہٹ کر کوئی شخص یا گروہ کسی کو کافر کہے گا تو وہ قانون کی رو سے سزا کا مستوجب ہوگا، ورنہ کسی کو کافر کہنے کی یک طرفہ پابندی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کے نام اور اسلامی نظام کے نفاذ کے وعدے کے ساتھ بننے والے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اگر کوئی شخص (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کر دے، اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف پرچار شروع کر دے، عقیدۂ ختم نبوت سے بغاوت کر دے، قرآن پاک یا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہرزہ سرائی کرے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں توہین کا ارتکاب کرے یا حضرات صحابہ کرام کے ایمان اور ان کی عدالت و دیانت پر حرف زنی شروع کر دے تو اس پر تو کوئی قدغن نہیں ہوگی مگر جو شخص ان کے اس کفر کی نشان دہی کرے گا اور اس کے خلاف احتجاج کرے گا، وہ قانون کی نظر میں مجرم قرار پائے گا۔

یہ انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے اور اس کے بارے میں کسی بھی قسم کی قانونی پیش رفت کے نتائج انتہائی دوررس ہوں گے، اس لیے جذباتی اور سطحی انداز میں کوئی قدم اٹھانے سے قبل حکومت کو اس کے دونوں پہلوؤں کا جائزہ لینا ہوگا، ورنہ فرقہ وارانہ کشیدگی ختم کرنے کی غرض سے کی جانے والی کارروائی اس کشیدگی میں کمی کی بجائے اس کی شدت میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔

اسی طرح مذہبی جلوسوں کے روٹس اور اوقات کے بارے میں بھی ٹھوس اور قابل عمل پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ امن عامہ کے قیام و استحکام کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ فرقہ وارانہ مذہبی رسوم و عبادات کو جن میں جلسے اور جلوس بھی شامل ہیں، عبادت گاہوں تک محدود کر دیا جائے۔ چاردیواری اور عبادت گاہ کی حدود میں کسی فرقہ کی سرگرمیوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ ہو اور متنازعہ مذہبی رسوم کو مشترکہ پبلک مقامات بالخصوص ان علاقوں میں بجالانے کی قطعاً اجازت نہ ہو جہاں ان رسوم کو شرعاً جائز نہ سمجھنے والے لوگوں کی آبادی بھی ہو، ورنہ تنازعات پر قابو پانا ممکن نہیں رہے گا اور فرقہ وارانہ کشیدگی پر پابندی کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو پائے گی۔ حکومت اگر فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے میں سنجیدہ ہے تو اسے فرقہ وارانہ کشیدگی کا باعث بننے والی باتوں کو روکنے میں بھی سنجیدہ ہونا چاہیے کیونکہ اسباب ختم کیے بغیر نتائج پر قابو پانے کی خواہش ہوا میں تلوار چلانے کے مترادف ہے اور اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔*

O*

* ہفت روزہ الہلال راول پنڈی، ۶ تا ۱۲/ اکتوبر ۲۰۰۰ء۔

مولانا حافظ سعید کی گم شدگی اور حکومتی ذمہ داری

مولانا اعظم طارق کی بھوک ہڑتال کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے اور اس کی پیچیدگی اور سنگینی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر حافظ سعید کا تعلق اہل حدیث مکتب فکر سے ہے۔ انھوں نے ''لشکر طیبہ'' کے نام سے مجاہدین کی جماعت بنائی جس نے بہت جلد مجاہدین کی تنظیموں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں کشمیری مجاہدین کی حمایت کے لیے شروع سے سرگرم عمل رہے، جبکہ افغانستان میں طالبان حکومت کی حمایت اور امریکی عزائم کی مذمت و مخالفت میں پروفیسر حافظ محمد سعید ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی جماعت کو نہ صرف امریکہ کی طرف سے دہشت گرد قرار دیا گیا بلکہ پاکستان میں بھی اس پر پابندی لگا دی گئی جس پر انھوں نے ''جماعت الدعوۃ'' کے نام سے ایک نئی دینی و سیاسی جماعت کی تشکیل کا اعلان کر دیا اور ''لشکر طیبہ'' کو کشمیر کے دائرے میں محدود کر کے پاکستان میں اس کی سرگرمیاں ختم کر دیں۔ تب سے وہ جماعت الدعوۃ کے امیر ہیں اور ملک کی دینی سیاست میں سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔

انھیں افغانستان میں امریکی حملہ کے موقع پر ''دفاع پاکستان و افغانستان کونسل'' کے مشترکہ فورم سے احتجاجی مہم میں متحرک کردار ادا کرنے پر گرفتار کیا گیا۔ کئی ماہ کے بعد وہ رہا ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ ان کی گرفتاری کی خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں اور حکومتی حلقوں کی طرف سے ان خبروں پر مکمل خاموشی اختیار کی گئی، لیکن جب گزشتہ روز ان کی اہلیہ محترمہ نے لاہور ہائی کورٹ میں ان کی گرفتاری یا نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کی تو صوبائی حکومت

نے عدالت عالیہ کے سامنے یہ موقف اختیار کر کے سب کو حیرت زدہ کر دیا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کو حکومت نے گرفتار نہیں کیا اور وہ حکومت کی تحویل میں بھی نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں صوبائی حکومت کو علم ہے کہ وہ کہاں ہیں؟

اس کے بعد جب وفاقی حکومت سے دریافت کیا گیا تو حکومت پاکستان کے وکیل نے بھی لاہور ہائی کورٹ میں وہی موقف دہرایا جو صوبائی حکومت اس سے قبل پیش کر چکی تھی۔ اس طرح اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید غائب ہیں، ان کے گھر والوں کو ان کے بارے میں کوئی علم نہیں اور وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہیں۔ دوسری طرف حکومت نے واضح طور پر ان کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا ہے کہ نہ انھیں گرفتار کیا گیا ہے اور نہ ہی حکومت ان کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔

ہمارے خیال میں حکومت کا یہ کہنا قرین قیاس نہیں ہے اور پروفیسر حافظ محمد سعید کے بارے میں اس درجہ کی لاعلمی کا اظہار کر کے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے، ورنہ اگر حکومت کا یہ موقف درست ہے تو اس کا اظہار اس وقت ہونا چاہیے تھا جب پروفیسر حافظ محمد سعید کی دوبارہ گرفتاری کی خبریں قومی اخبارات میں شائع ہوئی تھیں اور مسلسل کئی روز تک اس گرفتاری پر احتجاج بھی ہوتا رہا۔ اگر حکومت نے انھیں گرفتار نہیں کیا تھا تو اس کا فرض بنتا تھا کہ اسی وقت حکومت کی طرف سے ان خبروں کی تردید جاری کی جاتی اور واضح طور پر قوم کو بتا دیا جاتا کہ یہ خبریں غلط ہیں اور حکومت نے انھیں حراست میں نہیں لے لیا۔ حافظ صاحب ملک کی معروف دینی شخصیت ہیں اور ایک دینی سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں۔ ان کی گرفتاری کی خبروں پر حکومت کا خاموش رہنا اور کئی ماہ گزر جانے کے بعد ہائی کورٹ میں اس سے بےخبری کا اظہار نہ تو قانون وضابطہ کی زبان میں درست طرز عمل ہے اور نہ ہی اخلاقی طور پر اس کا کوئی جواز بنتا ہے۔ دوسری طرف ایک خبر کے مطابق حافظ محمد سعید کی اہلیہ نے اپنے شوہر کی گم شدگی یا گرفتاری کے کیس میں صوبائی وزیر مذہبی امور مفتی غلام سرور قادری کو فریق بنانے کی درخواست دے دی ہے جنھوں نے مبینہ طور پر ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید حکومت کی حراست میں ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کیس کی سنگینی میں اس بات سے کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ پروفیسر حافظ محمد سعید ان حضرات میں سے ہیں جن کے بارے میں امریکہ اور بھارت دونوں ملکوں کی حکومتیں اس بات میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اس کا کھلم کھلا مطالبہ کر چکی ہیں کہ انھیں آزاد نہ چھوڑا جائے، ان کی سرگرمیوں کو ختم کرایا جائے، بلکہ انھیں ایک ''دہشت گرد'' کے طور پر امریکہ یا بھارت کے حوالے کر دیا جائے، اس لیے ان کی گرفتاری کی واضح خبروں کے کافی عرصہ بعد حکومت کی طرف سے ان کے بارے میں بے خبری کا اعلان ذہنوں میں یہ شک پیدا کرتا ہے کہ کہیں انھیں کسی ''خفیہ ڈیل'' کے ذریعے امریکہ یا بھارت کے حوالے تو نہیں کر دیا گیا؟ اور صدر جنرل پرویز مشرف نے امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کی آمد کے موقع پر جو یہ اعلان فرمایا ہے کہ ہم نے کشمیر میں ''دہشت گردی'' کو ختم کرنے کے لیے بہت کچھ کر دیا ہے، کہیں اس بہت کچھ میں پروفیسر حافظ محمد سعید کی ''گمشدگی'' بھی تو شامل نہیں ہے؟

ہمارے ہاں اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں اور ہضم بھی ہو جایا کرتی ہیں، اس لیے ہمارا یہ خدشہ بے جا نہیں ہے۔ ہم نے ملا عبدالسلام ضعیف کو افغانستان کا سفیر تسلیم کر رکھا تھا اور ان کے کاغذات سفارت باقاعدہ ایوان صدار میں قبول کیے گئے تھے، لیکن افغانستان میں ان کو سفیر مقرر کرنے والی حکومت ختم ہو جانے کے بعد جب وہ سفیر نہ رہے تو ان کے ساتھ ڈیلنگ کے سفارتی تقاضے، ضوابط اور اخلاق کا ایک واضح نقشہ ہمارے سامنے موجود تھا جبکہ انھوں نے سیاسی پناہ کی درخواست بھی دے رکھی تھی جو ہمارے ہاں زیر غور تھی۔ دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ کسی سفارت کار کی سیاسی پناہ کی درخواست زیر غور ہو اور اس کا فیصلہ کیے بغیر اسے اس کے دشمن کے حوالے کر دیا جائے، جبکہ واضح طور پر اس کو جان کا خطرہ بھی نظر آ رہا ہو، مگر ہم نے ایسا کیا اور ''ڈنکے کی چوٹ پر'' کیا۔ نہ اخلاقی تقاضے ہمیں اس کارروائی سے روک سکے، نہ سفارتی ''آداب'' نے ہمارا دامن پکڑا اور نہ ہی قانون وضابطہ کی کوئی دفعہ ہمارا ہاتھ روک سکی، چنانچہ ایک ''سفیر'' ہمارے ہاتھوں ''جنگی مجرم'' کا درجہ پا کر دشمن کی حراست میں ہے جس کے بارے میں وحشیانہ تشدد کی خبریں بار بار عالمی پریس میں آ رہی ہیں اور چند روز سے اسی تشدد کی وجہ سے ان کی موت اور شہادت کی خبریں بھی منظر

عام پر آنا شروع ہوگئی ہیں۔

اس پس منظر میں جماعت الدعوۃ پاکستان کے امیر اور ملک کے معروف سیاسی و دینی راہ نما پروفیسر حافظ محمد سعید کی گمشدگی ملک بھر کے دینی حلقوں اور محبِّ وطن عناصر کے لیے سخت پریشانی اور اضطراب کا باعث بن گئی ہے اور پروفیسر صاحب محترم کی زندگی کے حوالے سے سنگین اور شدید خدشات ذہنوں میں ابھر رہے ہیں۔ اس لیے حکومت پاکستان یا پنجاب حکومت عدالت عالیہ میں یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے فارغ نہیں ہو جاتی کہ اسے پروفیسر حافظ محمد سعید کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے اور اس نے انھیں حراست میں نہیں لیا، بلکہ یہ حکومت کی قانونی و اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی پوزیشن عوام کے سامنے واضح کرے اور ان کی رہائی یا بصورت دیگر بازیابی کے لیے اپنی قانونی و اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے فوری اور ٹھوس اقدامات کرے، ورنہ اگر حکومت نے اس حوالے سے سنجیدگی کا مظاہرہ نہ کیا تو عوام کے ذہنوں سے اس شبہ کو نکالنا مشکل ہو جائے گا کہ پروفیسر حافظ محمد سعید کو ’’خفیہ ڈیل‘‘ کے ذریعے امریکہ یا بھارت کے حوالے کر دیا گیا ہے اور اب ’’بے خبری‘‘ کے اظہار کے ذریعے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔*

O

* روزنامہ پاکستان، ۶/اگست ۲۰۰۲ء۔

اطاعت امیر درست، مگر کن حالات میں!

صدر جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ دنوں اسلام آباد میں علمائے کرام اور مشائخ عظام کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا بہت سی فکر انگیز باتیں کی ہیں جن پر ہر پاکستانی کو غور کرنا چاہیے، کیونکہ صدر محترم کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان کی بہت سے آرا سے ہمیں بھی اختلاف ہے، لیکن اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جن امور کی انہوں نے نشاندہی کی ہے اور جن مسائل کا پاکستان کے حوالے سے انہوں نے اپنے خطاب میں تذکرہ کیا ہے، وہ اس وقت ہمارے لیے ایک چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں ہر باشعور شہری فکر مند اور پریشان ہے۔

جو علمائے کرام اور مشائخ عظام اس اجتماع میں شریک ہوئے، ان کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قوم کے کسی حصے کی نمائندگی نہیں کرتے، کیونکہ وہ سب محترم بزرگ ہیں اور اپنا اپنا حلقہ اثر رکھتے ہیں، لیکن اس اجتماع میں شرکت کے لیے علمائے کرام اور مشائخ عظام کا جس طریقے سے انتخاب کیا گیا ہے، وہ روایتی طور پر وہی تھا جس کی طرف گزشتہ روز ہمیں ایک ذمہ دار صحافی دوست نے توجہ دلائی۔ ایک ضلع میں اسلام آباد کے مذکورہ کنونشن کے لیے علما کا انتخاب ہو رہا تھا اور ضلعی انتظامیہ کی تیار کردہ فہرست کو ''آخری شکل'' دی جا رہی تھی تو بعض نام اس خدشے کی بنیاد پر کاٹ دیے گئے کہ یہ شاید وہاں کسی بات پر بول پڑیں، اس لیے ان کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فہرست اچھی طرح چھان بین کر مرتب کی گئی تھی کہ صرف وہی حضرات اس

اجتماع میں شریک ہوں جو خاموشی کے ساتھ خطاب سنیں اور پھر کوئی تبصرہ کیے بغیر وہاں سے واپس آجائیں۔ اس سے ہمیں وہ تاریخی واقعہ یاد آ گیا کہ حضرت عمر بن العزیزؒ جب خلیفہ بنے تو حضرت حسن بصریؒ کو خط لکھا کہ وہ انہیں ایسے چند علمائے کرام کے نام دیں جن کو وہ اپنے قریب بلا سکیں اور بوقت ضرورت ان سے مشورہ لیتے رہیں۔ حضرت حسن بصریؒ نے جواب میں لکھا کہ ''جو علما ہیں، وہ تمہارے پاس آئیں گے نہیں اور جو تمہارے پاس آجائیں گے، ان کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس لیے میں کوئی نام دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

اس کنونشن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ قومی پالیسیوں پر علمائے کرام کو اعتماد میں لینے کے لیے بلایا گیا تھا، لیکن اعتماد میں لینے کا یہ طریقہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ صرف ایسے لوگوں کو بلایا جائے کہ جو خاموشی کے ساتھ خطاب سنیں اور پھر کوئی بحث ومباحثہ اور سوال وجواب کیے بغیر اسی خاموشی کے ساتھ واپس گھروں کو سدھار جائیں۔ ہمارے ذہن میں کسی کو اعتماد لینے کا جو مفہوم ہے، وہ یہ ہے کہ جن کو کسی مسئلے میں اعتماد میں لینا مقصود ہے، انہیں اپنے موقف اور پروگرام سے آگاہ کیا جائے اور پھر ان سے رائے بھی طلب کی جائے اور ان کی تجاویز وآرا کو بھی موقف اور پروگرام کا حصہ بنایا جائے، لیکن یہاں تو چھان پھٹک کر بلایا ہی صرف ایسے بزرگوں کو گیا تھا جن سے کسی مسئلے پر بول پڑنے کا کوئی خدشہ نہ ہو، اس لیے ہمیں اس کنونشن کی اس کے علاوہ اور کوئی افادیت نظر نہیں آئی کہ روایتی انداز میں دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صدر محترم کی پالیسیوں کو علما ومشائخ کی حمایت حاصل ہے اور وہ اسلام کی جو تعبیر وتشریح کر رہے ہیں، اس میں علما ومشائخ کا ایک حلقہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ اب تو جارج واکر بش کی طرف سے اس سٹرفکیٹ کے اجرا کے بعد اس تکلف کی ضرورت بھی باقی ہی نہیں رہی جس میں صدر بش نے کہا تھا کہ پاکستان اب اسلام کی صحیح تعبیر وتشریح کی طرف آ رہا ہے۔

صدر پرویز مشرف کے مذکورہ خطاب کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کی ضرورت ہے اور ان پر قومی حلقوں میں بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے، مگر ان میں سے ایک اہم پہلو پر کچھ عرض کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا کہ حاکم وقت اور کمانڈر کی ہر حالت میں اطاعت

اسلامی نقطہ نظر سے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کے اس تاریخی کردار کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے عین حالت جنگ میں کمانڈر کے منصب سے معزولی کے حکم پر سر تسلیم خم کر کے لشکر کی کمان حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کے سپرد کر دی تھی اور پھر انھی کی کمان میں ایک سپاہی کے طور پر جنگ میں حصہ لیا تھا۔

حضرت خالد بن ولید کا یہ عمل ڈسپلن کی پابندی کے حوالے سے ایک تاریخی اور مثالی کردار کے طور پر یاد کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حضرت خالد بن ولید کی عظمت کردار کی علامت ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ روایت کبھی قابل عمل نہیں رہی اور ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے کہ اگر کسی سینئر کو نظر انداز کر کے اس کی جگہ جونیئر فوجی افسر کو کمانڈر بنا دیا جائے تو سینئر افسر اس کی کمان میں کام کرنے کی بجائے اختیاری ریٹائرمنٹ لے کر گھر چلا جاتا ہے جس کا مظاہرہ ہماری فوجی کمان میں کئی بار ہو چکا ہے، مگر اس سے قطع نظر ہم ایک اور پہلو سے اس مسئلے کو جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ کیا حضرت خالد بن ولیدؓ کے اس عمل سے یہ استدلال کرنا درست ہے کہ حاکم اور کمانڈر کی ہر حالت میں اطاعت ضروری ہے اور وہ جو حکم بھی دے، اس سے کسی صورت میں بھی اختلاف یا حکم عدولی کی گنجایش نہیں ہے؟

اس سلسلے میں ہم عہد نبوی کے دو واقعات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جنہیں امام بخاریؒ نے ''صحیح بخاری'' میں رویت کیا ہے۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن حذافہ کی قیادت میں ایک لشکر جہاد کے لیے روانہ کیا اور تلقین کی کہ امیر لشکر کی ہر حالت میں اطاعت کی جائے۔ دوران سفر کسی مقام پر امیر لشکر کسی بات پر غصے میں آ گئے اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ لکڑیاں اکٹھی کر کے لائیں۔ لشکر کے سپاہیوں نے لکڑیوں کا ایک ڈھیر جمع کر لیا۔ امیر صاحب نے حکم دیا کہ اس ڈھیر کو آگ لگائی جائے جو لگا دی گئی اور جب آگ اچھی طرح بھڑک اٹھی تو کمانڈر نے حکم دیا کہ سارا لشکر اس آگ میں کود جائے۔ سپاہی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اس پر کمانڈر نے یاد دلایا کہ تمہیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین کی تھی کہ امیر کی ہر حالت میں اطاعت کی جائے، اس لیے میرا حکم مانو اور آگ میں چھلانگ لگا دو۔ لشکر نے امیر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا

اور کہا کہ اس آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھا ہے، اس لیے ہم آگ میں نہیں کودیں گے۔ تھوڑی دیر بعد امیر لشکر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور آگ بھی سرد پڑ گئی۔ مدینہ منورہ واپسی پر یہ مقدمہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ لوگ اگر امیر کا حکم مان کر آگ میں چھلانگ لگا دیتے تو قیامت تک آگ میں ہی رہتے۔ اس کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امیر کی اطاعت ''معروف'' باتوں میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امیر کسی غلط بات کا حکم دے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔

دوسرا واقعہ بھی امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے جو حضرت خالد بن ولیدؓ کے بارے میں ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو ایک لشکر کا کمانڈر بنا کر کفار کے ایک قبیلے کے ساتھ جنگ کے لیے بھیجا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے حکم کے مطابق اس قبیلے کو اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے جواب میں ایسا جملہ کہا جس سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ ہم اپنے دین سے دست بردار ہو گئے ہیں، لیکن کلمہ طیبہ نہ پڑھ سکے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاید وہ کلمہ طیبہ کے الفاظ صحیح طور پر نہیں جانتے تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان کے اس اعلان کو قبول کرنے کی بجائے ان پر حملہ کر دیا اور شکست دے دی۔ جنگ میں ان میں سے کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ قیدی ہوئے جنہیں حضرت خالد بن ولیدؓ نے لشکریوں میں تقسیم فرما دیا۔ راستے میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے لشکریوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے قیدی کو قتل کر دیں۔ لشکر میں حضرت عمر بن عبداللہ بھی موجود تھے۔ انہیں یہ اشکال تھا کہ جب اسلام کی دعوت کے جواب میں اس قبیلے کے افراد نے یہ کہہ دیا تھا کہ ہم اپنے مذہب سے دست بردار ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے، لیکن حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان کی بات قبول کرنے کی بجائے ان کے خلاف جنگ شروع کر دی، اس لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے امیر لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں اپنے قیدی کو قتل نہیں کروں گا اور ہم میں سے کوئی بھی اپنے قیدی کو قتل نہیں کرے گا، بلکہ ہم یہ مقدمہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کریں گے اور ان کے حکم پر عمل کریں

گے۔

مدینہ منورہ پہنچ کر یہ معاملہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو بلوا کر جواب طلبی کی اور جب واضح ہو گیا کہ واقعہ اس طرح ہوا ہے جس طرح بیان کیا گیا تو یہ کہہ کر حضرت خالد بن ولیدؓ کے اس عمل سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لاتعلقی اعلان فرمایا کہ ''اے اللہ! خالدؓ نے جو کیا، میں اس سے بری ہوں۔''

یہ دونوں واقعات دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور بخاری شریف میں ہیں، جن میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر کے غلط حکم کو انکار کرنے والوں کو سزا دینے یا تنبیہ کرنے کی بجائے غلط حکم دینے والے امیروں کو ڈانٹا، ان کے عمل سے برات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ امیر کی اطاعت ضروری ہے، لیکن معروف باتوں میں۔ اگر وہ کوئی غلط حکم دے، جس کا غلط ہونا شرعی نقطہ سے واضح ہو تو اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ''ڈسپلن'' کی نفی کر رہے ہیں۔ جہاں نظم و نسق کا معاملہ ہو اور ڈسپلن کا تقاضا ہو، وہاں امیر اور کمانڈر کی اطاعت واجب ہے حتی کہ ڈسپلن اور نظم و نسق کے معاملات میں فقہائے کرام نے امیر کے غلط حکم کی اطاعت کو بھی واجب اور ضروری قرار دیا ہے، لیکن جہاں شریعت کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو اور اس حکم پر عمل کرنے والا شرعاً گنہگار ٹھہرتا ہو، وہاں اطاعت ضروری نہیں بلکہ حاکم کو اس غلطی پر خبردار کرنا ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشادِ گرامی موجود ہے کہ 'لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق'۔ خالق کی نافرمانی میں مخلوق میں سے کسی کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔*

O

* روزنامہ پاکستان، ۲۴ فروری ۲۰۰۴ء

حکومتی اعلان کے بغیر جہاد کی شرعی حیثیت

اسلام آباد کے ''علما کے کنونشن'' سے جنرل پرویز مشرف کے خطاب پر بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور قومی اخبارات میں اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے۔ اس کنونشن کے لیے اپنی مرضی کے علماو مشائخ کو جس انداز سے جمع کیا گیا، اس سے ماضی کی حکومتی روایات بھی مدھم پڑ گئیں کیونکہ ماضی کی حکومتیں ایسے مواقع پر اس بات کا خیال رکھتی تھیں کہ کانفرنس یا کنونشن میں اس کے ہم خیال حضرات ہی کی اکثریت ہو مگر توازن قائم رکھنے کے لیے مخالفانہ نقطہ نظر رکھنے والے کچھ حضرات کو بھی موقع دیا جاتا تھا لیکن اس بار کنونشن کے شرکاء کی فہرست کو ایسی باریک چھلنی سے گزارا گیا کہ ہاں میں سر ہلانے اور واہ واہ کرنے والوں کے سوا کوئی بھی اس کنونشن کی اگلی صفوں میں جگہ نہ پا سکا۔ چند سنجیدہ علما اور بزرگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی اور وہ شریک بھی ہوئے، لیکن انہیں پچھلی صفوں میں اس طرح جگہ دی گئی کہ نہ تو وہ کسی بات پر استفسار یا اظہار خیال کر سکیں اور نہ ہی ان کی موجودگی ذرائع ابلاغ میں نمایاں کوریج پا سکے۔ انہی چند سنجیدہ علما میں سے ایک ذمہ دار عالم دین نے مجھے بتایا کہ وہ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے تقریر کے درمیان میں اٹھے اور واپس جانے لگے تو ہال کے دروازے بند تھے اور ان سے کہا گیا کہ صدر صاحب کی تقریر ختم ہونے سے پہلے کسی کو ہال سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی دروازے کھولے جائیں گے۔

صدر صاحب کے اس ''خطاب بالخیر'' کے بہت سے نکات قومی اخبارات میں اس وقت موضوع بحث ہیں ان میں سے دو باتوں کے حوالہ سے ہم بھی چند گزارشات پیش کرنا مناسب خیال

کرتے ہیں۔

صدر محترم نے فرمایا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے، اس کا آئین اسلامی ہے کوئی بھی شخص پاکستان کے اسلامی تشخص کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی یہاں اسلام کے خلاف کوئی قانون بن سکتا ہے۔ ان کا ارشاد بجا ہے کہ پاکستان کا دستور فی الواقع یہ تحفظات فراہم کرتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان میں اس وقت اسلام کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں ہے؟ اور قومی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی احکام وتعلیمات کی عملداری قائم ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور عملا ملک میں بہت سے غیر اسلامی قوانین نافذ ہیں بلکہ اس کا مسلسل تحفظ کیا جا رہا ہے تو اس بات کی نشاندہی ہونی چاہئے کہ دستور پاکستان کی اس ضمانت کو ''کہ پاکستان میں اسلام کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا'' سبوتاژ کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ جب بھی حکمرانوں کو اسلامی نظام اور قوانین کے نفاذ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے وہ یہ کہہ کر بزعم خود اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتے ہیں کہ دستور میں اسلام کو پاکستان کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے اور اسلام کے خلاف کوئی قانون نہ بنائے جانے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ ہمارے حکمران طبقات کے نزدیک دستور میں ایک دو دفعات کا شامل ہو جانا ہی اسلامی نظام کے نفاذ کے مترادف ہے اور اس کے بعد عملاً اور کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کلمہ پڑھ لے اور کہے کہ چونکہ میں نے کلمہ پڑھ لیا ہے اور وقتاً فوقتاً اسے دہراتا رہتا ہوں، اس لیے میں مسلمان ہوں اور مجھے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلمہ پڑھنے سے وہ مسلمان ضرور شمار ہوگا لیکن صرف کلمہ پڑھ لینا اس کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ فرائض وواجبات، حلال وحرام اور حقوق ومعاملات کا ایک پورا نظام ہے جو اسے عملی زندگی میں اپنانا ہوگا ورنہ بارگاہ ایزدی میں فاسق وفاجر اور کبیرہ گناہوں کا مرتکب قرار پائے گا بلکہ اگر وہ عقیدہ کے طور پر فرائض وواجبات حلال وحرام اور حقوق ومعاملات کو غیر ضروری سمجھتا ہے تو اس کے کلمہ پڑھنے کا بھی شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔

پھر دستور میں صرف یہی نہیں لکھا ہوا کہ پاکستان میں اسلام کے خلاف کوئی قانون نہیں بن

سکے گا بلکہ اس بات کی بھی صراحتا ضمانت دی گئی ہے کہ ملک میں رائج قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی ہے۔ جس نے تمام مروجہ قوانین کے بارے میں سفارشات مرتب کر کے حکومت کو پیش کر رکھی ہے اور دستور میں اس کام کی جو مدت مقرر کی گئی تھی وہ بھی عرصہ ہوا گزر چکی ہے لیکن ابھی تک اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی عملی پیش رفت نہیں ہوئی، جن قوانین کو اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت قرآن وسنت کے منافی قرار دے چکی ہے وہ بدستور نافذ ہیں اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں دستوری ضمانتوں کا منہ چڑا رہے ہیں اس لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سربراہ کی حیثیت سے صرف جنرل پرویز مشرف صرف یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو جاتے کہ پاکستان کے دستور میں اسلام کے خلاف کوئی قانون نافذ نہ کیے جانے کی ضمانت دی گئی ہے اس لیے پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور اس کے لیے عملاً کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اگر وہ دستور کی اسلامی دفعات کے بارے میں سنجیدہ ہیں تو انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے اقدامات کرنا ہوں گے۔ جس کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کے سفارشات مرتب شکل میں وزارت قانون کے پاس موجود ہیں۔ اس کے بغیر پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور اس کے اسلامی تشخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا قسم کی باتیں خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

دوسری بات انہوں نے جہاد کے بارے میں کہی ہے اور یہ ''فتویٰ'' صادر کیا ہے کہ جہاد کے اعلان کا حق صرف حکومت کو حاصل ہے اور حکومت کے اعلان کے بغیر کسی جہاد کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ ہمارے بعض دانشور مسلسل یہ بات کہہ رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کسی ایسے دانشور نے ہی صدر محترم کو یہ پٹی پڑھائی ہو لیکن یہ بات اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے تسلسل سے مطابقت نہیں رکھتی اس لیے اس کی وضاحت ہم ضروری سمجھتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے خلاف ''اعلان جہاد'' حکومت ہی کا حق ہے اور کسی فرد یا طبقہ کا یہ استحقاق نہیں ہے کہ وہ کسی ملک یا قوم کے خلاف اپنے طور پر جہاد کا اعلان کرے لیکن مسلم سوسائٹی پر مسلط ہونے والے کفر سے نجات حاصل کرنے کے لیے جہاد کے اعلان کے لیے کسی حکومت کی اجازت ضروری نہیں اور اگر کسی مسلم

آبادی پر کافروں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے تو اس تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کسی حکومتی اعلان کے بغیر عام مسلمانوں کو بھی حق ہے کہ اگر وہ مزاحمت کر سکتے ہیں تو علم جہاد بلند کریں اور مسلم آبادی کو کافروں سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کریں۔

برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جنوبی ایشیا کی تمام تحریکات آزادی جو جہاد کے عنوان سے لڑی گئیں اسی اصول پر تھیں۔ شہدائے بالاکوٹ، بنگال میں حاجی شریف اللہؒ اور تیتو میرؒ کی مسلح تحریکات، پنجاب میں احمد خان کھرل شہیدؒ کی تحریک مزاحمت، ۱۸۵۷ء کا معرکہ حریت، سرحد میں حاجی صاحب ترنگ زئیؒ اور فقیر ایپیؒ کی تحریکات، الجزائر کی جنگ آزادی، سوڈان میں مہدی سوڈانی کا معرکہ حریت اور دنیائے اسلام کی دیگر مسلح تحریکات آزادی کے ساتھ ساتھ روسی جارحیت کے خلاف افغان عوام کی مزاحمت بھی جہاد کے عنوان سے تھی اور اس کا اعلان کسی حکومت نے نہیں کیا تھا بلکہ افغانستان کے اس جہاد کو پاکستانی حکومت اور فوج نے بھی سپورٹ کیا، اسی طرح کشمیر کی جنگ آزادی بھی جہاد کے پرائیویٹ فتویٰ پر شروع ہوئی تھی اور اس وقت آزاد کشمیر کے نام سے جو خطہ پاکستان کے ساتھ ہے وہ ''پرائیویٹ جہاد'' ہی کا ثمرہ ہے اور اس کے بعد بھی کشمیر کے عوام آزادی کے لیے جس جہاد میں مصروف ہیں وہ کسی حکومت کے اعلان کی بنیاد پر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ فلسطین کے عوام گزشتہ نصف صدی سے جو مسلح مزاحمت جہاد کے نام سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور اپنی جانوں کا نزرانہ پیش کر کے اسرائیلی درندگی کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں اس کا اعلان کس حکومت نے نہیں کیا تھا بلکہ پرائیویٹ جماعتیں ہیں جو مسلم حکمرانوں اور حکومتوں کی بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے جہاد کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اسرائیلی جبر و تشدد کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ جہاد کے اعلان کا حق صرف حکومت کو حاصل ہے اور اس کے سوا کسی اور کو جہاد کا اعلان کرنے کا حق نہیں ہے مسلم دنیا کی ان تمام مسلح تحریکات آزادی کی نفی کے مترادف ہے جو برطانوی، فرانسیسی، ولندیزی اور روسی استعماروں کے تسلط کے خلاف مسلم ممالک میں لڑی گئیں اور جن کے نتیجے میں آج مسلم ملکوں کے دارالحکومتوں میں کچھ لوگ اقتدار کی کرسیوں پر براجمان ہیں۔

کسی جہادی تحریک کا وقتی طور اپنے اہداف کا حاصل نہ کر سکنا اور بات ہے اور اس کی اصولی

واخلاقی حیثیت اس سے بالکل مختلف امر ہے، یہ غلامانہ نفسیات کا کرشمہ ہے کہ کسی مہم میں کامیابی حاصل نہ کر سکنے پر اس کے اسباب کا جائزہ لینے اوران کا سدِ باب کرنے کی بجائے ہم سرے سے اس مہم کے جواز کے بارے میں ہی شک وشبہ کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے معرکہ حریت کی ناکامی کے بعد بھی ایسا ہوا تھا کہ جب انگریزوں کے خلاف مسلح مزاحمت کامیاب نہ ہوسکی تو مشروعیت اور جواز کی بحث شروع ہوگئی اور مرزا غلام احمد قادیانی جیسے لوگوں نے تو جہاد کی منسوخی کا ہی اعلان کر دیا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے وہی منظر ہے، وہی کردار ہیں اور وہی میدان ہے اب کے برطانوی استعمار کی جگہ امریکی استعمار نے لے لی ہے۔ جہادی تحریکات امریکی قوت کے سامنے بے بس ہوتی جارہی ہیں اور یار لوگوں نے اس بے بسی کے اسباب کی نشاندہی اور اس کے پس منظر میں متحرک کرداروں کو بے نقاب کرنے کی بجائے سرے سے جہاد کے جواز کو ہی موضوع بحث بنالیا ہے۔ ان دوستوں سے گزارش ہے کہ یہ بحث برطانوی استعمار کے تسلط کے دور میں بہت ہوچکی ہے اس پر دونوں طرف سے بہت سے دلائل دیے جاچکے ہیں اور زمانہ اس بحث کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ چکا ہے اس موقف کو کہ کسی مسلم آبادی پر کافروں کے تسلط سے نجات کے لیے جہاد کے اعلان کے لیے بھی حکومت کی اجازت ضروری ہے مسلم امہ کے کسی حصے نے قبول نہیں کیا اور اس کے بعد بھی درجنوں مسلم ممالک میں جہاد کے پرائیویٹ فتویٰ کی بنیاد پر آزادی کی جنگیں لڑی گئی ہیں جو کامیاب بھی ہوئی ہیں اور آج مسلم حکمران ''آزاد مسلم ممالک'' کے اصحاب اقتدار کہلاتے ہیں ان کا یہ اقتدار اور کروفر اسی ''پرائیویٹ جہاد'' میں جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے عظیم شہدا کے مقدس خون کا صدقہ ہے۔

ہمارے ان دوستوں کا ارشاد ہے کہ اگر کسی مسلم معاشرہ پر کافروں کا غلبہ ہوجائے اور مسلمان اپنے اقتدار سے محروم ہوجائیں تو انہیں مزاحمت اور جہاد کے لیے حکومت کا انتظار کرنا چاہیے جو کافروں کی تسلط کی وجہ سے پہلے ہی ختم ہوچکی ہے یا اس کی جگہ کوئی کٹھ پتلی حکومت قائم ہوچکی ہے۔ کافروں کے غلبہ اور تسلط کو جواز فراہم کرنے کی اس سے زیادہ آسان صورت اور کیا ہوسکتی ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔*

* روزنامہ اسلام، یکم مارچ ۲۰۰۴ء۔

پاکستانی خواتین کے حقوق اور صدر مشرف

نیویارک میں پاکستانی خواتین کے اجتماع سے صدر پرویز مشرف کا خطاب ان دنوں عام طور پر موضوع بحث ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کے لیے صدر پرویز مشرف کی نیویارک آمد کے موقع پر یہاں کے پاکستانی حلقوں نے ''خواتین کانفرنس'' کا اہتمام کیا جس میں صدر پاکستان کے بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ خواتین کے حقوق و مسائل کے حوالے سے صدر محترم پاکستان میں جو کوششیں کر رہے ہیں یا حکومت پاکستان جو اقدامات کر رہی ہے، ان سے عالمی سطح پر لوگوں کو متعارف کرایا جائے اور اس عنوان سے صدر پرویز مشرف کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کو اجاگر کیا جائے، لیکن بات الٹ ہوگئی اور بجائے لینے کے دینے پڑ گئے۔

ہوا یوں کہ صدر پرویز مشرف کی نیویارک آمد پر ''واشنگٹن پوسٹ'' کے نمائندے نے ان سے ملاقات کے دوران مختاراں مائی کے مسئلے پر ان سے سوال کیا اور یہ دریافت کرنا چاہا کہ مختاراں مائی کے امریکہ آنے میں حکومت پاکستان رکاوٹ کیوں بنی ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ کیا ہے، درست کیا ہے کیونکہ مختاراں مائی کچھ ایسی تنظیموں (این جی اوز) کے زیر اثر آ گئی تھی جو پاکستان کو بدنام کر رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ''واشنگٹن پوسٹ'' کے بقول انھوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ پاکستان میں یہ کام منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کر گیا ہے کہ جس کو ویزا لینا ہے تو وہ ریپ کرا کے لکھ پتی بن جائے گی اور اس کو کینیڈا کا ویزا اور شہریت بھی مل جائے گی۔

''واشنگٹن پوسٹ'' میں ان کا یہ بیان شائع ہونے پر خاصی لے دی ہوئی اور یہ کہا گیا کہ انھوں

نے یہ کہہ کر پاکستانی عورتوں کی توہین کی ہے، حتیٰ کہ سابق وزیرِاعظم محترمہ بےنظیر بھٹواور بہت سے دیگر لیڈروں نے مطالبہ کیا کہ صدر پرویز مشرف اس بیان پر معافی مانگیں۔ اس پر صدر پرویز نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا، البتہ یہ کہا کہ ان کے بیان کی صحیح طور پر رپورٹنگ نہیں ہوئی کیونکہ انھوں نے کہا تھا کہ کچھ لوگ ایسے کہتے ہیں۔ یہ بیان ان کی طرف سے شائع کر دیا گیا، مگر واشنگٹن پوسٹ نے اس وضاحت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ انھوں نے وہی کچھ شائع کیا ہے جو صدر پرویز مشرف نے کہا تھا اور اس سلسلے میں کوئی ''مس رپورٹنگ'' نہیں ہوئی۔

اس کے بعد جب صدر پرویز مشرف نے ''خواتین کانفرنس'' سے خطاب کیا اور اس میں عورتوں کے حقوق و مسائل کے بارے میں اپنے موقف اور حکومت پاکستان کے بہت سے اقدامات کا تذکرہ کیا تو ایک خاتون نے ان سے واشنگٹن پوسٹ کے اس بیان کے حوالے سے استفسار کیا جس پر وہ برہم ہو گئے اور سوال و جواب نے شدت اختیار کر لی۔ اس واقعہ کی رپورٹنگ نیویارک سے شائع ہونے والے اردو جریدہ ہفت روزہ ''پاکستان نیوز'' نے ۲۲ تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۵ کی اشاعت میں اس طرح کی ہے:

''روز ویلٹ ہوٹل کے کانفرنس روم میں ہونے والی اس تقریب میں پاکستان کے سربراہ مملکت اور ورجینیا سے تعلق رکھنے والی خاتون صابرہ قریشی کے درمیان گرما گرم تکرار اور مکالمہ بازی کی وجہ دو سوالات تھے۔ صابرہ قریشی صدر پرویز مشرف سے پوچھنا چاہتی تھیں کہ اگر وہ واشنگٹن پوسٹ میں چھپنے والے اپنے بیان کی تردید کرتے ہیں تو کیا وہ پوسٹ سے ان کا بیان واپس لینے کو کہیں گے؟ جس پر صدر مشرف اپنے ضبط پر قابو نہ رکھ سکے اور کہا کہ ''تمھارے لیڈر جھوٹے ہیں اور انھوں نے تمھیں جھوٹ بتایا ہے۔'' صدر کے الزام کے جواب میں صابرہ نے کہا کہ ''ہمارے لیڈر تو آپ ہی ہیں۔'' صابرہ مشرف نے دوسرا کچھ ان الفاظ میں کیا کہ ''ہم نے اور یہاں خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں نے آپ سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں کہ پاکستان میں خواتین کے حالات اور امتیازی قوانین بدلیں گے، لیکن آپ نے ہمیں سخت مایوس کیا۔'' اس سوال کے جواب میں صدر انتہائی غصے میں کہنے لگے کہ ''آپ نے بھی مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ آپ جیسے لوگ قومی مفاد کے خلاف ہیں۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ میں آپ سے لڑوں گا

اور اگر آپ چیخیں گی تو میں آپ سے زیادہ چیخ سکتا ہوں۔'' اس موقع پر امریکہ میں پاکستان کے سفیر جنرل جہانگیر کرامت اپنی نشست سے اٹھے، صدر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مائیک خود سنبھال لیا۔''

جہاں تک اس سوال و جواب کا تعلق ہے، ہمارے خیال میں یہ ایک باقاعدہ پلاننگ کا حصہ تھی، اس لیے کہ اس سے ایک روز قبل نیویارک کے کوئینز کے علاقے جیکسن ہائیٹ میں ہونے والا ایک اجلاس ہمارے علم میں ہے جس میں صدر پرویز مشرف کے مخالف سیاسی کارکن جمع تھے اور صدر کی نیویارک آمد کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ اس موقع پر ایک اہم سیاسی لیڈر نے غیر رسمی گفتگو میں بعض حاضرین کو بتایا کہ ہم نے اپنے آدمی تیار کر دیے ہیں جو کسی نہ کسی طرح صدر پرویز مشرف کے اجتماعات میں شریک ہو جائیں گے اور ایسے سوالات کریں گے کہ جنرل پرویز مشرف کے لیے اپنی گفتگو کو جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بات سن کر ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا، لیکن ہماری وہاں حاضری محض اتفاقی تھی اور اس سلسلے کے کسی منصوبے میں شمولیت ہمارا مقصد نہیں تھا، اس لیے خاموشی اختیار کر لی۔

جہاں تک ''واشنگٹن پوسٹ'' سے جنرل پرویز مشرف کی گفتگو کا تعلق ہے، اس کے اس پہلو سے کسی طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان میں یہ کام اب منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اور عورتیں ویزا حاصل کرنے اور مال کمانے کے لیے یہ کام جان بوجھ کر کرواتی ہیں۔ صدر پرویز مشرف کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ بات بعض لوگوں کے تاثرات بیان کرتے ہوئے نقل کی تھی لیکن یہ بات اتنی لغو ہے کہ انھیں کسی کی طرف سے یہ بات نقل بھی نہیں کرنی چاہیے تھے، اس لیے کہ یہ بات درست نہیں ہے اور کسی پاکستانی عورت کے بارے میں یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ وہ ایسے کسی مقصد کے لیے اپنی عزت جان بوجھ کر لٹوائے گی اور جبری زنا کا ڈرامہ رچائے گی، البتہ صدر کا یہ کہنا بہرحال درست ہے کہ بعض این جی اوز اس قسم کے واقعات کو مفادات حاصل کرنے اور پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے تک مغربی ممالک بالخصوص جرمنی اور کینیڈا میں ویزے کے حصول اور سیاسی پناہ

کے لیے سب سے زیادہ کامیاب حربہ یہ تھا کہ خود کو قادیانی ظاہر کر کے اور مذہبی امتیاز کے حوالے سے ان ملکوں کی حکومتوں کی ہمدردی حاصل کر کے بہت سے لوگ سیاسی پناہ یا ویزا حاصل کر لیتے تھے یا توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والوں کو پاکستان میں اس کی سخت ترین سزا سے بچنے کے لیے مغربی ممالک میں سیاسی پناہ یا ویزا مل جایا کرتا تھا۔ مصر کے ڈاکٹر نصر ابوزید، بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین اور گوجرانوالہ پاکستان کے سلامت مسیح سمیت بہت سے لوگوں کو اس بنیاد پر مغرب کے بعض ممالک میں سیاسی پناہ ملی، بلکہ ۱۹۸۸ء میں ہم نے خود نیویارک میں گوجرانوالہ کے ایک نوجوان سے ملاقات کی جو قادیانی نہیں تھا لیکن قادیانی بن کر اس نے سیاسی پناہ حاصل کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں سالہا سال مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں آپ کے پیچھے نمازیں پڑھتا رہا ہوں اور اب بھی قادیانی نہیں ہوں، لیکن یہاں میں نے اس نام سے سیاسی پناہ حاصل کر رکھی ہے، مجبوری کے درجے میں قادیانی اجتماعات میں جاتا ہوں اور ان کا لٹریچر بھی مسلمانوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

ایک عرصہ تک پاکستان میں مذہب کے حوالے سے امتیازی قوانین کا حوالہ دے کر ہمارے بہت سے فنکار مغربی حکومتوں کو دھوکہ دیتے رہے۔ اب کچھ عرصہ سے طریق کار میں تبدیلی آ گئی ہے اور این جی اوز کو مغربی حکومتوں اور اداروں کو جھانسا دینے کے لیے سب سے زیادہ کارآمد ہتھیار جبر کا شکار ہونے والی عورت کی صورت میں مل گیا ہے جسے وہ بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کر رہی ہیں۔ قارئین کو لاہور کا ''صائمہ کیس'' یاد ہوگا کہ ایک لڑکی نے ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کر لی تھی جس پر ماں باپ نے عدالت سے رجوع کیا تھا۔ معاملہ ہائی کورٹ تک پہنچا تھا، این جی اوز کی دنیا کی ملکہ عاصمہ جہانگیر کی کوششوں سے اس کیس نے عالمی شہرت حاصل کر لی تھی، پھر اس کیس کو جس تیزی کے ساتھ نمٹایا گیا، مغربی حکومتوں اور لابیوں نے اس میں جس طرح دلچسپی لی اور جس انداز سے اس جوڑے کو ایک مغربی ملک میں سیاسی پناہ فراہم کی گئی، وہ اس مہم کی شروعات تھی اور اب مختاراں مائی اور ڈاکٹر شازیہ کے معاملات نے اسے عروج تک پہنچا دیا ہے۔

مختاراں مائی اور ڈاکٹر شازیہ کے ساتھ یقیناً ظلم ہوا ہے اور زیادتی ہوئی ہے جس پر قوم کے ہر فرد کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے، لیکن ان کے کیس کو این جی اوز نے جس طرح اپنے مقاصد کے

لیے استعمال کیا ہے اور اب بھی مسلسل کر رہی ہیں، وہ ایک الگ الم ناک باب ہے۔ ایک معصوم اور پاک امن عورت کے ساتھ جبر بہت بڑا ظلم ہے، لیکن اس کی ایسی مظلومیت اور عصمت دری کو پوری دنیا میں مشتہر کر کے اس کی بدنامی کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جانا اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔

پاکستان میں عورت کو جبر سے بچانا، خواہ وہ جبر ریپ کی شکل میں ہو یا اس کی مرضی کے خلاف جبری شادی کی صورت میں ہو، ہماری انسانی اور دینی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے حکومت کو ضروری اقدامات کرنے چاہییں، لیکن کسی عورت کی مظلومیت اور عصمت دری کو ملک کی بدنامی اور مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرنا اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔ صدر پرویز دونوں معاملات کو سامنے رکھ کر اسلامی تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے پیش رفت کریں۔ انھیں اس معاملے میں قوم کے ہر باشعور فرد کی حمایت حاصل ہوگی۔

O

نواب محمد اکبر بگٹی کا قتل

نواب محمد اکبر بگٹی کے افسوس ناک قتل نے جہاں ماضی کی بہت سی تلخ یادوں کو ایک بار پھر بے نقاب کر دیا ہے، وہاں مستقبل کے حوالے سے بھی انجانے خدشات وخطرات کی دھند ذہنوں پر مسلط کر دی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جو کچھ ہوا، درست نہیں ہوا اور اس کے نتائج ملک و قوم کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں، اس پر حکومتی پارٹی اور اپوزیشن میں اختلاف نہیں ہے اور متحدہ مجلس عمل اور اے آر ڈی کے ساتھ ساتھ چودھری شجاعت حسین اور میر ظفر اللہ خان جمالی بھی اس پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں، لیکن اس کے اسباب ومحرکات اور اس قتل کی ذمہ داری کے حوالے سے مختلف باتیں کہی جا رہی ہیں اور بحث ومباحثہ کا ایک نیا بازار گرم ہو گیا ہے۔

نواب محمد اکبر خان بگٹی کا نام پہلی بار میں نے اس وقت سنا جب ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے زمام اقتدار سنبھالی اور سرحد و بلوچستان میں جمعیۃ علماے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی نے مخلوط حکومتیں بنائیں۔ سرحد میں مولانا مفتی محمود اور بلوچستان میں سردار عطاء اللہ خان مینگل ان مخلوط حکومتوں کے سربراہ تھے، لیکن یہ مخلوط حکومتیں ابھی دس ماہ بھی کام نہ کر پائی تھیں کہ بلوچستان میں سردار عطاء اللہ خان مینگل کی وزارت کو وفاق کی طرف سے برطرف کر دیا گیا جس پر احتجاج کرتے ہوئے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمودؒ نے بھی استعفا دے دیا۔ اس موقع پر اسلام آباد میں عراقی سفارت خانہ سے اسلحہ کی برآمدگی کا مسئلہ سامنے آیا جس کا تعلق خان عبد الولی خان اور سردار عطاء اللہ خان مینگل

کی نیشنل عوامی پارٹی سے جوڑا گیا اور پھر نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون قرار دے کر اس کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان میں ریفرنس دائر کر دیا گیا جو حیدر آباد ٹربیونل کے سامنے کئی برس تک زیر سماعت رہا۔

نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم اس موقع پر بلوچستان کی ایک قد آور شخصیت کے طور پر بھٹو حکومت کے اقدامات کے حامی کے طور پر سامنے آئے اور انھوں نے موچی دروازہ لاہور میں جلسہ عام سے خطاب بھی کیا۔ اس مرحلے میں بلوچستان میں مری اور مینگل قبائل کے علاقوں میں فوجی ایکشن ہوا۔ ان قبائل کے لوگ حسب روایت پہاڑوں پر چڑھ کر مورچہ زن ہو گئے اور پاک فوج اور قبائل کے درمیان مسلح کشمکش کے ایک دور کا آغاز ہو گیا۔

اس کشمکش میں نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھی تھے اور ان کی طرف سے کچھ عرصہ بلوچستان کے گورنر بھی رہے۔ اسی دور میں اپوزیشن کی جماعتوں نے مل کر متحدہ جمہوری محاذ قائم کیا جس نے حکومت کے خلاف ملک گیر سیاسی مہم کا سلسلہ شروع کیا اور پنجاب کے گورنر جناب غلام مصطفیٰ کھر کی نافذ کردہ دفعہ ۱۴۴ کو ہدف بنا کر لاہور اور ملتان سے سول نافرمانی شروع کر دی۔ اس تحریک میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتاریاں پیش کرنے والوں میں ملک محمد قاسم، سید محمود قسود گردیزی، جناب حمزہ، قاری نورالحق قریشی اور متعدد سرکردہ سیاسی راہ نما شامل تھے۔ سیاسی کارکنوں پر لاہور اور ملتان، دونوں جگہ سخت تشدد کیا گیا، ملک محمد قاسم مرحوم زخمی ہوئے، میاں طفیل محمد جیسی محترم شخصیت تذلیل کا نشانہ بنی اور شیرانوالہ لاہور کے مولوی شیر محمد پر کسبی عورتیں مسلط کی گئیں۔ چودھری ظہور الٰہی مرحوم گرفتار ہوئے اور انھیں بلوچستان میں مچھ کے جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔

ان دنوں کی بات ہے، میں نے حضرت مولانا مفتی محمود سے دریافت کیا کہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ تو ہمارے ہاں معمولات میں شامل ہے اور یہ اکثر ہمارے اضلاع میں نافذ ہوتی رہتی ہے، اس پر اس قدر سخت ایکشن لینے کی کیا ضرورت ہے؟ مفتی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ ہم دراصل دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی بلوچستان کے عوام کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لیے کر رہے ہیں اور فوج کشی کا

نشانہ بننے والے بلوچوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومتی کارروائیوں اور ریاستی تشدد کا ان کی طرح ہم بھی نشانہ ہیں اور اس طرح ہماری کوشش ہے کہ پنجاب کے عوام اور سیاسی کارکن اس انداز میں قربانیاں دیں کہ بلوچ قبائل پر فوج کشی کے اس عمل کو پنجاب کے خلاف استعمال نہ کیا جا سکے۔ چودھری ظہور الٰہی مرحوم جب مچھ جیل سے رہا ہوئے تو انھوں نے بھی ہمارے ہاں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم بلوچ عوام کے ساتھ ہیں اور ان کے ساتھ ہم آہنگی کے اظہار کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ میں خود اس جلسہ کے منتظمین میں سے تھا اور چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے اس جلسے سے خطاب کرتے ہوئے بلوچ عوام کی مظلومیت کا جو نقشہ کھینچا اور مچھ جیل میں زیر حراست بلوچوں کی بے بسی کے جو مناظر پیش کیے، اس نے جلسہ میں شریک ہر آنکھ کو نم کر دیا تھا۔

بلوچستان میں جمعیۃ علماے اسلام کے صوبائی امیر اور بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر مولوی سید شمس الدین شہید کی الم ناک شہادت کا واقعہ بھی اسی دور کا ہے۔ مولوی سید شمس الدین شہید کا تعلق ژوب سے تھا، میرے کلاس فیلو تھے اور دورۂ حدیث انھوں نے میرے ساتھ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں کیا تھا۔ فراغت کے بعد وطن واپس پہنچے تو الیکشن کا طبل بج چکا تھا۔ وہ نوجوان تھے اور الیکشن لڑنے کی شرط ۲۵ سال کی عمر کی حد بھی بمشکل پوری کر پائے تھے۔ اپنے علاقے کے نواب کے مقابلے میں صرف اس نیت سے کھڑے ہو گئے کہ وہ بلا مقابلہ منتخب نہ ہو جائے۔ بائیسکلوں پر انتخابی مہم چلائی اور الیکشن جیت گئے۔ انھیں قادیانیوں کے خلاف ژوب میں ایک تحریک کے حوالے سے گرفتار کر لیا گیا اور غائب کر دیا گیا۔ کئی ماہ تک ان کی بازیابی اور تلاش کا سلسلہ جاری رہا، حتیٰ کہ مفتی محمود صاحب کو قومی اسمبلی میں یہ کہنا پڑا کہ اگر انھیں مار دیا گیا ہے تو ان کی لاش تو ورثا کے حوالے کر دی جائے۔ وہ رہا ہوئے مگر چند دنوں کے بعد انھیں شہید کر دیا گیا۔

یہ اس دور کی یادیں ہیں جب ہمارا یعنی جمعیۃ علماے اسلام کے کارکنوں کا نواب محمد اکبر بگٹی مرحوم سے پہلا تعارف ہوا اور ان سے واسطہ پڑا۔ پھر اس کے بعد وہ دور بھی آیا جب جمعیۃ علماے اسلام نے نواب اکبر خان بگٹی مرحوم کے ساتھ مل کر بلوچستان کی حکومت بنائی۔ جنرل محمد ضیاء الحق

مرحوم کے بعد ایک الیکشن میں بلوچستان اسمبلی میں نواب محمد اکبر خان بگٹی کی سربراہی میں کولیشن قائم ہوئی اور ان کی قیادت میں صوبائی حکومت بنائی گئی جس میں جمعیۃ علماے اسلام بھی شامل تھی۔ نواب بگٹی کا تعارف ایک سیکولر سیاست دان اور قوم پرست راہ نما کا تھا۔ وہ سیاست میں مذہب کی چھاپ کو پسند نہیں کرتے تھے اور خالصتاً قوم پرستانہ سیاست کے قائل تھے جبکہ ان کا مذکورہ بالا سیاسی پس منظر بھی ذہن میں تھا، اس لیے مجھے اس کولیشن پر تعجب ہوا۔ اس وقت جمعیۃ علماے اسلام، فضل الرحمٰن گروپ اور درخواستی گروپ میں منقسم تھی۔ میں درخواستی گروپ کے ذمہ دار حضرات میں شامل تھا اور فضل الرحمٰن گروپ کے ساتھ ہماری مخاصمت کھلے بندوں قائم تھی۔ اس کے باوجود میں نے ایک موقع پر مولانا فضل الرحمٰن سے خود ملاقات کر کے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھا کہ نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم کے ساتھ بلکہ ان کی قیادت میں جمعیۃ علماے اسلام کی کولیشن وزارت کے اسباب کیا ہیں؟ مولانا فضل الرحمٰن نے اس کا جو جواب دیا، وہ اس موضوع گفتگو سے تعلق نہیں رکھتا، اس لیے اس کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، البتہ یہ بات بتانا چاہ رہا ہوں کہ جمعیۃ علماے اسلام اور بگٹی مرحوم کی یہ کولیشن وزارت کئی برس تک چلتی رہی۔

نواب بگٹی مرحوم ایک جہاں دیدہ اور صاحب مطالعہ سیاست دان تھے، معاملات کو سمجھتے تھے اور موقع محل کے مطابق مشکل ترین حالات میں بھی راستہ نکالنے کے فن سے واقف تھے، لیکن ان کی سیاسی فکر اور سوچ بلوچ قومیت تک محدود رہی جس کی وجہ سے وہ قومی سیاست میں اپنی صحیح جگہ نہ پا سکے، ورنہ ان کے بارے میں میرا تاثر یہ تھا کہ اگر وہ بلوچ قوم پرستی کے دائرے سے نکل کر سیاست کے قومی دھارے میں وسیع ذہن کے ساتھ آئیں تو قومی سطح کے سیاست دانوں کی صف اول میں نمایاں جگہ پا سکتے ہیں بلکہ مختلف علاقائی قوم پرستانہ تحریکوں کے سنگم کے طور پر ان تحریکوں کو وفاقی لیڈرشپ بھی فراہم کر سکتے ہیں۔

نواب محمد اکبر خان بگٹی کی سوچ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں ہمیشہ اختلاف رہا ہے، لیکن ان کے قتل اور بلوچ قبائل کے خلاف اس طرح کے فوجی ایکشن کی کسی طرح حمایت نہیں کی جا سکتی۔ یہ جو کچھ ہوا ہے، اسے صریحاً ظلم اور عاقبت نااندیشی ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور اپوزیشن نے

اس کے خلاف یکم ستمبر کو ہڑتال کی جو کال دی ہے، وہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔ بھٹو حکومت کے دور میں بلوچستان پر ہونے والے فوجی ایکشن کے خلاف پنجاب سمیت ملک بھر کے سیاسی کارکنوں نے جس شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا، اسے پھر زندہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں مولانا مفتی محمود اور چودھری ظہور الٰہی مرحوم کے بیٹوں کو نمایاں کردار ادا کرنا چاہیے کہ ان دو عظیم راہ نماؤں کا سیاسی ورثہ یہی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ آج اس احتجاج میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی پارٹی بھی شریک ہے اور بلوچ عوام کے جائز حقوق کی حمایت کر رہی ہے۔ بلوچستان آج پھر فوج کشی کی زد میں ہے، بلوچ عوام کو ایک بار پھر کارزر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور بلوچستان ایک بار پھر پنجاب کی طرف دیکھ رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ پنجاب کے زندہ دل عوام ماضی کی طرح آج بھی اس امتحان میں سرخروئی حاصل کریں گے۔*

O

* روزنامہ پاکستان لاہور۔

پرویز حکومت اور دینی مدارس

دینی مدارس اور جدید سائنسی علوم

گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول نے رمضان المبارک کے دوران میں لاہور کے تین دینی مراکز کا دورہ کیا اور علما وطلبہ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن، جامعہ نظامیہ لوہاری گیٹ اور جامعہ عثمانیہ ماڈل ٹاؤن تشریف لے گئے، اساتذہ وطلبہ اور مسجد کے نمازیوں سے ملاقات کی اور ان سے مختلف امور پر بات چیت کی۔ اس سے قبل وفاقی وزیر داخلہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر نے کراچی میں دارالعلوم کورنگی کا دورہ کیا اور اساتذہ وطلبہ سے بعض امور پر گفتگو کی۔

ہمارا خیال ہے کہ دینی مدارس کے حوالے سے اس وقت عالمی حلقوں کی طرف سے جو دباؤ بڑھ رہا ہے، اس کے پیش نظر حکومت کے ذمہ دار حضرات ملک کے بڑے دینی مدارس کا دورہ کر رہے ہیں جس کا مقصد اس دباؤ کے سلسلے میں اہم دینی مدارس کے منتظمین کو اعتماد میں لینا معلوم ہوتا ہے جو بہرحال ایک خوش آئند بات ہے اور دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کو اس معاملہ میں سنجیدہ غور وخوض کی کوئی صورت ضرور نکالنی چاہیے تاکہ دینی مدارس کے تعلیمی کردار، خودمختاری اور آزادانہ نظام کی ضرورت واہمیت کا ارباب اختیار کو احساس دلاتے ہوئے اس کے تحفظ کا بھی کوئی باوقار راستہ نکل آئے۔

دینی مدارس کے تعلیمی کردار اور معاشرہ پر اس کے اثرات کے بارے میں عالمی حلقوں کو ایک عرصہ سے تشویش ہے اور وہ مسلم امہ میں مغربی تہذیب وثقافت اور فلسفہ ونظام کے اثر ونفوذ میں جو

فکری ونظریاتی رکاوٹیں محسوس کر رہے ہیں، ان کے خیال میں ان رکاوٹوں کا سرچشمہ یہ آزاد دینی مدارس ہیں، اس لیے عالمی حلقوں کی مدت سے یہ کوشش ہے کہ دینی مدارس کے اس آزادانہ اور خود مختار وخودکار نظام کو یا تو سرے سے ختم کر دیا جائے اور یا پھر اسے قومی تعلیمی نظام کے اجتماعی دھارے میں اس طرح ضم کر دیا جائے کہ وہ حکومتی پالیسیوں کے دائرہ سے ہٹ کر معاشرے میں کوئی امتیازی اور انفرادی کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس مقصد کے لیے اس سے قبل بھی مختلف حکومتوں کے دور میں دینی مدارس میں سرکاری مداخلت کے راستے نکالنے کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں جنہیں دینی مدارس نے اجتماعی طور پر مسترد کر دیا تھا اور اب ۱۱ رستمبر کے واقعات اور افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد اس کام کو پہلے کی نسبت آسان تصور کرتے ہوئے حکومتی حلقے پھر اس قسم کا کوئی راستہ تلاش کر رہے ہیں کہ دینی مدارس کے آزادانہ کردار کو محدود کرنے، اس نظام میں ریاستی مداخلت کی راہ ہموار کرنے اور ان کے امتیازی تعلیمی تشخص کو ختم کر کے انہیں سرکاری پالیسی کے تابع قومی تعلیمی نظام کے اجتماعی دھارے میں ضم کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں مگر دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ اور جماعت اسلامی کے مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے دینی مدارس کے پانچوں وفاقوں، وفاق المدارس العربیہ، تنظیم المدارس، وفاق المدارس السّلفیہ، وفاق المدارس الشیعہ اور رابطۃ المدارس الاسلامیہ نے گزشتہ دنوں ایک مشترکہ اجلاس میں ہر قیمت پر دینی مدارس کے آزادانہ تعلیمی کردار اور مالیاتی وانتظامی خودمختاری کے تحفظ کا عزم کرتے ہوئے ۶ رجنوری کو جامعہ نعیمیہ لاہور، ۲۰ رجنوری کو بنوری ٹاؤن کراچی، ۳ رفروری کو درویش مسجد پشاور اور ۱۰ رفروری کو اسلام آباد میں ''اجتماعی کنونشن'' منعقد کرنے کا اعلان کر دیا ہے جس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ دینی مدارس حسب سابق اپنی آزادی اور خودمختاری کے تحفظ کے لیے متحد ہیں اور حکومتی اقدامات کی مزاحمت کے لیے مکمل طور پر تیار ہیں۔

اس فضا میں جنرل (ر) معین الدین حیدر اور جنرل (ر) خالد مقبول کے دینی مدارس کے یہ دورے اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ اعلیٰ سرکاری حلقے افغانستان کی صورت حال اور طالبان حکومت کے خاتمے کے دینی مدارس پر پڑنے والے اثرات کا براہ راست جائزہ لینا چاہتے ہیں تا کہ

وہ اس کی روشنی میں اپنے اقدامات کی ترجیحات طے کر سکیں اور اس کے ساتھ ہی شاید ان کی یہ خواہش بھی ہو کہ کچھ اہم تعلیمی مراکز کو دینی مدارس کی اجتماعی مزاحمتی جدوجہد سے الگ رکھنا اگر ممکن ہو تو اس کے لیے ابھی سے پیش رفت کر لی جائے، مگر ان سب امور سے قطع نظر ہم گورنر پنجاب جنرل (ر) خالد مقبول کے ان ارشادات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نظامیہ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ''دنیائے اسلام کو اس وقت بہت بڑا چیلنج درپیش ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ، اقتصادی وسائل اور ٹیکنالوجی پر دسترس رکھنے والی قوتوں نے اسلام اور پاکستان کا غلط اور غیر حقیقی رخ پیش کر کے ہمارے مذہب و ملک کو ٹارگٹ بنا لیا ہے۔ ذرائع ابلاغ و جدید ٹیکنالوجی پر حاوی ہونے کے سبب یہ ممالک اپنے مفادات کا بھرپور تحفظ کر رہے ہیں کیونکہ وہ جو بات کہتے ہیں، دنیا اس کو تسلیم کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے جذبات اور نیتوں میں کوئی خرابی نہیں لیکن ہم دور جدید کے وسائل و ذرائع سے محروم ہونے کے سبب اپنے مفادات کا موثر تحفظ کرنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں مغربیت اور جدید ٹیکنالوجی کے حصول میں فرق کرنا ہوگا کیونکہ ایک اچھا ہتھیار مومن یا غیر مومن دشمن میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مخالفین کو جدید سائنسی علوم و تحقیقات میں کمال حاصل ہے جبکہ ہم کوڑا کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھی اغیار کی فنی مہارت و امداد کے محتاج ہیں۔ غیر ممالک سے خوراک و ادویات اور دیگر ساز و سامان حاصل کرنے کی صورت میں ہم برائے نام آزاد و خودمختار رہ جاتے ہیں۔''

ہمیں جنرل خالد مقبول کے ان ارشادات سے سو فیصد اتفاق ہے اور ہم ان کی دونوں باتوں کی تائید کرتے ہیں۔ اس بات کی بھی کہ اس وقت دنیا کے سامنے اسلام اور پاکستان کی صحیح تصویر پیش نہیں کی جا رہی ہے اور مغربی میڈیا جان بوجھ کر اسلام اور پاکستان کی تصویر بگاڑ رہا ہے جب کہ اسلام کی بات کہنے والے حلقے اور مراکز ابلاغ کے جدید ذرائع اور سائنٹفک اسلوب سے بہرہ ور نہ ہونے کی وجہ سے دنیا کو اسلام کی تعلیمات اور اس کے حقیقی کردار سے آگاہ نہیں کر پا رہے اور ان کی اس بات سے بھی ہم پوری طرح متفق ہیں کہ عالم اسلام کی بے بسی اور مغربی قوتوں کی بالادستی کی

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مغرب کو سائنسی علوم وتحقیقات اور جدید ترین ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل ہے جب کہ عالم اسلام اس سے محروم ہے اور اس کی وجہ سے نہ صرف مسلم ممالک کی آزادی اور خود مختاری برائے نام رہ گئی ہے بلکہ خود عالم اسلام کے اپنے بے پناہ وسائل اور دولت بھی مسلمانوں کے بجائے ان پر گھیرا تنگ کرنے والوں کے کام آ رہی ہے۔

البتہ گورنر پنجاب نے یہ باتیں جہاں کھڑے ہو کر فرمائی ہیں، اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کیونکہ یہ باتیں کہنے کی صحیح جگہ جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نظامیہ نہیں ہے اور نہ ہی دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ ان باتوں کے صحیح مخاطب ہیں۔ گورنر صاحب اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ جنوبی ایشیا پر برطانوی استعمار کے تسلط اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلم معاشرہ میں ایک فطری تقسیم کار وجود میں آ گئی تھی جس کے تحت دو الگ الگ تعلیمی نظام وجود میں آئے تھے۔ ایک نظام دینی مدارس کا تھا جس نے اپنے ذمے صرف یہ کام لیا تھا کہ وہ دینی علوم وروایات کا تحفظ کریں گے اور اسلامی تہذیب وثقافت کے نشانات کو باقی رکھتے ہوئے اسے حملہ آور تہذیب میں ضم ہونے سے بچائیں گے، جب کہ دوسرے تعلیمی نظام نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ مسلمانوں کو جدید علوم، سائنس، ٹیکنالوجی اور تحقیقات سے بہرہ ور کیا جائے گا اور انہیں معاصر اقوام کی ترقی سے ہم آہنگ کرنے کی جدوجہد کی جائے گی۔

جہاں تک دینی مدارس کی ذمہ داری، جدوجہد اور اس کے نتائج کا تعلق ہے، آج وہ اس معاملہ میں پوری طرح سرخرو ہیں کہ انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی صرف حفاظت نہیں کی بلکہ کسی قسم کی سرکاری امداد کے بغیر معاشرہ کے لاکھوں افراد کو ہر دور میں اسلامی علوم سے بہرہ ور کیا اور اسلامی تہذیب وثقافت کے صرف نشانات کو باقی نہیں رکھا بلکہ طالبان حکومت کی صورت میں اس کا عملی نمونہ بھی اس انداز سے دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ دیکھنے والے پکار اٹھے کہ یہ تو وہی دوسوسالہ پرانا نمونہ ہے اور انہوں نے تو گزشتہ دو صدیوں میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھی سرے سے کوئی اثر قبول نہیں کیا، اس لیے دینی مدارس سے کسی درجہ میں یہ شکایت تو ہو سکتی ہے (اگر اس شکایت کو درست تسلیم کر لیا جائے) کہ جو امانت ان کے سپرد کی گئی تھی، انہوں نے اتنی سختی اور شدت سے اس کی

حفاظت کی اور اسے آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا ہے کہ اسے زمانے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی، مگر جدید ٹیکنالوجی، سائنسی تحقیقات اور علوم میں قوم کے پیچھے رہ جانے پر دینی مدارس کو ذمہ دار قرار دینا اور ان کے اساتذہ وطلبہ کے درمیان کھڑے ہو کر سائنس وٹیکنالوجی اور ابلاغ کے جدید ترین ذرائع سے محرومی کا رونا رونا نہ صرف سراسر ناانصافی ہے بلکہ انتہائی بے ذوقی کی بات بھی ہے۔

آج اگر ہم جدید سائنسی علوم، ٹیکنالوجی اور تحقیقات کی صلاحیت ومواقع سے محروم ہیں تو اس کی ذمہ داری دینی مدارس پر نہیں بلکہ اس تعلیمی نظام پر ہے جس نے ڈیڑھ سو برس قبل اس کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اس نے جنرل خالد مقبول کے بقول مغربیت کو قبول کرنے میں تو کسی حجاب سے کام نہ لیا لیکن جدید ٹیکنالوجی کی طرف اس کے قدم نہ بڑھ سکے اور اس تعلیمی نظام کی نااہلی نے ہماری آزادی اور خودمختاری کو بے بسی کی دلدل سے دوچار کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمیں جنرل خالد مقبول کی باتوں سے اتفاق ہے اور ہم ان میں پوری طرح ان کے ساتھ ہیں لیکن اتنی گزارش کے ساتھ کہ یہ باتیں کہنے کی جگہ جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نظامیہ نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی اور وفاقی وزارت تعلیم کا پالیسی ونگ ہے۔ کیا جنرل (ر) معین الدین حیدر اور جنرل (ر) خالد مقبول اس بات کو پسند کریں گے کہ جدید سائنسی علوم وتحقیقات اور جدید ٹیکنالوجی میں قوم کے پیچھے رہ جانے کے اسباب وعوامل کی نشاندہی کے لیے ایک قومی کمیشن قائم کیا جائے جو اسباب وعوامل کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اس کے ذمہ داروں کا تعین کرے اور اس ناکامی کی تلافی کے لیے طریقہ کار اور اقدامات بھی تجویز کرے؟ ہم آپ کے ساتھ ہیں مگر قدم تو صحیح سمت اٹھائیے!*

O

* روزنامہ اوصاف، ۲۸/دسمبر ۲۰۰۱ء۔

دینی مدارس کا نظام اور جنرل مشرف کے خیالات

صدر جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ روز اسلام آباد میں علمائے کرام کے دو گروپوں سے ملاقات کے دوران میں اس امر کی یقین دہانی کرائی ہے کہ حکومت دینی مدارس میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور نہ ہی انہیں بند کیا جا رہا ہے، البتہ ہم دینی مدارس کو جدید ترین نظام تعلیم کے دھارے میں شامل کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے موجودہ نصاب میں تبدیلی کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ یہ غلط فہمی ہے کہ حکومت دینی مدارس کے خلاف ایکشن لے رہی ہے۔ ایسی کوئی تجویز زیر غور نہیں بلکہ حکومت کی کوشش اور خواہش ہے کہ لاکھوں طلبہ جو دینی مدارس میں زیر تعلیم ہیں، ان کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے علوم سے بھی روشناس کرایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ملک سے فرقہ واریت ختم کرنے کے لیے مرکزی، صوبائی اور ضلعی سطح پر علما کے بورڈ تشکیل دیے جائیں گے جن میں تمام مکاتب فکر کے نمائندوں کو شریک کیا جائے گا۔

صدر جنرل پرویز مشرف کی یہ یقین دہانی ملک کی اس عمومی فضا میں ایک اچھی خبر ہے کہ ایک طرف ملک بھر میں پولیس تھانوں کے ذریعے سے مساجد و مدارس کے کوائف جمع کرنے کے لیے فارم تقسیم کیے جا رہے ہیں اور بعض مقامات پر انہیں فوری طور پر کر کے واپس کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے اور دوسری طرف دینی مدارس کے خلاف وفاقی وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر کے تند و تیز بیانات کا سلسلہ بھی جاری ہے اور وہ دینی جماعتوں اور دینی مدارس کے خلاف بات کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہے۔

گزشتہ دنوں گوجرانوالہ کے بعض علاقوں میں پولیس تھانوں کے ذریعہ ایک پروفارما تقسیم کیا گیا جس میں مسجد کا سن تعمیر، ذرائع آمدنی، انتظامیہ، اخراجات، اس سے ملحقہ دینی مدرسہ کے کمروں کی تعداد، عملہ، مسلک اور دیگر امور کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے۔ بعض مساجد کے منتظمین نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ دینی مدارس کے تمام بڑے وفاقوں کا ۶ رجنوری ۲۰۰۲ء کو جامعہ نعیمیہ لاہور میں مشترکہ کنونشن ہو رہا ہے، اس کے فیصلوں کا انتظار کر لیا جائے اور پولیس اہل کاروں سے کہا جائے کہ وہ ۶ رجنوری کے کنونشن کے فیصلوں کی روشنی میں پروفارما پر کریں گے مگر ان دوستوں نے جب پولیس اہل کاروں سے یہ بات کہی تو انہیں کہا گیا کہ ہمیں فوری طور پر اس کا جواب چاہیے، اس لیے ۲۴ گھنٹے کے اندر جوابات تھانے پہنچائے جائیں۔

۲۷ ردسمبر کو لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی یہی صورت حال ہے بلکہ ایک پولیس اہل کار کو اتنی جلدی تھی کہ اس نے مسجد و مدرسہ کے کسی ذمہ دار شخص تک پہنچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ مسجد میں جو صاحب موجود ملے، انہی سے دو چار سوال کیے اور خود ہی پروفارما پر کر کے واپس چلتا بنا۔ جامعہ حنفیہ قادریہ چوک یادگار شہیداں لاہور کے استاذ مولانا حافظ ذکاء الرحمٰن اختر نے بتایا کہ ایک پولیس اہل کار کسی مدرسہ میں گیا اور وہاں موجود ایک صاحب سے مدرسہ و مسجد کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو ان صاحب نے کہا کہ باہر مین گیٹ پر جو بورڈ نصب ہے، اس میں بہت کچھ لکھا ہے تو اس پولیس اہل کار نے بورڈ ہی سے معلومات پروفارما پر نقل کرنا شروع کر دیں۔ وزیر داخلہ کے مسلسل بیانات اور اس کے بعد پولیس تھانوں کی اس کارگزاری کے پس منظر میں اگر پاکستان کے دینی مدارس کے بارے میں بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں اور امریکہ بہادر کے مطالبات کو سامنے رکھا جائے اور اس پس منظر پر بھی ایک بار پھر نظر ڈال لی جائے جو ہماری قومی پالیسیوں میں امریکی مداخلت اور امریکی تقاضوں اور مطالبات کے سامنے ہمارے لیڈروں کے مسلسل سرنڈر کرتے چلے جانے سے ہر شخص کو واضح طور پر دکھائی دینے لگا ہے تو دینی مدارس کی اس تشویش کو محض ''غلط فہمی'' قرار دینے کی کوئی وجہ سامنے نہیں آتی کہ حکومت دینی مدارس کے نظام پر سرکاری کنٹرول کی کوئی صورت پیدا کرنا چاہتی ہے اور ان کے معاملات میں مداخلت کے

راستے تلاش کر رہی ہے۔

پھر صدر پرویز مشرف نے علمائے کرام کے دو گروپوں سے بات چیت کرتے ہوئے دینی مدارس میں مداخلت کے پروگرام کی نفی کرتے ہوئے دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی اور انہیں اجتماعی دھارے میں لانے کی جس حکومتی خواہش اور کوشش کا ذکر کیا ہے، وہ بجائے خود دینی مدارس کے نظام میں مداخلت کے ارادے کی غمازی کرتی ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں دینی مدارس کے موجودہ نظام اور ان کے معاشرتی کردار کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم ان سطور میں متعدد بار یہ عرض کر چکے ہیں کہ جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرہ میں عام مسلمان کا دین سے اعتقادی وعملی تعلق قائم رکھنے، قرآن وسنت اور دیگر دینی علوم کی تعلیم وتدریس کے تسلسل کو باقی رکھنے اور مساجد ومکاتب کو آباد رکھنے میں دینی مدارس کے جس کردار کو بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے اور اسی کو مغربی قوتیں اور ادارے اپنی تہذیب وثقافت اور فکر ونظریہ کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں، اس کردار کی بنیادی وجہ دینی مدارس کا آزادانہ نظام اور ان کا تشخص وامتیاز ہے۔ اگر یہ مدارس اس امتیازی کردار، تعلیمی تشخص اور انتظامی و مالیاتی خودمختاری سے بہرہ ور نہ ہوتے تو آج جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرہ میں دینداروں اور دینی عقائد واعمال کے ساتھ عام مسلمان کی جذباتی وابستگی کی فضا موجود نہ ہوتی اور آج بھی اگر ان دینی مدارس کو امتیازی تشخص وکردار سے محروم کر کے اجتماعی دھارے میں شامل کر دیا جائے تو دینی بیداری کے اس ماحول کو ختم کرنے کے لیے مزید کسی اقدام کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی اور وہ بتدریج مغربی فلسفہ وثقافت سے متاثر اور مرغوب اجتماعی ماحول میں تحلیل ہوتا چلا جائے گا، اس لیے اگر دینی مدارس کو اپنا وہ کردار باقی رکھنا ہے جو گزشتہ ڈیڑھ صدی سے وہ ادا کرتے آ رہے ہیں تو اس کے لیے ان کے جداگانہ تشخص کی بقا اور اجتماعی دھارے سے ان کا فاصلہ قائم رکھنا ضروری ہے۔

جہاں تک دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کا تعلق ہے، اس کے بھی دو مختلف پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو وہی ہے جس کا تعلق ان کی اجتماعی دھارے میں شمولیت سے ہے کہ دینی مدارس کے کسی فاضل کو محض ایک مولوی، حافظ، قاری یا مفتی ومعلم نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے اس کے ساتھ انجینئر،

ڈاکٹر، وکیل یا سائنس دان بھی ہونا چاہیے اور اس نقطہ نظر کی بنیاد پر دینی مدارس کے نصاب میں ردوبدل کیا جانا چاہیے۔ یہ بات قابل قبول نہیں ہے اور فطرت کے بھی خلاف ہے۔ دینی تعلیم و تربیت، تحقیق اور ریسرچ اور عام مسلمانوں کی دینی راہ نمائی ایک مستقل دینی کام اور معاشرتی ضرورت ہے اور اس کے لیے مستقل افراد کار ضروری ہیں جن کا کسی دوسرے فن میں ماہر ہونا قطعی ضروری نہیں ہے، بالکل اسی طرح جیسے عام لوگوں کو انصاف فراہم کرنا ایک مستقل معاشرتی ضرورت ہے۔ اس کے لیے جج صاحبان کا ایک مستقل طبقہ ضروری ہے جو تعلیم وتربیت کے حوالہ سے جداگانہ تشخص رکھتا ہو، چنانچہ ایک جج کے لیے صرف قانون اور انصاف سے متعلقہ علوم کا حاصل کرنا ہی ضروری سمجھا جاتا ہے اور کسی جج کے لیے ڈاکٹر، سائنس دان یا انجینئر ہونا ضروری قرار نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح کسی مفتی، دینی معلم اور حافظ و قاری کے لیے بھی دیگر شعبوں کے علوم کا حاصل کرنا لازمی نہیں ہے۔ اس لیے جب کوئی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ علمائے کرام کو جدید سائنسی علوم سے بھی بہرہ ور ہونا چاہیے اور روزگار کا کوئی اور ذریعہ تلاش کر کے دینی کام رضا کارانہ طور پر ثانوی حیثیت سے کرنا چاہیے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے جج صاحبان سے کہا جا رہا ہے کہ وہ انصاف اور قانون کے علم کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی علوم بھی حاصل کریں اور انصاف پر تنخواہ وصول کرنے کے بجائے روزگار کا کوئی اور ذریعہ اختیار کریں اور لوگوں کو انصاف مہیا کرنے کا کام رضا کارانہ طور پر ثانوی حیثیت سے سرانجام دیا کریں۔ اس لیے دینی مدارس کے نصاب میں اس قسم کی کسی تبدیلی کی حمایت تو ہرگز نہیں کی جا سکتی البتہ کمپیوٹر، عالمی زبانوں، تاریخ اور عالمی حالات سے واقفیت جیسے ضروری علوم کو خود ہم بھی دینی مدارس کے نصاب میں شامل کرنے کے حق میں ہیں اور اس کے لیے مسلسل آواز اٹھا رہے ہیں۔ صدر پرویز مشرف بھی اگر یہی چاہتے ہیں تو سر آنکھوں پر! ہم ان کے ارشادات کی حمایت کرتے ہیں لیکن دینی مداس کے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کی قیمت پر نہیں!*

O

* روزنامہ اوصاف، ۲ جنوری ۲۰۰۲ء۔

دینی مدارس اور حکومتی اقدامات

دینی مدارس کے تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے پانچوں وفاقوں نے ان حکومتی اقدامات کو مسترد کرنے کا اعلان کیا ہے جن کی منظوری وفاقی کابینہ نے دی ہے اور جن کے تحت دینی مدارس کو چھ ماہ کے اندر رجسٹریشن کا پابند کرتے ہوئے سرکاری سطح پر مدرسہ تعلیمی بورڈ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ رجسٹریشن نہ کرانے والے مدارس کو بند کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے دینی مدارس کو بیرون ملک سے ملنے والی امداد کو مدرسہ تعلیمی بورڈ کی کلیئرنس کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دینی مدارس کے نصاب میں انگلش، ریاضی اور سائنس کے مضامین کے اضافے کو لازمی قرار دینے کے علاوہ دہشت گردی اور فرقہ واریت میں ملوث دینی مدارس کے ناظم صاحبان کو دو سال قید کی سزا اور جرمانہ کے قانون کے نفاذ کا عندیہ دیا گیا ہے۔ اگرچہ وفاقی وزیر مذہبی امور ڈاکٹر محمود احمد غازی نے وضاحت کی ہے کہ ابھی مدارس کے بارے میں آرڈیننس کی حتمی شکل طے نہیں ہوئی، مگر وفاقی کابینہ کے اجلاس کے بعد وزیر اطلاعات جناب نثار اے میمن کی پریس بریفنگ میں مذکورہ بالا امور کے سامنے آجانے کے بعد آرڈیننس کے بنیادی مشمولات کے بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا اور حکومت ایک عرصہ سے دینی مدارس کے بارے میں جن عزائم اور اقدامات کا اظہار کرتی آرہی ہے، اس کی عملی شکل کا بنیادی ڈھانچہ واضح ہو گیا ہے۔

وزیر مذہبی امور نے اپنی پریس کانفرنس میں دینی مدارس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے لیے حکومت کی طرف سے تیرہ ارب روپے کی امداد کی خوشخبری بھی دی ہے جو تین سال میں مدارس کو دی جائے گی، لیکن اس کے باوجود نہ صرف دینی مدارس نے متفقہ طور پر ان اقدامات کو مسترد

کرنے کا فیصلہ کیا ہے، بلکہ لاہور ہائی کورٹ بار نے ایک قرارداد میں دینی مدارس کے خلاف ان حکومتی اقدامات کو مسترد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دینی مدارس کے وفاقوں کی طرف سے حکومتی اقدامات کو یکسر مسترد کرنے کے مضمرات اور پس منظر کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں تین باتوں کا بطور خاص جائزہ لینے کی ضرورت ہے:

ایک یہ کہ دینی مدارس کے نظام ونصاب میں رفتار زمانہ کے ساتھ جس قسم کی اصلاحات ناگزیر ہیں، ان کی ضرورت سے کسی ذی شعور کو انکار نہیں ہے اور ہم خود ایک عرصہ سے دینی مدارس کے منتظمین کو اس طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ ہماری رائے میں دینی مدارس کے نصاب میں نہ صرف انگلش زبان کے اضافے کی ضرورت ہے، بلکہ عربی بول چال، تحریر وتقریر اور اس کے ساتھ ساتھ تقابل ادیان و مذاہب، تاریخ، پبلک ریلیشننگ اور کمپیوٹر ٹریننگ وغیرہ جیسے اہم مضامین کے اضافہ کو بھی ہم وقت کا تقاضا سمجھتے ہیں، لیکن یہ تبدیلی اور اضافہ حکومتی اقدامات، اسٹیبلشمنٹ کی ترجیحات اور امریکہ کے مطالبات کے دائرہ میں نہیں، بلکہ خود دینی حلقوں کی داخلی ضروریات اور ملی ومعاشرتی تقاضوں کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح جیسے ہم دینی مدارس کے نصاب میں ان مضامین کے اضافوں کو ناگزیر سمجھتے ہیں، بالکل اسی درجہ میں دینی مدارس کے نصاب میں سائنس اور ریاضی کے اضافہ کو قطعی طور پر غلط اور نامعقول تصور کرتے ہیں اور دینی تعلیم کے ساتھ ریاضی اور سائنس کی تعلیم کو لازمی قرار دینا اسی طرح غیر معقول حرکت ہے جیسے لاکالج کے نصاب میں سائنس اور ریاضی کو لازمی مضامین کا درجہ دے دیا جائے۔

دوسری بات یہ کہ اگر حکومت اس سلسلہ میں کوئی کردار ادا کرنا چاہتی ہے تو اس کی حیثیت ایک خیرخواہ مشیر اور رہنما کی ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ حکومت کوئی رول ادا کرنا چاہے گی تو اسے دینی مدارس کے داخلی معاملات میں مداخلت اور ان کی خودمختاری پر حملہ تصور کیا جائے گا جسے دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ دینی مدارس کا موجودہ کردار جس کے مفید پہلوؤں کا خود جنرل پرویز مشرف کئی بار اعتراف کر چکے ہیں اور دینی مدارس کے جس دینی ومعاشرتی کردار کا تذکرہ وفاقی وزیر مذہبی امور وفاقی وزیر داخلہ اور گورنر پنجاب کے بیانات میں مسلسل ملتا

ہے، اس کردار کی گاڑی مالیاتی و انتظامی خود مختاری اور تعلیمی نصاب و نظام کی آزادی کے دو پہیوں پر چلتی آرہی ہے۔ ان میں سے کسی ایک پہیے کی ہوا نکال دی گئی تو دینی مدارس کے اس ملی کردار کا وجود باقی نہیں رہے گا جس کا اعتراف ہمارے حکمران بار بار کر رہے ہیں اور جس ملی کردار سے خائف ہو کر عالمی استعماری قوتیں اور بین الاقوامی ادارے ان دینی مدارس کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ حکومت جس فضا اور حالات میں دینی مدارس کے گرد پابندیوں کا حصار قائم کرنے اور تیرہ ارب کی امداد کا لالچ دے کر انہیں اس دائرہ میں گرنے کی ترغیب دے رہی ہے، اس فضا میں تو کسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہے اور ایسے حالات میں حکومت دینی مدارس کے بارے میں جو بھی عملی قدم اٹھائے گی، اس سے حکومتی اور دینی حلقوں کے درمیان کشیدگی میں اضافہ کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ ایک طرف صورت حال یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے امریکہ کی زیر قیادت عالمی اتحاد کے ساتھ مل کر دینی مدارس کی ڈیڑھ صدی کی کمائی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ طالبان حکومت دینی مدارس کی ڈیڑھ صدی کی کمائی تھی اور دینی مدارس افغانستان میں خالصتاً نظریہ اور دینی بنیادوں پر قائم طالبان حکومت کو دیکھ کر مطمئن تھے کہ ان کی ڈیڑھ صدی کی محنت رنگ لے آئی ہے اور اسلام کی جن تعلیمات کو انہوں نے گزشتہ دو سو برس سے محنت، قناعت، فاقہ کشی اور قربانیوں کے ساتھ زمانے کی دست برد سے بچا کر رکھا ہوا تھا، وہ نہ صرف محفوظ ہے، بلکہ عملی اور اجتماعی زندگی میں ان کی عمل داری کے امکانات بھی نظر آنے لگے ہیں، لیکن امریکی اتحاد نے حکومت کے تعاون سے طاقت کے بل پر اس حکومت کا خاتمہ ہی نہیں کیا، بلکہ اس کے علمی اور فکری سرچشمہ دینی مدارس کے خلاف وسیع تر انتقامی سرگرمیوں کا آغاز بھی کر دیا ہے جن کا سلسلہ افغانستان سے آگے بڑھتا ہوا پاکستان کے مختلف شہروں تک پھیلتا جا رہا ہے۔ دینی مدارس پر چھاپے مارے جا رہے ہیں، علما اور کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں آرہی ہیں، خوف و ہراس کی فضا قائم کی جا رہی ہے اور دینی مدارس کے ساتھ تعاون کرنے والے اصحاب خیر کو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ امریکی کمانڈوز کی رہنمائی میں پاکستانی فورسز اس وقت پاکستان کے مختلف علاقوں میں دینی مدارس کے خلاف جو کارروائیاں کر رہی ہیں اور جس طرح دینی حلقوں کو خوف زدہ اور

ہراساں کیا جا رہا ہے، اس فضا میں دینی مدارس کے لیے تیرہ ارب روپے کی امداد اور ان کی اصلاح و ترقی کے سرکاری اقدامات کو ایک سنگین مذاق اور زخموں پر نمک چھڑکنے کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔

موجودہ حکومت اگر دینی مدارس کے نظام و نصاب کی اصلاح میں مخلص ہے اور خلوص دل کے ساتھ ان کی امداد کرنا چاہتی ہے تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ملک بھر میں دینی مدارس کے خلاف کی جانے والی کارروائیاں فی الفور بند کر دی جائیں، امریکی کمانڈوز سے دوٹوک طور پر کہہ دیا جائے کہ القاعدہ کے ارکان کی تلاش کی آڑ میں ہم اپنے دینی تعلیم کے نظام اور ماحول کو ڈسٹرب نہیں کر سکتے، دینی مدارس کو مالیاتی و انتظامی خودمختاری کے تحفظ کی دوٹوک گارنٹی دی جائے، نصاب و نظام کے معاملہ میں انہیں ڈکٹیشن دینے کے بجائے مشاورت کے ذریعے سے ضروری اصلاحات کی راہ ان کے وفاقوں کے ذریعے سے ہموار کی جائے اور دینی حلقوں اور مدارس کے بارے میں امریکہ اور بھارت کے ایجنڈے سے لاتعلقی کا واضح طور پر اعلان کیا جائے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاوندوں سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو غلاموں کی طرح زدوکوب نہ کیا کریں، کیونکہ یہ بات کسی طرح بھی اچھی نہیں ہوگی کہ دن کے وقت وہ انہیں تھپڑ مار رہے ہوں اور شام کو پھر انہیں گلے لگانے کے لیے بھی آگے بڑھیں۔ حکمران بھی گھر کے سربراہ کی طرح ہوتا ہے، اسے بھی اگر گھر کے افراد کے تعاون کی ضرورت ہے تو اسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ یہ تو کوئی شرافت کی بات نہیں سمجھی جائے گی کہ ایک طرف دینی مدارس چھاپوں کی زد میں ہوں، رات کی تاریکی میں ان کی دیواریں پھلانگی جا رہی ہوں، اساتذہ و طلبہ کو زدوکوب کیا جا رہا ہو اور جیل کی کال کوٹھڑیوں کو مولویوں سے بھرا جا رہا ہو اور دوسری طرف وفاقی وزیر مذہبی امور تیرہ ارب روپے کے نوٹ تھالی میں رکھ کر دینی مدارس کے دروازوں پر دستک دے رہے ہوں۔ ان حالات میں تو امداد اور نصیحت کی بات کوئی عام آدمی بھی قبول نہیں کرتا، حکومت نے دینی مدارس کے ارباب حل و عقد سے اس کی توقع کیسے کر لی؟*

O

---

* روزنامہ پاکستان، ۲۷ جون ۲۰۰۲ء۔

مدرسہ آرڈیننس کے مضمرات

گزشتہ روز ملتان میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ کے ایک ہنگامی اجلاس میں وفاق کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کی خصوصی دعوت پر شرکت کا موقع ملا۔ اگرچہ وفاق میں شامل ایک تعلیمی ادارہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں کئی سالوں سے تدریس کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں، مگر وفاق المدارس کے کسی اجلاس میں حاضری کا پہلی بار اتفاق ہوا۔ وفاق کا قیام حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا شمس الحق افغانی اور حضرت مولانا مفتی محمود رحمہم اللہ کی مساعی سے عمل میں آیا تھا جو ان بزرگوں کی مخلصانہ کوشش اور خلوص وللّٰہیت کی وجہ سے بحمد اللہ تعالیٰ اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے کہ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کے بقول اس سال وفاق کے سالانہ امتحانات میں اٹھانوے ہزار سے زائد طلبہ اور طالبات شریک ہو رہے ہیں۔ مدارس کے نظام ونصاب میں ہم آہنگی، باہمی ربط وتعاون اور امتحانات میں یکسانی کی غرض سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مسلسل محنت اور پیش رفت دیکھ کر دیگر مذہبی مکاتب فکر بھی متوجہ ہوئے اور ان کے ہاں بھی اس قسم کے وفاقوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ چنانچہ اس وقت تمام مکاتب فکر کے پانچ وفاق کام کر رہے ہیں اور ان کے تحت کم وبیش سترہ ہزار مدارس مصروف کار ہیں جن میں سب سے بڑی تعداد وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے مدارس کی ہے۔

وفاق نے نصاب تعلیم کے معیار کو بڑھانے اور امتحانات کی نگرانی کے لیے جو متوازن طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے، اس کی وجہ سے نہ صرف یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے وفاق المدارس العربیہ کی

سندات کو مختلف درجات و مراحل میں تسلیم کیا ہوا ہے بلکہ ملک کی یونیورسٹیاں بھی اس کے معیار کو قبول کرتی ہیں۔ چنانچہ وفاق کے سربراہ شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان نے اس سفر کے دوران میں ایک ملاقات میں بتایا کہ انہوں نے چند سال قبل کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو دعوت دی کہ وہ خود تشریف لا کر وفاق کے امتحانات کا معائنہ کریں اور امتحانات کے دوران میں کسی روز وفاق کے نظام امتحانات کو چیک کریں۔ وہ خود تو تشریف نہ لائے البتہ شعبہ عربی اور شعبہ اسلامیات کے سربراہوں کو اس مقصد کے لیے بھیجا جنہوں نے طلبہ کو امتحانات کے مراکز میں پرچے حل کرتے دیکھا اور اپنے تاثرات یوں بیان کیے کہ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دینی مدارس میں امتحانات کا اس قدر مضبوط و مربوط نظام ہوگا اور نگران حضرات کی کڑی نگرانی میں طلبہ اس خاموشی اور متانت کے ساتھ پرچے حل کر رہے ہوں گے۔ ان حضرات کا کہنا تھا کہ ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم انسانوں میں نہیں بلکہ فرشتوں کے درمیان بیٹھے ہیں اور ہم اس نظام سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

میں نے اس موقع پر وفاق کے صدر حضرت مولانا سلیم اللہ خان اور سیکرٹری جنرل حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری سے یہ عرض کیا کہ دینی مدارس کے نظام اور معیار تعلیم وغیرہ کے حوالے سے بین الاقوامی حلقوں میں جو شدید منافرت اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور جسے مخصوص عالمی لابیاں اپنے مقاصد کے لیے مسلسل بڑھاتی جا رہی ہیں، ان کو کم کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وفاق المدارس تعلیم سے تعلق رکھنے والے بین الاقوامی اداروں کو خود دعوت دے کہ وہ پاکستان کے بڑے مدارس کا دورہ کریں، ان کے تعلیمی نظام کا براہ راست جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ امتحانات کے موقع پر مانیٹرنگ بھی کریں تاکہ ان کو اس بات کا صحیح طور پر علم ہو کہ پاکستان کے دینی مدارس کے خلاف عالمی سطح پر پھیلائی جانے والی کردارکشی کی باتوں میں کس حد تک صداقت ہے اور اس قسم کا پراپیگنڈا کرنے والوں کا اصل مقصد کیا ہے؟ وفاق کے دونوں ذمہ دار حضرات نے میری اس گزارش سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ وہ اس تجویز کا سنجیدگی سے جائزہ لیں گے۔

وفاق المدارس العربیہ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں دینی مدارس کی رجسٹریشن اور ریگولیشن کے حوالے سے حکومت کا مجوزہ آرڈیننس زیر بحث آیا جس کے بارے میں صدر جنرل پرویز مشرف اور

ان کے وزرا کی طرف سے بار ہا یہ یقین دہانی کرائی جاتی رہی ہے کہ اس آرڈیننس کا مقصد دینی مدارس کے نظام میں مداخلت کرنا نہیں اور نہ ہی کوئی آرڈیننس دینی مدارس کے وفاقوں کی مشاورت کے بغیر نافذ کیا جائے گا، حتیٰ کہ جنرل پرویز مشرف نے اپنی ۱۲ جنوری ۲۰۰۳ء کی نشری تقریر میں پوری قوم کے سامنے یہ بات کہی تھی کہ وہ دینی مدارس کو سرکاری کنٹرول میں لے کر انہیں خراب نہیں کرنا چاہتے، لیکن جب ۶ جولائی کے مذاکرات میں دینی مدارس کے وفاقوں کو وفاقی کابینہ کا منظور کردہ مسودہ دیا گیا تو وہ ان دونوں یقین دہانیوں کے برعکس تھا۔ اسے وفاقی کابینہ میں منظور کرنے سے قبل دینی مدارس کی قیادت کو اس کے حوالے سے اعتماد میں لینے کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا اور دینی مدارس کے داخلی نظام میں مداخلت نہ کرنے کے بار بار اعلانات کے برعکس اس آرڈیننس کو دینی مدارس کے لیے ایک ایسا شکنجہ بنا دیا گیا ہے کہ خدانخواستہ اس آرڈیننس کے نفاذ کی صورت میں ملک کا کوئی دینی مدرسہ اپنے تعلیمی کام کے تسلسل کو آزادانہ ماحول میں جاری نہیں رکھ سکتا۔

اس آرڈیننس کی رو سے ملک میں اس وقت موجود تمام دینی مدارس کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ خود کو حکومت کے قائم کردہ ''مدرسہ تعلیمی بورڈ'' کے ساتھ ملحق کریں اور جو مدرسہ اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد چھ ماہ تک اپنا الحاق اس بورڈ سے نہیں کرائے گا، اسے بند کر دیا جائے گا اور بورڈ کو اختیار ہوگا کہ وہ اس مدرسے کی انتظامیہ کو برطرف کر کے اپنی طرف سے انتظامیہ قائم کر دے یا اس مدرسے کو بند کر کے اس کے اثاثے اور جائیداد اپنی صوابدید پر کسی دوسرے مدرسے کو منتقل کر دے۔

اس آرڈیننس کی رو سے ''سرکاری مدرسہ تعلیمی بورڈ'' دینی مدارس کے نصاب میں اضافہ تجویز کرے گا جن کو قبول کرنا لازمی ہوگا۔ بورڈ امتحانات کا طریق کار وضع کرے گا، دینی مدارس کے لیے قواعد وضوابط طے کرے گا، اساتذہ کی اہلیت کے معیار کا تعین کرے گا، امتحانات کی نگرانی کرے گا اور مختلف درجات کی سندات کے لیے نصاب کا معیار اور مواد بھی بورڈ ہی تجویز کرے گا۔ جو مدرسہ بورڈ کے طے کردہ قواعد وضوابط اور ہدایات کی پابندی نہیں کرے گا، اس کے ذمہ دار حضرات کے لیے دو سال قید یا پچاس ہزار روپے جرمانہ کی سزا کے ساتھ مدرسے کے انتظام سے ان کی علیحدگی بھی ضروری ہو جائے گی۔

آرڈیننس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر مدرسہ اپنی آمدنی کے ذرائع اور چندہ دینے والوں کے کوائف بورڈ کو دینے کا پابند ہوگا اور بیرون ملک سے آنے والی کسی بھی قسم کی رقوم کو بورڈ کی اجازت کے بغیر وصول نہیں کر سکے گا۔ اس کے علاوہ ہر مدرسہ اپنا اکاؤنٹ بھی بورڈ کے منظور کردہ بینک میں کھلوا سکے گا، بورڈ ہی کے مقرر کردہ آڈیٹر سے حسابات چیک کرانے کا پابند ہوگا اور بورڈ کے مقرر کردہ افسر مجاز کی طرف سے مالی بدعنوانی یا بورڈ کی ہدایات کی خلاف ورزی کی شکایت پر مدرسے کی انتظامیہ کو برطرف کر کے بورڈ کی صواب دید پر نئی انتظامیہ مقرر کی جا سکے گی۔

گویا اس آرڈیننس کی رو سے حکومت نے ملک کے تمام دینی مدارس کو اپنے کنٹرول میں لینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود جنرل پرویز مشرف کے بقول ان کے نظام کو خراب کیا جائے اور ان کے اس معاشرتی و دینی کردار کا خاتمہ کر دیا جائے جس کا خود ہمارے موجودہ حکمران بھی کئی بار کھلے بندوں اعتراف کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ نے اس آرڈیننس کو ''انسداد دینی مدارس آرڈیننس'' قرار دیتے ہوئے یکسر مسترد کر دیا ہے، جبکہ اس سے اگلے روز تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے پانچوں وفاقوں نے لاہور میں اجلاس کر کے مشترکہ طور پر اس آرڈیننس کو مسترد کرنے کا اعلان کیا ہے اور اس سلسلے میں رائے عامہ کو منظم کرنے اور دینی وسیاسی حلقوں کو اعتماد میں لینے کے لیے مختلف شہروں میں علما اور دینی کارکنوں کے کنونشن منعقد کرنے اور ۷/اگست کو لاہور میں کل جماعتی کانفرنس طلب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ وفاق المدارس العربیہ اور ملک کے دیگر وفاقوں کا یہ مشترکہ موقف اور پروگرام وقت کی اہم ضرورت ہے، کیونکہ معاشرہ میں دینی تعلیم کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے دینی مدارس کی آزادی اور خودمختاری اسی طرح ضروری ہے جس طرح نماز کے لیے وضو ضروری ہے۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز جب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے تو بعض دوستوں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ صوبے کے حکمران ہیں، اس لیے انہیں صوبائی حکومت کی طرف سے دینی مدارس کی امداد کے لیے کوئی نظام وضع کرنا چاہیے۔ مفتی محمود صاحب خود اس وقت وفاق

المدارس العربیہ کے سربراہ تھے، لیکن انھوں نے اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا اور فرمایا کہ میں نے ہمیشہ حکمران نہیں رہنا۔ حکومتیں بدلتی رہتی ہیں اور ان کے مفادات اور ترجیحات بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اس لیے دینی مدارس کے نظام کو ان تبدیلیوں کے اثرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے اور ان کی آزادی کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے۔

جنرل پرویز مشرف سے بھی یہی گزارش ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، کیونکہ دینی مدارس کی جن اچھائیوں کا وہ خود اعتراف کر رہے ہیں، ان اچھائیوں کی بنیاد ان کی آزادی اور خود مختاری پر ہے جس کے لیے انہیں سرکاری اہل کاروں کی مداخلت اور بیوروکریسی کے کنٹرول سے بچانا ضروری ہے، ورنہ ان کی کابینہ کے منظور کردہ آرڈیننس کے (خدانخواستہ) نفاذ کی صورت میں دینی مدارس کا حشر کیا ہوگا، اس کا حال معلوم کرنے کے لیے وہ جامعہ عباسیہ بہاولپور اور جامعہ عثمانیہ گول چوک اوکاڑہ کی فائلیں منگوا کر پڑھ لیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ملک کے تمام دینی مدارس کو جامعہ عباسیہ اور جامعہ عثمانیہ بنانا پسند نہیں کریں گے۔*

O

---

* روزنامہ اسلام، ۲۵ر جولائی ۲۰۰۲ء۔

دینی مدارس اور قومی دھارا

اے پی پی کے مطابق گزشتہ دنوں کوئٹہ میں دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کے لیے منعقدہ آٹھ روزہ ورکشاپ کے اختتام پر ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال نے فرمایا ہے کہ دینی مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی راہ میں کوئی اندرونی یا بیرونی رکاوٹ برداشت نہیں کی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ دینی مدارس میں دنیاوی علوم کے فروغ کا مقصد دینی مدارس کے طلبہ کو ملک اور قوم کا ایک کارآمد شہری بنانا ہے۔ وزیر تعلیم نے اس موقع پر دینی مدارس کے حوالے سے سرکاری پروگرام کی وضاحت کی اور بہت سے دیگر باتیں بھی فرمائیں مگر اس مرحلہ میں ہم مذکورہ بالا دو باتوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے قبل اس ضمن میں عمومی صورتحال اور منظر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو کچھ اس طرح ہے کہ ایک طرف دینی مدارس کے وفاقوں کی ان اسناد کو عدالت عظمیٰ میں چیلنج کر کے مشکوک بنا دیا گیا ہے جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تسلیم کر رکھی تھیں جبکہ ان اسناد کی بنیاد پر لاکھوں علمائے کرام، حفاظ اور قرا ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور ہزاروں طلبہ نے ان اسناد کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم میں پیش رفت کی ہے۔ دوسری طرف سرکاری سطح پر ''مدرسہ ایجوکیشن بورڈ'' کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے جس کے چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایم زمان ہیں۔ اس بورڈ کا ہیڈ آفس اسلام آباد کے حاجی کیمپ میں قائم کیا گیا ہے، ایک اخباری اشتہار کی صورت میں بورڈ نے الحاق کے لیے دینی مدارس سے درخواستیں طلب کر لی ہیں اور عمومی طور پر یہ تاثر

قائم کیا جا رہا ہے کہ آئندہ دینی مدارس کی اسناد کا تحفظ صرف اسی صورت میں ہوگا کہ وہ سرکاری مدرسہ بورڈ کے ساتھ الحاق کریں، اس کے بغیر دینی مدارس کی اسناد شکوک وشبہات کے دائرے سے نہیں نکل سکیں گی۔ تیسری جانب یہ بات قومی اخبارات کے ذریعے منظر عام پر آچکی ہے کہ دینی مدارس کی اصلاح کے نام پر امریکہ نے پاکستان کو کم وبیش تین ارب روپے کی امداد فراہم کر دی ہے اور یورپی یونین کی یہ پیشکش سامنے آچکی ہے کہ وہ بھی دینی مدارس کی اصلاح کی غرض سے حکومت پاکستان کو مالی امداد فراہم کرنے کے لیے تیار ہے جس کا مطلب واضح ہے کہ دینی مدارس کی اس انداز سے اصلاح کرنا مقصود ہے کہ ان کے بارے میں مغرب کو جو اعتراضات یا شکایات ہیں، ان کا ازالہ ہو جائے اور دینی مدارس کا تعلیمی کردار مغربی ممالک کے لیے قابل قبول ہو جائے۔

مغرب کو ان دینی مدارس سے کیا شکایات ہیں؟ ان پر تفصیل کے ساتھ ہم کئی بار گزارش کر چکے ہیں کہ ان مدارس میں قرآن پاک اور حدیث نبوی کے اصلی اور محفوظ ذخیرہ کی کسی ترمیم کے بغیر تعلیم دی جاتی ہے جس میں کسی اسلامی ملک میں اسلام کا ریاستی کردار، جہاد کے احکام، شرعی سزاؤں کا نفاذ، خاندانی نظام کے اسلامی قوانین، خلافت وحکومت کے فرائض واہمیت اور دنیا کے دیگر تمام مذاہب پر اسلام کی برتری کی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ سب باتیں مغرب کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ مغرب اسلام کی تعلیمات کو اسی دائرے میں محدود کر دینا چاہتا ہے جس دائرے میں اس نے امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا کے مسیحی ممالک میں مسیحیت کو محدود کر دیا ہے اور وہ دائرہ عقائد، عبادات اور اخلاق کی ان تعلیمات کا ہے جن کا تعلق کسی شخص کے ساتھ صرف ذاتی حد تک ہے جبکہ معاشرتی زندگی حتیٰ کہ خاندانی زندگی میں بھی مذہب کی تعلیمات کی بالادستی اور عمل داری کو قبول کرنے کے لیے مغرب تیار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں جب دینی مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی بات ہوتی ہے تو واقفان حال کے لیے اس حقیقت کا ادارک کوئی مشکل امر نہیں رہتا کہ پاکستان میں مساجد اور دینی مدارس کے مستقبل کے لیے وہی کردار ہمارے مقتدر حلقوں کے ذہنوں میں ہے جو یورپ اور امریکہ میں کلیسا کے لیے باقی رہ گیا ہے جس کردار کے نتیجے میں کلیساؤں کی ایک بڑی تعداد اپنے

عقیدت مندوں کو ترس رہی ہے اور ہزاروں فروخت ہوکر مساجد اور دیگر مقاصد کی عمارتوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ دینی مدارس نے قومی دھارے کے اسی رخ کو بروقت بھانپتے ہوئے خود کو ''قومی دھارے'' سے الگ رکھنے کا حکیمانہ فیصلہ کیا تھا اور اپنے دینی و تعلیمی نظام ونصاب کی بنیاد جداگانہ تشخص پر رکھی تھی چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے صرف آٹھ سال بعد ۱۸۶۵ء میں دیوبند میں قائم ہونے والے دینی مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے اساسی اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے تو دینی مدارس کے جداگانہ تشخص اور امتیاز کی حکمت واہمیت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

ان اساسی اصولوں میں، جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے تحریر فرمائے تھے، ایک اصول یہ تھا کہ اس مدرسہ کو عام مسلمانوں کے رضا کارانہ چندہ سے چلایا جائے اور کسی حکومت یا ریاست کی امداد قبول کرنے سے گریز کیا جائے۔ انہیں اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ ہماری حکومتیں خواہ کسی درجہ کی ہوں، عالمی استعمار کے اثرات سے آزاد نہیں ہیں اس لیے ان کی امداد قبول کرنے کا مطلب خود کو ان کے زیر اثر لانے اور ان کی وساطت سے عالمی استعمار کی بالادستی قبول کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے دینی مدارس نے گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے دوران اپنا یہ امتیاز اور تشخص باقی رکھا ہے اور اپنی خودمختاری اور آزادانہ کردار کا ہر دور میں تحفظ کیا ہے جس کے باعث وہ معاشرہ میں دین کی اصل تعلیمات کو پیش کرنے اور انہیں کسی بھی قسم کی آمیزش یا ترمیم وتبدیلی سے پاک رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ آج اگر دینی مدارس میں قرآن وسنت کی اصلی اور مکمل تعلیمات کا درس دیا جا رہا ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ مساجد ومدارس کے نظام کا حکومتی اثر سے آزاد ہونا اور اپنے جداگانہ تشخص وامتیاز کے ساتھ آزادانہ کردار کو برقرار رکھنا ہے۔ اسی راز اور حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے دینی مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے خوشنما عنوان کے ساتھ ان کے جداگانہ تشخص وامتیاز، خودمختاری اور آزادانہ کردار سے محروم کرنے کی پلاننگ کی گئی ہے اور اس کے لیے ملک کے اندر اور باہر ہر سطح پر تحریص اور تخویف کا وسیع جال پھیلایا جا رہا ہے۔

وزیر تعلیم نے دینی مداس کے طلبہ کو قوم کے لیے ایک ''کارآمد شہری'' بنانے کی نوید بھی سنائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت دینی تعلیم کے مختلف شعبوں میں جو لوگ کام کر رہے ہیں، وہ ملک

کے کارآمد شہری نہیں ہیں اور یہ بات محض قیاس آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ ہمارے مقتدر طبقوں کے نزدیک دینی تعلیم کے حوالہ سے خدمات سرانجام دینے والے لوگ مثلاً حافظ، قاری، خطیب، امام، مدرس، مفتی اور مبلغ ملک وقوم کے کارآمد شہری تصور نہیں ہوتے، انہیں معاشرہ کا ''عضو بیکار'' سمجھا جاتا ہے اور انہیں مفت خوری کا طعنہ دے کر کوئی متبادل روزگار تلاش کرنے کی بھی عام طور پر تلقین کی جاتی ہے۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے اور اس کے ڈانڈے بھی مغرب کے فلسفہ وفکر سے ملتے ہیں کہ جس طرح مغرب میں مذہب کو ایک زائد از ضرورت چیز تصور کر لیا گیا ہے اور مذہب کے کسی بھی معاشرتی کردار کو قبول نہ کرتے ہوئے اسے صرف ایک فرد کی ذاتی اور شخصی ذہنی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ہمارے ہاں بھی مقتدر حلقوں کو مذہب کی اس کے سوا کوئی ضرورت وافادیت دکھائی نہیں دیتی، اس لیے ظاہر بات ہے کہ جب خود دین ومذہب کو معاشرہ اور سوسائٹی کے لیے کارآمد چیز نہیں سمجھا جائے گا تو اس کے لیے کام کرنے والے آخر کس طرح ملک کے کارآمد شہری تصور کیے جا سکتے ہیں؟

محترمہ زبیدہ جلال نے ان ارشادات کے ساتھ ساتھ اس موقع پر یہ بھی فرمایا ہے کہ ''دینی تعلیم کے فروغ کے لیے دینی مدارس کے کردار میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جائے گی'' جو خوش کن تو ہے لیکن ان کے باقی فرمودات سے مطابقت نہیں رکھتی، اس لیے کہ گزشتہ ڈیڑھ سوسالہ تاریخ گواہ ہے کہ دینی مدارس اگر اس معاشرہ میں دینی تعلیم کے فروغ کے لیے کوئی کردار ادا کر سکے ہیں تو وہ صرف اس وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ وہ قومی دھارے کے ''سنہری جال'' سے آزاد تھے اور کسی بھی دباؤ سے آزاد رہتے ہوئے قرآن وسنت کی تعلیم دینے میں خود مختار تھے۔ قومی دھارے اور سرکاری اثر میں آجانے کے بعد وہ یہ کردار ادا نہیں کر سکیں گے، اس لیے وفاقی وزیر تعلیم سے ہماری مودبانہ گزارش ہے کہ اگر وہ دینی تعلیم کے فروغ کے لیے دینی مدارس کے بنیادی کردار کو باقی رکھنے میں سنجیدہ ہیں تو انہیں قومی دھارے کے نام پر سرکاری دائرۂ اثر میں لینے کے طرز عمل پر نظر ثانی کریں کیونکہ یہ دونوں قطعی طور پر متضاد باتیں ہیں اور ان دونوں کو بیک وقت پورا کرنے کی کوشش خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح وفاقی وزیر تعلیم سے ہماری استدعا ہے کہ وہ مختلف شعبوں میں قوم کی دینی خدمات

سرانجام دینے والوں کو اور جو چاہیں کہہ لیں، مگر ''عضو بیکار'' ہونے کا طعنہ بے جا نہ دیں کیونکہ ایک تو اس میں خود دین کے استخفاف کا پہلو نکلتا ہے اور دوسرے خود زبیدہ جلال اور ان کے قبیلہ کے افراد کی اس وقت عالمی سطح پر جو مانگ اور قدر و منزلت ہے، وہ انہی بے کار لوگوں کی قربانیوں کا ثمر ہے۔ اگر یہ دینی مدارس اور ان کا آزادانہ کردار نہ ہوتا تو آج زبیدہ جلال ایک آزاد ملک کی وزیر تعلیم نہ ہوتیں اور نہ ہی انہیں عالمی سطح پر آؤ بھگت کا وہ ماحول میسر آتا جس سے وہ ان دینی مدارس کے غیر کار آمد لوگوں کی قربانیوں کے صلہ میں مسلسل بہرہ ور ہو رہی ہیں۔ *

O

* روزنامہ اسلام ۴/ اگست ۲۰۰۳ء۔

مدارس آرڈیننس نافذ کرنے کا نیا سرکاری پروگرام

دینی مدارس کے بارے میں صدر پرویز مشرف اور وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی کے اعلانات کے باوجود تذبذب اور گومگو کی فضا ابھی تک ختم نہیں ہوئی اور مختلف حوالوں سے یہ خبریں سامنے آ رہی ہیں کہ حکومت ریگولیشن اور رجسٹریشن کے نام پر اس آرڈیننس کو ایک بار پھر جھاڑ پھونک کر نفاذ کے مرحلہ تک لانے کی تیاریاں کر رہی ہے جسے دینی مدارس کے تمام وفاقوں نے متفقہ طور پر مسترد کر دیا تھا۔ باخبر ذرائع کے مطابق صوبہ سرحد کی حکومت نے پچھلے دنوں وفاقی حکومت سے استفسار کیا کہ جو مدارس رجسٹرڈ نہیں ہیں، کیا انہیں پہلے سے چلے آنے والے رجسٹریشن کے قانون کے تحت رجسٹرڈ کر لیا جائے؟ اس کے جواب میں وفاق نے صوبائی حکومت کو یہ کہہ کر اس کام سے روک دیا کہ اس سلسلہ میں ایک آرڈیننس کا مسودہ زیرِ غور ہے، اس کے نفاذ تک کسی مدرسہ کی رجسٹریشن نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی سرحد حکومت کو وفاقی حکومت کی طرف سے اسی آرڈیننس کی کاپی بھجوا دی گئی جسے ملک کے دینی حلقوں اور مدارس کے تمام مکاتب فکر کے وفاقوں نے متفقہ طور پر مسترد کر دیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی بعض اخبارات میں پنجاب حکومت کے حوالے سے شائع ہونے والی یہ خبر بھی توجہ طلب ہے کہ اس نے دینی مدارس کے بارے میں کوئی نیا قانون آرڈیننس کی شکل میں نافذ کرنے سے اختلاف کیا ہے۔ خبر کے مطابق وفاقی حکومت نے صوبائی حکومتوں کو مذکورہ آرڈیننس کا مسودہ بھجوا کر اس کے نفاذ کے سلسلہ میں ان سے رائے طلب کی ہے جس کے جواب میں پنجاب

حکومت نے کہا ہے کہ تمام مکاتب فکر کے نمایاں افراد کو اعتماد میں لیے بغیر اس سلسلہ میں کیا جانے والا کوئی فیصلہ خطرناک اور دھماکہ خیز ہوسکتا ہے اس لیے اس قانون کو آرڈیننس کی صورت میں لانے کے بجائے بل کی شکل میں اسمبلی میں پیش کیا جائے۔ پنجاب حکومت نے یہ رائے بھی دی ہے کہ جو معروف مدارس پہلے سے رجسٹرڈ چلے آرہے ہیں، ان کے لیے نئی رجسٹریشن کی شرط ضروری قرار نہ دی جائے اور قواعد میں نرمی کرکے انہیں حسب سابق رجسٹرڈ تصور کیا جائے۔ نیز نئے مسودہ قانون کی اس شق پر نظر ثانی کی جائے کہ کسی مدرسہ کی مختلف شاخوں کو الگ الگ خودمختار تعلیمی اداروں کی صورت میں رجسٹرڈ کیا جائے گا، بلکہ انہیں الگ حیثیت دینے کے بجائے اسی مرکز کا حصہ تصور کیا جائے جس کی وہ شاخیں ہیں۔ اس کے علاوہ پنجاب حکومت نے اپنے جوابی خط میں چند اور تجاویز بھی پیش کی ہیں جن کا تعلق انتظامی امور سے ہے۔

ان خبروں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مدارس کے بارے میں کوئی نیا آرڈیننس نافذ کرنے کا سرکاری پروگرام ختم نہیں ہوا بلکہ وقتی طور دینی حلقوں کے احتجاج کی وجہ سے اسے موخر کردیا گیا تھا اور اب اسے نئے سرے سے سامنے لانے کی صورت نکالی جارہی ہے، لیکن اس دفعہ طریق کار میں یہ فرق ہے کہ اس سے قبل دینی مدارس کے وفاقوں کو اس معاملہ میں اعتماد میں لیا جاتا تھا اور ان کے نمائندوں سے مشاورت کی جاتی تھی، لیکن اب اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جارہی اور حکومت اپنے طور پر ہی اس کام کو نمٹانے کے لیے کوشاں دکھائی دیتی ہے، حتیٰ کہ تمام دینی مکاتب فکر کے دینی مدارس کے وفاقوں کے مشترکہ اجلاس میں جو گزشتہ روز جامعہ نعیمیہ لاہور میں ہوا اور جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور اہل تشیع سے تعلق رکھنے والے تمام وفاقوں کے ذمہ دار حضرات شریک ہوئے، بتایا گیا کہ کچھ عرصہ قبل وفاقی وزرا اور دیگر اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے ساتھ دینی مدارس کے وفاقوں کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں نورکنی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اور طے کیا گیا تھا کہ دینی مدارس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ اس نورکنی مشترکہ کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں کیا جائے گا۔ پھر ستمبر کے وسط میں وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال نے ایک اجلاس میں دینی مدارس کی نمائندہ قیادت کے ساتھ وعدہ کیا کہ ایک ماہ کے اندر مشترکہ اجلاس اس مقصد کے لیے

طلب کیا جائے گا، لیکن ان دونوں باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور دینی مدارس کی قیادت کو ایک طرف رکھتے ہوئے حکومت ان کے بارے میں آرڈیننس کے نفاذ کی تیاریوں میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔

مذکورہ آرڈیننس دینی مدارس نے اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ اس کے نفاذ کی صورت میں ان کی آزادی اور خودمختاری سلب ہو کر رہ جائے گی جو خود صدر جنرل پرویز مشرف کے اس اعلان کے منافی ہے کہ وہ مدارس کے نظام میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی انہیں کنٹرول میں لینا چاہتے ہیں۔ یہ اعلان صدر جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ ہفتے اسلام آباد میں علمائے کرام کے ایک اجلاس میں پھر دہرایا ہے کہ ان کا دینی مدارس کے معاملات میں مداخلت اور کنٹرول کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور وہ صرف ان کے نصاب میں جدید علوم کو شامل کرانا چاہتے ہیں تاکہ انہیں قومی دھارے میں لایا جا سکے۔ اسی طرح پنجاب کے وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی نے رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کے موقع پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ دینی مدارس کے نظام میں مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ وارثانِ انبیائے کرام علیہم السلام کے مراکز ہیں جبکہ جس آرڈیننس کو ازسرِنو ملک میں نافذ کرنے کی سرگرمیاں دکھائی دے رہی ہیں، وہ دینی مدارس کے نظام کو مکمل طور پر سرکاری کنٹرول میں لینے کا قانون ہے اور وفاقی وزیر داخلہ کئی بار یہ کہہ چکے ہیں کہ اس آرڈیننس کے نفاذ کے لیے پیش رفت ہو رہی ہے۔

اس وقت اس سلسلے میں عجیب سی صورت حال ہے۔ ایک طرف صدر محترم سمیت ذمہ داران حکومت کے یہ اعلانات ہیں کہ دینی مدارس کو کنٹرول کرنے اور ان کے نظام میں مداخلت کرنے کا کوئی سرکاری پروگرام نہیں ہے۔ دوسری طرف اس آرڈیننس کا مسودہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے مختلف محکموں میں مشاورت کے لیے گھوم رہا ہے جس کے بارے میں دینی حلقوں کا کہنا ہے کہ اس کے نفاذ سے دینی مدارس کی آزادی سلب ہو جائے گی اور وہ مکمل طور پر سرکاری کنٹرول میں چلے جائیں گے، جبکہ تیسری طرف امریکہ کا یہ اعلان اس صورت حال کو اور زیادہ گھمبیر بنا رہا ہے کہ وہ پاکستان کے دینی مدارس کی ''اصلاح'' چاہتا ہے اور اس نے اس مقصد کے لیے حکومت پاکستان کو

کروڑوں روپے کی مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے جس کے تحت بارہ ارب روپے کی وہ خطیر رقم اس وقت فٹ بال بنی ہوئی ہے جو امریکہ نے فراہم کی ہے اور حکومت پاکستان اسے امداد کے نام سے دینی مدارس میں تقسیم کرنا چاہتی ہے، لیکن دینی مدارس نے یہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور جامعہ نعیمیہ لاہور میں منعقد ہونے والے مذکورہ اجلاس میں تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کی اعلیٰ قیادت نے متفقہ طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ وہ نہ صرف امریکہ کی اس رقم کو مسترد کرتے ہیں بلکہ وہ کسی قسم کی سرکاری امداد قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ دینی مدارس کا یہ آزادانہ ماحول آج کی عالمی برادری اور مغربی قیادت کے لیے ناقابل برداشت ہے کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ کسی ترمیم اور تحفظات کے بغیر قرآن وسنت کی مکمل تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں جبکہ مغربی قیادت کا تقاضا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے وہ حصے جو بالادست مغربی تہذیب اور عالمی نظام سے متصادم ہیں، وہ نہ پڑھائے جائیں اور ان کے لیے نئی نسل کی ذہن سازی نہ کی جائے کیونکہ اس سے نئی نسل میں مروجہ عالمی نظام اور مغربی تہذیب وثقافت کے خلاف بغاوت کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ مدارس کو اس کام سے روکنے کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اگر رضاکارانہ طور پر مغربی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو انہیں کسی نہ کسی طرح سرکاری کنٹرول میں لیا جائے اور قومی دھارے میں شامل کر کے دیگر قومی اور حکومتی شعبوں کی طرح دینی مدارس کے شعبہ کو بھی عالمی نظام کے شکنجے میں جکڑ لیا جائے۔ مگر دینی مدارس کی قیادت بیدار ہے اور مغربی نظام کے اس مقصد کا پوری طرح ادراک رکھتی ہے، اس لیے وہ مدارس کی آزادی اور خودمختاری کو ہر حالت میں قائم رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے اور اس کے خلاف کسی اقدام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس غرض کے لیے دینی مدارس کا ایک متبادل سرکاری نظام ''مدرسہ ایجوکیشن بورڈ'' کے نام سے قائم کیا گیا اور محکمہ تعلیم نے انٹرمیڈیٹ کے تمام بورڈز میں ''درس نظامی گروپ'' قائم کیے لیکن اساتذہ اور طلبہ نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ پھر اربوں روپے کی مالی امداد کا لالچ دے کر مدارس کو اس ڈھب پر لانے کی کوشش کی گئی مگر دینی مدارس نے اربوں روپے کی اس رقم کو اس شان

بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا کہ جرمنی کے سفیر محترم کو دارالعلوم سرحد پشاور جا کر سوال کرنا پڑا کہ آپ لوگ امریکہ کی مالی امداد کو قبول کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ اس کے بعد ایک ہی حربہ باقی رہ گیا ہے کہ جبر سے کام لیا جائے اور یک طرفہ طور پر ان کے خلاف اقدامات کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کے لیے دینی مدارس کے وفاقوں کو غیر موثر بنانا اور مدارس پر ان کی گرفت کمزور کرنا ضروری ہے اور نمائندہ وفاقوں کو نظر انداز کر کے الگ طور پر علمائے کرام کے اجلاس طلب کرنے، ملک بھر میں مدارس کو براہ راست امداد کی پیش کش کرنے اور رجسٹریشن اور ریگولیشن کے نام پر مجوزہ آرڈیننس کی تیاری میں دینی مدارس کی نمائندہ قیادت کے ساتھ مشاورت کا سلسلہ یک لخت ترک کر دینے کے پیچھے یہی حکمت عملی کارفرما ہے۔

مجھ سے ایک دوست نے پوچھا کہ کیا حکومت پنجاب کی طرف سے دینی مدارس کی رجسٹریشن کے مذکورہ متنازعہ قانون کو آرڈیننس کی شکل میں جبراً نافذ کرنے کی مخالفت کے باوجود وفاقی حکومت اتنے بڑے اقدام کا ''رسک'' لے گی؟ میں نے عرض کیا کہ ہم ''یوٹرن'' کے عادی ہیں، بلکہ ہم نے ''اباؤٹ ٹرن'' کی مشق بھی اچھی طرح کر رکھی ہے جس کے لیے صرف ایڑی کے بل گھوم جانا ہوتا ہے، اس لیے کوئی اقدام بھی غیر متوقع نہیں ہے۔ البتہ اگر دینی مدارس کے وفاق باہمی رابطہ واعتماد کی موجودہ فضا کو قائم رکھ سکیں، ملحقہ مدارس پر اپنی اپنی گرفت برقرار رکھنے کے ضروری تقاضے پورے کر لیں اور رائے عامہ کے ساتھ ان کا تعلق مستحکم ہو جائے تو ''جبر کا حربہ'' بھی اسی طرح ناکام ہو جائے گا جس طرح ''لالچ'' کے حربے کو منہ کی کھانی پڑی ہے۔ اصل بات ملک بھر کے دینی مدارس کے ارباب بست وکشاد کی دینی حمیت اور بیداری، اپنے اپنے وفاقوں کی قیادت پر بھرپور اعتماد اور پھر تمام وفاقوں کی قیادتوں کا باہمی رابطہ ومشاورت ہے۔ یہ بات قائم رہی تو ان شاء اللہ تعالیٰ دینی مدارس اس امتحان میں بھی سرخرو ہوں گے۔*

O

* روزنامہ اسلام، ۱۱؍دسمبر ۲۰۰۳ء۔

وفاق المدارس العربیہ کا کنونشن

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام ۱۵ مئی ۲۰۰۵ء کو کنونشن سنٹر اسلام آباد میں منعقد ہونے والا دینی مدارس کنونشن اس حوالے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ نیشنل سیکیورٹی کونسل کے حالیہ اجلاس کے بعد دینی مدارس کے بارے میں حکومت کی نئی پالیسی اور حکمت عملی سامنے آ گئی ہے۔ چنانچہ ۱۵ مئی کے مذکورہ کنونشن کی کارروائی اس لیے بھی ملک بھر کے عوام کی توجہ کا مرکز ہوگی کہ نئی حکومتی پالیسی کا ردعمل دینی مدارس کے اس سب سے قدیمی اور سب سے بڑے وفاق کی طرف سے کیا سامنے آتا ہے؟

''دینی مدارس کنونشن'' بظاہر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سالانہ امتحانات میں گزشتہ سال اور اس سے پیوستہ سال اول، دوم، سوم آنے والے فضلا اور فاضلات میں انعامات کی تقسیم کے لیے انعقاد پذیر ہو رہا ہے اور اس میں ملک کے مقتدر طبقات اور مختلف مکاتب فکر کے زعما کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے، جبکہ وفاق کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد حنیف جالندھری نے ایک اخباری اشتہار میں کنونشن کے لیے جن عنوانات کا اعلان کیا ہے اور ان پر ملک بھر کے ارباب علم و دانش کو اپنے مضامین کے ذریعے سے خامہ فرسائی کی دعوت دی ہے، ان عنوانات کا تنوع اور ان کی وسعت اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ وفاق کی قیادت ملک کے مقتدر حلقوں اور بین الاقوامی لابیوں کے سامنے اپنے پروگرام اور پالیسیوں کو زیادہ سنجیدگی کے ساتھ واضح کرنا چاہتی ہے اور اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینی مدارس کے کردار اور سرگرمیوں کے بارے میں اعلیٰ حلقوں میں جو ابہام پایا جاتا ہے،

وہ دور ہو اور جو مختلف قسم کے شکوک وشبہات پھیلائے جاتے ہیں، ان کا ازالہ ہو۔ اس لیے اس اجتماع کے لیے اسلام آباد شہر اور ملک کے سب سے مہنگے کانفرنس ہال کا انتخاب کیا گیا ہے اور میرے خیال میں اگر وفاق المدارس اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے اور ان حلقوں تک اپنا پیغام براہ راست پہنچانے کا یہ ہدف کسی بھی سطح پر پا لیتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ وقت کی ضروریات میں شمار ہوگا اور وفاق کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا، مگر اس کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے اور صرف کنونشن سینٹر کی بکنگ، دعوت ناموں، اشتہارات اور خبروں پر قناعت کرنے کے بجائے ذاتی رابطوں اور مختلف طبقات کی اہم شخصیات کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے ہوم ورک پر زیادہ توجہ دینی ہوگی۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ملک میں دینی مدارس کو ایک فورم پر متحد کرنے، ان کے تعلیمی وامتحانی نظام کو مربوط بنانے اور ان کی آزادی وخودمختاری کے تحفظ کے لیے ہراول دستے کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ وفاق دیوبندی مکتب فکر کے مدارس پر مشتمل ہے جس نے اس سمت میں جدوجہد کا آغاز کیا جبکہ اس کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے مکاتب فکر نے بھی اپنے اپنے وفاق قائم کیے اور دینی مدارس کی تنظیم وارتباط کا سلسلہ دن بدن وسیع ہوتا چلا گیا۔ پھر وفاق المدارس العربیہ نے یہ کریڈٹ بھی حاصل کیا کہ دینی مدارس کی آزادی وخودمختاری کے لیے خطرات کی بو سونگھتے ہوئے اس نے مختلف مکاتب فکر کے وفاقوں کو ایک فورم پر متحد کرنے میں پہل کی اور آج تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس تمام تر باہمی اختلافات کے باوجود ''اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ'' کے نام سے متحد ہیں اور ان کے اتحاد اور باہمی اعتماد وتعاون ہی کا ثمرہ ہے کہ عالمی استعماری حلقے ان مدارس کے آزادانہ تعلیمی کردار اور مالیاتی وانتظامی خودمختاری ختم کرنے کے ہر حربے میں ناکام ہوئے ہیں۔ وفاق المدارس العربیہ کا یہ امتیاز بھی ہے کہ اس کے ساتھ مدارس کی سب سے بڑی تعداد منسلک ہے اور شاید اس بات میں مبالغہ نہ ہوگا کہ وفاق المدارس سے الحاق رکھنے والے مدارس کی تعداد دوسرے تمام وفاقوں سے منسلک مدارس کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے اس سطح پر تقسیم انعامات کی تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ پہلی بار کیا ہے اور اس طرح ایک

نئی روایت کی بنیاد ڈالی ہے جس سے ''دینی مدارس کنونشن'' نے خاصی اہمیت اختیار کر لی ہے، مگر میرے خیال میں نیشنل سیکیورٹی کونسل کی ان سفارشات نے اس کنونشن کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے جو حال ہی میں سامنے آئی ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت، لاہور کی ۹ رمئی کی اشاعت میں شامل ایک رپورٹ کے مطابق نیشنل سیکیورٹی کونسل کے گزشتہ اجلاس میں ملک میں مذہبی انتہا پسندی کو کنٹرول کرنے اور اعتدال پسندی کو فروغ دینے کے عنوان سے دینی مدارس کے کردار کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اور متعدد سفارشات مرتب کی گئی ہیں جو عمل درآمد کے لیے صوبائی حکومتوں کو بھجوا دی گئی ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حکومت نے دینی مدارس میں اصلاحات کے لیے صوبائی حکومتوں کو جو فنڈز دیے تھے، وہ روک لیے ہیں اور حکومتی انتظام کے تحت جو مدارس قائم کیے گئے تھے، انہیں بند کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں پروگرام اپنے مقاصد کے حوالے سے ناکام ہو گئے ہیں۔ حکومت کا خیال تھا کہ اگر دینی مدارس کو وسیع مالی امداد دی جائے گی تو وہ حکومتی پروگرام کے تحت چلنے پر آمادہ ہو جائیں گے اور اپنے آزادانہ تعلیمی کردار سے دستبرداری اختیار کر لیں گے۔ ماڈل مدارس قائم کر کے اساتذہ اور طلبہ کو جب مختلف مفادات اور مراعات کی ترغیب دی جائے گی تو وہ اپنے معاشی مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے اس طرف دوڑے چلے آئیں گے، لیکن یہ دونوں توقعات نقش بر آب ثابت ہوئیں اور تمام تر ترغیبات اور دھمکیوں کے باوجود پورے ملک میں نصف درجن ماڈل مدارس بھی قائم نہیں ہو سکے اور جو چند مدارس وجود میں آ گئے، وہ خطیر رقوم صرف کرنے کے باوجود نہیں چل سکے، اس لیے حکومت کو بالآخر یہ دونوں فیصلے واپس لینے پڑے ہیں اور یہ بلاشبہ دینی مدارس کے وفاقوں کے اتحاد اور جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

البتہ مذکورہ بالا رپورٹ میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ حکومت مالی ترغیبات اور مراعات و مفادات کی تحریص کے حربے میں ناکامی کے بعد اب رجسٹریشن کے نام سے مدارس کو قانونی شکنجے میں کسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پاکستان کے دینی مدارس کی اکثریت سوسائٹی ایکٹ، ٹرسٹ ایکٹ، سوشل ویلفیئر اور والنٹیئر ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہے لیکن حکومت نے ماڈل دینی

مدارس کے نام پر مدرسہ بورڈ قائم کر کے ان کی متبادل رجسٹریشن کا جو پروگرام بنایا تھا، اس کے تحت اب تک صرف ایک سو پانچ مدرسے رجسٹرڈ ہوئے ہیں، اس لیے اسے ناکام پروگرام قرار دے کر بند کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ رجسٹریشن کے حوالے سے دینی مدارس اور حکومت کے درمیان اسی نکتے پر تنازع چلا آ رہا ہے کہ حکومت مذکورہ بالا قوانین کے تحت مدارس کی رجسٹریشن کو کافی نہ سمجھتے ہوئے رجسٹریشن کا نیا قانون نافذ کرنا چاہتی ہے، جس کا مقصد مدارس کے نظام میں حکومتی مداخلت کی راہ ہموار کرنا اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ دینی مدارس حکومت کی مقرر کردہ حدود سے ہٹ کر کوئی تعلیمی پروگرام جاری نہ رکھ سکیں۔ یہ صورت حال دینی مدارس کے لیے قابل قبول نہیں، اس لیے کہ یہ ان کی گزشتہ ڈیڑھ سو صدی کی روایات کے خلاف ہے، اس لیے بھی کہ وہ اس صورت میں معاشرے میں دینی تعلیم کے فروغ اور اسلامی روایات و اقدار کے تحفظ کے حوالے سے اپنے اساسی مقاصد و اہداف کے حصول میں کامیابی کو مشکوک سمجھتے ہیں اور اس لیے بھی کہ دینی مدارس پر سرکاری کنٹرول کے اس پروگرام کے پیچھے انہیں عالمی استعمار کے عزائم اور ایجنڈا صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے جو سرے سے دینی مدارس کے وجود اور ان کے جداگانہ تشخص ہی کے خاتمہ کے درپے ہے۔ اس لیے دینی مدارس نے پہلے سے چلنے والے رجسٹریشن کے قوانین کے تحت خود کو رجسٹریشن کرانے سے کبھی انکار نہیں کیا، مگر سرکاری مداخلت اور کنٹرول کی راہ ہموار کرنے والے رجسٹریشن کے کسی نئے قانون کو وہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

مذکورہ بالا رپورٹ کے مطابق اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ رجسٹریشن کا نیا قانون آرڈیننس کے بجائے پارلیمنٹ سے منظور کرا کے نافذ کیا جائے اور اس کے عملی نفاذ میں سختی سے کام لیا جائے۔ اس سفارش میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ رجسٹریشن نہ کرانے والے مدارس کی ڈگری کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، کسی نئے دینی مدرسہ کے لیے حکومت سے این او سی کو لازمی قرار دیا جائے گا، دینی مدارس کو فنڈز انٹر مدارس بورڈ کے ذریعے سے دیے جائیں گے اور قانوناً تمام مدارس کو رجسٹریشن کا پابند بنایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سفارش یہ بھی ہے کہ جن علاقوں میں دینی مدارس زیادہ ہیں، وہاں ان کے قریب ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے بنائے جائیں تاکہ علاقہ کے لوگوں کو متبادل تعلیم

کے ذرائع میسر آسکیں۔

ان سفارشات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہ بھولے بادشاہ ابھی تک اسی غلط فہمی میں ہیں کہ دینی مدارس میں پڑھنے اور پڑھانے والے غربت کی وجہ سے مجبوراً ایسا کر رہے ہیں، اس لیے اگر انہیں ڈگری کا لالچ دیا جائے تو وہ حکومتی پروگرام کو قبول کر لیں گے اور اگر انہیں متبادل ٹیکنیکل تعلیم فراہم کر دی جائے تو وہ دینی تعلیم سے دستبرداری اختیار کر لیں گے۔ خدا جانے ہمارے یہ بزرجمہر کس فضا میں بیٹھے یہ باتیں سوچتے رہتے ہیں اور کون انہیں یہ احمقانہ مشورے دیتا ہے۔ ان خدا کے بندوں کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ دینی تعلیم غربت یا ڈگری کا مسئلہ نہیں، ایمان اور عقیدے کا مسئلہ ہے اور جسے یہ بھولے بادشاہ مذہبی انتہا پسندی سے تعبیر کر رہے ہیں، اس کی جڑیں مسلمانوں کی حمیت و غیرت میں پیوست ہیں بلکہ جوں جوں امریکی استعمار اور اس کے ہمنواؤں کی طرف سے اس کی مخالفت بڑھ رہی ہے، اس کے فطری ردعمل کے طور پر دینی تعلیم کے رجحان میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اور جوں جوں دین کے ساتھ وفادارانہ وابستگی کو انتہا پسندی کا نام دے کر اس کی نفی کی جا رہی ہے، دین کے ساتھ مسلمانوں کی کمٹمنٹ میں مزید مضبوطی اور استحکام پیدا ہو رہا ہے۔ یہ فطری ردعمل ہے جسے ڈگری کے لالچ اور ٹیکنیکل تعلیم کے ذریعے سے روکا نہیں جا سکتا۔

بہرحال اس فضا میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام ۱۵ مئی کو کنونشن سنٹر اسلام آباد میں منعقد ہونے والا ''دینی مدارس کنونشن'' خاصی اہمیت کا حامل ہے جو دینی مدارس کی جدوجہد میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا اور دینی مدارس کا یہ قافلہ معاشرہ میں دینی تعلیم کے فروغ اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کے لیے نئے حوصلے اور اعتماد سے سرشار ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ *

O

* روزنامہ اسلام، ۱۳ مئی ۲۰۰۵ء۔

دینی مدارس کی اسناد کا مسئلہ

دینی مدارس کی اسناد کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ اور رجسٹریشن کے حوالے سے صدارتی آرڈیننس بیک وقت سامنے آ گئے ہیں اور دین کی تعلیم دینے والی درس گاہیں ایک بار پھر ملک بھر میں گفتگو اور تبصروں کا موضوع بن گئی ہیں۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس سے قبل عبوری فیصلے میں دینی مدارس کی اسناد رکھنے والوں کو بلدیاتی الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دے دی تھی مگر الیکشن کے پہلے مرحلے سے صرف دو روز قبل حتمی فیصلہ صادر کر کے یہ قرار دے دیا کہ دینی مدارس کے وفاقوں سے شہادۃ ثانیہ رکھنے والے افراد نے چونکہ مطالعہ پاکستان، انگلش اور اردو کے لازمی مضامین کا میٹرک کے درجہ میں امتحان نہیں دیا، اس لیے اس سند کو میٹرک کے مساوی تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اس سند کے حاملین بلدیاتی الیکشن میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ اگرچہ اس فیصلے کا فوری اطلاق ان حضرات پر ہوا ہے جو اس رٹ میں فریق تھے، لیکن اٹارنی جنرل کا یہ کہنا اہمیت رکھتا ہے کہ جن لوگوں نے دینی مدارس کی اسناد کی بنیاد پر بلدیاتی الیکشن میں حصہ لیا ہے، وہ کامیاب ہونے کے باوجود اس فیصلے کی رو سے نااہل ہو جائیں گے بلکہ یہ فیصلہ سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ان ارکان پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے جنہوں نے دینی مدارس کی اسناد کی بنیاد پر الیکشن میں حصہ لیا ہے اور منتخب ہوئے ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے کم و بیش دو سو ارکان اس فیصلے کی زد میں آ سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک معروف قانون دان محمد اسلم خاکی نے اپنی ایک سابقہ رٹ کو جلد از جلد زیر بحث لانے کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان میں

درخواست دے دی ہے۔ان کی رٹ میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ دینی مدارس کی اسناد کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے چونکہ صرف تعلیمی مقاصد کے لیے ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کے برابر تسلیم کیا ہے، اس لیے تعلیمی مقاصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے ان اسناد کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور چیف الیکشن کمشنر نے گزشتہ انتخابات میں شہادۃ العالمیہ کی سند کو ایم اے کے برابر تسلیم کرتے ہوئے اس کے حاملین کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینے کی جو اجازت دی تھی، وہ درست نہیں تھی، اس لیے عدالت عظمیٰ اس اجازت نامے کو منسوخ کرتے ہوئے دینی اسناد پر منتخب ہونے والے اسمبلیوں کے ارکان کو نااہل قرار دے۔ رٹ ابھی موجود ہے اور اس پر فیصلہ ہونا باقی ہے، اس لیے رٹ کے محرک نے دوبارہ درخواست دائر کر دی ہے کہ اس رٹ کو جلد از جلد زیر بحث لایا جائے اور اس پر فیصلہ صادر کیا جائے۔

دوسری طرف بعض سیاسی حلقوں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ دینی مدارس کی اسناد کے بارے میں گومگو اور تذبذب کی فضا قائم رکھنا موجودہ حکومت کی طے شدہ پالیسی کا حصہ ہے تاکہ متحدہ مجلس عمل کو دباؤ میں رکھا جائے اور اسے حکومت کے خلاف کسی عملی تحریک کا حصہ بننے سے روکا جائے۔ ان سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ چونکہ متحدہ مجلس عمل نے اے آر ڈی کے ساتھ مل کر حکومت کے خلاف گرینڈ الائنس قائم کرنے اور احتجاجی تحریک منظم کرنے کا حال ہی میں فیصلہ کر لیا ہے، اس لیے دینی مدارس کی اسناد کی قانونی حیثیت کا مسئلہ دوبارہ سامنے آ گیا ہے تاکہ متحدہ مجلس عمل حکومت کے خلاف عملی تحریک کا حصہ نہ بنے اور اگر وہ حکومت کے خلاف تحریک کے فیصلے میں سنجیدہ ہے تو اسمبلیوں میں اپنے کم و بیش دو سو ارکان کے نااہل قرار دیے جانے کے فیصلے کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہے۔ اس طرح دینی مدارس کی اسناد کا مسئلہ فنی اور تعلیمی دائرے سے نکل کر سیاسی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے جو بہرحال ایک توجہ طلب بات ہے اور اس پر دینی مدارس کے وفاقوں کی اعلیٰ قیادت اور اس کے ساتھ ہی متحدہ مجلس عمل کی ہائی کمان کو بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

جہاں تک فنی مسئلہ کی بات ہے، ہمارے خیال میں جب دینی مدارس کے وفاقوں نے میٹرک کی سطح تک مطالعہ پاکستان، اردو اور انگلش کے مضامین کو اپنے نصاب میں شامل کر کے اس پر

عملدرآمد شروع کر رکھا ہے تو اس تبدیلی کو سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے میں بالکل نظرانداز کیے جانے کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ہمارے خیال میں یہ بات سپریم کورٹ کے علم میں سرے سے لائی ہی نہیں گئی اور دینی مدارس کی اسناد کا دفاع کرنے والے وکلا اس سلسلے میں پورے حقائق عدالت عظمیٰ کے سامنے نہیں رکھ سکے، ورنہ شاید فیصلے کی حتمی صورت یہ نہ ہوتی۔ اب بھی تمام وفاقوں کی قیادت سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ عدالت عظمیٰ میں اس کیس کی خود پیروی کریں اور مذکورہ فیصلے پر نظر ثانی کی اپیل کے لیے ملک کے نامور وکلا سے صلاح مشورہ کر کے دینی مدارس کی اسناد کے دفاع کے لیے پیش رفت کریں۔

جہاں تک رجسٹریشن کا تعلق ہے، ہمارے خیال میں یہ بات اطمینان بخش ہے کہ دینی مدارس کی رجسٹریشن سابقہ سوسائٹی ایکٹ کے تحت کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو خود دینی مدارس کا مطالبہ تھا اور وہ اس ایکٹ کے تحت رجسٹریشن کے لیے نہ صرف تیار تھے بلکہ ہزاروں مدارس نے اس سے قبل سوسائٹی ایکٹ کے تحت اپنی رجسٹریشن کرا رکھی ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ۱۸۶۰ء کے سوسائٹی ایکٹ میں ایک نئی شق کا اضافہ قابل غور ہے جس کے تحت دینی مدارس کے لیے رجسٹریشن کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور سالانہ کارکردگی اور آڈٹ شدہ حسابات کی رپورٹ کی کاپی رجسٹریشن آفس میں جمع کرنے کا انہیں پابند کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ان تینوں امور میں بظاہر کوئی حرج کی بات نہیں اور یہ باتیں نتائج کے حوالے سے دینی مدارس کے لیے فائدہ کا باعث ہی ہوں گی، البتہ دینی مدارس میں فرقہ وارانہ تعلیم کی ممانعت کی شق مبہم ہے، اس لیے کہ فرقہ وارانہ تعلیم کا ایک پہلو یہ ہے کہ ملک میں مختلف مذہبی فرقے آباد ہیں اور ان کے دینی مدارس کام کر رہے ہیں، اس لیے ان فرقوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے، امن عامہ کے مسائل کھڑے کرنے اور قومی وحدت کو مجروح کرنے کی سرگرمیوں کی اجازت نہیں ہونی چاہیے اور ایسی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور ان کی روک تھام کرنا حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، لیکن اس کا دوسرا پہلو علمی و تحقیقی وضاحت سے متعلق ہے جس میں اپنے مسلک کی علمی وضاحت اور دلائل کی بنیاد پر اس کی ترجیح کی طرز اختیار کی جاتی ہے۔ یہ نہ صرف پاکستان کے دینی مدارس میں ہوتا ہے بلکہ دنیا بھر میں تمام مذاہب کی مذہبی درس گاہوں میں اس کا

صدیوں سے اہتمام چلا آ رہا ہے، لہٰذا اس نئے آرڈیننس میں ان دونوں پہلوؤں کے درمیان فرق کی وضاحت ضروری ہے، ورنہ یہ مسئلہ بھی وہی صورت اختیار کر سکتا ہے جو دہشت گردی کے خلاف جنگ کی صورت میں اس وقت دنیا کو درپیش ہے کہ دہشت گردی کی کسی سطح پر کوئی تعریف متعین نہیں ہے اور اسے مکمل طور پر ابہام میں رکھا گیا ہے جبکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے والے اس ابہام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جس مخالف کو چاہتے ہیں، دہشت گرد قرار دے کر اس کے خلاف جنگ کا محاذ کھول دیتے ہیں۔ اسی طرح فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ سرگرمیوں کی حدود اگر واضح طور پر طے نہ کی گئیں تو نہ صرف یہ کہ علم وتحقیق کے راستے مسدود ہو جائیں گے بلکہ یہ بات مکمل طور پر حکومت اور متعلقہ افسران کی صوابدید پر ہوگی کہ وہ جس مدرسہ کو چاہیں فرقہ وارانہ سرگرمیوں میں ملوث قرار دے کر اسے بند کرنے کا حکم جاری کر دیں۔

ہمارے خیال میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور دینی مدارس کے دیگر وفاقوں کی قیادتوں کو اس مسئلے کے حوالے سے صورت حال کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے اور حکومت کے ساتھ مذاکرات اور مفاہمت کے ذریعے سے اس کا فوری طور پر حل نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے، ورنہ یہ بیوروکریسی کے ہاتھ میں دینی مدارس کے خلاف ایک ایسا ہتھیار ثابت ہوگا جس سے ملک کی تمام دینی درس گاہیں مکمل طور پر متعلقہ محکموں اور افسروں کے رحم وکرم پر ہوں گی اور دینی مدارس کی جس آزادی اور خودمختاری کے تحفظ کی ایک عرصہ سے جنگ لڑی جا رہی ہے، وہ فرقہ وارانہ تعلیم پر پابندی کی اس مبہم شق کے باعث بیوروکریسی کے ہاتھ میں گروی ہو کر رہ جائے گی۔ *

O

* روزنامہ اسلام لاہور ۲۰ / اگست ۲۰۰۵ء

دینی مدارس کے حوالے سے چار اہم خبریں

دینی مدارس کے حوالے سے اس ہفتے کے دوران کی چار اہم خبریں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ پہلی خبر یہ ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے اسلام آباد میں ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''دینی مدارس'' پر چھاپوں کا سلسلہ جاری رہے گا اور دہشت گردوں کی تلاش میں اب شہروں میں بھی دینی مدارس پر چھاپے مارے جائیں گے''۔ دوسری خبر یہ ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے دینی مدارس کی اسناد کے بارے میں تفصیلی فیصلہ جاری کر دیا ہے جس میں یہ بات واضح طور پر کہہ دی گئی ہے کہ چونکہ دینی مدارس کی اسناد کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے صرف تعلیمی مقاصد کے لیے کالج اور یونیورسٹی کی اسناد کے برابر قرار دیا ہے، اس لیے تعلیمی مقاصد سے ہٹ کر کسی اور شعبہ بالخصوص انتخابات کے لیے ان اسناد کو کارآمد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تیسری خبر یہ ہے کہ تنظیم المدارس نے اسلام آباد کے کنونشن سینٹر میں منعقدہ دینی مدارس کے عالمی کنونشن میں دینی مدارس کے تحفظ کے عزم کا اعادہ کیا ہے اور اس سلسلے میں حکومتی دباؤ کو مسترد کرنے کا اعلان کیا ہے، جبکہ چوتھی خبر ''آن لائن'' کے حوالے سے ایک قومی اخبار نے یہ نشر کی ہے کہ ملائشیا سے تعلق رکھنے والے دو سو طلبہ جو پاکستان کے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اب وہ پاکستانی حکومت کے فیصلے کے مطابق وطن واپس جا رہے ہیں، ملائیشیا کی حکومت نے اپنے ملک کی یونیورسٹیوں میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کر دی ہے۔

یہ چاروں خبریں ایک ہفتے بلکہ دو تین روز کے دوران کی ہیں اور ان سے بخوبی اندازہ کیا جا

سکتا ہے کہ پاکستان کے دینی مدارس اس وقت کس سطح پر قومی اور عالمی حلقوں میں گفتگو اور بحث و مباحثہ کا موضوع بنے ہوئے ہیں اور اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے دینی مدارس کے وفاقوں کی قیادت کو کس درجے کے تدبر، حوصلہ اور فہم و فراست سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک صدر پرویز مشرف کے اس اعلان کا تعلق ہے کہ دہشت گردوں کی تلاش میں دینی مدارس پر چھاپوں کا سلسلہ جاری رہے گا اور اب شہروں میں بھی دینی مدارس پر چھاپے مارے جائیں گے، ہمارے نزدیک یہ بات خود صدر پرویز مشرف کی حکومت کے ذمہ دار افراد کے ان اعلانات کی نفی کے مترادف ہے کہ دینی مدارس میں دہشت گردی کی ٹریننگ نہیں دی جاتی اور اس سلسلے میں اب تک کی تمام تحقیقات میں دینی مدارس پر لگائے گئے اس الزام کی نفی ہوتی ہے۔

سابق وزیر اعظم اور وزیر داخلہ اور موجودہ حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے اسلام آباد میں ہزاروں علمائے کرام کے کنونشن میں کھلے بندوں اعلان کیا تھا کہ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں دینی مدارس کے حوالے سے ملک گیر سطح پر تحقیقات کرائی تھیں اور کوئی مدرسہ دہشت گردی میں ملوث نہیں پایا گیا تھا۔ وفاقی وزیر مذہبی امور اعجاز الحق نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی دینی مدرسہ دہشت گردی کی ٹریننگ میں ملوث پایا گیا تو وہ اپنے منصب سے مستعفی ہو جائیں گے۔ سندھ کے گورنر عشرت العباد کا یہ بیان قومی پریس کے ریکارڈ میں موجود ہے کہ صوبہ سندھ میں اب تک دہشت گردی کے الزام میں جتنے لوگ پکڑے گئے ہیں، ان میں ستر فیصد وہ ہیں جنہوں نے دینی مدرسہ دیکھا تک نہیں۔ موجودہ وفاقی وزیر تعلیم جاوید اشرف قاضی متعدد بار اعلان کر چکے ہیں کہ پاکستان کے دینی مدارس میں دہشت گردی کی ٹریننگ کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ اس سب کچھ کے باوجود صدر پرویز مشرف کے نزدیک دینی مدارس ہی دہشت گردی کے مراکز ہیں اور وہ دہشت گردوں کی تلاش میں دینی مدارس پر چھاپے مارنا چاہتے ہیں تو یہ بات دینی مدارس کے قائدین کے لیے تو یقیناً قابل غور ہے ہی مگر ان سے کہیں زیادہ مذکورہ بالا حضرات کے لیے لمحہ فکر یہ ہے کہ صدر پرویز مشرف کے اس اعلان کے بعد ان حضرات کے مذکورہ بیانات کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے اور جس عالمی برادری کو مطمئن کرنے کے لیے وہ دینی مدارس کی صفائی پیش کر رہے ہیں، اس برادری کے نزدیک

صدر پرویز مشرف کے اپنے بیان کے سامنے ان کی اس صفائی کا کیا وزن ہے؟

جہاں تک دینی مدارس میں دہشت گردی کی ٹریننگ یا دہشت گردوں کی موجودگی کا تعلق ہے ،اس سلسلے میں دینی مدارس کے تمام وفاقوں کے اس واضح موقف کے بعد اس الزام کو دہرانے کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز باقی نہیں رہ جاتا کہ جن مدارس میں بعض حکومتی حلقوں کے نزدیک دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے،ان کی نشان دہی کی جائے۔ان کے خلاف کارروائی میں دینی مدارس کی قیادت حکومت کے ساتھ ہوگی،مگر کسی ثبوت اور نشاندہی کے بغیر مدارس پر چھاپے مارنے کا سلسلہ درست نہیں کیونکہ یہ دینی مدارس کے تعلیمی سلسلے میں رکاوٹ ڈالنے اور انہیں ہراساں کرنے کے مترادف ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کے بارے میں ہم اس کالم میں اس سے قبل اظہار کر چکے ہیں کہ اس کیس میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے سامنے حقائق نہیں لائے گئے،خصوصاً دینی مدارس کے وفاقوں نے اپنے نصاب میں تبدیلی اور میٹرک کی سطح تک عصری مضامین کو شامل کرنے کے بارے میں جو فیصلے کیے ہیں اور ان پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے،اس لیے عدالت عظمیٰ سے اسی فیصلے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں وفاقوں کی قیادت اس سلسلے میں صرف عوامی دباؤ اور سیاسی جدوجہد پر انحصار کیے ہوئے ہے اور عدالت عظمیٰ میں سنجیدگی کے ساتھ اس کیس کی پیروی کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی،ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ہم سیاسی دباؤ اور عوامی ردعمل کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کو منظم طریقے سے آگے بڑھانے کے حق میں ہیں لیکن عدالت میں کیس کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لڑنے اور اسے صحیح توجہ نہ دینے کے طرز عمل کو ہم درست نہیں سمجھتے۔ابھی عدالت عظمیٰ کے حتمی فیصلے تک ایک مرحلہ باقی ہے جس کا وہ حوالہ اس تفصیلی فیصلے میں بھی موجود ہے۔ ہماری رائے میں وفاقوں کی قیادت کو اس مقدمہ میں فریق بننا چاہیے،پوری توجہ کے ساتھ یہ کیس لڑنا چاہیے اور اس سلسلے میں تمام حقائق عدالت عظمیٰ کے فورم پر قوم کے سامنے لانے چاہئیں۔اگر خدانخواستہ عدالت عظمیٰ کا حتمی فیصلہ مدارس کے خلاف بھی ہوا تو کم از کم حقائق اور اصل صورت حال تو عوام کے سامنے ہوگی اور عدالت عظمیٰ میں مقدمہ خدانخواستہ ہار جانے کی صورت میں بھی دینی مدارس کی قیادت عوامی

محاذ پر سرخرو رہے گی۔

تنظیم المدارس کے عالمی کنونشن میں جس جرات اور حوصلہ کے ساتھ دینی مدارس کے بارے میں وفاقوں کے اجتماعی موقف کا اعادہ کیا گیا ہے، وہ انتہائی خوش آئند ہے اور بالخصوص مولانا مفتی منیب الرحمٰن نے دینی مدارس کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے جس پر وہ مبارک باد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس سے قبل وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے اسی کنونشن سینٹر میں دینی مدارس کے موقف اور پالیسی کے قومی سطح پر اظہار کا اہتمام کیا تھا جس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اب تنظیم المدارس کے کنونشن سے بات مزید آگے بڑھی ہے اور نہ صرف پاکستان کے عوام کے سامنے بلکہ عالمی سطح پر بھی دینی مدارس کی صحیح پوزیشن کی وضاحت میں اس سے مدد ملی ہے۔ اگر دیگر وفاق بھی اس طرح کے اجتماعات کا اہتمام کریں تو اس سے نہ صرف مدارس کی باہمی ہم آہنگی میں اضافہ ہوگا بلکہ دینی مدارس کی آزادی اور خودمختاری کے تحفظ کی جدوجہد بھی مزید مضبوط ہوگی۔

پاکستان کے دینی مدارس سے نکالے گئے ملائشین طلبہ کو ملائشیا کے تعلیمی اداروں میں داخلہ دینے پر پابندی کی خبر بھی اس لحاظ سے توجہ طلب ہے کہ اس سے نہ صرف دو سو طلبہ کا تعلیمی مستقبل تاریک ہو جائے گا بلکہ دینی تعلیم کے حصول کے رجحانات کی بھی حوصلہ شکنی ہوگی جو شاید ایسا کرنے والوں کا اصل مقصد ہے، مگر عالمی سطح پر دینی مدارس کا مقدمہ لڑنے کے لیے سرے سے کوئی فورم ہی موجود نہیں ہے تو ان غریب طلبہ کے تعلیمی مستقبل کے تحفظ کی فکر آخر کیسے ہوگی؟*

O

* روزنامہ اسلام، ۲؍ستمبر ۲۰۰۵ء۔

عصری تعلیم اور بین الاقوامی مطالبات

اشاعتی اداروں سے منسلک مزدوروں کے
معاشی قتل کی منصوبہ بندی

نصابی کتابوں کی تیاری، طباعت اور تقسیم کا نظام بین الاقوامی اداروں کے سپرد کرنے کے حکومتی فیصلے نے قومی حلقوں میں تشویش کی ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے اور پنجاب پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں نے گزشتہ دنوں لاہور میں ایک تقریب کے دوران اپنے خدشات کا اظہار کیا ہے جن پر سنجیدگی سے توجہ دینا ضروری ہے۔ ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر زبیر سعید کے مطابق وفاقی کابینہ کی طرف سے صوبائی ٹیکسٹ بک بورڈوں کو ڈی ریگولیٹ کرنے کے احکامات صادر کر دیے گئے ہیں اور ان احکامات کے نتیجے میں صوبائی ٹیکسٹ بک بورڈوں سے وابستہ چھ سو نجی اشاعتی ادارے اور ان سے منسلک لاکھوں مزدوروں، ہزاروں کتب فروشوں اور کروڑوں غریب طلبا، والدین اور اساتذہ تشویش کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اقدام غیر ملکی ملٹی نیشنل اشاعتی اداروں کے ایما پر کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں بچوں کی نصابی کتب بے تحاشا مہنگی ہو جائیں گی اور ان میں ملکی مفاد اور پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کے خلاف ایسا مواد بھی طلبہ کو پڑھنا پڑے گا جس کی یلغار کو ٹیکسٹ بک بورڈ کی نصابی کتب میں ہمیشہ روکا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وفاقی حکومت کے اس اقدام سے نہ صرف نصابی کتب تین گنا سے نو گنا تک مہنگی ہو جائیں گی بلکہ غیر ملکی ناشرین کو بیش بہا مالی فوائد مستقل طور پر حاصل ہوں گے۔ پاکستانی اشاعتی ادارے بند اور لاکھوں ملازمین بے کار اور بے روزگار ہو جائیں گے، جب کہ وفاقی اور صوبائی حکومت کے محصولات میں بھی چار کروڑ کے

لگ بھگ کمی ہو جائے گی۔

ملک کے نصاب تعلیم کو عالمی معیار اور بین الاقوامی یکسانیت کے دائرہ میں لانے کے عنوان سے ایک عرصے سے مہم جاری ہے اور اس کا سب سے بڑا ہدف یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں رائج سرکاری نصاب تعلیم میں موجود تھوڑا بہت مذہبی مواد ہے۔ اقوام متحدہ کے تعلیمی اداروں اور دیگر بین الاقوامی حلقوں کا کہنا ہے کہ اسلام کا معاشرتی کردار، خاندانی نظام کے قرآنی احکام اور جہاد سے متعلق آیات واحادیث پڑھنے کے بعد پاکستانی طالب علم اس بین الاقوامی فکر و فلسفہ اور ثقافت سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا جو اس وقت پوری دنیا میں عام ہو چکی ہے اور جسے گلوبلائزیشن کے عنوان سے اقوام متحدہ کی چھتری تلے پوری دنیا کا واحد کلچر بنانے کی مہم جاری ہے۔ قرآن کریم، احادیث نبویہ اور فقہ اسلامی کی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان دینی عقائد اور روایات کے حوالہ سے جداگانہ امتیاز کو اپنے ذہن اور عادات میں سمو لیتا ہے اور بین الاقوامی برادری کے ساتھ فکر و فلسفہ اور کلچر و ثقافت کے حوالے سے ایڈجسٹمنٹ قبول نہیں کرتا، اس لیے ان عالمی اداروں کے نزدیک نصاب تعلیم سے اس قسم کے دینی عنصر و مواد کو خارج کرنا ضروری ہے اور اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم کے شعبے کو بھی سیکولر بنیادوں پر استوار کرنا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

اس مقصد کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف تجاویز اور جزوی اقدامات سامنے آتے رہے ہیں لیکن مذہبی حلقوں اور رائے عامہ کے تحت اس طرف موثر پیش رفت نہیں ہو سکی۔ اس سلسلے میں ورلڈ بنک اور اقوام متحدہ کے تعلیمی ادارے اس قدر حساس ہیں کہ حکومتی حلقے کی ایک انتہائی ذمہ دار شخصیت کی روایت کے مطابق جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں جب مسجد مکتب سکیم کا آغاز کیا گیا، جس کے تحت پرائمری اسکول کی تعلیم کے لیے مساجد کو مرکز بنانا مقصود تھا، اس کے ذریعے بہت تھوڑے اخراجات کے ساتھ خواندگی کے تناسب میں معقول اضافے کی منصوبہ بندی کی جا چکی تھی، اور تجربے کے طور پر ہزاروں مسجد مکتب اسکولوں نے کام شروع کر دیا تھا، مگر ورلڈ بینک کی مداخلت پر یہ منصوبہ اچانک ختم کر دیا گیا تھا اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ اس طرح بچوں کی زیادہ تعداد کو پرائمری اسکول

کے لیے مسجد کے ماحول میں چار پانچ سال رہنا پڑے گا جس سے بنیاد پرستوں کے تناسب میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا، اس لیے سرے سے یہ منصوبہ ہی ختم کر دیا گیا۔

اب بھی شنید ہے کہ ورلڈ بنک نے یہ شرط لگائی ہے کہ جب تک نصابی کتب کی تیاری اور تقسیم کو اقوام متحدہ کے تعلیمی اداروں اور بین الاقوامی اشاعتی اداروں کی نگرانی میں نہیں دیا جائے گا، اس وقت تک تعلیمی مقاصد کے لیے ورلڈ بنک کی طرف سے رقوم فراہم نہیں کی جائیں گی، چنانچہ حکومت پاکستان نے مبینہ طور پر ورلڈ بنک کے اس دباؤ کے سامنے سرنڈر کرتے ہوئے وزارت تعلیم کی نگرانی میں نصابی کتب تیار کرنے والے سرکاری ٹیکسٹ بک بورڈوں کو ہی سرے سے ختم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا ہے جس کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ سر دست نصابی کتب کی تیاری پاکستانی ماہرین تعلیم ہی کے ذمہ ہو گی مگر طباعت، تقسیم کا نظام بین الاقوامی ادارے سنبھال لیں گے، لیکن جس پس منظر اور ماحول میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستانی ماہرین تعلیم کے ذریعے نصابی کتب کی تیاری کی بات سراسر مشکوک اور مشتبہ ہو جاتی ہے، کیونکہ پاکستانی ماہرین تعلیم کے نام سے جو لوگ سامنے آئیں گے، وہ انہی بین الاقوامی اداروں اور این جی اوز کے تیار کردہ ہوں گے، اور جس طرح پاکستانی معیشت کو ملکی ماہرین معیشت اور ٹیکنو کریٹس کے خوشنما لیبل کی آڑ میں ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی مکمل غلامی میں دے دیا گیا ہے، اسی طرح بین الاقوامی اداروں میں کام کرنے والے پاکستانی ماہرین تعلیم کو سامنے لا کر ان کے ہاتھوں ملک کے تعلیمی نصاب و تعلیم کا جھٹکا کر دیا جائے گا اور سرکاری نصاب تعلیم کو مکمل طور پر سیکولرائز کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کے اشاعتی اداروں اور ان سے وابستہ لاکھوں افراد کے روزگار پر جو زد پڑے گی، وہ اس پر مستزاد ہو گی، اور بین الاقوامی اداروں کی شائع کردہ مہنگی ترین کتابوں کی خرید کا بوجھ جن کروڑوں طلبہ کے والدین پر پڑے گا، وہ تعلیمی ماحول کے لیے انتہائی حوصلہ شکن ہو سکتا ہے۔

ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ایک طرف امریکی دانشور پروفیسر جان وال برج لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے فورم پر پاکستان کے سرکاری تعلیمی نظام میں ''درس نظامی'' کی روایت کے مفقود ہونے کے نقصانات گنوا رہے ہیں اور مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ معاشرہ میں ''درس نظامی'' کا

فعال کردار بحال کرنے کی طرف توجہ دیں اور دوسری طرف پاکستان کے ارباب اختیار ملک کے سرکاری نصاب تعلیم میں تھوڑے بہت دینی مواد کو برداشت نہ کرنے والے بین الاقوامی اداروں کی ہاں میں ہاں ملانے اور پورا نصابی نظام ہی ان کے حوالے کر دینے کے لیے تیار ہو گئے ہیں، اور اس کے لیے وفاقی کابینہ نے احکامات بھی جاری کر دیے ہیں۔

ہم ملک کے سیاسی اور دینی حلقوں سے گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ کی سنگینی کا احساس کریں اور تعلیمی نصاب کو ورلڈ بنک کی غلامی سے بچانے کے لیے اگر وہ کچھ کر سکتے ہیں تو اس کا بروقت اہتمام کریں۔ یہ مسئلہ ملک کی نظریاتی اساس کا ہے، نئی نسل کے عقیدہ وایمان کے تحفظ کا ہے اور لاکھوں پاکستانیوں کے روزگار کا ہے۔ اس سلسلے میں خاموشی یقیناً قومی جرم ہوگی اور اگر خدانخواستہ اس پر خاموشی اختیار کر لی گئی تو اس کا خمیازہ آئندہ کئی نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔*

O

---

* روزنامہ اوصاف، یکم مئی ۲۰۰۱ء۔

عالمی طاقتیں اور نصاب تعلیم

نصاب تعلیم کا مسئلہ آج سے نہیں، صدیوں سے مغربی اقوام کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ ایک تاریخی روایت ہے کہ برطانیہ کے وزیر اعظم گلیڈ اسٹون نے آج سے کوئی سو برس قبل برطانوی پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر قرآن کریم کا نسخہ لہراتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک یہ کتاب مسلمانوں میں پڑھائی جاتی رہے گی، اس وقت تک مسلمانوں میں مذہبی جنون (جہاد) باقی رہے گا اور جب تک مسلمانوں میں مذہبی جنون موجود رہے گا، تب تک انہیں غلام رکھنا ممکن نہیں ہے۔ یہ روایت معلوم نہیں کہاں تک درست ہے، مگر حقائق کے اعتبار سے اس کی واقعیت میں کلام کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ جو مسلمان ایک دفعہ قرآن کریم کے مضامین سے اجمالی طور پر بھی واقف ہو جاتا ہے، اسے اسلام سے ہٹانا اور کفر کی کسی بات سے سمجھوتے اور مفاہمت کے لیے تیار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ گزشتہ دنوں ایک محفل میں چند دوست حکومت پاکستان کی طرف سے قائم کیے جانے والے مجوزہ دینی مدارس کے بارے میں بات کر رہے تھے اور کچھ خدشات کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ گھبرانے کی بات نہیں کیونکہ سرکاری خرچ سے پڑھایا جائے یا غیر سرکاری خرچ سے، اگر یہی قرآن کریم پڑھایا جائے گا تو عقیدہ وفکر کے اعتبار سے نتیجہ کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگا اور قرآن کریم اپنے پڑھنے والوں کے دماغوں پر یکساں اثرات قائم کرے گا۔

تحریک آزادی کے ممتاز رہنما مولانا محمد علی قصوریؒ کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی ندوۃ العلما لکھنو کے سربراہ تھے، انہی دنوں یو پی کے انگریز گورنر سر جان

ہیرٹ نے انہیں بلا کر پیشکش کی کہ اگر ندوہ کے نصاب میں حدیث رسول کو لازمی کے بجائے اختیاری مضمون قرار دے دیا جائے اور قرآن کریم کی تعلیم کے نصاب سے سورہ انفال، سورہ توبہ، سورہ ممتحنہ اور سورہ صف کو نکال دیا جائے تو انگریزی حکومت ندوۃ العلما لکھنو کو ایک لاکھ روپے سالانہ گرانٹ دینے کے لیے تیار ہے، مگر مولانا شبلی نعمانی نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا شبلی نعمانی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا اور یہ اس سے پہلے کا قصہ ہے۔ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ اس وقت کے ایک لاکھ روپے آج کے حساب سے کتنی رقم بنتی ہوگی اور انگریز حکمران ان معاملات میں کس قدر حساس اور سنجیدہ تھے۔

انگریز حکمرانوں کے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ ''درس نظامی'' کے جس نصاب و نظام کو انہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد یکسر ختم کر دیا تھا اور اس نظام کو چلانے والے ہزاروں مدارس بند کر کے ان کی جائیدادیں اور بلڈنگیں ضبط کر لی تھیں، وہ چند درویش صفت علما کی مخلصانہ جدوجہد کی بدولت ایک متوازی نظام کی صورت میں نہ صرف قائم رہا بلکہ دن بدن ترقی کرتے ہوئے دنیا کی تمام استعماری قوتوں کے لیے ایک علمی اور فکری چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا۔

دوسری طرف سرسید احمد خان مرحوم نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی بنیاد پر جس جدید نظام تعلیم کی بنیاد رکھی تھی اور فکر کی آزادی کے نام پر قرآن وسنت کی نت نئی تعبیرات وتشریحات کا جو بیڑا اٹھایا تھا، وہ عام مسلمانوں کو ہضم نہ ہوا اور جدید تعلیم کا نظام راسخ العقیدہ اور دین دار مسلمانوں کے تعاون کے بغیر آگے بڑھتا نظر نہ آیا، اس لیے وہاں بھی مذہبی معاملات کی باگ ڈور ہر دور میں علما ہی کے ہاتھ میں دینا پڑی جس کی وجہ سے علی گڑھ کا نظام تعلیم جدید تعلیم کا مرکز تو بن گیا مگر اسلام کی جدید تعبیر وتشریح کا فلسفہ اس نظام میں ایڈجسٹ نہ ہوسکا۔ اس طرح اس جدید نظام تعلیم میں بھی دین اسلام کی جو تھوڑی بہت تعلیم شامل کی بھی گئی، وہ سرسید کے فلسفے کے بجائے علمائے کرام اور امت کے اجماعی عقیدہ وتعامل کے مطابق تھی اور اس کو پڑھانے اور چلانے کے لیے بھی علما کے روایتی طبقہ سے افراد کار فراہم کیے گئے، چنانچہ علی گڑھ محمڈن کالج میں، جو بعد میں یونیورسٹی کہلایا، شعبہ دینیات کے پہلے سربراہ حضرت مولانا عبداللہ انصاریؒ تھے جو دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم

نانا توویؒ کے داماد اور اپنے وقت کے بڑے عالم دین تھے۔ انہی مولانا عبداللہ انصاریؒ کے بیٹے مولانا منصور انصاری تحریک آزادی میں امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے دست راست تھے۔ مولانا منصور انصاریؒ کے فرزند مولانا حامد انصاری معروف کتاب ''اسلام کا نظام حکومت'' کے مصنف ہیں اور ان کے بیٹے ڈاکٹر عابداللہ غازی آج کل شکاگو (امریکہ) میں اسلامی تعلیمات کے ایک بڑے پراجیکٹ کے نگران ہیں۔

علی گڑھ اور اس کی طرز پر چلنے والے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اگرچہ دینی تعلیم کا مواد بہت کم تھا مگر جتنا بھی تھا، اس کی بنیاد جدید فکر وفلسفہ کے بجائے قدیم روایت پر تھی جو پاکستان کے قیام کے بعد بھی بدستور قائم ہے اور اس میں دینی حلقوں کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے کچھ اضافہ ہی ہوا ہے، کمی نہیں ہوسکی۔ یہ بات آج کے عالمی تعلیمی حلقوں کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے کیونکہ قرآن کریم، حدیث رسولؐ اور فقہ اسلامی کا خواہ کتنا تھوڑا حصہ ہی کیوں نہ ہو، اگر اس کا مواد قدیمی ہے اور طرز روایتی ہے تو اس کے اثر انداز ہونے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی اور اس کی تعلیم وتدریس کے مرحلہ سے گزرنے والا مسلمان عملی لحاظ سے خواہ کتنا ہی بے کار ہو، مگر قرآن وسنت اور دین کی بنیادوں کے ساتھ کمٹمنٹ کے اعتبار سے وہ یقیناً بے لچک ثابت ہوگا۔

اسی وجہ سے اقوام متحدہ کے تعلیمی اداروں اور دیگر بین الاقوامی تعلیمی حلقوں کی طرف سے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے تعاون سے پاکستان پر دباؤ بڑھایا جا رہا ہے کہ وہ سرکاری نصاب تعلیم کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنائے جس کا مطلب یہ ہے کہ دینیات کا وہ حصہ جسے بین الاقوامی حلقے بنیاد پرستی میں اضافے کا باعث سمجھتے ہیں اور اس میں جہاد کے احکام کے علاوہ خاندانی نظام اور نکاح وطلاق اور وراثت کے شرعی احکام بھی شامل ہیں، اسے نصاب سے نکال دیا جائے۔ گزشتہ دنوں قرآنی تعلیم کے مواد سے سورہ توبہ اور سورہ انفال کو طلبہ اور طالبات کے لیے مشکل قرار دیتے ہوئے نصاب سے خارج کرنے کی جو آواز اٹھی تھی، وہ اسی پس منظر میں تھی اور اسی تقاضے کی صدائے بازگشت تھی جو ایک صدی قبل یوپی کے انگریز گورنر نے ندوۃ العلما لکھنو کے سربراہ مولانا شبلی نعمانی سے کیا تھا، لیکن یہ تقاضا جب خالص غلامی کے دور میں قابل قبول نہیں تھا تو آج بظاہر آزادی کے دور

میں کس طرح قبولیت حاصل کر سکتا ہے؟ مگر سیکولر حلقوں کی چابک دستی کو داد دیجیے کہ جو بات وہ سیدھے راستے سے منوانے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے، اس کے لیے انہوں نے بالواسطہ طریقہ اختیار کر لیا ہے اور وہ جنرل پرویز مشرف کی کابینہ سے یہ فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ نصابی کتابوں کی تیاری اور طباعت کی ذمہ داری سرانجام دینے والے ٹیکسٹ بک بورڈز ڈی ریگولیٹ کر دیے گئے ہیں اور اب یہ کام بین الاقوامی اداروں کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ یعنی اپنے تقاضوں اور مطالبات کو حکومت پاکستان سے براہ راست منوانے میں کامیابی کے امکانات واضح نہ دیکھتے ہوئے بین الاقوامی اداروں نے یہ سارا کام ہی اپنے ہاتھ میں لینے کا راستہ صاف کر لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملک کے دینی حلقے اور محبّ وطن تعلیمی ادارے اس صورت حال کا کس طرح سامنا کرتے ہیں اور بین الاقوامی سیکولر حلقوں کے اس ''کامیاب وار'' کے توڑ کے لیے کیا راستہ اختیار کرتے ہیں؟*

O

* ہفت روزہ الہلال راول پنڈی، ۱۱ تا ۱۷ مئی ۲۰۰۱ء۔

میٹرک کا نصاب اور سورہ توبہ

میرپور آزاد کشمیر کے ضلع مفتی مولانا قاضی محمد اویس خان ایوبی نے ''اوصاف'' میں شائع ہونے والے ایک مراسلے میں بتایا ہے کہ پاکستان کی وفاقی وزارت تعلیم کے بعض ذمہ دار حکام میٹرک کے نصاب تعلیم سے قرآن کریم کی سورہ توبہ کو خارج کرنے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس سے قبل بھی راقم الحروف کے علم میں بعض ذرائع سے یہ بات آچکی ہے کہ وفاقی وزارت تعلیم میں اس قسم کی کھسر پھسر جاری ہے اور اس سلسلہ میں اسلام آباد میں ایک اجلاس بھی ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ سورت بہت مشکل ہے اور ملک کے مختلف حصوں سے طلبہ کے خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ اس سورہ کا ترجمہ پڑھنا ان کے لیے دشوار ہے اور انہیں امتحان میں دقت پیش آتی ہے۔ ملک کے کسی بھی حصے سے وزارت تعلیم کے حکام کے نام اس قسم کے خطوط کا اہتمام کرنا ان این جی اوز کے لیے کوئی بھی انوکھا کام نہیں ہے جو رفاہی اور تعلیمی سرگرمیوں کے نام پر بین الاقوامی اداروں کے تعاون سے ملک میں ذہنی انتشار اور فکری انارکی کی فضا پیدا کرنے کے لیے کام کر رہی ہیں، ورنہ جہاں تک مشکل مضامین کا تعلق ہے، میٹرک کے طلبہ کے لیے اس سے کہیں زیادہ مشکل انگریزی اور ریاضی کے مضامین ہیں اور میٹرک میں فیل ہونے والے طلبہ کی ایک بڑی تعداد بلکہ اکثریت ان دو مضامین کی وجہ سے فیل ہوتی ہے، مگر وزارت تعلیم کے حکام یا این جی اوز نے کبھی طلبہ اور طالبات کی اس مشکل کو دور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی ایسی کسی شکایت کو توجہ کے قابل سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ تعلیم میں نصاب کی بنیاد اس پر نہیں ہوتی کہ طلبہ اپنے لیے کون سی بات کو آسان سمجھتے ہیں اور کون سی بات انہیں مشکل دکھائی دیتی ہے، بلکہ نصاب تعلیم کی بنیاد ضروریات اور ملی تقاضوں پر

ہوتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس سطح پر ہم ان طلبہ اور طالبات کو کیا پڑھانا چاہتے ہیں؟ پھر اس دائرہ کے تعین کے بعد اس کے اندر رہتے ہوئے طلبہ کے لیے متوقع مشکلات کو آسان کرنے کی کوشش میں بھی کوئی حرج نہیں ہوتا۔

جہاں تک سورہ توبہ کا تعلق ہے، ہمیں مولانا قاضی محمد اویس خان ایوبی کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ یہ طلبہ اور طالبات کے لیے مشکل ہو یا نہ ہو، البتہ اس سورہ کے مضامین کو ہضم کرنا ان عالمی طاقتوں اور بین الاقوامی اداروں کے لیے بہت مشکل ہو رہا ہے جو ملت اسلامیہ میں تیزی سے ابھرتے ہوئے جذبہ جہاد کو موجودہ عالمی نظام کے لیے خطرہ سمجھ رہے ہیں اور مسلمان بچوں کا قرآنی تعلیمات سے واقف ہونا ان کے نزدیک ان کے بنیاد پرست ہونے اور جہاد کے احکام وفضائل سے آگاہی ان کے دہشت گرد ہونے کی علامت ہے اور اسی وجہ سے تعلیمی نصاب کے حوالے سے کام کرنے والے عالمی ادارے اور تعلیم کے نام پر مالی امداد دینے والی بین الاقوامی تنظیمیں مسلمان ملکوں پر اپنے نصاب تعلیم پر نظر ثانی اور اس میں دینی معلومات کا عنصر کم سے کم کرنے پر زور دیتی ہیں۔

کچھ عرصہ قبل صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں مسجد مکتب اسکیم کے عنوان سے ملک بھر میں ایک تعلیمی پروگرام شروع کیا گیا تھا جس کا مقصد تعلیمی دائرہ کو وسیع کرنا اور مساجد کو عوامی تعلیمی دائرہ میں شامل کرنا اور خواندگی اور تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ اس پروگرام کے تحت مساجد میں قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ پرائمری اسکولوں کی سطح تک تعلیم کا اہتمام کیا جاتا تھا جس سے پرائمری سطح پر تعلیم کے اخراجات بہت کم ہو جاتے اور زیادہ سے زیادہ بچوں کو اس سے فائدہ ہوتا۔ یہ سلسلہ شروع ہوا اور ملک کے بہت سے حصوں میں مساجد میں اس پروگرام کا آغاز بھی ہوا مگر بعد میں یہ اسکیم ختم کر دی گئی اور واقفان حال نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ عالمی اداروں کے خیال میں اس طرح ملک میں بچوں کی بہت زیادہ تعداد کو مساجد کے ماحول میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا، اس نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی اکثریت بچپن میں ہی بنیاد پرستی کی خوگر ہو جاتی، اور اس کے نتیجے میں بنیاد پرستوں کے تناسب میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ مبینہ طور پر عالمی اداروں کی مداخلت کی وجہ سے یہ مفید اسکیم ختم کر دی گئی۔ اس سابقہ تلخ تجربہ کے پیش نظر محسوس ہوتا ہے کہ میٹرک کے نصاب سے سورہ توبہ کو خارج کرنے کی یہ تجویز

بھی اسی پس منظر میں پیش کی گئی ہے اور اگر قارئین سورہ توبہ کے مضامین پر ایک نظر ڈال لیں تو انھیں اس تجویز کا پس منظر اور مقصد سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ان سطور میں سورہ توبہ کے سب مضامین کا احاطہ تو مشکل ہے، البتہ ان میں سے چند اہم امور کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے:

یہ سورہ قرآن کریم کے دسویں اور گیارہویں پارے میں ہے اور اس کے دو نام ہیں۔ اسے سورہ براءت بھی کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین کے بہت سے قبائل نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امن کے معاہدات کر رکھے تھے، لیکن بعض قبائل بالخصوص قریش نے ان معاہدات کی شرائط کی پاسداری نہیں کی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان معاہدات سے براءت کے اعلان کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی ایسے تمام معاہدے ٹوٹ گئے جن میں عرب قبائل نے شرائط کو ملحوظ رکھنے کے بجائے من مانی کرنے کی کوشش کی تھی، البتہ جن قبائل نے شرائط کی پابندی کی، ان کے ساتھ معاہدات کو برقرار رکھا گیا۔

اس سورہ کو سورہ توبہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، اس لیے کہ اس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مخلص صحابہ کرام، حضرت کعب بن مالک، حضرت ہلال بن امیہ اور حضرت مرارہ بن ربیع کی توبہ قبول کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جو غزوہ تبوک میں کسی عذر کے بغیر پیچھے رہ گئے تھے۔ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ اس وقت کی ایک عالمی قوت رومن ایمپائر (اس وقت کا امریکہ) نے شام کے راستے سے مدینہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے، جس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا موقع دینے کے بجائے خود شام کی سرحد پر جانے اور وہاں ان کے خلاف محاذ آرا ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے مدینہ منورہ میں سب لوگوں کو جہاد کے لیے تیاری کرنے کا دے دیا۔ سخت گرمی کا موسم تھا، فصلیں پکی ہوئی تھیں، مالی سال کے اختتام کی وجہ سے وسائل اور پیسے کم تھے اور سفر لمبا تھا، اس لیے لوگوں کا جہاد کے لیے جانا بظاہر بہت مشکل تھا، لیکن حضرات صحابہ کرام نے ان تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہا اور ہزاروں کی تعداد میں تیار ہو گئے۔ البتہ منافقوں نے حیلے بہانے شروع کر دیے اور مختلف عذر پیش کر کے ان کی ایک بڑی تعداد پیچھے رہ گئی،

جبکہ صحابہ کرام میں سے مذکورہ بالا تین حضرات ساتھ نہ جا سکے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لشکر لے کر تبوک تک گئے، وہاں ایک ماہ قیام کیا مگر رومی لشکر کو مقابلہ پر آنے کی ہمت نہ ہوئی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ مدینہ منورہ واپسی پر منافقین نے تو جھوٹے عذر اور حیلے بہانے پیش کر کے اپنی جان چھڑا لی، لیکن مذکورہ تین بزرگوں نے صاف گوئی کے ساتھ اپنے قصور کا اعتراف کیا جس پر انہیں یہ سزا دی گئی کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اور آپ کے حکم سے صحابہ کرام نے ان تینوں حضرات کا کئی روز تک سوشل بائیکاٹ کیے رکھا جس میں ان کے ساتھ بول چال اور لین دین کے سارے معاملات ترک کر دیے گئے اور ان کی مسلسل ثابت قدمی کے باعث اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی توبہ قبول کرنے کا اعلان فرمایا جس کا ذکر اس سورہ میں ہے اور اسی وجہ سے اسے سورہ توبہ کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اس سورہ میں غزوہ حنین کا ذکر ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے قدم اکھڑ جانے کے بعد ان کی مدد کی اور انہیں فتح عطا فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی یہ حکم اس سورہ میں بطور خاص مذکور ہے کہ مشرکین کو آج کے بعد مکہ مکرمہ میں مسجد حرام اور بیت اللہ شریف کے قریب آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ پھر اس سورہ میں یہود و نصاریٰ کی سرکشی اور نافرمانی کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کے علما اور پیروں کی ایک بڑی تعداد نے خود کو خدائی مقام عطا کر رکھا ہے اور وہ لوگوں کا مال اس کے ذریعے سے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اس سورہ میں مسلمانوں کو جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب دی گئی ہے اور جہاد سے پیچھے رہنے والے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ اس میں جہاد کے فضائل بیان کیے گئے ہیں، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کا جنازہ پڑھنے سے روکا گیا ہے جبکہ سورہ کے اختتام پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ان میں دین کا علم اور تفقہ حاصل کرنے والی ایک جماعت ضرور موجود رہنی چاہیے جو دینی معاملات میں امت کی راہنمائی کرتی رہے۔

یہ سورہ توبہ کے بعض مضامین کی ایک ہلکی سی جھلک ہے جس سے بخوبی انداز کیا جا سکتا ہے کہ اس سورہ کو میٹرک کے نصاب سے نکالنے کی تجویز کا اصل مقصد کیا ہے۔*

---

* روزنامہ اوصاف اسلام آباد، ۴؍ فروری ۲۰۰۰ء۔

تعلیمی نظام کی سیکولرائزیشن کا ایجنڈا

۱۵/اپریل کو اسلام آباد میں ایک دوست کے ہاں شام کے کھانے پر کچھ احباب سے ملاقات ہوئی جن میں ایک دوست نے جو پاک سیکرٹیریٹ میں اہم عہدے پر کام کرتے ہیں، توجہ دلائی کہ ریفرنڈم سے زیادہ اس کے بعد تیزی سے آگے بڑھائے جانے والے ایجنڈے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے جس کے لیے ہوم ورک مکمل ہو چکا ہے، ہدایات آ چکی ہیں اور گرین سگنل مل چکا ہے، اس لیے علمائے کرام اور دینی حلقوں کو اس کا سامنا کرنے کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ سب سے زیادہ سنگین مرحلہ ''تعلیمی نصاب ونظام'' کا ہوگا جسے بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کے عنوان سے از سر نو مرتب کیا جا رہا ہے اور ملک کے سرکاری تعلیمی نصاب سے ہر سطح پر ایمان وعقیدہ، جہاد اور اسلام کے عالمی کردار سے متعلقہ تمام تر مواد خارج کر دینے کا پروگرام بن چکا ہے اور ملک کے تعلیمی نظام کی سیکولرائزیشن کا منصوبہ ہوم ورک کی حد تک مکمل ہو چکا ہے۔

یہ باتیں رات کے کھانے پر ہوئیں مگر اسی رات کے اختتام پر ہم ناشتے کے دسترخوان پر تھے کہ اخبارات آ گئے اور ایک اخبار میں این این آئی کے حوالے سے ضلع کونسل پشاور کی یہ قرارداد نظر سے گزری جس کے ذریعے ایک خاتون کونسلر نے سرحد حکومت سے اس بات پر احتجاج کیا ہے کہ صوبہ کے تعلیمی اداروں میں سکولوں کی سطح پر تھیالوجی اور قاری صاحبان کی سیٹیں ختم کر کے ان کی جگہ بیوٹیشن اور میوزیشن کی آسامیاں پیدا کی جا رہی ہیں تا کہ نئی نسل کو آرایش اور میوزک کی باقاعدہ تعلیم دی جا سکے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ بعض اخباری اطلاعات کے مطابق محکمہ تعلیم کے نصاب میں بنیادی تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں اور اسکولوں میں قاری اور تھیالوجی کی پوسٹیں ختم کر کے اس کی جگہ بیوٹیشن اور

میوزیشن کی آسامیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہماری بچیوں کو میڈونا، ماریا کیری بنایا جائے گا؟ نہیں، ہم بحیثیت مسلمان اس کی قطعی اجازت نہیں دے سکتے، اس لیے حکومت اس کی وضاحت کرے اور اگر ایسا کوئی فیصلہ کیا گیا ہے تو وہ واپس لیا جائے۔ قرارداد میں خاتون کونسلر نے تقاضا کیا ہے کہ اگر حکومت نے فنون لطیفہ کو ترقی دینی ہے اور صوبائی وزیر کو اس کا بہت زیادہ شوق ہے تو وہ علیحدہ ادارے بنائے اور سرکاری اسکولوں میں مفت کمپیوٹرائزڈ، معاشرتی انصاف اور خواتین کے حقوق کا نصاب متعارف کرائے۔ قرارداد کے ساتھ ضلع کونسل پشاور کی اس خاتون کونسلر کا نام نہیں ہے، لیکن جس خاتون نے بھی یہ قرارداد پیش کی ہے، ہم اس کے شکر گزار ہیں کہ اس باغیرت خاتون نے ایک خطرناک رجحان اور فتنہ کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ قوم کو اس سے بروقت خبردار کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے اور صوبہ سرحد کے غیور مسلمانوں کے علاوہ بطور خاص دین دار اور غیرت مند خواتین کے جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف ملک بھر میں ریفرنڈم کی حمایت میں جلسے کر رہے ہیں جن سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیونکہ وہ خود اعلان فرما چکے ہیں کہ ریفرنڈم کا اعلان انھوں نے جیتنے ہی کے لیے کیا ہے، اس لیے وہ جیت ہی جائیں گے بلکہ جیت ہی چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک مسئلہ یہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ اس کے بعد شروع ہونے والا ہے جب وہ ریفرنڈم کے نام پر اپنی صدارت کو پانچ سال کے لیے طے شدہ قرار دے کر ان فائلوں کا فیتہ کھولیں گے جو ان کی میز پر ان کے ''ایکشن'' کے انتظار میں پڑی ہیں اور جن کے لیے امریکی حکومت کے ترجمان نے یہ کہہ کر این او سی بھی جاری کر دیا ہے کہ ''ریفرنڈم کے بارے میں فیصلہ کرنا پاکستان کی عدالتوں کا کام ہے'' اور اس طرح سودی قوانین کے خاتمہ، توہین رسالت پر موت کی سزا کے قانون اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے واضح فیصلوں پر ناک بھوں چڑھانے والے امریکہ نے ریفرنڈم کے بارے میں پاکستانی عدالتوں کو فائنل اتھارٹی تسلیم کر کے دراصل اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے کلیئرنس دے دی ہے جس کا دینی حلقوں کو بروقت ادراک کرنا چاہیے اور اس ایجنڈے کا ''ڈے ٹو ڈے'' سامنا کرنے کے لیے لنگر لنگوٹ کس لینا چاہیے۔ *

* روزنامہ اوصاف، ۱۹/اپریل ۲۰۰۲ء۔

تعلیمی نظام اور بین الاقوامی مطالبات

ملک کا تعلیمی نظام اس وقت سہ طرفہ یلغار کی زد میں ہے اور اعلیٰ سطح پر اس سلسلہ میں جو سرگرمیاں نظر آ رہی ہیں یا در پردہ جاری ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام و نصاب کا کوئی شعبہ بھی ان تبدیلیوں کے اہداف سے باہر نہیں ہے جو پاکستان کے حوالے سے طے کر لی گئی ہیں اور انہیں روبہ عمل کرنے کے لیے ''ہوم ورک'' تیزی کے ساتھ مکمل کیا جا رہا ہے۔

ایک طرف دینی مدارس کا نظام و نصاب ہے جس میں اصلاح و ترمیم کے مختلف شعبے سرگرم عمل ہیں اور اصلاح و ترمیم کا اصل ہدف امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کی اس حالیہ بریفنگ کے بعد بالکل واضح ہو گیا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ دینی مدارس بنیاد پرستی اور دہشت گردی کی اصل آماج گاہ ہیں جو امریکہ کے لیے باعث تشویش ہے اور اس کا اصل حل یہ ہے کہ ان میں جو نظریہ پڑھایا جاتا ہے، اسے تبدیل کیا جائے۔ یہ بات اس سے قبل سابق امریکی صدر بل کلنٹن جدہ میں اکنامک فورم سے خطاب کرتے ہوئے سعودی عرب کے حوالے سے بھی کہہ چکے ہیں کہ سعودی عرب کے نصاب تعلیم میں عقیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اپنے مذہب کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ کا درس دیا جاتا ہے جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

گویا بات بڑھتے بڑھتے اپنے اصل نکتہ اور ہدف تک آ گئی ہے کہ امریکہ اور اس کے ہم نواؤں کو اصل اعتراض اس پر ہے کہ سعودی عرب، پاکستان یا دوسرے مسلم ممالک کے دینی تعلیمی اداروں میں عقیدہ کے حوالہ سے جو تعلیم دی جاتی ہے اور یہ پڑھایا جاتا ہے کہ اسلام حق مذہب ہے اور

دوسرے مذاہب باطل ہیں، اس لیے دنیا میں ایک حق مذہب کے طور پر اسلام کی بالادستی نسل انسانی کی ضرورت ہے، یہ تعلیم بعض مغربی دانش وروں کے نزدیک غلط ہے اور ان کے بقول عالمی رواداری اور ہم آہنگی میں رخنے پیدا کرتی ہے۔ان حضرات کا کہنا ہے کہ اپنے دائرہ میں مذہب کی تعلیم دی جائے لیکن دوسرے مذاہب کو غلط نہ کہا جائے اور انہیں باطل قرار دے کر ان کی مخالفت نہ کی جائے۔ یہ بات اسلام کے مزاج اور بنیادی عقیدہ کے خلاف ہے اور اسی طرح کی بات ہے جو مشرکین مکہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشکش کے طور پر کہی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کو غلط کہنا چھوڑ دیں اور ہم آپ کے رب کی پرستش میں شریک ہوجاتے ہیں، اس طرح ایک دوسرے کی مخالفت کیے بغیر ہم باہمی رواداری کے ساتھ اکٹھے رہ سکیں گے، لیکن قرآن کریم نے سورہ ''الکافرون'' کی صورت میں اس پیشکش کو یکسر مسترد کر دیا تھا اور عقیدہ کے حوالے سے کوئی لچک یا ایڈجسٹمنٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آج بھی دینی نصاب تعلیم کے حوالہ سے یہی صورت حال ہے۔مسلمانوں سے تقاضا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی نفی نہ کریں، انہیں بھی اسلام کی طرح ایک صحیح مذہب کے طور پر برداشت کریں اور ان کے بارے میں رواداری کا وہ ماحول پیدا کریں جو مغرب میں ہے جہاں دوسرے مذاہب کجا، خود اپنے مذہب کے بارے میں بھی رواداری کے نام پر بے تعلقی اور عدم دلچسپی کو عقیدہ کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

دینی مدارس سے دوسرا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے نصاب سے وہ تمام چیزیں خارج کریں جو آج کے مروجہ عالمی کلچر میں مسلم معاشرہ کے ضم ہونے میں رکاوٹ ہیں، لیکن دینی مدارس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ قرآن کریم اور سنت نبوی کا جو محفوظ اور مکمل ذخیرہ ان کے پاس موجود ہے، وہ انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اس لیے بھی قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چھانٹی کر کے ان میں کسی چیز کو حذف کرنے، ان میں کوئی اضافہ کرنے یا ان کی طے کردہ ترجیحات کو آگے پیچھے کرنے کا مسلمانوں میں سے کسی کے پاس کسی درجے میں کوئی اختیار موجود نہیں ہے۔ نہ حکمرانوں کے پاس، نہ منتخب اداروں کے پاس، نہ علمائے کرام اور دانش وروں کے پاس اور نہ ہی براہ راست عوام کے پاس اس نوعیت کا کوئی اختیار ہے۔ اس لیے اس حوالہ سے مغربی حکمرانوں کا

دباؤ اور امریکہ بہادر کے تحریص اور تخویص کے حربے دینی مدارس کی مشکلات میں تو ضرور اضافہ کریں گے اور اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ ریاستی قوت بلکہ بین الاقوامی طاقت دینی مدارس کے موجودہ ڈھانچے میں تھوڑے بہت رد و بدل میں کامیابی حاصل کر لے، لیکن ان کا یہ ہدف کہ قرآن وسنت کی تعلیمات میں آج کے عالمی نظام اور بالا دست کلچر کے تقاضوں کی روشنی میں نظر ثانی ہو اور ترامیم یا ترجیحات میں تبدیلی کے کسی عمل سے انہیں گزارا جائے، یہ قطعی طور پر ناممکن ہے جو قیامت تک نہیں ہو سکے گا۔

بہرحال یہ کشمکش جاری ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔ دینی مدارس اس سے قبل ۱۸۵۷ء کے بعد کے متحدہ ہندوستان، سیکولر ترکی اور کمیونسٹ وسطی ایشیا میں اس قسم کی بلکہ اس سے زیادہ شدید اور سنگین صورت حال کا سامنا کر چکے ہیں اور ان بحرانوں سے کامل سرخ روئی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں، اس لیے ان کی قیادت زیادہ پر اعتماد نظر آتی ہے کہ وہ اس بحران میں بھی سرخرو ہوں گے اور دینی تعلیم کے بنیادی ڈھانچے کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے، ان شاء اللہ۔

دوسری طرف ملک کے ریاستی اور سرکاری تعلیمی اداروں کا نصاب ونظام تعلیم بھی رد و بدل کے اس عمل سے دوچار ہے اور اسے دو حوالوں سے یلغار کا سامنا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں جس درجہ میں بھی دینی تعلیم اور اسلامی اقدار کا مواد موجود ہے، اسے نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جہاد کی آیات نصاب سے نکالنے کی کوشش پر قومی اسمبلی میں ہنگامہ ہو چکا ہے اور حکمران گروہ لوگوں کو یہ یقین دلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے کہ نصاب میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی جا رہی، جبکہ سرکاری تعلیمی بورڈ کو آغا خان فاؤنڈیشن کے تعلیمی نظام کے ساتھ منسلک کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آغا خان فاؤنڈیشن کے ذریعے سے ایجوکیشن بورڈز اور تعلیمی نصابوں کو از سر نو سیکولر تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلام کی تعلیم کا جو عنصر کسی بھی درجہ میں موجود ہے، اسے خارج کر کے بین الاقوامی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر پورے نصاب تعلیم کو سیکولر بنا دیا جائے۔ ایک طرف وفاقی وزرا نصاب سے اسلامی مواد خارج نہ کرنے کی یقین دہانی کرانے میں مصروف ہیں اور دوسری طرف آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ تعلیمی بورڈز کو منسلک کر کے عملاً تمام

تبدیلیوں کی راہ ہموار کر دی گئی ہے۔

اس عالمی یلغار کے تیسرے ریلے کا رخ بھی ریاستی اور حکومتی تعلیمی نظام ونصاب کی طرف ہے اوراس کا ہدف یہ ہے کہ تعلیمی نصاب میں جو مواد بھارت کے بارے میں منفی جذبات کا باعث بن رہا ہے، وہ خارج کر دیا جائے۔ اس کی زد میں تاریخ بھی ہے کہ مغلوں کی بادشاہت کا تذکرہ بھارت کے لیے قابل قبول نہیں ہے، تحریک آزادی کے بہت سے مسلم ہیرو بھارت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے، کشمیراور اس کی تحریک آزادی کا تذکرہ بھارت کے خلاف منفی جذبات ابھارتا ہے اور ۶۵ء کی جنگ کے شہدا بھی بھارت کی جارحیت کے خلاف دفاع وطن کا جذبہ پیدا کرنے میں خاصا کردارادا کرتے ہیں۔ یہ سارا مواد تعلیمی نصاب سے خارج کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر پاکستان کو عالم اسلام اور اسلامی برداری سے الگ کرنے کے بعد اب دوسرے مرحلے میں اسے جنوبی ایشیا کی کسی یونین یا کنفیڈریشن کا حصہ بنانے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے، اور ہمیں اس مہم کو دیکھ کر برادر مسلم ملک ترکی یاد آ رہا ہے جسے کہا گیا تھا کہ وہ ترکی ہے، یورپین ہے، اور مغرب کا حصہ ہے۔ اسے عالم اسلام کی چودھراہٹ سے کیا سروکار ہے؟ وہ مسلم دنیا کی چودھراہٹ چھوڑ دے، عالم عرب اور عالم اسلام سے الگ ہو جائے اور ''سب سے پہلے ترکی'' کو اپنا ہدف بنائے۔ اس غریب نے ایسا ہی کیا اور اس کے لیے بہت کچھ قربان کر دیا، لیکن 'نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم' کے مصداق اس کے ہاتھ سے عالم اسلام کی چودھراہٹ بھی گئی، خلافت اور اسلامی نظام قانون بھی ہاتھ سے جاتا رہا اور یورپی یونین میں شرکت کا خواب بھی پورا نہ ہوا۔

پاکستان بنانے والوں نے اسے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے مرکز اور مسلم دنیا کی قیادت کے لیے تشکیل دینے کا تصور پیش کیا تھا۔ علامہ اقبال کا خواب یہی تھا اور قائداعظم تحریک پاکستان کے دوران میں مسلسل یہ بات دہراتے رہے کہ وہ اسلامی تہذیب کے احیا اور ایک فلاحی اسلامی ریاست کا نمونہ پیش کرنے کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن آج یہ سارا فلسفہ، پوری سوچ اور مکمل جدوجہد جنوبی ایشیا کی اجتماعیت اور عالمی ہم آہنگی کے نام پر عالمی استعمار کے ایک اشارۂ ابرو پر قربان کی جا رہی ہے۔ یہ امتحان کا وقت ہے اور آزمائش کا مرحلہ ہے، علمائے کرام کے لیے بھی اور

محبّ وطن دانش وروں کے لیے بھی کہ وہ قوم کو اس بحران سے نکالنے کے لیے کیا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری دینی قیادت اور قومی دانش کو اس نازک مرحلہ میں صحیح اور دانش مندانہ فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔ *

O

* روزنامہ اسلام، ۱۹/ مارچ ۲۰۰۴ء۔

تعلیمی نصاب میں اصلاحات کی نئی بحث

دینی مدارس کے نصاب ونظام میں اصلاح کی بحث ابھی جاری تھی کہ ریاستی تعلیمی نصاب میں اصلاحات وترامیم کا ''پنڈورا باکس'' بھی کھول دیا گیا اور مختلف رپورٹوں اور تجاویز کی صورت میں یہ تقاضے شروع ہو گئے کہ عالمی اور جنوبی ایشیا کی سطحوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ریاستی تعلیمی نظام کی ''اوور ہالنگ'' کی جائے اور نصاب کے اہداف اور مواد، دونوں پر نظر ثانی کر کے اسے ازسرِ نو ترتیب دیا جائے۔

عالمی تبدیلیوں اور جنوبی ایشیا کے حالات میں تغیر کے حوالے سے ہمارے بعض دانش وروں کا خیال یہ ہے کہ مغرب نے ٹیکنالوجی، دولت اور عسکری بالادستی کے زور پر جو فلسفہ حیات اور تہذیب دنیا پر مسلط کر دی ہے، وہ اب ''حرفِ آخر'' ہے اور چونکہ مغربی دانش ور موجودہ دور کو ''اینڈ آف دی ہسٹری'' قرار دے کر اب مزید ارتقا اور تغیر کے امکانات کو رد کر رہے ہیں اور موجودہ عالمی صورت حال کو ہی انسانی سوسائٹی کی ترقی اور ارتقا کی معراج تصور کر رہے ہیں، اس لیے ہمیں بھی اس پر ''ایمان'' لے آنا چاہیے اور اپنی تعلیم وتہذیب، عقیدے اور روایات واقدار کے ہر اس حصے سے دست بردار ہو جانا چاہیے جو مغرب کے فلسفے اور تہذیب سے متصادم ہے یا اس کی بالادستی اور عمل داری میں کسی بھی درجے میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ اسی طرح جنوبی ایشیا کے لیے دنیا کی بالاتر قوتوں نے مستقبل کا جو کردار متعین کر دیا ہے، وہ بھی کسی نظر ثانی، ترمیم یا استرداد کا محتاج نہیں ہے، لہٰذا ہمیں اسے صدقِ دل سے قبول کر کے وہ تمام لکیریں اور دائرے مٹا دینے چاہئیں جو دنیا کے اس خطے کے

بارے میں بالادست قوتوں کے ایجنڈے کی تکمیل کی راہ میں حائل ہو رہے ہیں۔

اس وقت دنیا میں ٹیکنالوجی، دولت اور اسلحہ پر جن قوتوں کی اجارہ داری ہے، وہ یہ سمجھتی ہیں کہ نسل انسانی کی علمی و فکری اور تہذیبی قیادت بھی انہی کا حق ہے اور ان کے علم، فلسفے اور تہذیب کے علاوہ اور کسی علم، فلسفہ و فکر اور ثقافت کو دنیا میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حق حاصل نہیں رہا، اس لیے وہ یہ چاہتی ہیں کہ سیاست و معیشت اور عسکریت کے شعبوں کی طرح تعلیم اور تہذیبی میدانوں میں بھی انہی کی بات مانی جائے اور انہی کی ہدایات پر عمل کیا جائے۔ مغرب کے بالادستی کے اس جنون کی راہ میں مذہب اور ثقافت کے دو عنصر ہی رکاوٹ بن سکتے تھے، اس لیے اس نے دنیا کے مختلف حصوں میں مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کرنے اور علاقائی تقاضوں کو مغربی تقاضوں میں ضم کرنے کے لیے مسلسل محنت کی جس میں اسے خاصی کامیابی بھی حاصل ہوئی اور بہت سے مذاہب کے پیروکاروں اور علاقائی تقاضوں کے علم برداروں نے ہتھیار ڈال کر دست برداری اختیار کر لی ہے، لیکن مسلم دنیا میں اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی عملی و تہذیبی وابستگی بالادست قوتوں کے اس جنون کی تکمیل میں ''کباب کی ہڈی'' ثابت ہو رہی ہے اور دو صدیوں کی مسلسل محنت کے باوجود مسلم معاشروں کو اس بات کے لیے تیار نہیں کیا جا سکا کہ وہ معاشرتی زندگی کے ساتھ مذہب کے تعلق سے دست بردار ہو جائیں اور اپنے علاقائی تقاضوں کو مکمل طور پر مغربی ثقافت میں ضم کر دیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشکل پاکستان میں پیش آ رہی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام ہی مسلم تہذیب و ثقافت کے تحفظ و احیا کے نعرے کے ساتھ عمل میں آیا تھا اور جنوبی ایشیا میں اس کا الگ تشخص صرف اور صرف یہ ہے کہ مسلم تہذیب و ثقافت کو اس خطے کی دوسری اقوام کی تہذیب و ثقافت سے الگ قرار دیتے ہوئے اس کے لیے الگ مملکت کا قیام ضروری سمجھا گیا تھا، ورنہ اگر یہ امتیاز اور تشخص تسلیم نہ کیا جائے تو ایک الگ ملک کے طور پر پاکستان کے قیام کا اور کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا جسے بطور ملک پاکستان کے الگ وجود کی بنیاد قرار دیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے تعلیمی نظام و نصاب میں اصلاح کی بات عالمی ماحول کے حوالے سے ہو یا جنوبی ایشیا کے پس منظر میں، دونوں صورتوں میں اس کا سب سے بڑا ہدف اسلامی تعلیمات ہی قرار پاتی ہیں اور

قرآن وسنت کی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے مواد کو تعلیمی نصاب سے خارج کیے بغیر ملک کے تعلیمی نصاب کو ان گلوبل اور علاقائی تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنا ممکن دکھائی نہیں دیتا جن تقاضوں کو ہماری ''تقدیر'' کا درجہ دے کر ہم سے انہیں بہر حال پورا کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جب تعلیمی نصاب میں قرآن کریم اور حدیث نبوی کا معتد بہ حصہ شامل ہوگا تو اسے ایمان وعقیدہ کے ساتھ پڑھنے والے نوجوانوں کے لیے نہ عالمی سطح پر بالاتر تہذیب وثقافت کو قبول کرنا آسان ہوگا اور نہ جنوبی ایشیا کی بالادست ہندو ثقافت کو ہضم کرنا ہی ان کے بس میں ہوگا، کیونکہ قرآن وسنت میں عقیدے، خاندانی نظام اور ثقافتی اقدار کے حوالے سے مسلمانوں کو اپنا الگ امتیاز وتشخص قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، دوسری قوموں کے عقائد، خاندانی سسٹم اور تہذیب وثقافت کے ساتھ اختلاط سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے اور اپنے عقیدہ وثقافت کے ساتھ صرف وابستگی ہی کی تلقین نہیں کی گئی، بلکہ اسے دوسری قوموں کے سامنے پیش کرنے اور اس کا دائرہ دنیا کی تمام اقوام تک وسیع کرنے کی ہدایات بھی دی گئی ہیں جن میں موجودگی میں دنیا کی تمام اقوام کے عقیدوں، تقاضوں اور خاندانی نظاموں کے ادغام واختلاط کا وہ ہدف مسلم معاشرے میں حاصل ہونا قطعی طور پر ناممکن ہو جاتا ہے جو آج کی بالادست قوتوں کی تمام تر تگ وتاز کا سب سے بڑا ہدف بن چکا ہے۔

اسی طرح اسلامی تاریخ کا معاملہ ہے۔ عالمی حوالے سے حضرت خالد بن ولید، حضرت ابو عبیدہ، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی اور نور الدین زنگی جیسے جرنیلوں اور جنوبی ایشیا کے پس منظر میں محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، ظہیر الدین بابر، اور احمد شاہ ابدالی جیسے فاتحین کا تذکرہ نصاب میں ہوگا تو مسلمانوں اور ہندوؤں میں رواداری اور ہم آہنگی کا وہ ماحول پیدا نہیں کیا جا سکے گا جو آج کی بالادست قوتیں پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ پھر جہاد کا مسئلہ بجائے خود سب سے زیادہ اہمیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ قرآن وحدیث کی تعلیم ہوگی تو جہاد کی تعلیم بھی ہوگی، اس کے فضائل بھی ہوں گے، اس کے احکام بھی ہوں گے اور اس کی ترغیب بھی ہوگی۔ اب یہ بات تو کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ قرآن کریم پڑھایا جائے، حدیث وسنت کی تعلیم دی جائے اور فقہ اسلامی کی

تدریس ہو اور ان میں سے جہاد کے حصوں کو نکال دیا جائے۔

یہ بات سیکولر حلقوں کے لیے الجھن کا باعث بنی ہوئی ہے اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس سب کچھ کی موجودگی میں پاکستانی معاشرے کو نہ تو عالمی ماحول اور بالادست قوتوں کے لیے پوری طرح قابل قبول بنایا جا سکتا ہے اور نہ جنوبی ایشیا اور سارک ممالک کے ساتھ اس سطح پر ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے جس کو اس خطے میں عالمی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمارے سیکولر دانش وروں نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ سرے سے پاکستان کے ریاستی نصاب تعلیم سے قرآن و سنت اور اسلامی تاریخ کے ان حصوں کو خارج کر دیا جائے جو مسلم اور غیر مسلم کا فرق قائم رکھنے کا ذہن پیدا کرتے اور پاکستان کے اسلامی تشخص کو اجاگر کرتے ہیں، اس لیے ان دونوں حوالوں سے ملک کے مروجہ ریاستی تعلیمی نصاب و نظام کے بارے میں جو رپورٹیں سامنے آ رہی ہیں، ان میں اس کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا ہے، اس کی خامیوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے اور اصلاحات و ترامیم تجویز کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام آباد کے ایک ادارے ''سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ پالیسی انسٹی ٹیوٹ'' (SDPI) کی ایک تفصیلی رپورٹ کا خلاصہ ہمارے سامنے ہے جس میں مروجہ ریاستی تعلیمی نصاب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے مطابق پاکستان کے ریاستی نصاب تعلیم میں جو باتیں قابل اعتراض اور لائق اصلاح ٹھہرائی گئی ہیں، ان میں سے چند اہم باتیں درج ذیل ہیں:

☆ نظریہ پاکستان کے نام سے ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان نفرت پیدا کی جا رہی ہے اور اسرائیل کے خلاف بھی ذہن سازی کی جا رہی ہے۔

☆ جہاد اور شہادت کو عظمت دی جا رہی ہے جس سے ہماری نسلوں میں دہشت گردی پیدا ہو رہی ہے۔

☆ قرآن کی تدریس غیر ضروری طریقے سے سب پر ٹھونسی جا رہی ہے۔

☆ ہر طرف سے اسلامیات کے مضمون کو حاوی کر دیا گیا ہے۔

☆ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں، انہیں کافر قرار دے کر ان کی تذلیل کی جا رہی ہے۔

☆ راجہ داہر کو لٹیرا، راہزن اور برے حکمران کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے اور محمد بن قاسم، محمود

غزنوی اور محمد غوری کو ہیرو بنایا جارہا ہے جبکہ تاریخی حقائق اس کے برعکس ہیں۔

☆ پاکستان کو اسلامی ملک قرار دیتے ہوئے اس کے نظام تعلیم کو اسلامی رنگ میں رنگنے اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دینے پر زور بڑھتا جارہا ہے۔

یہ ان اعتراضات وتنقیدات کے چند پہلو ہیں جو صرف نمونے کے طور پر نقل کیے جا رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے ریاستی تعلیمی نصاب کو عالمی اور جنوبی ایشیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر اس میں کس قسم کی ترامیم کا خاکہ تیار کیا جارہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی کم تشویش ناک نہیں ہے کہ ملک کے تعلیمی نصاب کو آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ وابستہ کیا جارہا ہے، اگرچہ اس کی عملی شکل اس وقت ہمارے سامنے واضح نہیں ہے۔

ہمیں عالمی ماحول اور جنوبی ایشیا کے مستقبل کے تقاضوں سے انکار نہیں، نہ ہی مشترکہ امور میں ہم آہنگی کی ضرورت کو مسترد کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے اپنے وجود، تشخص، عقیدے، تہذیب، مذہب اور ماضی سے دست بردار ہوکر ضم ہونا ضروری نہیں، بلکہ اپنے عقیدہ وثقافت اور روایات واقدار پر قائم رہتے ہوئے بھی مشترکہ امور میں تعاون ومفاہمت کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے۔ ہم نے اپنے عروج واقتدار کے دور میں ایک ہزار سال تک مذہب اور ثقافت کے فرق کو برقرار رکھتے ہوئے جنوبی ایشیا میں باہمی رواداری اور ہم آہنگی کا جو ماحول قائم رکھا ہے، آج اس رواداری اور ہم آہنگی کے لیے مذہبی تعلیمات اور تہذیبی امتیازات سے دست بردار ہونا کیوں ضروری سمجھا جا رہا ہے؟ سیکولر دانش وروں سے گزارش ہے کہ وہ گلوبلائزیشن اور جنوبی ایشیا کے سیاسی تغیرات کو سیاست ہی کے دائرے میں رہنے دیں اور اس تاریخی حقیقت کو نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہونے دیں کہ مسلمانوں نے اپنے عقیدے اور ثقافت کے حوالے سے کسی بھی کوشش کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔*

O

* روزنامہ پاکستان، ۲۹/مارچ ۲۰۰۴ء۔

نصاب میں تبدیلی اور آغا خان فاؤنڈیشن

اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تعلیم کے بارے میں متضاد خبریں سامنے آ رہی ہیں۔ حکومتی حلقوں کا کہنا ہے کہ نصاب میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں کی جا رہی ہے، وفاقی وزرا نصاب تعلیم سے اسلامی مواد کو خارج نہ کرنے کی یقین دہانیاں کرا رہے ہیں اور اب وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی نے بھی کہا ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم اسلامی ہے اور اس میں اس حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، لیکن دوسری جانب ملک کے تعلیمی حلقے مسلسل حالت اضطراب میں ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ کے مختلف فورموں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ نصاب میں تبدیلیاں کر دی گئی ہیں، نئی نصابی کتابوں میں متعدد ایسی تبدیلیاں موجود ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ملک کے تعلیمی و امتحانی نظام کو آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ پیش رفت جاری ہے۔ ملک کے دینی حلقے بھی اس حوالے سے خاصے متحرک ہیں۔ گزشتہ روز جامعہ نعیمیہ لاہور میں مختلف دینی جماعتوں کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں صورت حال کو اضطراب انگیز قرار دیتے ہوئے تحریک ختم نبوت کی طرز پر جدوجہد منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہم نے بھی پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام ایک مشاورتی اجلاس ۵/اپریل کو مسجد امن باغبانپورہ لاہور میں مولانا فداء الرحمٰن درخواستی کی زیر صدارت منعقد کیا جس میں متعدد دینی جماعتوں کے رہنماؤں نے شرکت کی اور جامعہ نعیمیہ لاہور کے مہتمم ڈاکٹر سرفراز نعیمی نے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں شرکائے اجلاس کو بریف کیا۔

اس موقع پر دو باتیں خاص طور پر سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ وزیر اعظم پاکستان کی زیر صدارت

منعقدہ اجلاس کے حوالے سے جو یہ خبر آئی ہے کہ نصاب تعلیم سے سورہ توبہ کے اخراج کا فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی جگہ تبدیل کر دی گئی ہے اور سورہ توبہ کو، جو زیادہ تر جہاد کے احکام وواقعات پر مشتمل ہے، میٹرک کے بجائے ایف اے کے نصاب میں شامل کر دیا گیا ہے جس سے وہ لاکھوں طلبہ اس کی تعلیم سے محروم رہیں گے جو میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ دوسری بات یہ کہ اصل مسئلہ ایک سورہ یا چند آیات قرآنی کا نصاب میں شامل کرنا یا ان کی جگہ تبدیل کرنا نہیں ہے، بلکہ اصل متنازعہ امر یہ ہے کہ ملک کے نظام تعلیم کو بتدریج آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے دینی حلقوں کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں اجلاس میں بتایا گیا کہ پاکستان کے تعلیمی نظام کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اسلام آباد میں امریکی سفیر محترمہ نینسی پاؤل اور آغا خان فاؤنڈیشن کے جناب شمس الحق لاکھانی کے درمیان باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوا ہے جس کے تحت آغا خان فاؤنڈیشن اس سلسلے میں بنیادی کردار ادا کرے گی اور حکومت امریکہ کی طرف سے اسے ساڑھے چار سو لاکھ ڈالر دیے جائیں گے۔ اس معاہدے پر وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال اور سندھ کے وزیر تعلیم جناب عرفان مروت نے بھی دستخط کیے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے اس معاہدے کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا ہے اور اس پر عمل درآمد کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خبریں بھی منظر عام پر آ رہی ہیں کہ آغا خان فاؤنڈیشن کے تعلیمی بورڈ کو سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے جو ۲۰۰۶ء سے باقاعدہ امتحانات لینا شروع کر دے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبریں بھی آ رہی ہیں کہ ملک کے تمام تعلیمی بورڈز کو، جن کی تعداد تیئیس بتائی جاتی ہے، اس بورڈ کے ساتھ ملحق کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے اور آغا خان تعلیمی بورڈ کو امتحانی یونیورسٹی کا درجہ دے کر ملک کے تمام تر امتحانی نظام کو اس کی نگرانی میں دیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ملک کے تعلیمی اور دینی حلقے یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ ملک کے سرکاری تعلیمی نظام کی نگرانی آغا خان فاؤنڈیشن کرے گی اور ظاہر ہے، جب ایسا ہوگا تو بات صرف امتحانی سسٹم تک محدود نہیں رہے گی بلکہ نصاب کی تیاری بھی اسی کی نگرانی میں ہوگی۔ اس طرح ملک کی آئندہ نسلوں کی تعلیم وتربیت اور فکر وثقافت کا تمام تر دار ومدار آغا خان فاؤنڈیشن کی پالیسی اور ترجیحات پر

ہوگا۔ اگر حالات کی رفتار کا یہ تجزیہ اور مستقبل قریب کے خدشات کا یہ نقشہ درست ہے تو یہ انتہائی خطر ناک بات ہے اور اس کے بارے میں ملک کے تعلیمی و دینی حلقوں کی طرف سے جس اضطراب کا اظہار کیا جا رہا ہے، وہ نہ صرف درست ہے بلکہ اصل ضرورت سے کہیں کم ہے۔

پاکستان کے تعلیمی نظام کے بارے میں امریکی سفیر اور آغا خان فاؤنڈیشن کے مذکورہ معاہدے نے پاکستانیوں کے لیے دو مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ ایک یہ کہ اب ہمارے تعلیمی نظام ونصاب کے معاملات بھی امریکہ نے براہ راست سنبھال لیے ہیں اور ہمارے وزرا نے اس پر دستخط کر کے اس صورت حال کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام ونصاب کے بارے میں مغربی حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں اور جو مطالبات سامنے آ رہے ہیں، ان کی طرف عملی پیش رفت کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ مغرب کے ان مطالبات میں سرفہرست مطالبہ یہ ہے کہ تمام تر تعلیمی نصاب سے دینی مواد کو خارج کر دیا جائے، اس لیے کہ جب ایک مسلم نوجوان کو عقیدے کی تعلیم دی جاتی ہے اور اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام حق مذہب ہے اور باقی مذاہب حق نہیں ہیں، پھر اس کے ساتھ جب اسے یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنے خاندانی نظام اور عمومی معاشرت میں دوسری اقوام کی پیروی کرنے کے بجائے اپنے دین کے احکام وقوانین پر عمل کرنے کا پابند ہے تو وہ ذہنی، فکری اور عملی طور پر اس عالمی برادری کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہتا جس کی قیادت اس وقت مغرب کے ہاتھ ہے اور جسے ''اینڈ آف دی ہسٹری'' اور ''ترقی یافتہ سولائزیشن'' قرار دے کر مغرب اسے پوری دنیا پر طاقت کے زور سے مسلط کرنے کے درپے ہے۔

مغرب کے نزدیک مسلمانوں اور پاکستانیوں کے عالمی برادری اور سوسائٹی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عقیدہ وثقافت اور خاندان ومعاشرت کے حوالے سے وہ تمام مواد تعلیمی نصاب سے خارج کر دیا جائے جو اسلام کے جداگانہ تشخص اور مسلمانوں کے خاندانی ومعاشرتی نظام کے دوسری قوموں سے امتیاز کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس بنا پر اگر تعلیمی نصاب کے بارے میں مغرب کا یہ موقف قبول کر لیا جائے تو پھر وہ چھوٹی چھوٹی اور جزوی باتیں غیر اہم ہو جاتی ہیں جن کے حوالے سے ہمارے دینی حلقے اس وقت احتجاج کر رہے ہیں اور تعلیمی نظام کا اصل فکری

ڈھانچہ اور ثقافتی فریم ورک ہی سوالیہ نشان بن کر رہ جاتا ہے۔ پھر بات صرف تعلیمی نصاب تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نظریاتی تشخص، اس کے الگ ملک کے طور پر قیام کی نظریاتی اساس اور تہذیبی پس منظر کا جواز بھی دھندلکوں کی نذر ہونے لگتا ہے جسے ملک کا کوئی بھی محبّ وطن شہری ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرسکتا۔

نینسی پاؤل اور شمس الحق لاکھانی کے مذکورہ مبینہ معاہدے سے دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوگیا ہے کہ امریکہ یا مغرب نے پاکستان کے تعلیمی نظام ونصاب کے بارے میں اپنے مقاصد کی طرف پیش رفت میں پاکستان کے معروف حلقوں میں سے کسی پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ اس نے ذریعے کے طور پر ایک ایسی اقلیت کا انتخاب کیا ہے جو اپنے عقیدے اور فکر کے حوالے سے پاکستان کی غالب اکثریت سے کسی طرح کی ہم آہنگی نہیں رکھتی اور عالم اسلام کے بارے میں اس کے سیاسی کردار پر پاکستان کے دینی وتعلیمی حلقے واضح تحفظات وخدشات رکھتے ہیں۔ آغا خان فاؤنڈیشن یا آغا خان یونیورسٹی یقیناً ایک تعلیمی ادارے کے طور پر متعارف ہے اور اسی حیثیت سے اسے سامنے لایا گیا ہے لیکن آغا خان فرقے کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ یہ ایک الگ فرقہ ہے جو عقائد اور سیاسی کردار، دونوں حوالوں سے عالم اسلام کے سواد اعظم سے الگ طرز عمل کا حامل ہے۔ اس طرح مذکورہ معاہدے کی رو سے پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ایک نیا محاذ کھول دیا گیا ہے کہ وہ ایک طرف اپنے تعلیمی نظام اور تہذیب وثقافت کو مغرب کے تقاضوں اور دباؤ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف داخلی محاذ پر اپنے اکثریتی عقائد وروایات کو اقلیتی مداخلت اور دست برد سے بچانے کے لیے بھی محنت کریں۔ یہ ایک نیا محاذ ہے جو مغرب نے کھول دیا ہے اور اب ملک کے دینی حلقوں کو آغا خانی گروہ کے بارے میں ملک کے عوام کو یہ بتانا ہوگا کہ اس اقلیتی فرقے کے عقائد کیا ہیں؟ ملت اسلامیہ کی سیاسی تاریخ میں اس کا کیا کردار رہا ہے؟ عالم اسلام کی موجودہ صورت حال میں وہ کس کیمپ میں کھڑا ہے؟ اور اسلام اور مغرب کی ہمہ گیر کشمکش میں وہ کس کی خدمات سرانجام دے رہا ہے؟

آغا خانی دوستوں کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے لیے جس جگہ اور کیمپ

کا انتخاب کیا ہے، وہ ان کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہوگا اور انہیں اس کی مستقبل میں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی؟ جوں جوں بات آگے بڑھے گی، انہیں اس کا احساس ہوتا جائے گا، لیکن بدقسمتی سے جب وہ احساس وادراک کی اصل منزل تک پہنچیں گے تو واپسی کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔ گزشتہ صدی میں یہ رول اور کردار قادیانیوں نے پسند کیا تھا، وہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ چکے ہیں۔ مغرب نے اب ان کے بجائے اس کام کے لیے کسی اور کو چنا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مغرب کے نزدیک اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس کی ہے جسے دوبارہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ خیر یہ سوچنا آغا خان کمیونٹی کے ارباب دانش کا کام ہے۔ اگر انہوں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے تو یقیناً اس کے نتائج وعواقب سے بھی وہ بے خبر نہیں ہوں گے۔ البتہ اپنے قارئین کو اس بات سے آگاہ کرنا ہم ان کا حق سمجھتے ہیں کہ ''آغا خانی فرقہ'' کون ہے اور اس کا جداگانہ تشخص اور عقائد کیا ہیں؟

پنجاب یونیورسٹی کے ''دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مطابق یہ ''اسماعیلی فرقہ'' کی ایک شاخ ہے۔ اسماعیلی فرقہ حضرت امام جعفر صادق کی وفات کے بعد باقی اہل تشیع سے اس اختلاف پر الگ ہو گیا تھا کہ باقی اہل تشیع نے امام جعفر صادق کے فرزند امام موسیٰ کاظم کو ان کا جانشین اور اپنا امام تسلیم کیا تھا، جبکہ اسماعیلیوں نے ان کے بجائے امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے امام اسماعیل کو ان کے جانشین کے طور پر اپنا امام قرار دیا تھا۔ باقی اہل تشیع کے نزدیک بارھویں امام کے غائب ہونے کے بعد اب ان کی دوبارہ واپسی تک انہی کی امامت چلتی رہے گی، مگر آغا خانی فرقے کے نزدیک اماموں کا یہ تسلسل نسل درنسل چلا آ رہا ہے اور ان کے موجودہ امام پرنس کریم آغا خان انچاسویں امام ہیں۔ اسماعیلیوں کے مختلف گروہ ہیں جن میں ہمارے ہاں خوجے، بوہرے، داؤدی اور آغا خانی معروف ہیں۔ ''دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مطابق آغا خانی فرقے کا عقیدہ یہ ہے کہ امام براہ راست خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اور عقائد وعبادات کی مختلف صورتیں متعین کرنے کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ قرآنی آیات کی تشریح میں اس کا قول آخری ہے، دنیا کا نظام اماموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اخروی نجات کے لیے امام سے تعلق قائم ہونا ضروری ہے اور جو شخص امام وقت کو تسلیم کیے بغیر مر گیا، وہ کافر

کی موت مرے گا۔

اسماعیلی فرقے کی الگ شاخ کے طور پر آغا خانی گروہ کا آغاز ایران میں آقائے حسن علی شاہ کی امامت سے ہوا جو آغا خان اول کہلاتے ہیں۔ ان کی وفات ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ ان کے جانشین آغا خان دوم علی شاہ کی وفات ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔ آغا خان سوم سلطان محمد شاہ ۱۸۸۵ء میں امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان کی ولادت کراچی میں ہوئی اور انہوں نے جنوبی ایشیا کی سیاست میں سرگرم کردار ادا کیا۔ وہ برطانوی وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے اور انہیں اس دور میں متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ تحریک پاکستان میں بھی ان کے کردار کا بطور خاص تذکرہ ہوتا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کی وفات کے بعد پرنس کریم، آغا خان چہارم کے لقب کے ساتھ آغا خانیوں کے امام بنے اور اب تک وہی امام چلے آرہے ہیں۔ ''دائرہ معارف اسلامیہ'' میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں آغا خان فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے جو جنوبی ایشیا، انڈونیشیا، چین، ملایا، مشرق وسطٰی اور افریقہ کے مختلف ممالک کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں میں آباد ہیں، جبکہ کراچی کو آغا خانی سرگرمیوں میں مرکزی مقام حاصل ہے۔

اس پس منظر میں اگر ملک کے تعلیمی اور دینی حلقے اپنے تعلیمی نصاب و نظام کے حوالے سے تحفظات کا اظہار کر رہے ہیں اور تعلیمی سسٹم کو ایک اقلیت کے سپرد کر دینے پر ان کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے تو یہ غیر متوقع اور غیر منطقی ردعمل نہیں ہے۔ حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس اضطراب کو محسوس کریں، اس کے اسباب و عوامل اور نتائج و عواقب کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیں اور اس چنگاری کو شعلہ بننے سے قبل حکمت عملی اور تدبر و حوصلے کے ساتھ قابو کرنے کی کوشش کریں، ورنہ پانی سر سے گزر جانے کے بعد پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔*

O

* روزنامہ پاکستان، ۱۱/اپریل ۲۰۰۴ء۔

قومی نظام تعلیم اور آغا خان تعلیمی بورڈ

''آن لائن'' کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی نے گزشتہ روز اسلام آباد میں ''فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن'' کے بہترین اساتذہ میں انعامات کی تقسیم سے خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ دینی مدارس کے لیے چھ ارب روپے رکھے گئے تھے جن میں سے پانچ ارب روپے دیے جا چکے ہیں اور ایک ارب روپے اب بھی موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ خبر ''انکشاف'' کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے کہ یہ بات تو درست ہے کہ وفاقی حکومت نے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی طرف سے دینی مدارس کی اصلاح کے لیے دی گئی خطیر رقم میں سے چھ ارب روپے دینی مدارس کے لیے مختص کر رکھے ہیں، لیکن ان میں سے پانچ ارب روپے دیے جانے کی بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کیونکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دینی مدارس کی غالب اکثریت ان وفاقوں سے وابستہ ہے جو مختلف مکاتب فکر نے اپنے اپنے دینی مدارس کے نظام اور امتحانات کو مربوط بنانے کے لیے قائم کر رکھے ہیں۔ اس وقت موجودہ پانچ وفاقوں، دیوبندی مکتب فکر کے وفاق المدارس العربیہ، بریلوی مکتب فکر کے تنظیم المدارس، اہل حدیث مکتب فکر کے وفاق المدارس السّلفیہ، شیعہ مکتب فکر کے وفاق المدارس الشیعہ اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے رابطۃ المدارس العربیہ نے متفقہ طور پر اس رقم میں سے کوئی امداد قبول نہ کرنے بلکہ امداد قبول کرنے والے کسی بھی مدرسے کو اپنے اپنے وفاق سے خارج کر دینے کا اعلان کیا ہوا ہے، اس لیے اس صورت حال میں پانچ ارب کی خطیر رقم مدارس میں دیے جانے کی بات قابل فہم نہیں ہے۔ اس

کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں کہ یا تو بہت سے مدارس نے یہ پیسے لے لیے ہیں اور وفاقوں کی قیادت نے معلوم ہوتے ہوئے بھی دھیان دوسری طرف کر لیا ہے اور یا پھر یہ رقم تقسیم کرنے والوں نے ادھر ادھر کر لی ہے اور ریکارڈ میں دینی مدارس کے نام لکھ دی گئی ہے۔ بہر حال جو بھی صورت ہے، قوم کو اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔ ایم ایم اے کے کسی سینیٹر یا ایم این اے کو اگر دوسرے جھمیلوں سے فرصت ہو تو اسے یہ بات پارلیمنٹ کے فلور پر حکومت سے دریافت کرنی چاہیے کہ پانچ ارب کی اتنی بڑی رقم جن مدارس کو دی گئی ہے، ان کے نام بتائے جائیں اور دینی مدارس کے نام پر مختص کی جانے والی رقم کی تقسیم کے بارے میں پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیا جائے۔

وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی نے اپنے مذکورہ خطاب میں آغا خان تعلیمی بورڈ کو امتحانی اختیارات دینے کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس سے کوئی طوفان نہیں آئے گا، اس کی مخالفت بلا جواز ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پرائیویٹ تعلیمی ادارے آغا خان بورڈ کے ساتھ الحاق کر سکتے ہیں، تاہم انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ آغا خان بورڈ کو امتحانی اختیارات دینے کے بارے میں تعلیمی بورڈ میں اختلاف پایا جاتا ہے جسے دور کرنے کے لیے چیئرمین فیڈرل بورڈ کی سربراہی میں تین رکنی کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ آغا خان تعلیمی بورڈ کے حوالے سے ہم اپنے تحفظات کچھ عرصہ قبل اس کالم میں بیان کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں ملک بھر کے تعلیمی حلقوں میں بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔

آغا خان یونیورسٹی کو ’’ایگزامی نیشن بورڈ‘‘ کے قیام کا اختیار دینے کا اعلان صدر جنرل پرویز مشرف کے دستخطوں سے جاری ہونے والے آرڈیننس کے ذریعے سے اب سے دو سال قبل ۸ر نومبر ۲۰۰۳ء کو کر دیا گیا تھا۔ ’’غیر معمولی آرڈیننس‘‘ کے عنوان سے یہ حکم نامہ ’’دی گزٹ آف پاکستان‘‘ میں موجود ہے۔ اس میں ’’آغا خان یونیورسٹی ایگزامی نیشن بورڈ‘‘ کو منظور کرتے ہوئے فوری طور پر اس کا نفاذ عمل میں لایا گیا ہے اور پورے پاکستان کو اس کے دائرہ کار میں شامل کیا گیا ہے۔ آرڈیننس کے ذریعے سے اس بورڈ کو مکمل طور پر خود مختار اور اپنے مقاصد کے لیے قواعد و ضوابط وضع کرنے میں کامل طور پر آزاد قرار دیا گیا ہے۔ آغا خان یونیورسٹی کو یہ حق بھی دیا گیا ہے کہ وہ اپنی کلی صواب دید پر امتحانی بورڈ قائم کرے۔ آرڈیننس میں بتایا گیا ہے کہ آغا خان یونیورسٹی اپنے کلی اختیار

کے تحت امتحانی بورڈ کو پرائیویٹ امیدواروں، پاکستان اور پاکستان سے باہر کے غیر سرکاری اسکولوں اور ان کے طالب علموں کو امتحانات کی پیشکش قبول کرنے کی ہدایت کر سکتی ہے اور امتحانی بورڈ وفاقی وصوبائی حکومتوں کی اجازت کے ساتھ اپنی حدود کار کو سرکاری اسکولوں تک وسعت دینے کا مجاز ہوگا، جبکہ وفاقی حکومت کے زیر انتظام اسکول اور ان کے طالب علم بشمول اسلام آباد کے وفاقی علاقے، نیز وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقے (فاٹا)، شمالی علاقہ جات اور چھاؤنیوں کے علاقوں کے اسکول بھی آغا خان امتحانی بورڈ کے امتحانات کو طے شدہ شرائط پر اختیار کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا صدارتی آرڈیننس کے تحت قائم ہونے والے ''آغا خان تعلیمی بورڈ'' نے اس کے بعد اب تک جو پیش رفت کی ہے، اس سلسلے میں اسلام آباد کے ایک انگریزی روزنامہ میں ۹رفروری ۲۰۰۴ء کو شائع ہونے والی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حکومت نے وفاقی تعلیمی بورڈ کو آغا خان بورڈ سے منسلک کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے۔ اس مقصد کے لیے وفاقی وزیر تعلیم اور فیڈرل ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کے ڈائریکٹر جنرل نے سرگرمی کے ساتھ دباؤ بڑھانا شروع کر دیا ہے، لیکن والدین اور اساتذہ کی انجمن نے اس امر کی مخالفت کی ہے اور اپنے ایک مشترکہ اجلاس میں اس کی مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس منصوبے پر دو طریقوں سے عمل کیا جائے گا۔ پہلے والدین کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ ایک ہی تعلیمی ادارے میں اپنے بچوں کو آغا خان بورڈ کے تحت امتحان دلانا چاہتے ہیں یا نہیں، دوسرے مرحلے میں اس ادارے کے سب بچوں پر لازم کر دیا جائے گا کہ وہ آغا خان بورڈ کو ہی منتخب کریں، جبکہ اس سے اگلے مرحلے میں وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی کا ۱۱راکتوبر ۲۰۰۴ء کے اخبارات میں شائع ہونے والا یہ بیان قابل توجہ ہے:

> ''آغا خان فاؤنڈیشن کا امتحانی نظام ہمارے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم تعلیمی اداروں کو آغا خان فاؤنڈیشن کے سپرد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے، تاہم بعض تعلیمی اداروں کے امتحانات کو ہم آغا خان فاؤنڈیشن سے منسلک کر رہے ہیں۔ اے لیول اور او لیول کے امتحانات خصوصی طور پر آغا خان فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد کیے جانے کے انتظامات ہو چکے ہیں۔''

ہماری معلومات کے مطابق اس وقت اسلام آباد کے وفاقی تعلیمی بورڈ کو آغا خان فاؤنڈیشن

کے ساتھ ملحق کرنے کے لیے دباؤ بڑھ رہا ہے، مگر نہ صرف یہ کہ اساتذہ اور والدین کی انجمن اس کی مخالفت کر رہی ہے بلکہ خود وفاقی تعلیمی بورڈ کے ارکان میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے جسے نمٹانے کے لیے مذکورہ بالا تین رکنی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اس پس منظر سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آغا خان یونیورسٹی کو مکمل اختیارات کے ساتھ امتحانی بورڈ قائم کرنے کی اجازت دینے کے بعد ملک بھر کے تعلیمی اداروں کو آغا خان فاؤنڈیشن کی طے کردہ شرائط کے ساتھ آغا خان بورڈ کے ساتھ بتدریج منسلک کر دینے کے لیے مسلسل کام ہو رہا ہے اور اگر اسے کسی مضبوط اور موثر مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا تو اگلے چار پانچ سال کے عرصے میں سرکاری اور غیر سرکاری، دونوں شعبوں میں امتحانی نظام کا سب سے بڑا کنٹرولر آغا خان بورڈ ہوگا۔ اس طرح پورے ملک کا تعلیمی نظام آغا خان بورڈ کی تحویل میں چلا جائے گا۔

جہاں تک اس حوالے سے کوئی طوفان آنے یا نہ آنے کا سوال ہے، ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ یہ دو حوالوں سے ملک وقوم کے لیے نقصان دہ، بلکہ فکری اور نظریاتی طور پر تباہ کن بات ہوگی۔ ایک اس لیے کہ آغا خان فاؤنڈیشن کا یہ تعلیمی منصوبہ خود اس کا اپنا منصوبہ نہیں ہے، بلکہ امریکی سفیر کے ساتھ ایک باقاعدہ اور آن ریکارڈ معاہدے کے تحت اس نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے اور اس طرح اس کے ساتھ تعلیمی نظام کو منسلک کرنے کا مطلب ملک کے پورے تعلیمی نظام کو بالواسطہ طور پر امریکی ایجنڈے کے ساتھ وابستہ کر دینا ہے جو ملک کی خودمختاری کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کے حوالے سے تعلیمی مقاصد سے انحراف کے بھی مترادف ہے۔ دوسرا حوالہ خود آغا خان فاؤنڈیشن کا ہے کہ آغا خان فرقہ ایک اقلیتی گروہ ہے جس کے عقائد قادیانیوں کی طرح ملت اسلامیہ کے اکثریتی عقائد سے متصادم ہیں اور مسلمانوں کے لیے اپنے تعلیمی نظام میں اس کی بالادستی کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوگی۔ وفاقی وزیر تعلیم کو شاید یہ طوفان نظر نہ آ رہا ہو مگر اس کے آثار آنکھیں کھلی رکھنے والے ہر شخص کو دکھائی دے رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ہمارے حکمران بھی طوفان والی سمت میں ایک نظر دیکھنے کی زحمت گوارا کر سکیں۔*

* روزنامہ پاکستان، ۲۸ نومبر ۲۰۰۴ء۔

''دی لیڈر'' اور قومی نصاب کمیٹی

وفاقی حکومت نے گیارھویں جماعت کے لیے نیشنل بک فاؤنڈیشن کی تیار کردہ انگریزی کی نصابی کتاب سے ''دی لیڈر'' کے عنوان کے تحت شامل کی جانے والی نظم کو نصاب سے خارج کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس نظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے سے امریکہ کے صدر جارج بش کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ این این آئی کی رپورٹ کے مطابق یہ فیصلہ وفاقی وزیرِ تعلیم لیفٹیننٹ جنرل (ر) جاوید اشرف کی صدارت میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں کیا گیا جس میں بتایا گیا کہ یہ نظم انٹرنیٹ سے لی گئی اور یہ نظم جس کے شاعر کا نام بھی مذکور نہیں ہے، گیارھویں جماعت کی نصابی کتاب میں شامل کر دی گئی تھی۔

اس سے قبل ملک کے نامور ماہرینِ تعلیم اور اربابِ دانش کی طرف سے اس نظم کو شاملِ نصاب کرنے پر شدید احتجاج ریکارڈ پر آ چکا ہے جس کے مطابق اسے مجرمانہ غفلت قرار دیتے ہوئے ممتاز اہلِ دانش نے کہا ہے کہ صدر بش کی تعریف کر کے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکا گیا ہے اور یہ نئی نسل کو گمراہ کرنے کے مترادف ہے، جبکہ وفاقی وزارتِ تعلیم کی طرف سے اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ نظم محض ''اتفاق'' سے شاملِ نصاب ہو گئی ہے جسے نصاب سے خارج کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے، جبکہ اگلے سال پوری کتاب کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک نظم کو کتاب سے خارج کرنے کا تعلق ہے، یہ خوش آئند بات ہے کہ وزارتِ تعلیم نے ملک کے کروڑوں عوام اور اربابِ علم و دانش کے جذبات کا احترام کیا ہے اور اس کا بروقت نوٹس لیا ہے، لیکن اس سلسلے میں جو عذر پیش کیا گیا ہے، وہ ''محلِ نظر'' ہے۔ اس نے ایک اور نازک سوال کھڑا کر دیا ہے کہ کیا ہمارے ہاں قومی

نصاب سازی کا معیار یہی ہے کہ کسی صاحب کو انٹرنیٹ سے اپنے ذوق کی کوئی نظم مل گئی اور اس نے اسے اٹھا کر نصاب میں شامل کر دیا؟ ظاہر ہے کہ یہ کتاب ''قومی نصاب کمیٹی'' میں منظوری کے مراحل سے گزری ہے، اس کے بعد ہی نیشنل بک فاؤنڈیشن نے اسے شائع کیا ہے۔ کیا قومی نصاب کمیٹی اور نیشنل بک فاؤنڈیشن میں کارکردگی کا معیار یہی ہے اور کیا تعلیمی نصاب کے لیے مواد منتخب کرنے کا طریقہ کار یہی ہے؟ اس پس منظر میں ''قومی نصاب کمیٹی'' اور ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'' کے پورے ڈھانچے اور طریق کار کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ مسئلہ اس قدر ہلکا پھلکا اور آسان نہیں ہے کہ اسے ''محض اتفاق'' قرار دے کر نظر انداز کر دیا جائے، اس لیے ہم یہ گزارش کریں گے کہ قومی سطح پر ماہرین تعلیم کا ایک کمیشن قائم کیا جائے جو ''قومی نصاب کمیٹی'' اور ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'' کے طریق کار کا جائزہ لے کر اس متنازعہ نظم کے شامل نصاب ہونے کی وجوہ اور اسباب کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ان دونوں قومی اداروں کی مجموعی کارکردگی کے بارے میں بھی رپورٹ پیش کرے۔

جہاں تک ''دی لیڈر'' کے عنوان سے قومی نصاب تعلیم میں صدر بش کو خراج تحسین پیش کرنے کا تعلق ہے، یہ کارروائی جس کسی کو بھی خوش کرنے کے لیے کی گئی ہے، نہ صرف قوم کے مجموعی جذبات واحساسات اور ملت اسلامیہ کے رجحانات کے منافی ہے بلکہ معروضی حقائق سے بھی متصادم ہے، کیونکہ اس وقت دنیا بھر میں، بلکہ خود امریکہ میں صدر بش کی پالیسیوں اور طرز عمل کو جس طرح تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، اس سے آنکھیں بند کر لینا کسی طرح بھی عقل ودانش کا تقاضا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نقطۂ نظر سے نظم کا جائزہ لیا جائے تو اس میں صدر بش کے بارے میں ان جذبات کا اظہار کیا گیا ہے کہ ''دی لیڈر'' صابر اور ثابت قدم رہتا ہے، وہ سب کچھ برداشت کر کے تمام چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، وہ اپنے طرز عمل میں نرم ہے، مگر اسٹیل کی طرح مضبوط بھی ہے، ایمان کا پکا اور خوش گوار طبیعت کا عادی ہے، وہ اپنی اہلیت کی وجہ سے قوم کو مشکل ترین حالات سے نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ سچائی کے لیے لڑتا ہے، وہ لڑائی کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے، تاہم امن کا داعی بھی ہے اور امن کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے، جب وہ سچائی کے راستے پر چل نکلتا ہے تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا، وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اور اپنے اوپر ہونے والے شبہے کو دور کرنے کے لیے بار

بار اپنا کیس واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے، ان لوگوں تک بھی پہنچتا ہے جو اس کو نہیں سنتے، وہ چاہتا ہے کہ دنیا اس کی ثابت قدمی کا ساتھ دے، وہ امن کو چاہتے ہوئے بدی کو مٹانے میں اپنی قوت لگا رہا ہے اور ہر وہ کام کرنا چاہتا ہے، جو صحیح ہو۔

اس نظم کو اگر صدر بش کی شخصیت اور کردار سے ہٹ کر دیکھا جائے تو بلا شبہ کسی بھی صحیح الفکر لیڈر یا انسانیت دوست عالمی راہنما میں یہی اوصاف ہونے چاہئیں، لیکن ان اوصاف کو صدر بش پر منطبق کرنے سے پہلے ہمیں تصویر کے دوسرے رخ پر بھی ایک نظر ڈالنا ہوگی اور اس کے لیے ہم امریکہ ہی کے سابق صدر جناب جمی کارٹر کے ایک مضمون کا حوالہ دینا چاہیں گے جو گزشتہ دنوں امریکہ کے معروف اخبار ''لاس اینجلس ٹائمز'' میں شائع ہوا ہے اور جس میں صدر بش کی قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مضمون کا اردو ترجمہ روزنامہ پاکستان نے ۱۸/نومبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں شائع کیا ہے اور ہمارے نزدیک امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر کا یہ مضمون امریکہ کے موجودہ صدر جارج ڈبلیو بش کے خلاف چارج شیٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے قومی تعلیمی نصاب میں صدر بش کی تعریف کے لیے شامل کی جانے والی اس نظم کا مسئلہ سامنے نہ آتا تو ہم اس مضمون کے بعض پہلوؤں کا ''جمی کارٹر بنام جارج ڈبلیو بش'' کے عنوان سے جائزہ لینے کا ارادہ رکھتے تھے، مگر نظم کے مسئلے نے رخ تھوڑا سا تبدیل کر دیا ہے۔ جمی کارٹر اپنے اس مضمون میں کہتے ہیں کہ:

☆ ہمارے تاریخی اوصاف یہ ہیں کہ ہم اپنے شہریوں کو درست معلومات مہیا کرتے ہیں اور اختلاف رائے اور اختلاف عقائد کو عزت و احترام کے ساتھ برداشت کرتے ہیں، لیکن موجودہ حالات میں یہ تاریخی اوصاف خطرات سے دوچار ہو چکے ہیں۔

☆ ہمارے سیاسی راہنماؤں نے یک طرفہ طور پر بین الاقوامی تنظیموں اور دیرینہ معاہدوں کی پابندیوں سے آزادی کا اعلان کر دیا ہے۔ ان میں وہ تمام معاہدے بھی شامل ہیں جو ایٹمی اسلحے اور جراثیمی و حیاتیاتی ہتھیاروں کے ضمن میں طے ہوئے یا جو عالمی انصاف کے بارے میں تھے۔

☆ جب تک ہماری ملکی سلامتی کو (براہ راست) کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، امن ہماری قومی ترجیحات میں سرفہرست ہے، لیکن ہم اپنی اس روایت کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ ہم نے ''قبل از وقت''

حملے کی پالیسی اپنالی ہے۔ اگر کسی ناپسندیدہ حکومت کو بدلنا مقصود ہو یا کوئی اور مقصد پیش نظر ہو تو یک طرفہ اقدام کو ہم نے اپنا حق سمجھ لیا ہے۔ ہم اسے ''عالمی اچھوت'' قرار دے کر اس کے ساتھ براہ راست مذاکرات سے انکار کر دیتے ہیں۔

☆ ہمارے چوٹی کے راہنماؤں کی شدید کوشش ہے کہ ساری دنیا پر امریکی سامراجیت مسلط کر دی جائے۔ انہیں کوئی پروا نہیں کہ اس خواہش یا کوشش کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

☆ ایک طرف ہماری فوج مصروف جنگ ہے اور دوسری طرف ہمیں دہشت گردی کے خطرات لاحق ہیں، پھر بھی ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ''یا تو ہمارا ساتھ دو یا ہم تمہیں اپنا مخالف سمجھیں گے''۔ ہم نے کسی کے لیے تیسرا راستہ رہنے ہی نہیں دیا۔

☆ ممکنہ حد تک حقائق چھپائے جا رہے ہیں اور ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کہ امریکی عوام کو مرنے والے امریکی فوجیوں کی اصل تعداد کا علم نہ ہو سکے۔

☆ بجائے اس کے کہ ہم بنیادی انسانی حقوق کے علم بردار اور چمپئن کا کردار ادا کرتے، قانون حب الوطنی (patriot act) کی بعض انتہا پسندانہ شقوں نے ہماری شہری آزادی اور نجی زندگی کے حقوق کو سلب کر لیا ہے۔

☆ امریکہ نے جنیوا سمجھوتوں کو پس پشت ڈال کر عراق، افغانستان اور گوانتا ناموبے میں تشدد کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ مختلف ملکوں کی جو حکومتیں امریکہ کی حامی ہیں، ان سے بھی ان کے عوام پر تشدد کرایا جا رہا ہے۔

☆ گزشتہ نصف صدی کے دوران میں تخفیف اسلحہ کے ضمن میں جتنے معاہدے طے پائے، ہم چاہتے ہیں کہ انہیں بیک جنبش قلم منسوخ کر دیا جائے یا ان کی صریحاً خلاف ورزی کی جائے۔ ہم اب عالمی سطح پر ایٹمی پھیلاؤ کے ''بڑے مجرم'' بن چکے ہیں۔

جمی کارٹر نے اس چارج شیٹ میں اور بھی بہت کچھ کہا ہے، مگر ہم ان چند باتوں پر اکتفا کرتے ہوئے پاکستان کی قومی نصاب کمیٹی اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے بزرجمہروں سے پوچھنا چاہیں گے کہ کیا ان کی نظر میں ''دی لیڈر'' کا معیار یہی ہوتا ہے؟*

* روزنامہ پاکستان، ۱۳ر دسمبر ۲۰۰۵ء۔

سرکاری نظامِ تعلیم اور دینی نصاب

مکہ مکرمہ میں منعقدہ مسلم سربراہ کانفرنس کے حالیہ غیر معمولی اجلاس کے فیصلوں میں ایک اعلان یہ بھی تھا کہ مسلم ممالک اپنے اپنے نصاب تعلیم میں تبدیلی کریں گے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ مسلم دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں معاصر اقوام سے بہت پیچھے رہ گئی ہے اور اس کوتاہی کی گزشتہ دو صدیوں سے خوف ناک سزا بھگت رہی ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو اس کا کچھ احساس ہو گیا ہو گا اور انھوں نے باہم مل بیٹھ کر یہ طے کیا ہو گا کہ اس کی تلافی کے لیے کوئی راستہ اختیار کیا جائے اور اپنے اپنے نصاب تعلیم میں مسلم حکومتیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم کے حوالے سے معاصر اقوام کے برابر آنے کے لیے ضروری تبدیلیاں کریں، لیکن او آئی سی کی طرف سے مسلم ممالک کے تعلیمی نصابوں میں تبدیلی کے اس اعلان کے بعد اس سلسلے میں جو پہلا فیصلہ آیا ہے، وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزارت تعلیم کا ہے کہ ہم اپنے نصاب تعلیم سے نماز کا طریقہ خارج کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی کے نزدیک مسلمان بچوں کو نماز کا طریقہ سکھانا حکومت یا ریاستی نظام تعلیم کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو نماز کا طریقہ سکھائیں۔ اس پر ملک بھر کے دینی حلقوں اور خاص طور پر طلبہ تنظیموں کی طرف سے احتجاج کا سلسلہ جاری ہے اور مختلف مقامات پر مظاہرے بھی ہوئے ہیں، مگر ہمارے روشن خیال حکمران پوری دل جمعی کے ساتھ اپنے ایجنڈے پر کاربند ہیں، اس لیے یہ توقع کم دکھائی دے رہی ہے کہ اس احتجاج کا کوئی اثر ہو گا اور حکومت اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کے لیے آمادہ ہو گی۔

اس سے قبل قرآن کریم کی تعلیم کے حوالے سے بھی اس قسم کی صورت حال پیش آ چکی ہے کہ چند سال پہلے وفاقی محتسب اعلیٰ کی طرف سے حکومت کو ہدایت کی گئی تھی کہ قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم کا اسکولوں میں اہتمام کیا جائے اور مڈل تک بچوں کو ناظرہ قرآن کریم پڑھا دیا جائے، لیکن حکومت نے اس سلسلے میں ہاتھ کھڑے کر دیے تھے جس کی وجہ سے اسکولوں میں قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم کا ابھی تک اہتمام نہیں ہو سکا، حالانکہ قرآن کریم کی تعلیم کے سلسلے میں یہ سب سے پہلا اور ابتدائی درجہ ہے کہ مسلمان بچے اور بچیاں قرآن کریم کم از کم ناظرہ تو پڑھ سکیں۔ ممکن ہے اس وقت بھی وزارت تعلیم کے ارباب حل وعقد کے ذہن میں یہی ہو کہ بچوں کو قرآن کریم پڑھانا ہماری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو قرآن کریم پڑھائیں۔

وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی کا یہ کہنا کہ بچوں کو نماز کا طریقہ سکھانا والدین کا کام ہے، ہمارے نزدیک محض دفع الوقتی یا لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بات کہہ دینے کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک مستقل سوچ اور فلسفہ وفکر کارفرما ہے کہ دین اور دینی معاملات کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور سوسائٹی میں دینی امور کا اہتمام کرنا ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل نہیں ہے۔ یہ سوچ مجموعی طور پر ہماری قومی پالیسیوں اور حکمران طبقات کے ذہنوں میں پائی جاتی ہے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً حال ہی میں زلزلہ سے متاثرہ علاقوں میں امداد اور بحالی کا جو پروگرام قومی سطح پر ریاستی ذمہ داری کے حوالے سے شروع کیا گیا ہے اور جس کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر وسائل جمع کر کے حکومتی اداروں کی طرف سے امداد و بحالی کی ترجیحات طے کی گئی ہیں، اس پروگرام میں مسجد اور دینی مدرسہ کی بحالی کا کوئی شعبہ موجود نہیں ہے، حالانکہ زلزلہ سے متاثر ہونے والے مسلمان جہاں آباد ہوں گے، انھیں لازماً مسجد کی ضرورت بھی پڑے گی اور اپنے بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے وہ دینی مدرسہ کی ضرورت بھی محسوس کریں گے اور امداد و بحالی کا قومی پروگرام تشکیل دینے والوں کے علم میں یہ بات یقیناً ہوگی کہ زلزلہ میں جہاں لوگوں کے مکانات، سرکاری عمارتیں، اسکول، کالج، عدالتیں اور دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والی ہزاروں بلڈنگیں مسمار اور متاثر ہوئی ہیں، وہاں سینکڑوں مساجد اور دینی مدارس بھی زلزلہ کی زد میں آئے ہیں، لیکن

اس سب کچھ کے باوجود اس سلسلے میں اب تک سامنے آنے والی قومی پالیسی اور پروگرام میں مسجد اور دینی مدرسہ کی بحالی کی کوئی بات شامل نہیں ہے بلکہ ایک مقتدر ترین شخصیت کے قومی پریس کے ذریعے سے سامنے آنے والے اس ارشاد نے صورت حال کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ ہم نے غیر ملکی این جی اوز سے کہا ہے کہ زلزلہ سے متاثرہ علاقوں میں اسکول اور کالج کی تعمیر کی طرف فوری توجہ دی جائے، ورنہ دینی لوگ مدرسے بنانا شروع کر دیں گے۔ اس مقتدر شخصیت کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ مسجد اور دینی مدرسہ بنانے والوں نے اس سے قبل بھی یہ کام کرنے کے لیے کسی سے نہیں پوچھا تھا اور کسی سرکاری شعبہ کی طرف سے امداد پر بھروسہ نہیں کیا تھا اور اب بھی وہ اس تکلف میں نہیں پڑیں گے۔ جہاں جہاں کسی نے مسجد و مدرسہ تعمیر کرنا ہوگا، وہ کر لے گا اور کوئی بات اس میں رکاوٹ نہیں بن سکے گی، البتہ انھوں نے ایک سوچ کا ضرور اظہار کر دیا ہے اور یہ وہی سوچ ہے جس کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں کہ ہمارے ان مہربانوں کے نزدیک مسجد، مدرسہ، قرآن کریم کی تعلیم، نماز اور دیگر دینی امور کا قومی ضروریات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور ان مقاصد کے لیے ریاستی وسائل کا استعمال ان کے خیال میں کوئی درست بات نہیں ہے۔

اس بات کو ایک اور حوالے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان مہربانوں کی طرف سے دینی مدارس کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم دینی مدارس کے نصاب میں سائنس اور ٹیکنالوجی شامل کر کے انھیں قومی دھارے میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت دینی مدارس جو تعلیم دے رہے ہیں، وہ ان کے نزدیک قومی دھارے کی ضروریات میں سے نہیں ہے، ورنہ وہ دینی مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی بات نہ کہتے۔ یہ بات کہ دینی مدارس صرف دینی تعلیم دیتے ہیں اور تعلیم کے باقی شعبوں میں حصہ نہیں لیتے، اس لیے وہ قومی دھارے سے الگ ہیں، انتہائی مضحکہ خیز بات ہوگی، اس لیے کہ اگر اس سوچ کو قبول کر لیا جائے تو پھر یہ بھی کہا جا سکے گا کہ لا کالج چونکہ صرف قانون کی تعلیم دیتے ہیں اور قومی زندگی کے دیگر شعبوں کی تعلیم ان کے نصاب میں شامل نہیں ہے، اس لیے وکلا کی برادری قومی دھارے میں شامل نہیں ہے اور انھیں قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے لا کالجوں کے نصاب میں تبدیلی کر کے اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو شامل کرنا

ضروری ہو گیا ہے اور پھر یہ بات صرف لا کالجوں تک محدود نہیں رہے گی بلکہ میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور اس نوعیت کے دیگر تعلیمی ادارے بھی اسی اصول پر قومی دھارے سے خارج قرار پائیں گے اور انھیں قومی دھارے میں شریک کرنے کے لیے ان کے نصابوں میں دوسرے شعبوں کی تعلیم کو شامل کرنا ضروری ہو جائے گا۔

اس لیے ہمارے نزدیک جناب جاوید اشرف قاضی کا یہ ارشاد کہ بچوں کو نماز کی تعلیم دینا ان کے والدین کی ذمہ داری ہے اور اس بنیاد پر نماز پڑھنے کے طریقے کو قومی نصاب سے خارج کر دینے کی یہ کارروائی ایک سرسری اور وقتی کارروائی نہیں ہے بلکہ ایک مستقل سوچ اور فلسفہ کی نمائندگی کرتی ہے جسے دھیرے دھیرے ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، مگر جاوید اشرف قاضی صاحب اور ان کے رفقا اس بات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر رہے کہ ان کی یہ سوچ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی ہے بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے رائج الوقت دستور سے بھی انحراف ہے اس لیے کہ دستور پاکستان نے قرآن وسنت کے احکام کے نفاذ، اسلامی تعلیمات کے فروغ اور اسلامی اقدار وروایات کے تحفظ کو حکومت پاکستان کی ذمہ داری قرار دے رکھا ہے۔

ہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے، اگر جاوید اشرف قاضی قرآن کریم کا تھوڑا بہت مطالعہ رکھتے ہیں تو یہ بات ان سے مخفی نہیں ہوگی کہ قرآن کریم نے ایمان وعقیدہ کے بعد سب سے زیادہ نماز پر زور دیا ہے اور سینکڑوں آیات کریمہ میں مختلف اور متنوع اسالیب میں نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو نماز کی پابندی کی تلقین کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے نماز کو صرف فرد کی ذمہ داری قرار نہیں دیا بلکہ سوسائٹی کی اجتماعی ذمہ داریوں کے طور پر بیان فرمایا ہے، اسی لیے نماز کے بارے میں صرف یہ حکم نہیں ہے کہ ''نماز پڑھو''، بلکہ ''اقامت صلوٰۃ'' یعنی نماز کو معاشرہ میں قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے میں نماز کا ماحول قائم ہو اور نماز کی ادائیگی کا اجتماعی طور پر اہتمام کیا جائے۔

قرآن کریم نے سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۳۲ میں خاندان کے سربراہ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ وہ اپنے گھر کے افراد کو نماز کی ادائیگی کی تلقین کرے اور اس پر کاربند رہے۔ اس طرح نماز کی ذمہ داری

فرد سے بڑھ کر خاندان اور فیملی کے دائرے تک وسیع ہو جاتی ہے بلکہ اجتماعی ذمہ داریوں کا حصہ بن جاتی ہے، جبکہ سورۃ الحج کی آیت ۴۱ ۵ میں قرآن کریم نے نماز قائم کرنے یعنی مسلم معاشرے میں نماز کا ماحول بنانے کو مسلم حکمران کی ذمہ داریوں میں بتایا ہے، چنانچہ اس آیت میں ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے کہ:

''ان لوگوں کو جب ہم زمین میں اقتدار دیتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں، نیکی کے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔''

اس لیے نماز کا اہتمام اور نماز کے ماحول کا قیام فرد اور خاندان سے آگے بڑھ کر ریاست اور سوسائٹی کے وسیع تر ماحول کی اجتماعی ضرورت بن جاتا ہے اور ایک مسلم حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہمارے حکمران اگر اپنے طرز عمل اور پالیسیوں کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ وسنت کو راہ نمائی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں تو انھیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں کس قدر حساس تھے۔ انھوں نے تو ایک موقع پر یہاں تک فرما دیا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ مسجد میں کسی اور کو نماز پڑھانے کے لیے کہوں اور خود نماز کے دوران ان لوگوں کے گھروں کو دیکھوں جو تندرست اور صحیح ہوتے ہوئے بھی نماز با جماعت میں شریک نہیں ہوتے اور پھر ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ مسلم شریف کی روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے جن کا نماز کے لیے مسجد میں آنا ضروری نہیں تو میں اپنے اس ارادے پر ضرور عمل کر گزرتا۔

محترم جاوید اشرف قاضی صاحب! جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تو نماز کے لیے بلاعذر مسجد میں نہ آنے والوں کے گھروں کو آگ لگانے کی بات فرما رہے ہیں اور آنجناب کا کہنا ہے کہ بچوں کو نماز کا طریقہ سکھانا حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل نہیں ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا*

O

---

* روزنامہ پاکستان، ۳۰ دسمبر ۲۰۰۵ء۔

جامعہ حفصہ کا سانحہ

''غیر قانونی'' مساجد کو مسمار کرنے کا مسئلہ

اسلام آباد میں مبینہ طور پر غیر قانونی مساجد میں سے چند مساجد کو مسمار کرنے اور دیگر مساجد کو گرانے کا نوٹس دیے جانے سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے، وہ ایک نئے بحران کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور دینی جماعتوں کا احتجاج اس سلسلے میں منظّم ہوتا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ مساجد اور کچھ مدارس بھی اجازت کے بغیر تعمیر ہوئے ہیں جو غیر قانونی ہیں اور قانون کے مطابق انھیں مسمار کرنا ضروری ہے۔ سرکاری حلقوں کی طرف سے یہ اعلان سامنے آیا ہے کہ غیر قانونی طور پر تعمیر کی گئی تمام مساجد اور مدارس کو شہید کر دیا جائے گا جبکہ دوسری طرف اسلام آباد اور راول پنڈی کی جمعیۃ اہل سنت اور اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ پاکستان نے اس پر شدید احتجاج کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ مزید مساجد کو شہید نہیں کرنے دیا جائے گا بلکہ مسمار کی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا جائے گا۔ ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ جہاں ایک بار مسجد تعمیر ہو جائے، وہ قیامت تک مسجد ہوتی ہے اور اسے کسی صورت میں نہیں گرایا جا سکتا۔ اس مہم میں سب سے زیادہ فعال کردار حضرت مولانا محمد عبد اللہ شہید کے قائم کردہ مدرسہ جامعہ حفصہ للبنات کی طالبات ادا کر رہی ہیں جنھوں نے جامعہ حفصہ کے قریب ایک سرکاری لائبریری پر احتجاج طور پر قبضہ کر رکھا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ جب تک حکومت مساجد و مدارس کو گرانے کا نوٹس واپس نہیں لیتی، تب تک وہ اس قبضہ سے دست بردار نہیں ہوں گی۔

سرکاری حلقوں کی طرف سے اخبارات میں ایک موقف یہ بھی سامنے آیا ہے کہ جو مدارس

ومساجد اسلام آباد کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے مین راستے میں ہیں اور وفاقی دارالحکومت میں آنے والے معزز غیر ملکی مہمانوں کی گزرگاہ میں ہیں، وہ ان کے نزدیک سکیورٹی رسک ہیں جہاں سے کسی بھی وقت کسی بھی قسم کی کارروائی ہوسکتی ہے، اس لیے سکیورٹی کے نقطۂ نظر سے بھی ان مدارس ومساجد کا راستے سے ہٹایا جانا ضروری ہے۔ جامعہ حفصہ للبنات کی طالبات نے کچھ عرصہ قبل پولیس کی مداخلت کے خلاف مزاحمت کا جو مظاہرہ کیا تھا اور پولیس کو ان طالبات کے مقابلے میں ملیوڈی تک پسپا ہونا پڑا تھا، وہ بات ابھی تک سرکاری ذہنوں میں تازہ ہے اور ہمارے خیال میں اسی کے ردعمل میں جامعہ حفصہ اور مختلف مساجد ومدارس کو حکومت کی نئی پالیسی کا ہدف قرار دے دیا گیا ہے۔

اس پر ملک بھر کے دینی مدارس کے تمام مکاتب فکر کے وفاقوں پر مشتمل مشترکہ فورم ’اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ‘‘ نے مضبوط موقف اختیار کیا ہے اور نہ صرف یہ کہ مدارس کے نظام کے حوالے سے وفاقی وزیر مذہبی امور جناب اعجاز الحق کے ساتھ اپنے پہلے سے طے شدہ مذاکرات میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ہے بلکہ مساجد ومدارس کے تحفظ کے لیے ایک نئی مہم کا بھی آغاز کر دیا ہے اور حسب سابق اس سلسلے میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور تنظیم المدارس العربیہ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی سب سے زیادہ متحرک اور سرگرم عمل ہیں اور اس مہم کو آگے بڑھانے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں۔

جہاں تک مساجد ومدارس کے غیر قانونی ہونے کا تعلق ہے، یہ بات بہرحال بحث طلب ہے۔ اس پر اس سے پہلے قومی سطح پر کئی بار بحث ہو چکی ہے اور حکومتی حلقوں کا کہنا ہے کہ کسی جگہ پر جگہ کے مالک کی اجازت کے بغیر تعمیر کی جانے والی مسجد چونکہ شرعاً مسجد نہیں ہوتی، اس لیے حکومت کو ایسی مساجد کو گرانے کا حق حاصل ہے، چنانچہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مولانا مفتی منیب الرحمٰن نے بھی ایک حالیہ انٹرویو میں اس موقف کا اظہار کیا ہے کہ کسی شخص کی ذاتی یا حکومت کی سرکاری زمین پر بغیر اجازت بنائی جانے والی مسجد غیر قانونی اور غیر شرعی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ جب سرکاری زمین پر مسجد بنائی جاتی ہے تو متعلقہ محکمے اور اہل کار خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور جب کئی برس تک وہاں نمازیں ادا ہونے کے بعد اسے گرانے کی بات ہوتی ہے تو ایک طرح

کی جذباتی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا مفتی منیب الرحمٰن صاحب ان مساجد کے غیر قانونی اور غیر شرعی ہونے میں حکومت کے ساتھ متفق ہیں، البتہ انھیں جذباتی ماحول کی وجہ سے ان کے گرائے جانے پر اشکال ہے، مگر ہمیں مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے اس موقف سے اتفاق نہیں اور اس کے بارے میں ہم کچھ معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

جہاں تک کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر مسجد یا مدرسہ تعمیر کیے جانے کا تعلق ہے، ہم اس موقف سے متفق ہیں کہ وہ مسجد اور مدرسہ صرف غیر قانونی ہی نہیں بلکہ غیر شرعی بھی ہے اور زمین کے مالک کو حق حاصل ہے کہ وہ اس زمین کو واپس حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی معروف قانونی طریقہ اختیار کر کے اپنی زمین کا قبضہ حاصل کرے، کیونکہ اس کی زمین غصب کی گئی ہے اور غاصب کو اپنی مغصوب چیز واپس لینے کا ہر وقت حق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن کیا سرکاری زمین کا حکم بھی یہی ہے؟ اس میں ہمیں کلام ہے، اس لیے کہ ایک اسلامی ریاست میں لوگوں کی ضروریات کے لیے مساجد کا تعمیر کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر کسی علاقے میں مسجد کی ضرورت ہے، لیکن حکومت وہاں مسجد کی تعمیر کے لیے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہی اور وہاں کے مسلمان باہمی تعاون کے ساتھ کسی موزوں سرکاری جگہ پر مسجد تعمیر کر لیتے ہیں تو ہماری طالب علمانہ رائے میں وہ اس دینی ضرورت کو پورا کرنے میں حکومت ہی کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ مسجد شرعاً مسجد بن جاتی ہے۔

پھر ایک اور حوالے سے بھی دیکھ لیا جائے کہ ایک ہے اجازت اور ایک ہے رضامندی۔ دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے اور اس فرق کو ملحوظ رکھنا فقہی طور پر ضروری ہے۔ اجازت یہ ہے کہ اس جگہ مسجد تعمیر کرنے کے لیے باقاعدہ درخواست دی جائے اور اجازت ملنے کے بعد وہاں تعمیر کر لی جائے، اور رضامندی یہ ہے کہ مسجد تعمیر کر لی گئی ہے اور متعلقہ محکموں اور مجاز اتھارٹی نے اس پر خاموشی اختیار کر کے اسے عملاً قبول کر لیا ہے۔ مولانا مفتی منیب الرحمن صاحب کو میں ایک فقہی جزئیہ کی طرف متوجہ کرنا چاہوں گا جسے ہمارے فقہا نے ''نکاح فضولی'' کے عنوان سے ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے کسی دوست سے پوچھے اور اس کے علم میں لائے بغیر اس کی طرف سے نمائندہ بن کر اس کا

نکاح کسی خاتون سے کرا دیا ہے۔ جب نکاح ہو رہا ہے تو جس کا نکاح کیا جا رہا ہے، اسے سرے سے اس کی کوئی خبر ہی نہیں ہے، لیکن اس کا کوئی دوست اس کی اجازت اور مرضی معلوم کیے بغیر اس کا نکاح کرا رہا ہے۔ فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ یہ نکاح اگر متعلقہ شخص نے بعد میں قبول کر لیا ہے اور اس عورت کے ساتھ میاں بیوی کا تعلق اختیار کر لیا ہے تو شرعاً یہ نکاح منعقد ہو جائے گا، وہ دونوں میاں بیوی متصور ہوں گے اور نکاح وغیرہ کے تمام شرعی احکام ان پر لاگو ہوں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کسی محلّہ کے مسلمانوں نے مسجد کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی موزوں اور مناسب سرکاری زمین پر مسجد تعمیر کر لی ہے اور مجاز اتھارٹی نے اس پر خاموشی اختیار کر لی ہے تو یہ ''رضامندی'' کے مترادف ہے اور اس عملی رضامندی کے بغیر حکومت کو وہ مسجد گرانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ پھر اس رضامندی کا مدار صرف خاموشی پر نہیں ہے بلکہ سالہا سال تک وہاں نمازیں ادا کی جاتی رہی ہیں جبکہ بجلی، پانی، گیس اور دیگر ضروری چیزوں کے کنکشنز کی منظوری اور متعلقہ محکموں اور مجاز اتھارٹی کے لوگوں کا اس مسجد میں نمازیں ادا کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ سالہا سال تک بطور مسجد ڈیل کرنا ''خاموش رضامندی'' سے بہت آگے کے امور ہیں اور یہ صرف رضامندی نہیں بلکہ عملاً اجازت کے مترادف ہیں۔

علاوہ ازیں ان مساجد و مدارس کو مسمار کرنے کی اس کارروائی کو اس موقع پر قانون اور شرعی حیثیت کے حوالے سے پیش کرنا بھی ہمارے نزدیک فریب کاری سے کم نہیں ہے، اس لیے کہ اگر بات صرف قانون کی عمل داری یا شرعی حیثیت کی پاس داری کی ہوتی تو اس کا نشانہ صرف مساجد نہ بنتیں بلکہ اسلام آباد میں غیر قانونی قبضوں کی باقی صورتیں بھی اس میں شامل ہوتیں اور کسی بھی عنوان سے سرکاری اراضی پر بغیر اجازت تعمیر کی جانے والی تمام عمارتوں کے خلاف اجتماعی آپریشن کا فیصلہ ہوتا۔ باقی تمام غیر قانونی قبضوں کو نظر انداز کر کے صرف مساجد کے خلاف آپریشن اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اصل ہدف ''لاقانونیت'' نہیں بلکہ ''مسجد'' ہے اور اسلام آباد کے حکمران دنیا کو اپنے سیکولر ہونے کا یقین دلانے کے لیے مساجد کے خلاف آپریشن کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس صورت میں یہ مسئلہ مساجد کے قانونی یا غیر قانونی ہونے کا نہیں رہتا بلکہ مساجد کے تقدس اور ان کے معاشرتی

کردار کے تحفظ کا بن جاتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ اور جمعیۃ اہل سنت اسلام آباد نے اس سلسلے میں جو موقف اختیار کیا ہے، وہ معروضی تناظر میں صحیح موقف ہے جس کی تمام اہل دین کو حمایت کرنی چاہیے۔*

O

* روزنامہ اسلام، ۲۸/جنوری ۲۰۰۷ء۔

جامعہ حفصہ کی طالبات کی جدوجہد۔ چند سوالات

جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات کے مطالبات اور جدوجہد کے حوالے سے معاملات جس رخ پر آگے بڑھ رہے ہیں، اس سے کئی سنجیدہ سوالات نے جنم لیا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ بات اسلام آباد میں ایک مسجد کے گرائے جانے اور متعدد دیگر مساجد کو غیر قانونی قرار دے کر ان کے گرائے جانے کا نوٹس جاری ہونے پر بطور احتجاج شروع ہوئی تھی جس میں جامعہ حفصہ کی طالبات نے ایک سرکاری لائبریری پر احتجاجاً قبضہ کر لیا تھا۔ ان طالبات اور ان کے سرپرست مولانا عبدالعزیز اور مولانا غازی عبدالرشید کا، جو مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے سابق خطیب حضرت مولانا محمد عبداللہ شہیدؒ کے فرزند و جانشین ہیں، مطالبہ یہ تھا کہ گرائی جانے والی مسجد یا مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا جائے اور دیگر مساجد کو گرانے کا نوٹس واپس لیا جائے۔ جامعہ حفصہ مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے ساتھ ملحق ہے اور اس میں ہزاروں طالبات نہ صرف دینی تعلیم حاصل کرتی ہیں بلکہ مستقل طور پر ہاسٹل میں قیام پذیر بھی ہیں اور اس سے قبل ایک موقع پر اسلام آباد پولیس کے ساتھ کھلے روڈ پر ان طالبات کی محاذ آرائی ہو چکی ہے جس میں پولیس کو پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ اس لیے طالبات کے اس احتجاج نے اوپر کی سطح تک ہلچل پیدا کر دی اور اعلیٰ حلقوں میں یہ سوچا گیا کہ طالبات کے خلاف قوت استعمال کرنے اور سختی کا ماحول قائم کرنے کے بجائے افہام و تفہیم سے کام لیا جائے اور مذاکرات کے ذریعے سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

جہاں تک مساجد کے گرائے جانے کا تعلق ہے، اس پر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے

سربراہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان اور دیگر اکابر کی مساعی سے یہ حل نکل آیا کہ وفاقی حکومت نے گرائی جانے والی مسجد کی دوبارہ تعمیر کا اعلان کر کے وفاقی وزیر مذہبی امور کے ہاتھوں اس کا سنگ بنیاد بھی رکھوا دیا اور دیگر مساجد کے بارے میں اسلام آباد کے سرکردہ علمائے کرام کے ساتھ ایک مشترکہ کمیٹی قائم کر کے ان کے بارے میں فیصلہ اس کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا، لیکن طالبات اور ان کے سرپرستوں نے اس کو قبول کرنے کے بجائے ملک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کے ساتھ دیگر بعض اور مطالبات بھی شامل کر کے اعلان کر دیا کہ جب تک یہ سارے مطالبات منظور نہیں ہو جاتے، ان کا احتجاج جاری رہے گا، حالانکہ ان کی مدد کے لیے اسلام آباد آنے والے اکابر علمائے کرام مولانا سلیم اللہ خان، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ، مولانا حسن جان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور دیگر حضرات نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ لائبریری کا قبضہ چھوڑ کر تصادم کا ماحول ختم کر دیں اور ان مطالبات کو، جو جائز مطالبات ہیں، حکومت سے منوانے کے لیے پرامن جدوجہد کا کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے۔

راقم الحروف نے بھی اس موقع پر مختلف احباب کے استفسار پر عرض کیا کہ ہم طالبات کے مطالبات کی حمایت کرتے ہیں اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے معروف اور پرامن ذرائع اختیار کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے ہیں، لیکن اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت میں حکومت کے خلاف اس سطح کی محاذ آرائی کو شرعاً اور اخلاقاً درست نہیں سمجھتے جسے سیاسی زبان میں بغاوت یا شرعی اصطلاح میں خروج سے تعبیر کیا جا سکے، کیونکہ اس خروج کے لیے فقہائے کرام نے جو شرائط اور طریق کار بیان کیا ہے، وہ موجود نہیں ہے اور اس کے بغیر قانون کو ہاتھ میں لینے اور تصادم کی طرز کی محاذ آرائی کا راستہ اختیار کرنے کی حمایت نہیں کی جا سکتی، مگر جامعہ حفصہ کی طالبات اور ان کے سرپرستوں نے ان گزارشات پر توجہ دینے کے بجائے محاذ آرائی کا تسلسل قائم رکھنے کو ترجیح دی ہے اور تادم تحریر صورت حال یہ ہے کہ سرکاری لائبریری پر طالبات کا قبضہ برقرار ہے، ہزاروں طالبات ڈنڈوں سے مسلح ہو کر نہ صرف جامعہ کے اندر موجود ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً سڑکوں پر بھی آ رہی ہیں اور متعدد مواقع پر سرکاری فورسز کے ساتھ تصادم کی نوبت آ چکی ہے۔ اس دوران میں ایک واقعہ یہ بھی

ہوا ہے کہ طالبات نے مبینہ طور پر فحاشی کے ایک اڈے سے چند خواتین کو پکڑا اور اپنے ساتھ لے گئیں جس سے ان کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ انہیں سمجھا بجھا کر بدکاری کے عمل سے روکا جائے۔ بعد میں ان خواتین کو اگرچہ چھوڑ دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوال کھڑا ہو گیا ہے کہ کیا معاشرہ میں فحاشی یا دیگر منکرات کو روکنے کے لیے اس قسم کی کارروائی کی اجازت دی جا سکتی ہے؟

جہاں تک سوسائٹی میں معروفات کے فروغ اور منکرات کے سدِ باب کے لیے، جن میں بدکاری اور فحاشی سرفہرست ہیں، عوامی دباؤ یا جدوجہد کا تعلق ہے، یہ ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے اور قرآن وسنت میں سینکڑوں مقامات پر نہ صرف اس کا حکم دیا گیا ہے بلکہ اس سے گریز کو دینی تقاضوں سے انحراف قرار دیا گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک اسلامی حکومت کے فرائض میں بھی شامل ہے اور سوسائٹی کے ہر فرد کی انفرادی ذمہ داریوں میں بھی ایک اہم دینی ذمہ داری شمار ہوتی ہے، حتیٰ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جس معاشرہ میں نیکی کی تلقین اور برائی سے روکنے کی عمومی روایت ختم ہو جائے، وہ معاشرہ خدا کے عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی پوری سوسائٹی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، اس لیے جہاں تک اصولی طور پر لوگوں کو برائی سے روکنے کا تعلق ہے، اس کی اہمیت وضرورت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس ماحول میں جبکہ ریاست اور حکومت کے کم وبیش تمام ذرائع منکرات کے فروغ کے لیے بے دریغ استعمال ہو رہے ہیں اور سرکاری سطح پر معروفات کی حوصلہ شکنی اور منکرات کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کا ماحول بنتا جا رہا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عمل میں احتجاج اور شدت کا عنصر شامل ہونے کو بھی بے جواز نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس سب کے باوجود حکومت وقت کے ساتھ تصادم اور قانون کو ہاتھ میں لینے کا جواز موجود نہیں ہے اور اس پہلو سے بہر حال بچنے کی ضرورت ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ طالبات کا یہ غصہ بے جواز نہیں ہے اور یہ ردعمل ہے حکومتی اداروں کی طرف سے اسلامی احکام وقوانین کے نفاذ سے مسلسل گریز اور منکرات وفواحش کی سرپرستی کا جس پر غصہ آنا ایمان کی علامت ہے، اس لیے جہاں ہم اپنی عزیز بچیوں سے گزارش کر رہے ہیں کہ وہ تصادم کے راستے سے بچیں اور اپنے بزرگوں کا مشورہ تسلیم کرتے ہوئے اپنی اس جائز جدوجہد کے مستقبل کے

معاملات ان کے سپرد کر دیں کہ اس میں خیر کا پہلو یہی ہے، وہاں حکومتی حلقوں سے یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کریں کہ یہ سب کچھ ان کی غلط پالیسیوں، اسلامی نظام و قوانین کے نفاذ سے ان کے مسلسل انحراف اور منکرات وفواحش کی ان کی طرف سے حوصلہ افزائی کا فطری ردعمل ہے جسے ختم کیے بغیر وہ اس کے ردعمل پر قابو پانے کی کسی کوشش میں بہرحال کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔*

O

---

* روزنامہ پاکستان لاہور، ۸/اپریل ۲۰۰۷ء۔

جامعہ حفصہ کا مسئلہ اور دینی مدارس کا مستقبل

مولانا عبدالعزیز کی گرفتاری کے بعد لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا حکومت کے ساتھ تنازع ایک لحاظ سے اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے اور ان کے نائب مولانا عبدالرشید غازی کی طرف سے خود کو حکومت کے حوالے کرنے کی مشروط پیش کش نے حکومت کے ساتھ ان کی مسلح مزاحمت کے باقی ماندہ امکانات کو بھی ختم کر دیا ہے۔ جب ان دونوں بھائیوں نے چند ماہ قبل اپنے بعض مطالبات کے لیے محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا تھا، اس وقت ملک کے سنجیدہ دینی حلقوں اور ان کے خیر خواہوں کی طرف سے انھیں یہ کہہ دیا گیا تھا کہ حکومت کے ساتھ اس طرح کی محاذ آرائی کا طریقہ درست اور قابل عمل نہیں ہے، اس لیے وہ اسے ترک کر دیں اور ملک کی علمی و دینی قیادت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی مشاورت کے ساتھ اپنے مطالبات منوانے کے لیے جدوجہد کا طریق کار از سر نو طے کریں، لیکن انھوں نے کوئی بھی معقول بات ماننے کے بجائے خود اپنے طے کردہ طریق کار پر قائم رہنے کا اعلان کر دیا اور اس پر ڈٹے رہے جس کا منطقی نتیجہ یہی ہونا تھا جو سامنے آ چکا ہے کہ دو درجن کے لگ بھگ شہریوں کی ہلاکت اور ملٹری فورسز کے آپریشن کے بعد غازی برادران کی پسپائی کا تماشا پوری دنیا دیکھ رہی ہے۔

جہاں تک ان مطالبات کا تعلق ہے کہ اسلام آباد میں سرکاری طور پر گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا جائے، ملک میں اسلامی نظام کا مکمل نفاذ عمل میں لایا جائے، فحاشی اور بدکاری کے مبینہ اڈے ختم کیے جائیں اور حدود آرڈیننس میں کی گئی حالیہ غیر شرعی ترامیم واپس لی جائیں تو ان میں

سے کوئی مطالبہ بھی ایسا نہیں ہے جسے ناجائز کہا جا سکے بلکہ یہ خود دستورِ پاکستان کے اسلامی ونظریاتی تقاضوں کو پورا کرنے کے مطالبات ہیں، لیکن اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا، اس سے ملک کے ہر ذی شعور شخص نے اختلاف کیا اور اسے غلط ٹھہرایا، اس لیے کہ ایک مسلم ملک میں مسلمان حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا، متوازی نظام قائم کرنے کی کوشش کرنا اور عام لوگوں کو از خود سزا دینے کا طریقہ اختیار کرنا کسی طرح بھی جائز عمل نہیں کہلا سکتا، لیکن نہ صرف یہ کہ اس پر اصرار کیا گیا بلکہ اسے ''جہاد'' قرار دیا گیا اور طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد کو اس مقصد کے لیے ڈھال بنایا گیا جس سے معاملہ بتدریج سنگین سے سنگین تر صورت اختیار کرتا چلا گیا۔

دوسری طرف حکومت نے لال مسجد کی انتظامیہ کے غلط طریق کار کی آڑ میں ان جائز مطالبات کو مسلسل نظر انداز کیا جن کی ملک کے دینی حلقے حمایت کر رہے ہیں اور اس مسئلے کو مذاکرات کے ذریعے سے حل کرنے کے بجائے اسے زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش کی جس سے ملک کے سنجیدہ حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ یہ سارا معاملہ خود حکومت کا پیدا کردہ ہے اور حکومت اس سے نہ صرف ملک کے اندر سیاسی فوائد حاصل کر رہی ہے بلکہ اسے دنیا میں دینی مدارس کے بارے میں غلط تاثرات پھیلانے کا ذریعہ بھی بنایا جا رہا ہے۔

دینی مدارس کے بارے میں سالہا سال سے عالمی میڈیا اور ادارے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ان میں اسلحہ کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور یہ مبینہ طور پر دہشت گردی کے مراکز ہیں، لیکن دینی مدارس کے وفاقوں کی قیادت نے مسلسل محنت کے ساتھ اس تاثر کو زائل کیا اور عالمی رائے عامہ کو کسی حد تک یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی کہ جنوبی ایشیا کے یہ دینی مدارس صرف تعلیم اور نظریاتی وفکری تربیت تک محدود ہیں، ان میں نہ اسلحہ کی تربیت دی جاتی ہے اور نہ ہی ان میں اسلحہ موجود ہے۔ اس پر پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے بھی، جب وہ وزیر داخلہ تھے، مضبوط اسٹینڈ لیا اور واضح طور پر دنیا کو بتایا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں اسلحہ کی موجودگی اور اس کی ٹریننگ کے الزامات بے بنیاد اور خلاف واقعہ ہیں۔ حقیقت حال اب بھی یہی ہے اور جامعہ حفصہ کی طرز کے اکا دکا مدارس کے علاوہ ملک بھر کے ہزاروں دینی مدارس میں کوئی ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں

ہے جہاں اسلحہ کی ٹریننگ یا اسلحہ کے استعمال کی ترغیب دی جاتی ہو، لیکن جامعہ حفصہ کی صورت حال نے اس تاثر کو الٹ دیا اور لوگوں کو پاکستان کے وفاقی دارالحکومت کے ایک بڑے مدرسے میں نہ صرف طلبہ بلکہ طالبات کے ہاتھوں میں بھی اسلحہ دکھائی دینے لگا ہے۔

ہمارے نزدیک حکومت نے معاملے کو حد سے زیادہ طول دے کر دیگر سیاسی مقاصد کے ساتھ ساتھ اس تاثر کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس پر چودھری شجاعت حسین کے ایک حالیہ بیان کو بطور شہادت پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کی کوششوں سے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے سے معاملات طے ہونے کے قریب پہنچ گئے تھے کہ کسی خفیہ ہاتھ نے معاملات کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض عناصر یہ منظر بہر صورت دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک طرف ملک کی مسلح فورسز ہیں اور دوسری طرف ان کے مقابلے میں ایک دینی مدرسے کے طلبہ اور طالبات ہتھیار اٹھائے مزاحمت کے لیے مورچہ زن ہیں، اور ایسا چاہنے والے عناصر اس مقصد میں بہر حال کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس افسوس ناک صورت حال کی ذمہ داری دونوں فریقوں پر عائد ہوتی ہے۔ غازی برادران نے ایک غلط طریق کار پر بے جا اصرار کر کے جہاں ملک بھر کے دینی حلقوں کا اعتماد کھویا اور محاذ آرائی کو تصادم تک پہنچانے کا ذریعہ بنے تو دوسری طرف حکومت نے معاملات کو حد سے زیادہ طول دے کر اور مذاکرات کے لیے کوئی سنجیدہ صورت اختیار کرنے سے عمداً گریز کر کے معاملات کو یہاں تک پہنچا دیا۔ اب اس کے بعد کیا ہونے والا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف باتیں کہی جا رہی ہیں۔ مجھے گزشتہ روز ایک ذمہ دار عالم دین نے فون پر بتایا کہ اس افسوس ناک واقعہ کی آڑ میں حکومت، اسلام آباد میں موجود دینی مدارس کے خلاف کارروائی کا پروگرام بنا رہی ہے اور اس مبینہ تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش ہو سکتی ہے کہ سیکیورٹی کے نام پر ان دینی مدارس کو اسلام آباد کی حدود سے باہر منتقل کر دیا جائے۔ یہ تجویز کچھ عرصہ قبل سامنے آئی تھی جسے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت نے مسترد کر دیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کی دستوری اور قانونی دائرے میں بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔

موجودہ صورت حال میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے افسوس ناک واقعات کی آڑ میں ان عالمی حلقوں کا دباؤ بھی بڑھ سکتا ہے جو حکومت پاکستان پر پورے ملک کے دینی مدارس کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے اور اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کے نام پر ان کے الگ تعلیمی نظام کو سرکاری کنٹرول میں لینے کے لیے زور دے رہے ہیں۔ آج ہی ایک خبر نظر سے گزری ہے کہ حکومت نے ملک بھر کے دینی مدارس میں اسلحہ کی موجودگی کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کی ہدایات جاری کر دی ہیں، حالانکہ ملک کے دینی مدارس کا اس حوالے سے کئی بار سروے کیا جا چکا ہے اور ہر بار اس کی رپورٹ نفی میں آئی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ صورت حال میں جب کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے معاملات ملک بھر کے دینی مدارس سے اسلحہ اور محاذ آرائی، دونوں حوالوں سے مختلف ہیں اور کئی ماہ تک دنیا یہ منظر دیکھ چکی ہے کہ اس معاملے میں اسلام آباد اور ملک کے دیگر حصوں کے دینی مدارس لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے ساتھ شریک اور معاون نہیں ہیں، اس کے باوجود اگر اس کی آڑ میں اسلام آباد کے دینی مدارس یا ملک بھر کے دینی مدارس کے بارے میں کوئی منفی طرز عمل اختیار کیا گیا تو یہ بعض حلقوں کے اس تاثر کو حقیقی ثابت کرنے کی کارروائی سمجھی جائے گی کہ یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے جس کے ایک حصے میں کامیابی سے عمل درآمد کے بعد اب اس ایجنڈے کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔*

O

* روزنامہ پاکستان لاہور، ۱۰ر جولائی ۲۰۰۷ء۔

مذاکرات کی کہانی

اب جبکہ لال مسجد اسلام آباد، جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کا معاملہ مسلح حکومتی آپریشن کے بعد اس انجام کو پہنچ چکا ہے جو ملک کی مقتدر قوتوں کی خواہش تھی اور جس کے لیے گن گن کر دن گزارے جا رہے تھے، اور اس وقت جب میں اسلام آباد ہی میں بیٹھا یہ سطور تحریر کر رہا ہوں، غازی عبدالرشید اپنی والدہ محترمہ اور دیگر بہت سے رفقا سمیت جام شہادت نوش کر چکے ہیں جبکہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف سرکاری فورسز کا آپریشن آخری مرحلہ میں ہے جس کے بارے میں توقع کی جا رہی ہے کہ چند گھنٹوں میں اپنے آخری نتیجے تک پہنچنے والا ہے جبکہ کل صبح آپریشن کے آغاز سے ہی الیکٹرانک میڈیا پر وفاقی وزرا اور دیگر سرکاری ترجمانوں کے بیانات اور وضاحتوں کی شکل میں یک طرفہ صورت حال بار بار پیش کی جا رہی ہے، میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ میں بھی ان مذاکرات کا حصہ رہا ہوں جن کے اچانک ختم ہو جانے کے بعد مسلح آپریشن کا آخری راؤنڈ شروع ہو گیا تھا اور وہ اب تک جاری ہے، ان مذاکرات کے مختلف مراحل کی تفصیل قارئین کے سامنے پیش کر دوں تاکہ وہ معاملہ کے وسیع تر تناظر میں یہ جائزہ لے سکیں کہ وہ مذاکرات کیوں ناکام ہوئے جن کے ختم ہوتے ہی سب کچھ ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

ان مذاکرات کی کہانی کا طویل پس منظر ہے اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے حوالے سے، جو دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والے ملک بھر کے کم وبیش بارہ ہزار دینی مدارس کی نمائندہ تنظیم ہے، ان مذاکرات کا قصہ اس وقت شروع ہوا جب جامعہ حفصہ لال مسجد اسلام آباد کی طالبات

نے قریب ہی واقع ایک سرکاری چلڈرن لائبریری پر یہ کہتے ہوئے قبضہ کرلیا کہ یہ قبضہ اسلام آباد میں مقامی حکومت کی طرف سے چند مساجد کو گرائے جانے کے خلاف احتجاج کے طور پر کیا گیا ہے اور مساجد کی دوبارہ تعمیر کی صورت میں یہ قبضہ چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ امور بھی مطالبات میں شامل تھے کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے، فحاشی اور بے حیائی کے مبینہ اڈوں کو ختم کیا جائے اور حدود شرعیہ میں ایک آرڈیننس کے ذریعے سے جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، وہ واپس لی جائیں۔

اس موقع پر اسلام آباد اور راولپنڈی کے سرکردہ علماے کرام نے جہاں حکومت پر دباؤ ڈال کر اس سے وعدہ لیا کہ وہ ان مساجد کو دوبارہ تعمیر کرے گی جو اسلام آباد میں گزشتہ چند برسوں کے دوران میں گرائی گئی ہیں بلکہ ان میں سے ایک مسجد کی تعمیر دوبارہ شروع بھی کرادی گئی، وہاں ان علماے کرام نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے منتظم مولانا عبدالعزیز اور ان کے معاون مولانا عبدالرشید غازی پر بھی زور دیا کہ وہ سرکاری لائبریری کا قبضہ چھوڑ دیں اور کسی بھی احتجاجی جدوجہد کے لیے قانونی طریق کار پر قناعت کرتے ہوئے قانون کو ہاتھ میں لینے سے گریز کریں۔ دونوں بھائیوں نے اسلام آباد اور راولپنڈی کے سرکردہ علماے کرام کے اس موقف کو قبول نہ کیا تو چونکہ معاملہ ایک دینی مدرسہ کا تھا کہ جامعہ حفصہ کا شمار ملک کے طالبات کے بڑے مدارس میں ہوتا تھا اور اس کی طالبات نے سرکاری لائبریری پر قبضہ کیا تھا، اس لیے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی ہائی کمان سے رجوع کیا گیا کہ وہ مداخلت کرے اور اس قضیہ کو نمٹانے کے لیے کردار ادا کرے، چنانچہ وفاق المدارس کی طرف سے اس کے سربراہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور ان کے ہمراہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا حسن جان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور دیگر سرکردہ حضرات اسلام آباد تشریف لائے اور حکومت کے ذمہ دار حضرات سے ملاقات کر کے گرائی جانے والی مساجد کو فوری طور پر دوبارہ تعمیر کرنے کا مطالبہ کیا اور مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی سے ملاقات کر کے انھیں بتایا کہ سرکاری عمارت پر قبضہ کرنے، قانون کو ہاتھ میں لینے اور حکومت کے ساتھ تصادم پیدا کرنے کی پالیسی سے وفاق المدارس کی قیادت کو اتفاق نہیں ہے اور

ملک بھر کے اکابر علمائے کرام اس طریق کار کو غلط سمجھتے ہیں، اس لیے وہ لائبریری کا قبضہ چھوڑ دیں اور اپنے مطالبات کے لیے قانونی طریق کار اور ذرائع اختیار کریں، مگر مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی نے یہ بات قبول نہ کی اور اپنے طریق کار کو درست قرار دیتے ہوئے اسی پر برقرار رہنے کا اعلان کر دیا جس پر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی ہائی کمان نے وفاق کے ساتھ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کا الحاق ختم کرنے کا اعلان کیا اور اس کے چند روز بعد وفاق المدارس کی مجلس عاملہ نے ایک باضابطہ اجلاس میں اپنے موقف کا اعلان کیا کہ اس کے نزدیک لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے منتظمین کے مطالبات درست ہیں مگر طریقہ کار غلط ہے جس سے وفاق کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجلس عاملہ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ جائز مطالبات کی منظوری کا اعلان کرے اور طاقت کے استعمال کے بجائے مذاکرات کے ذریعے سے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ مجلس عاملہ کے اعلان میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ اگر حکومت نے طاقت کا استعمال کیا تو یہ بھی ایک غلط طریق کار ہوگا جس کی وفاق کی طرف سے شدید مخالفت کی جائے گی۔

اس پس منظر میں جب لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع میں مزید شدت پیدا ہوئی، سرکاری فورسز نے ان دونوں اداروں کو گھیرے میں لے لیا، دونوں طرف سے فائرنگ اور مسلح تصادم کے واقعات میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا اور وفاق کی قیادت نے محسوس کیا کہ مزید خونریزی اور خوفناک تصادم کو روکنے کے لیے کردار ادا کرنا ضروری ہوگیا ہے تو وفاق کے سربراہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان نے اس سلسلے میں پیش رفت کا فیصلہ کیا، چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور دیگر سرکردہ علمائے کرام اسلام آباد تشریف لائے اور غازی برادران سے بات کی کہ وہ تصادم کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے لچک پیدا کریں اور کسی درمیانی راستے پر آئیں۔ اس پر مولانا عبدالرشید غازی نے چند شرائط پر خود کو علمائے کرام کے حوالے کرنے کی پیش کش کی مگر بات بوجوہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے بعد جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمٰن نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا جس میں ان کے ساتھ اسلام آباد اور راول پنڈی کے سرکردہ علمائے کرام کے علاوہ پاکستان شریعت کونسل پنجاب کے امیر مولانا عبدالحق خان بشیر بھی شریک تھے، مگر ڈیڈلاک بدستور باقی رہا۔

۸؍ جولائی کو حضرت مولانا سلیم اللہ خان خود، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا ڈاکٹر محمد عادل خان اور دیگر علمائے کرام کے ہمراہ کراچی سے اسلام آباد پہنچے جبکہ ان کی ہدایت پر مولانا قاری محمد حنیف جالندھری ملتان سے اور راقم الحروف گوجرانوالہ سے اسلام آباد پہنچے بلکہ میں اس روز دارالعلوم رحیمیہ ملتان کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے وہاں جارہا تھا اور لاہور پہنچ چکا تھا جہاں سے مجھے تین بجے ملتان کے لیے پی آئی اے کی فلائٹ پکڑنا تھی مگر حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کے حکم پر میرا روٹ اچانک تبدیل ہوگیا اور میں تین بجے ملتان کی فلائٹ پر سوار ہونے کے بجائے دو بجے اسلام آباد کی فلائٹ پر سوار ہوگیا۔

اسلام آباد پہنچے تو ہم نے یہ طے کیا کہ ہمارا بنیادی ہدف حکومت اور عبدالرشید غازی صاحب کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ دوبارہ شروع کرانا، مزید خونریزی کو روکنا، اور انسانی جانوں کو ضائع ہونے سے بچانا ہوگا اور اس کے لیے، ہم اپنی پوری صلاحیتیں اور قوت صرف کریں گے۔ اس مرحلہ پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہمارا اسلام آباد آنا کسی کی دعوت پر نہیں تھا جیسا کہ ایک ٹی وی چینل کے نشریہ میں آج یہ کہا گیا ہے کہ ان علمائے کرام کو بلایا گیا تھا اور یہ انہی بلانے والوں کے مہمان ہیں۔ یہ قطعی طور پر غلط بات ہے۔ ہم وفاق المدارس کی ہائی کمان کے اپنے فیصلے کے مطابق آئے ہیں، وفاق کے انتظامات کے تحت یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور اسی کے پروگرام کے مطابق واپس چلے جائیں گے۔

بہرحال ہم نے یہ طے کیا کہ سب سے پہلے چودھری شجاعت حسین صاحب سے رابطہ کیا جائے اور ان سے بات کر کے مزید پیش رفت کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ چودھری صاحب سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ وہ ابھی ایک گھنٹہ کے بعد وزیراعظم سے ملاقات کے لیے جا رہے ہیں، اس لیے آپ حضرات ابھی آسکیں تو آجائیں۔ ہم اس وقت کھانے کے لیے میز پر بیٹھ چکے تھے، مگر کھانا وہیں چھوڑ کر بھاگم بھاگ چودھری شجاعت حسین کے ہاں پہنچے تو وہ وفاقی وزرا جناب نصیر خان، جناب انجینئر امیر مقام اور دیگر رفقا کے ہمراہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے وفد میں حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع

عثمانی، مولانا ڈاکٹر عادل خان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور راقم الحروف کے علاوہ اسلام آباد اور راولپنڈی کے علمائے کرام میں سے مولانا قاضی عبدالرشید، مولانا محمد نذیر فاروقی، مولانا محمد شریف ہزاروی اور دیگر علمائے کرام بھی شامل تھے۔ حضرت مولانا سلیم اللہ خان کی قیادت میں جانے والے اس وفد کے متکلم مولانا مفتی رفیع عثمانی تھے۔ انھوں نے ملک کے دینی حلقوں اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے وابستہ ہزاروں مدارس کی ترجمانی کرتے ہوئے چودھری صاحب کو بتایا کہ اس سے قبل صورت حال یہ تھی کہ مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی ایک غلط طریق کار پر بے جا اڑے ہوئے تھے اور حکومت نے صبر وتحمل اور مذاکرات کا راستہ اختیار کر کے بہتر طرز عمل کا مظاہرہ کیا، لیکن اب حکومت نے طاقت استعمال کر کے اور مذاکرات کا راستہ بند کر کے جو رویہ اختیار کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ بھی غلط ہے اور اس سے جو جانی نقصان ہو رہا ہے، اس سے یہ تاثر پھیل رہا ہے کہ حکومت بھی ایک غلط بات پر اڑ گئی ہے، اس لیے ہم یہ مطالبہ لے کر آئے ہیں کہ فوجی طور پر فوجی آپریشن بند کیا جائے، مذاکرات دوبارہ شروع کرنے کے اعلان کیا جائے، وہاں جو لاشیں بتائی جاتی ہیں انھیں نکالا جائے، زخمیوں کو علاج کے لیے ہسپتالوں میں منتقل کیا جائے، انسانی ہمدردی کی بنیاد پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود طالبات اور طلبہ کو خوراک اور دیگر بنیادی ضروریات فراہم کی جائیں، پانی کا کنکشن بحال کیا جائے اور عبدالرشید غازی صاحب نے جو شرائط باہر نکلنے کے لیے پیش کی ہیں، انھیں یکسر مسترد کرنے کے بجائے ان پر دوبارہ غور کر لیا جائے تاکہ کوئی قابل عمل درمیانی راستہ نکالا جا سکے۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کے ساتھ عبدالرشید غازی صاحب کی اس سے قبل ہونے والی گفتگو کی روشنی میں چودھری صاحب کو بتایا گیا کہ عبدالرشید غازی چند شرائط پر ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہیں اور وہ یہ ہیں کہ:

...... عبدالرشید غازی کو ان کے خاندان اور ذاتی سامان سمیت ان کے آبائی گاؤں (روجھان، ڈیرہ غازی خان) میں منتقل کر دیا جائے اور ان کی گرفتاری یا نظر بندی نہ کی جائے۔

...... جامعہ حفصہ اور لال مسجد میں مقیم طالبات، طلبہ اور دیگر افراد میں سے کسی کو لال مسجد اور

جامعہ حفصہ کے تنازع کے حوالہ سے درج کسی مقدمہ میں گرفتار نہ کیا جائے، البتہ ان میں سے کوئی فرد لال مسجد کے تنازع سے پہلے کے کسی کیس میں مطلوب ہے تو اس کی گرفتاری پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

...... وہ لال مسجد، جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ تینوں کے نظم ونسق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہیں، بشرطیکہ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کا انتظام وفاق المدارس کے سپرد کر دیا جائے اور لال مسجد کا نظام محکمہ اوقاف اسلام آباد کی تحویل میں دیا جائے جو وفاق المدارس کے مشورہ سے اس کے انتظامات کرے۔

یہ غازی صاحب کی شرائط تھیں جن کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ یہ حکومت کی طرف سے اس عام معافی کے اعلان کی ایک عملی شکل تھی جس کا خود حکومت نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد کے لیے چند ہفتے قبل اعلان کیا تھا، اس لیے ہم نے عرض کیا کہ جب حکومت خود اس سے قبل عام معافی کا اعلان کر چکی ہے تو اس کی عملی شکل کے طور پر ان شرائط کو قبول کر لیا جائے اور انسانی جانوں کے مزید ضیاع کو روکنے کے لیے عبدالرشید غازی کو ان کی شرط کے مطابق لال مسجد سے نکلنے کا محفوظ راستہ دے دیا جائے۔

یہ شرائط چودھری شجاعت حسین صاحب اور ان کے رفقا کے علم میں اس سے قبل بھی آ چکی تھیں، اس لیے ہمیں اپنا موقف سمجھانے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی، البتہ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے اس موقع پر اس بات کا حوالہ دیا کہ ایسے موقع پر انسانوں جانوں کو بچانے کے لیے اس سے زیادہ سخت شرائط دنیا میں تسلیم کی جاتی رہی ہیں بلکہ خود پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں کابل ایئرپورٹ پر کھڑے پی آئی اے کے اغوا شدہ طیارے میں موجود ایک سو پچیس مسافروں کی جانیں بچانے کے لیے پاکستان کی مختلف جیلوں سے تین سو کے لگ بھگ مجرموں کو رہا کر دیا گیا تھا، اس لیے اگر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد بالخصوص بچوں اور عورتوں کی جانیں بچانے کے لیے عبدالرشید غازی کی یہ شرائط تسلیم کر لی جائیں تو مزید خونریزی کو روکا جا سکتا ہے۔ علما کے وفد نے چودھری شجاعت حسین سے کہا کہ ہماری تجویز یہ ہے کہ انسانی جانوں کو بچانے

کے لیے حکومت بڑے پن کا مظاہرہ کرے اور غازی عبدالرشید کی یہ ضد اگر بے جا بھی ہے تو بھی اسے مان لے تا کہ مزید خونریزی کو روکا جا سکے۔ اس موقع پر وفد کے بعض ارکان کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ فوری طور پر دونوں طرف سے سیز فائر کیا جائے، آپریشن روک دیا جائے، وہاں سے غیر ضروری فورسز ہٹالی جائیں اور اس کے بعد تمام معاملات سپریم کورٹ آف پاکستان یا وفاقی شرعی عدالت کے سپرد کر دیے جائیں اور وہ جو فیصلہ بھی کریں، دونوں فریق اسے قبول کر لیں۔

گفتگو کے دوران میں ایک موقع پر ملک کی عمومی صورت حال اور اہل دین کے حوالے سے حکومت کی پالیسیوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی خاصے جذباتی ہو گئے اور صدر جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کو سختی کے ساتھ ہدف تنقید بنایا جس پر فضا گرم ہوتے ہوتے رہ گئی، مگر مجموعی طور پر گفتگو کا ماحول مناسب رہا اور ہم نے اپنے جذبات اور موقف چودھری شجاعت حسین صاحب اور ان کے رفقا تک اس خیال سے پہنچا دیے کہ وہ صدر اور وزیر اعظم کے پاس جا رہے ہیں، انھیں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف مسلح آپریشن کے بارے میں دینی حلقوں کے جذبات سے آگاہ کریں گے۔ چودھری صاحب نے کہا کہ وہ ہمارا یہ موقف اور جذبات وزیر اعظم اور صدر مملکت تک پہنچا دیں گے اور ان کی پوری کوشش ہوگی کہ معاملات کو افہام وتفہیم کے ساتھ حل کرنے اور تصادم کے امکانات کو روکنے کے لیے کوئی قابل عمل راستہ نکالا جائے۔

اس موقع پر میڈیا کے حضرات بھی موجود تھے جنھوں نے گفتگو کی مجموعی رپورٹ تیار کرنے کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں سے الگ الگ انٹرویو بھی لیے۔ میں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ اس سے قبل ہم یہ کہتے رہے ہیں کہ لال مسجد کی انتظامیہ کے مطالبات صحیح ہیں لیکن ان کا طریق کار غلط ہے، لیکن اب حکومت بھی طاقت کے استعمال کا غلط طریق کار اختیار کر کے اسی پوزیشن پر آ گئی ہے اور ہم حکومت کو یہ بتانے کے لیے آئے ہیں کہ اس کے اس طرز عمل کا ردعمل انتہائی شدید ہوگا اور ملک بھر کے دینی حلقوں اور عوام میں سخت اشتعال پیدا ہوگا۔ ایک صحافی دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ ریاست کو مذہب سے الگ کرنے کی کسی مہم کا حصہ تو نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس قسم کی کارروائیاں اسی مقصد کے لیے کی جاتی ہیں لیکن پاکستان میں ایسا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ پاکستان کی نہ صرف

دستوری بنیاد اسلامی نظریہ پر ہے بلکہ اس کے وجود کی بنیاد بھی اسلام پر ہی ہے، اس لیے پاکستان کو اس کے قیام کے نظریاتی اور تہذیبی پس منظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پاکستان اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔

بہرحال ہم چودھری شجاعت حسین صاحب سے یہ عرض کر کے اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے کہ ہم آپ کے جواب کے منتظر رہیں گے۔ مغرب کے بعد وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کا وفاقی وزیر مذہبی امور جناب اعجاز الحق سے رابطہ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ وہ خود ہمارے پاس تشریف لا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے اور ان کے ساتھ کم و بیش ایک گھنٹہ تک انہی امور پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ چودھری شجاعت حسین کے ساتھ ہماری ملاقات کی تفصیلات صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم جناب شوکت عزیز تک پہنچ چکی ہیں۔ خود ان حضرات کی بھی خواہش ہے کہ افہام و تفہیم کے ساتھ مسئلہ کے حل کی کوئی صورت نکل آئے اور اس مقصد کے لیے وزیراعظم کے ساتھ آپ حضرات کی ملاقات کا پروگرام طے کیا جا رہا ہے۔ اس دوران ہم نے صدر جنرل پرویز مشرف سے براہ راست ملاقات کے لیے وفاق المدارس کی طرف سے ایک مکتوب بذریعہ فیکس بھجوا دیا تھا جس کی وصولی کی ان کے آفس سے اطلاع مل گئی تھی اور جنرل شفقات صاحب کے ساتھ قاری محمد حنیف جالندھری کی فون پر گفتگو بھی ہو گئی تھی لیکن جب اعجاز الحق نے بتایا کہ صدر اور وزیراعظم دونوں تک ہمارا موقف اور جذبات پہنچ چکے ہیں اور وزیراعظم کے ساتھ ہماری ملاقات کا پروگرام طے کیا جا رہا ہے تو پھر ہم نے صدر کے ساتھ ملاقات کا زیادہ پیچھا نہیں کیا۔

اگلے روز ۹ر جولائی کو ڈھائی بجے وزیراعظم جناب شوکت عزیز کے ساتھ ہماری ملاقات ہوئی جس میں ہماری طرف سے مولانا سلیم اللہ خان، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا حکیم محمد مظہر، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا ڈاکٹر عادل خان اور راقم الحروف کے علاوہ مولانا مفتی محمد اور مولانا قاضی عبدالرشید بھی شامل تھے جبکہ وزیراعظم کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین صاحب، جناب اعجاز الحق، جناب محمد علی درانی، جناب طارق

عظیم اور دیگر حضرات تھے۔ وزیر اعظم نے علمائے کرام کی اسلام آباد میں آمد کا خیر مقدم کیا، ان کے مصالحتی جذبہ کو سراہا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ خدا کرے کہ یہ کوشش کامیاب ہو اور انسانی جانوں کو بچایا جا سکے۔ انہیں وفاق المدارس کے موقف اور جذبات سے آگاہ کیا گیا جس کی اطلاع انہیں پہلے بھی مل چکی تھی اور جو نکات چودھری شجاعت حسین صاحب کے ساتھ ملاقات میں زیر بحث آئے تھے، وہ وزیر اعظم کے سامنے پھر دہرائے گئے جن میں سے غازی عبدالرشید کو محفوظ راستہ دینے کے بارے میں تھوڑی بہت بات ہوئی مگر پھر اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ ان کی گرفتاری یا نظر بندی نہیں ہوگی اور یہ بات چودھری شجاعت حسین صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ خود مجلس میں دہرائی۔ دوسرے نکات پر بھی اصولی اتفاق رائے ہو گیا اور طے پایا کہ اس کی تفصیلات وفاق المدارس کے ذمہ دار حضرات وفاقی وزرا کے ساتھ مل کر طے کر لیں گے۔

ہم نے گزارش کی کہ علمائے کرام کا وفد غازی عبدالرشید سے براہ راست ملاقات کے لیے لال مسجد جانا چاہتا ہے، مگر وزیر اعظم نے اس کی اجازت دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے، اس لیے آپ حضرات کو لال مسجد میں جانے کی ہم اجازت نہیں دیں گے۔ البتہ وہاں جو ٹاکنگ پوائنٹ حکومت کی طرف سے بنایا گیا ہے، وہاں جا کر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے آپ ان سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ یہ صورت حال ہمارے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ مگر وزیر اعظم سے ملاقات سے فارغ ہو کر جب ہم اپنی قیام گاہ تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ لال مسجد میں جانے کا پروگرام بن گیا ہے اور ہم لوگ چودھری شجاعت حسین صاحب اور اعجاز الحق صاحب کے ساتھ پانچ بجے کے بعد وہاں جائیں گے۔ اس دوران میں ٹیلی فون پر غازی عبدالرشید کے ساتھ بھی رابطہ ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ وہ چودھری صاحب اور علمائے کرام کا لال مسجد میں خیر مقدم کریں گے اور انہیں پورا تحفظ دیا جائے گا حتیٰ کہ اس کی تفصیلات بھی طے ہو گئیں کہ کون سے راستے سے جائیں گے، کہاں تک گاڑیوں پر جائیں گے اور کون سے دروازے سے اندر داخل ہوں گے، مگر جب علمائے کرام کا وفد چودھری شجاعت حسین صاحب، اعجاز الحق صاحب، محمد علی درانی صاحب، طارق عظیم صاحب، اور عبدالستار ایدھی کے ہمراہ وہاں پہنچا تو وہاں موجود حکام نے ہمیں لال مسجد جانے سے روک دیا اور

کہا کہ آپ حضرات میں سے کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس دوران میں غازی عبدالرشید نے فون پر ہونے والی گفتگو میں یہ کہا کہ وفاقی وزرا کے ساتھ علما کی گفتگو میں مولانا فضل الرحمٰن خلیل کو بھی شامل کیا جائے، چنانچہ ان کے اصرار پر انہیں بلا لیا گیا اور وہ اس کے بعد ہونے والی گفتگو میں ہمارے ساتھ شریک رہے۔

ہم شام پونے چھ بجے کے لگ بھگ اس جگہ تک پہنچے جسے ٹاکنگ پوائنٹ کا نام دیا گیا ہے اور جہاں سے آگے کسی کو نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ وہاں ایک گاڑی پر لاؤڈ اسپیکر نصب تھا جس کے ذریعے سے لال مسجد کے اندر کے لوگوں کو خطاب کیا جاتا تھا اور وہ جس بات کا جواب ضروری سمجھتے، مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے اس کا جواب دیتے تھے۔ ہم سے بھی کہا گیا کہ اس لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے اندر کے لوگوں سے خطاب کریں اور انہیں ہتھیار ڈالنے کے لیے کہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم اس کام کے لیے نہیں آئے۔ اگر اندر جانے کی اجازت ہے تو ہم براہ راست وہاں جا کر عبدالرشید غازی کے ساتھ مذاکرات کے لیے تیار ہیں، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ٹیلی فون کا رابطہ ہی کافی ہے، ہم لاؤڈ اسپیکر کو ان کے ساتھ گفتگو کے لیے ذریعہ بنانے کو تیار نہیں ہیں۔

اس دوران میں قریب کے ایک خالی مکان میں ہمارے مل بیٹھنے کا بندوبست کیا گیا اور ہم مذکورہ بالا وفاقی وزرا اور چودھری شجاعت حسین صاحب کے ساتھ اس اصولی مفاہمت کی تفصیلات طے کرنے بیٹھ گئے جو وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات کے دوران میں طے پا گئی تھی۔ ایک ایک شق پر بحث ہوئی، ہر شق کے مختلف پہلوؤں پر دونوں طرف سے تحفظات کا اظہار ہوتا رہا اور رات تقریباً سوا بارہ بجے ہم ایک تحریر پر متفق ہوئے جن کے نکات طارق عظیم صاحب نے لکھے، اسے باقاعدہ فارمولے کی شکل میں نے دی اور جب ہم اس پر اتفاق رائے کر چکے تو ہمیں بتایا گیا کہ اب اسے لے کر چودھری شجاعت حسین صاحب ایوان صدر جائیں گے اور وہاں سے منظوری کے بعد اسے حتمی شکل دی جائے گی جبکہ اسے فون پر غازی عبدالرشید کو سنایا جا چکا تھا اور انہوں نے بھی اس سے اتفاق کا اظہار کر دیا تھا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم نے جو کچھ طے کیا ہے، وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات میں اصولی طور پر طے

پا جانے والے نکات کی روشنی میں ہے، اس لیے مزید کسی جگہ سے اس کی توثیق کی ضرورت نہیں پڑے گی، لیکن ہمیں بتایا گیا کہ ایسا ضروری ہے اور چودھری صاحب نے کہا کہ آپ حضرات انتظار کریں، ہم آدھ پون گھنٹہ میں واپس آ رہے ہیں۔ مجلس میں شریک دونوں طرف کے حضرات کے نزدیک یہ معاملات تقریباً طے پا چکے تھے۔ چودھری وجاہت حسین صاحب بار بار اصرار کر رہے تھے کہ یہ سارا عمل رات ہی رات مکمل کر لیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ وہ جامعہ حفصہ اور لال مسجد میں موجود لوگوں کو منتقل کرنے کے لیے کتنی گاڑیوں کا بندوبست کریں اور اس کے ساتھ یہ بات بھی زیرِ بحث آئی کہ جب ہم تھوڑی دیر کے بعد سب اندر جائیں گے تو وہاں موجود افراد کے لیے کھانا بھی ساتھ لے کر جائیں گے، اس کا انتظام کر لینا چاہیے۔ اس پر یہ تجویز دی گئی کہ لاہور کے داتا دربار کی طرح اسلام آباد میں بھی بعض مقامات پر پکی پکائی دیگیں مل جاتی ہیں، وہاں سے منگوالی جائیں حتیٰ کہ ایک مرحلہ پر چودھری وجاہت حسین نے بتایا کہ وہ بیس دیگوں کا انتظام کر رہے ہیں، لیکن جب انتظار طویل ہوتا گیا تو ہمارے ذہنوں میں تشویش پیدا ہوئی اور ہم نے (مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور راقم الحروف) اس پر آپس میں بات بھی کی، چنانچہ جب رات اڑھائی بجے کے لگ بھگ چودھری شجاعت حسین صاحب وفاقی وزرا کے ہمراہ واپس آئے تو ان کے پاس ہماری طے شدہ تحریر کے بجائے ایک اور تحریر تھی جس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ صرف اسے قانونی شکل دینے کے لیے نئے سرے سے لکھا گیا ہے، مگر جب اسے پڑھ کر سنایا گیا تو اس میں پہلی تحریر کے تینوں نکات غائب تھے۔

......غازی عبدالرشید کے لیے لکھا گیا تھا کہ انہیں ان کے خاندان سمیت گھر میں رکھا جائے گا اور ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی ہوگی۔

......لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود طلبہ اور دیگر مرد حضرات کو لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع کے حوالہ سے گرفتار نہ کرنے کی بات حذف کر دی گئی تھی اور لکھا گیا تھا کہ ان میں سے جو شخص (تنازعہ سے قبل یا بعد کے فرق کے بغیر) کسی بھی مقدمہ میں مطلوب ہوگا، اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔

...... جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو وفاق المدارس کی تحویل میں دینے کی بات بھی حذف کر دی گئی تھی۔

یہ تینوں باتیں ہماری تجاویز نہیں تھیں بلکہ غازی عبدالرشید کی شرائط تھیں جن پر انہیں شدت سے اصرار تھا، اس لیے ہم ان کے بارے میں از خود کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لیے طے پایا کہ فون پر یہ نئی تحریر غازی عبدالرشید کو سنا دی جائے اور اگر وہ اسے قبول کر لیں تو ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن جب مولانا فضل الرحمٰن خلیل نے انہیں فون پر یہ تحریر سنائی تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مولانا فضل الرحمٰن خلیل ہمارے سامنے انہیں سمجھاتے رہے کہ حالات کی سنگینی کا تقاضا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیں، لیکن جب وہ نہ مانے تو مولانا فضل الرحمٰن خلیل نے فون میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے غازی عبدالرشید سے بات کی جو میری ان سے آخری گفتگو ثابت ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس تحریر میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا اور ہاں یا نہ میں جواب درکار ہے جس کے لیے صرف آدھے گھنٹے کی گنجائش ہے، اس لیے آپ اسے قبول کر لیں تو بہتر ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ وہ پہلے والی تحریر جو مجھے سنائی گئی تھی، اب بھی میرے لیے قابل قبول ہے لیکن دوسری تحریر کو آپ تبدیل کرانے کی کوشش کریں۔ میں نے کہا کہ ایسا عملاً ممکن نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے، ان سے کہیں کہ یہ ہمارا قتل عام کریں، قیامت کے دن میں آپ سب حضرات سے اس کے بارے میں بات کر لوں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت خود میرے حواس بھی قابو میں نہیں رہے تھے، اس لیے میں نے مزید کوئی بات کیے بغیر ٹیلی فون دوبارہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس تحریر میں کوئی ردوبدل ممکن نہ ہونے کی بات میں نے اس لیے کہی تھی کہ ان حضرات نے آتے ہی ہمیں دوٹوک طور پر کہہ دیا تھا کہ یہ آخری اور حتمی فیصلہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس کا جواب ہاں یا نہ میں دیں اور اس کے لیے ہمارے پاس نصف گھنٹہ سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس دوران میں ایک اعلیٰ فوجی افسر مذاکرات کے کمرے میں تشریف لائے اور کرسی پر بیٹھ کر ہماری گفتگو کا جائزہ لیتے رہے۔ میں فوجی رینکوں کے درجات کو نہیں پہچانتا، اس لیے ان کی وردی اور

لہجوں سے مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کس سطح کے افسر ہیں، لیکن ان کا لہجہ اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ کمانڈر ہیں، اس لیے کہ جب گفتگو کے دوران میں غازی عبدالرشید نے کہا کہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل اور مولانا زاہدالراشدی یہ تحریر لے کر میرے پاس آ جائیں، ہم اس پر دوبارہ غور کر لیتے ہیں مگر ان فوجی افسر صاحب نے انتہائی تحکمانہ لہجے میں کہا کہ میں فضل الرحمٰن خلیل کے علاوہ کسی اور شخص کو اندر جانے کی اجازت نہیں دوں گا اور یہ بھی صرف پندرہ منٹ کے لیے جا سکیں گے، اس سے زیادہ وقت نہیں ہے۔

اس صورت حال میں ان مذاکرات میں مزید حصہ دار بننا ہمارے لیے ممکن ہی نہ تھا، اس لیے ہم نے آپس میں مشورہ کیا اور وہاں سے فوری چلے آنے کا فیصلہ کیا۔ صورت حال کی سنگینی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم زبانی طور پر السلام علیکم کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئے اور کسی سے رخصتی مصافحہ نہ کر سکے اور ان میں سے بھی کسی دوست کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ہمیں مزید رکنے کا کہیں یا ہم سے رخصتی مصافحہ کر لیں۔ دونوں فریقوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ہم علمائے کرام وہاں سے فوراً روانہ ہو جائیں حتیٰ کہ دوسرے کمرہ میں موجود ہمارے بعض ساتھیوں نے بتایا کہ کمرے سے باہر سرکاری وفد کے دو حضرات آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ ''ان مولویوں کو یہاں سے جلدی چلتا کرو۔'' چنانچہ ہم وہاں سے اڑھائی بجے کے لگ بھگ چلتے بنے لیکن جب ہم اپنی قیام گاہ میں پہنچ کر تھوڑی دیر باہمی مشاورت کے بعد نماز فجر کا وقت داخل ہونے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ نماز پڑھ کر کچھ نیند کر لیں تو دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور میڈیا نے خبر دی کہ مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں اور آپریشن کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

مذاکرات کے حوالے سے چند باتیں اور بھی ہیں جن کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ بعض وفاقی وزرا نے اپنے انٹرویوز میں کہا ہے کہ مذاکرات کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ عبدالرشید غازی نے یہ شرط لگا دی تھی کہ ان کے ساتھ لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں جو غیر ملکی موجود ہیں، انھیں بھی تحفظ فراہم کیا جائے اور یہ بات حکومت کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی جبکہ اصل بات یہ ہے کہ وفاق المدارس العربیہ کے وفد کا ٹیلی فونک رابطہ غازی عبدالرشید سے، وزیراعظم سے ہماری ملاقات

کے بعد قائم ہوا جو وقفہ وقفہ سے رات اڑھائی بجے تک جاری رہا اور اس وقت تک غیر ملکیوں کے حوالے سے ان کی طرف سے کوئی بات سامنے نہیں آئی اور مقدمات اور گرفتاریوں کے بارے میں صرف اس پہلو پر بات چیت ہوتی رہی کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع سے قبل یعنی چلڈرن لائبریری پر جامعہ حفصہ کی طالبات کے قبضہ سے پہلے کے مقدمات میں اگر کوئی شخص مطلوب ہے تو اس کی گرفتاری پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا، البتہ چلڈرن لائبریری پر قبضہ کے بعد درج کیے جانے والے مقدمات میں کسی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ یہ غازی عبدالرشید کی شرط تھی جسے وزیراعظم کے ساتھ ہماری ملاقات کے دوران میں تسلیم کر لیا گیا تھا مگر صدر جنرل پرویز مشرف نے اسے مسترد کر دیا جس کا انہوں نے قوم سے نشری خطاب کے دوران خود بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ عبدالرشید غازی کو گرفتاری یا نظر بندی سے مستثنیٰ کرنے اور ان کے ساتھ لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد کو چلڈرن لائبریری کے بعد درج کیے جانے والے مقدمات میں گرفتار نہ کرنے کی شرط قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جس کی وجہ سے علما اور وزرا کا مرتب کردہ مصالحتی فارمولا ناکام ہو گیا۔

اس لیے اس مرحلے میں یہ وضاحت ہماری طرف سے ضروری ہو گئی ہے کہ ہمارے ساتھ گفتگو کے دوران میں غازی عبدالرشید نے غیر ملکیوں کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا ڈاکٹر عادل خان اور راقم الحروف پر مشتمل وفد جب رات اڑھائی بجے کے لگ بھگ مذاکرات سے لاتعلق ہو کر لال مسجد کے قریب ٹاکنگ پوائنٹ سے واپس آیا تو اس کے بعد وزرا کی بات چیت مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے سے کم وبیش ڈیڑھ گھنٹہ تک چلتی رہی۔ اسی وجہ سے ہم نے اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر یہ طے کیا کہ ہم سر دست میڈیا سے کوئی بات نہیں کریں گے اور ہمارے بعد ہونے والی اس گفتگو کے نتائج کا انتظار کریں گے تاکہ میڈیا کے ساتھ ہماری کسی بات سے اس گفتگو کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ ہماری خواہش اور دعا تھی کہ خدا کرے، اس گفتگو کا ہی کوئی مثبت نتیجہ نکل آئے اور جس نقصان اور المیہ سے ہم ڈر رہے تھے، اس کو روکنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے باہمی مشورہ سے اپنے موبائل فون بند کر دیے اور نماز فجر ادا کرنے کے بعد کمرے بند کر کے سو گئے۔ مجھے ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ حامد

میر صاحب نے آ کر جگایا۔ انہیں کسی ذریعے سے پتہ چل گیا تھا کہ میں فلاں ہوٹل کے فلاں کمرے میں سویا ہوا ہوں۔ میرے چھوٹے بھائی اور پاکستان شریعت کونسل پنجاب کے امیر مولانا عبدالحق خان بشیر بھی اسی کمرے میں میرے ساتھ تھے اور میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ مجھے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے نہ جگایا جائے، مگر حامد میر صاحب کے اصرار پر مجھے جگا دیا گیا اور اس وقت تک رونما ہونے والی صورت حال سے مجھے آگاہ کیا گیا تو میں نے میر صاحب کو جیو کے لیے وہ انٹرویو دیا جو بار بار نشر ہو چکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وزرا اس قدر اعتماد کے ساتھ غیر ملکیوں کے حوالے سے بات کر رہے ہیں تو ممکن ہے، ہماری واپسی کے بعد مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے سے ہونے والی گفتگو میں عبدالرشید غازی نے اس قسم کی کوئی بات کی ہو، لیکن مجھے رات ایک دوست نے بتایا کہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل نے بھی ایک ٹی وی چینل کو دیے گئے انٹرویو میں یہ وضاحت کی ہے کہ ان کے ساتھ عبدالرشید غازی نے غیر ملکیوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

اسی طرح لال مسجد کے بارے میں سپریم کورٹ کے ازخود نوٹس لینے کے حوالہ سے جو صورت حال پیدا ہوئی، اسے بھی ریکارڈ میں لانا ضروری ہے۔ سپریم کورٹ نے اس واقعہ کا ازخود نوٹس لے کر حکومت کو عدالت میں طلب کیا اور ہدایات جاری کیں جو اخباری اطلاعات اور وہاں موجود افراد کے ذریعے سے ہم تک پہنچیں۔ وہ یہ تھیں کہ:

......لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد کی جانوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔

......علما کی جس مصالحتی کمیٹی نے وزیر اعظم سے ملاقات کی ہے، اس کے لال مسجد میں جانے اور عبدالرشید غازی کے ساتھ مذاکرات کا اہتمام کیا جائے۔ اس مصالحتی کمیٹی کو سرکاری طور پر سہولت فراہم کی جائے اور اسے تحفظ فراہم کیا جائے۔

......لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد اگر ہتھیار ڈالیں تو اس وقت سیشن جج اسلام آباد وہاں موجود ہوں تاکہ سپریم کورٹ کی ہدایات پر عملدرآمد کی نگرانی کر سکیں، وغیر ذلک۔

ہمیں خوشی ہوئی کہ اس سے ہمیں اپنے مصالحتی مشن میں سپورٹ حاصل ہوگی، لیکن عملاً جو کچھ ہوا، اس سے ہمارے لیے مشکلات پیدا ہوئیں اور مصالحتی کمیٹی کو سپورٹ کرنے کے لیے عدالت عظمیٰ

کی یہ ہدایت عملاً مصالحتی کمیٹی کے لیے رکاوٹوں کا باعث بن گئی جس کی کچھ واقعاتی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ہم ٹاکنگ پوائنٹ کے قریب ایک مکان کی بالائی منزل میں وفاقی وزرا کے ساتھ مصالحتی فارمولا کو حتمی شکل دینے کے لیے مذاکرات میں مصروف تھے اور عبدالرشید غازی کے ساتھ فون پر گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ اچانک نیچے سے لاؤڈ اسپیکر پر ایک اعلان شروع ہو گیا جو اسلام آباد کے سیشن جج صاحب کی طرف سے تھا کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے حکم کے مطابق وہ عبدالرشید غازی اور ان کے ساتھ موجود تمام افراد کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ فوری طور پر ہتھیار ڈال دیں اور سیشن جج کی موجودگی میں خود کو قانون کے حوالہ کر دیں۔

میں نے اس موقع پر طارق عظیم صاحب اور دیگر وزرا سے کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سپریم کورٹ کے آرڈر پر ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر یہ ضروری تھا تو ہمارے آنے سے پہلے ہو سکتا تھا یا ہمارے جانے تک اسے موخر کیا جا سکتا تھا، لیکن عین اس وقت جبکہ ہم عبدالرشید غازی کے ساتھ مصالحت کی تفصیلات طے کر رہے ہیں، ہماری موجودگی میں یہ اعلان مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کی کوشش ہے۔ اس پر طارق عظیم اور اعجاز الحق کے ساتھ میری خاصی تلخی ہو گئی۔ ہم نے اصرار کیا کہ اس اعلان کو فوراً رکوایا جائے مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے ایک وکیل رائے بشیر صاحب نے، جو سپریم کورٹ کی عدالتی کارروائی میں وہاں موجود تھے اور ہمارے ساتھ رات کو ساتھ والے کمرے میں دوسرے حضرات کے ساتھ ہماری گفتگو کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے، بتایا کہ ان سے اسلام آباد انتظامیہ کے ایک ذمہ دار افسر نے کہا کہ ہم سیشن جج صاحب کو گھر سے لے کر آئے ہیں، وہ ابھی اعلان کریں گے۔ آپ بھی بطور وکیل ان کے ساتھ کھڑے ہو کر لال مسجد والوں سے ہتھیار ڈالنے کی اپیل کریں مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔

ہم نے وزرا سے کہا کہ ہماری معلومات کے مطابق سپریم کورٹ آف پاکستان نے حکومت کو ہدایت کی ہے کہ وہ علما کی مصالحتی کمیٹی کے لال مسجد میں جانے اور عبدالرشید غازی کے ساتھ ان کی ملاقات کا اہتمام کرے۔ حکومت اس سلسلے میں کیا کر رہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ حضرات کو اسی

لیے یہاں لایا گیا ہے کہ آپ ٹاکنگ پوائنٹ پر سیشن جج صاحب کے ساتھ کھڑے ہوکر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے اعلان کریں اور اندر والوں سے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہیں۔ ہم نے گزارش کی کہ ہم تو مصالحت کے لیے آئے ہیں، ہتھیار ڈالنے کا اعلان کرنے کے لیے نہیں آئے۔ انہوں نے کہا کہ سپریم کورٹ نے یہی کہا ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ اگر ہمارا کام صرف سیشن جج صاحب کے ساتھ کھڑے ہوکر یہ اعلان کرنا ہے تو پھر ''مصالحتی کمیٹی'' کا کیا مطلب ہے؟ اس کا کوئی جواب وزرا کی طرف سے نہیں دیا گیا۔

رات دو بجے کے بعد جب چوہدری شجاعت حسین صاحب اور وفاقی وزرا ایوان صدر سے ایک نیا مسودہ لے کر آئے اور اسے پڑھا گیا تو ہم نے عرض کیا کہ ہمارے ساتھ آپ نے طے کیا تھا کہ عبدالرشید غازی کو گرفتار یا نظر بند نہیں کیا جائے گا اور ان کے ساتھیوں میں سے بھی کسی کو چلڈرن لائبریری پر قبضہ کے بعد درج کیے جانے والے کسی مقدمہ میں گرفتار نہیں کیا جائے، مگر اس نئی تحریر میں یہ دونوں باتیں ختم کردی گئی ہیں تو ان وفاقی وزرا نے کہا کہ سپریم کورٹ کے آرڈر کے بعد ایسا ضروری ہوگیا ہے کیونکہ اگر ہم وہی کچھ لکھیں جو پہلی تحریر میں لکھا گیا تھا تو ہم سپریم کورٹ کے احکام کی خلاف ورزی اور توہین عدالت کے مرتکب قرار پاسکتے ہیں، جبکہ ہمارا موقف تھا کہ جب سپریم کورٹ نے ہماری ''مصالحتی کمیٹی'' کی مصالحتی حیثیت اور کردار کو تسلیم کرلیا ہے تو ہمارے ذریعے سے جو بھی مصالحت طے پائے گی، وہ قانون کی خلاف ورزی یا سپریم کورٹ کے حکم سے انحراف متصور نہیں ہوگی، لیکن ہمارے اس موقف کو تسلیم نہیں کیا گیا اور وزرا نے یہ کہہ کر ایوان صدر سے لائی گئی تحریر میں کسی قسم کے ردوبدل سے انکار کردیا کہ سپریم کورٹ کے آج کے آرڈر کے بعد ہم ایسا نہیں کرسکتے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، وہ قوم کے سامنے ہے اور جو کچھ ہونے جا رہا ہے، اس کے بارے میں بھی کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہے۔ اہل دین کی آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہوگیا ہے جس کا سامنا کرنے کے لیے بہت زیادہ حوصلہ وتدبر اور حکمت ودانش کی ضرورت ہے۔ غازی عبدالرشید، ان کی والدہ محترمہ اور ان کے رفقا کی المناک شہادت ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی

باعث رنج وغم ہے کہ ان کا تعلق اہل دین سے تھا اور وہ ایک غلط طریق کار پر بے جا اڑے رہنے کے باوجود جن مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، وہ درست تھے۔ اور یہ سانحہ ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی انتہائی صدمہ کا پہلو لیے ہوئے ہے کہ ہمارے محترم اور بزرگ دوست حضرت مولانا محمد عبداللہ شہیدؒ کا خاندان اپنے انتہائی قیمتی افراد سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جن افسران، سپاہیوں اور دیگر شہریوں نے جانیں دی ہیں، ان کی موت پر بھی ہم اسی طرح صدمہ سے دوچار ہیں۔ وہ بھی ہمارے مسلمان بھائی تھے، پاکستانی تھے اور اپنی ڈیوٹی پر تھے۔ ہم سب حضرات کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت اس صورت حال میں مسلسل باہمی مشاورت میں ہے۔ اس کی مجلس عامہ کے فیصلے ان سطور کی اشاعت تک آپ کے سامنے آ چکے ہوں گے۔ ہمارا بنیادی ہدف اور دائرہ کار دینی تعلیم کا فروغ، اسلامی روایات کا تحفظ، دینی مدارس اور ان کی آزادی کی بقا اور عالم کفر کی نظریاتی، تہذیبی اور تعلیمی یلغار کا مقابلہ کرنا ہے۔ ان مقاصد کے لیے قانون اور دستور کے دائرے میں رہتے ہوئے جدوجہد کا ہر معروف طریقہ اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ ہمارا حق بنتا ہے بلکہ ہمارے فرائض میں سے ہے۔ اس نئی صورت حال میں جہاں جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کے مستقبل کا سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے، وہاں ملک بھر کے دینی مدارس کے جداگانہ تشخص اور آزادی وخود مختاری کو بھی دوبارہ سوالیہ نشان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہم حوصلہ، تدبر، دانش، جرات، استقامت، اور تسلسل کے ساتھ اپنی جدوجہد کو جاری رکھ سکے تو دینی مدارس اس نئی آزمائش میں بھی سرخرو ہوں گے۔

قارئین کرام! جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اس کے اسباب وعوامل اور نتائج وعواقب کا تجزیہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر ایک عرصہ تک بحث ہوتی رہے گی اور ہم بھی حسب موقع اور حسب توفیق اس بحث میں اپنا حصہ ڈالیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مذاکرات کے دوران میں ہونے والے اہم واقعات کو تاریخ کے ریکارڈ میں لانا ضروری تھا۔ جو کچھ اس کالم میں تحریر کیا گیا ہے، وہ قوم کی اور

تاریخ کی امانت تھی جو امانت ہی کے جذبہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے۔ خدا کرے کہ ہم اس قسم کے المیوں سے صحیح طور پر سبق حاصل کر سکیں اور یہ حادثات اپنی تمام تر المناکیوں کے باوجود ہمارے لیے مستقبل کی بہتر صورت گری کا باعث بن جائیں۔ آمین یارب العالمین۔*

O

* ۱۱ر جولائی ۲۰۰۷ء۔

مذاکرات کی ناکامی کے بعد کیا ہوا؟

جامعہ حفصہ کے المیہ کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس قضیہ کے آغاز سے ہی میں نے اس کے حوالے سے اپنے تاثرات لکھنا شروع کر دیے تھے جو روزنامہ اسلام، روزنامہ پاکستان، ماہنامہ الشریعہ اور ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں شائع ہوتے رہے ہیں' چنانچہ اس عنوان پر لکھے گئے میرے بیس مضامین کا مجموعہ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ نے ایک سو تیس صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے اور میرے خیال میں اس کے کسی پہلو پر مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، البتہ ایک پہلو تشنہ رہا اور میری خواہش تھی کہ اگر اس کے بارے میں براہ راست کچھ معلوم ہو جائے تو اسے بھی اپنی گزارشات کے ریکارڈ میں لے آؤں۔ وہ پہلو یہ ہے کہ جب لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف افسوس ناک مسلح آپریشن سے قبل رات اڑھائی بجے حکومتی ٹیم کے ساتھ ہمارے مذاکرات تعطل کا شکار ہوئے اور ہم مذاکرات میں مزید پیش رفت سے قطعی طور پر مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ کر آ گئے تو اس کے بعد بھی یہ مذاکرات مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے ڈیڑھ دو گھنٹے جاری رہے اور ان مذاکرات کے دوران ہی آپریشن کا آغاز ہو گیا۔ ان مذاکرات میں کیا باتیں ہوئیں اور کون سا لمحہ اور آخری پوائنٹ تھا جہاں مذاکرات کو سبوتاژ کر کے لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد پر آتش و آہن کی بارش کر دی گئی؟ مولانا فضل الرحمٰن خلیل نے کسی ٹی وی چینل کو اس کی تفصیلات بتائی تھیں مگر میں چونکہ چینلز دیکھنے کا عادی نہیں، کیوں کہ اس کا وقت ہی نہیں ملتا اور اس سلسلے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا، وہ زبانی طور پر مختلف دوستوں کے ذریعے یا بعض کالم نویس دوستوں کی تحریروں سے معلوم ہوا، جب کہ میری عادت ہے کہ موضوع پر، خاص طور پر اس قسم کے حساس

موضوع پر جب تک براہ راست معلومات حاصل نہ کرلوں، قلم نہیں اٹھاتا، اس لیے اس انتظار میں خاموش رہا کہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل سے کسی وقت ملاقات ہوئی تو ان سے براہ راست دریافت کروں گا، مگر ایسا کوئی موقع نہ نکل سکا اور میرا معمول کا بیرونی سفر شروع ہوگیا۔ کافی انتظار کے بعد گزشتہ ہفتے کے دوران ایک دوست کے ہاں مولانا فضل الرحمٰن خلیل سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ان مذاکرات کے آخری حصے کی تفصیلات سے آگاہ کیا جو قارئین کی نذر کی جارہی ہیں۔

اس سے قبل بطور یاددہانی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے آخری شب کے مذاکرات جن میں ایک طرف سے مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا قاری حنیف جالندھری، مولانا ڈاکٹر محمد عادل خان، راقم الحروف اور دوسرے حضرات تھے جب کہ دوسری طرف چودھری شجاعت حسین، اعجاز الحق، محمد علی درانی اور طارق عظیم تھے اور مولانا غازی عبدالرشید شہید کی خواہش پر مولانا فضل الرحمٰن خلیل کو بھی بطور خاص ان مذاکرات کے لیے بلایا گیا تھا، ۹ جولائی کو رات اڑھائی بجے کے لگ بھگ اس نکتہ پر ٹوٹے تھے کہ اس سے دو گھنٹے قبل مصالحت کے جس مسودہ پر دونوں ٹیموں میں اتفاق رائے ہوگیا تھا اور غازی عبدالرشید شہید نے بھی فون پر اسے سماعت کر کے اس سے اتفاق کرلیا تھا، وہ مسودہ ایوان صدر سے قبولیت حاصل نہ کرسکا اور جب وزرا کی ٹیم اڑھائی بجے شب کے لگ بھگ ایوان صدر سے واپس آئی تو ان کے ہاتھ میں ایک نیا مسودہ تھا جس میں غازی عبدالرشید شہید کو گرفتار نہ کرنے، لال مسجد میں موجود افراد کو اس قضیہ کے آغاز کے بعد درج شدہ کسی مقدمہ میں گرفتار نہ کرنے اور جامعہ حفصہ کو وفاق المدارس کے سپرد کرنے کی شرائط کو مسترد کردیا گیا تھا اور دوٹوک طور پر یہ کہہ دیا گیا تھا کہ یہ مسودہ حتمی ہے، اس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہوگا، اس کا ہاں یا ناں میں جواب دیا جائے اور اس کے لیے بھی صرف نصف گھنٹہ کی گنجائش ہے، جب کہ غازی عبدالرشید شہید نے اس دوسرے مسودہ کو فون پر سن کر اسے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا اور اس پر مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کی سربراہی میں مذاکرات کرنے والی ہماری ٹیم نے مذاکرات اور مصالحت میں مزید پیش رفت کی کوئی گنجائش نہ دیکھتے ہوئے وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہمیں صاف طور پر نظر آرہا تھا کہ سرکاری فورسز بہرحال یہ آپریشن کرنا چاہتی ہیں اور انہیں اس سے باز رکھنے کی کوئی قابل عمل صورت ہمارے

سامنے موجود نہیں تھی، البتہ یہ ہمارے علم میں آ گیا تھا کہ ہمارے چلے جانے کے بعد مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے مذاکرات کو جاری رکھنے کی ایک اور کوشش ہو رہی ہے بلکہ اس کا اندازہ ہمیں وہاں سے روانہ ہونے سے قبل ہی ہو گیا تھا کہ اب شاید فریقین مزید گفتگو مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ہم نے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد اپنے اپنے موبائل فون بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، کیونکہ میڈیا مسلسل تعاقب میں تھا اور ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ میڈیا کے ساتھ ہماری کوئی بات ان مذاکرات پر اثر انداز ہو اور خدانخواستہ ہماری وجہ سے ان میں کوئی رکاوٹ پڑ جائے۔

اس سے آگے مولانا فضل الرحمٰن خلیل کی بات شروع ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے جانے کے بعد انہوں نے فون پر غازی عبدالرشید شہید سے فون پر دوبارہ رابطہ کیا اور خاصی دیر تک گفتگو کرتے رہے جس میں انہوں نے غازی عبدالرشید شہید پر زور دیا کہ وہ مصالحت کے اس سرکاری مسودہ کو قبول کر لیں اور اپنی شرائط پر زور دینے کی بجائے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیں۔ اس کے لیے غازی عبدالرشید شہید ابتدا میں تیار نہیں تھے اور ان کا اصرار تھا کہ رات کو علمائے کرام کی ٹیم کے ذریعے جو معاملات طے ہوئے تھے اور جس مسودہ پر انہوں نے بھی اتفاق کر لیا تھا، وہ اسی پر قائم ہیں اور سرکاری شرائط پر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

مولانا فضل الرحمٰن خلیل کا کہنا ہے کہ انہوں نے غازی عبدالرشید شہید کو صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کیا اور ان پر مسلسل زور دیتے رہے کہ وہ اپنی شرائط پر اس قدر زور نہ دیں جس پر بالآخر وہ آمادہ ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، وہ اپنی شرائط سے دستبردار ہوتے ہیں اور لال مسجد سے باہر آنے کے لیے تیار ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن خلیل نے اس سے چودھری شجاعت حسین اور ان کے رفقا کو آگاہ کیا تو انہوں نے بھی اطمینان کا اظہار کیا اور ''اوپر'' بات کی تو ان سے کہا گیا کہ ٹھیک ہے، غازی عبدالرشید سے کہیں کہ وہ اس پر اپنی آمادگی کی علامت کے طور پر اندر موجود افراد میں سے تین چار کو باہر بھیجیں تا کہ اس بات کا اعتماد ہو جائے کہ وہ واقعی اس کے لیے تیار ہیں۔ غازی عبدالرشید شہید سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ جب وہ خود باہر آنے کو تیار ہیں تو پھر اس شرط کی کیا ضرورت

ہے؟ ان سے کہا گیا کہ ہم اس کو ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ تھوڑے بہت اصرار کے بعد وہ اس کے لیے آمادہ ہو گئے اور کہا کہ وہ اپنے چار پانچ ساتھیوں کو علامت کے طور پر باہر بھیج دیتے ہیں۔ یہ بات ''اوپر'' پہنچائی گئی تو جواب آیا کہ چار پانچ نہیں بلکہ پندرہ بیس افراد باہر بھجوائے جائیں۔ غازی عبدالرشید شہید سے بات ہوئی تو انہوں نے مایوسی کا اظہار کیا کہ یہ شرطیں خواہ مخواہ لگائی جا رہی ہیں اور دراصل سرکاری فورسز مصالحت کے لیے تیار ہی نہیں، مگر مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے اصرار پر وہ اس کے لیے بھی تیار ہو گئے اور کہا کہ آپ جتنے ساتھی کہتے ہیں، میں علامت کے طور پر بھجوا دیتا ہوں۔ مولانا فضل الرحمٰن خلیل کا کہنا ہے کہ غازی عبدالرشید شہید کی طرف سے اس ہاں کے بعد وہ جب یہ بات چودھری شجاعت حسین کو بتانے گئے تو وہ پریس کانفرنس کر رہے تھے۔ پریس کانفرنس رکوا کر انہیں اس بات کی اطلاع دی گئی مگر ابھی انہیں یہ بتایا جا رہا تھا کہ دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور آپریشن کا آغاز ہو گیا۔

مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے بقول انہوں نے اس بات کے بعد غازی عبدالرشید شہید سے بات کی اور انہیں تسلی دینے کی کوشش کی کہ آپریشن رکوانے کی کوئی صورت نکالی جا رہی ہے جبکہ انہوں نے سرکاری ٹیم سے کہا کہ جب غازی عبدالرشید سب باتیں ماننے کے لیے تیار ہیں تو اس آپریشن کو فوری طور پر رکوایا جائے اور حملے بند کروائے جائیں تاکہ اندر موجود افراد کو پرامن طور پر باہر لانے کی تدبیر کی جائے۔ چودھری شجاعت حسین اور ان کے رفقا نے متعلقہ فورسز کے افسران سے بات کی مگر حملے رکوانے کی کوئی درخواست کارگر نہ ہو سکی اور جس خوفناک آپریشن کی کئی روز سے دھمکیاں دی جا رہی تھیں، وہ بالآخر غازی عبدالرشید اور ان کے ساتھ معصوم طالبات اور دیگر افراد کی شہادت اور جامعہ حفصہ کے افسوس ناک انہدام تک جاری رہا۔

یہ تفصیل اس سے قبل بھی سامنے آ چکی ہے، لیکن میں اسے اپنی گزارشات کا حصہ بنانا بھی ضروری سمجھتا ہوں تاکہ تاریخ کا ریکارڈ صحیح رہے اور مستقبل کے مورخ کو اس سلسلے میں اپنی رائے قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔*

* روزنامہ اسلام، ۸ دسمبر، ۲۰۰۷ء۔

لال مسجد کا سانحہ اور ہماری ذمہ داریاں

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے سانحے نے پوری قوم کو غم اور صدمے سے دوچار کر دیا ہے اور جس شخص کے سینے میں بھی گوشت کا دل ہے، وہ اس المیہ پر مضطرب اور بے چین ہے۔ ۱۰ر جولائی کی صبح کو عین اس وقت جبکہ حکومت اور غازی عبدالرشید شہید کے درمیان مذاکرات ایک مثبت نتیجے پر پہنچ چکے تھے، ان مذاکرات کو ملک کی مقتدر شخصیت نے ویٹو کر دیا اور پھر مذاکرات کا دور ختم ہوتے ہی جس بے دردی اور سنگ دلی کے ساتھ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے اندر موجود افراد، بالخصوص طالبات اور بچوں کو مسلح آپریشن کا نشانہ بنایا گیا، وہ ملک کی تاریخ میں وحشت اور درندگی کے ایک افسوس ناک باب کے عنوان کے طور پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ تاریخ میں چنگیز خان، ہلاکو خان، مسولینی اور ہٹلر کے مظالم کی داستانیں پڑھتے تھے تو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کوئی انسان اس انتہا تک بھی جا سکتا ہے، مگر اکیسویں صدی کے نام نہاد مہذب دور میں جس طرح لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں بے شمار افراد، عورتوں اور بچوں کو بھنتے اور کٹتے اور جلتے ہوئے دیکھا گیا ہے، اس نے وحشت و بربریت کے ان نامور ہیروز کو بھی شرما کر رکھ دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت واقعہ ہے کہ ۹ اور ۱۰ جولائی کی درمیانی شب تک وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے راہ نماؤں کے ساتھ وزیراعظم پاکستان، ان کے متعدد وزرا اور حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین کے مذاکرات کے نتیجے میں ایک ایسے فارمولے پر اتفاق رائے ہو چکا تھا جسے ٹیلی فون پر سننے کے بعد غازی عبدالرشید شہید نے بھی اس سے اتفاق کر لیا تھا اور اس رات

چند ایسے لمحات ضرور آئے تھے جب فریقین میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع کے عملی حل کے سلسلے میں کوئی اصولی اختلاف باقی نہیں رہ گیا تھا، لیکن خدا جانے کس منحوس کی نظر بد آڑے آئی کہ اسی رات کو صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اسلام آباد دھماکوں سے لرز رہا تھا اور لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے در و دیوار گولیوں اور بموں سے چھلنی ہو رہے تھے۔

راقم الحروف اس رات اسلام آباد میں تھا اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے راہ نماؤں مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، ڈاکٹر عادل خان اور دیگر حضرات کے ہمراہ چودھری شجاعت حسین، جناب محمد اعجاز الحق، جناب محمد علی درانی اور جناب طارق عظیم کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھا کہ اچانک ان مذاکرات میں ڈیڈ لاک پیدا کیا گیا اور پھر اچانک مسلح آپریشن کے آخری راؤنڈ کا پوری شدت کے ساتھ آغاز کر دیا گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ قوم کے سامنے ہے اور قوم کے دل و جگر پر لگنے والا یہ زخم خدا جانے کب تک رستا رہے گا۔

سانحہ لال مسجد کے اسباب و عوامل کیا تھے اور معاملات کو اس افسوس ناک مرحلے تک پہنچانے میں کس کس کا کیا کردار ہے؟ اس کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس جناب جسٹس افتخار محمد چودھری نے فل بنچ قائم کر دیا ہے جو اپنے کام کا آغاز کر چکا ہے اور جوں جوں اس کی کارروائی آگے بڑھے گی، بہت سے چہرے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے اور کئی سربستہ راز منظر عام پر آئیں گے، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہٹ کر بھی اس صورت حال کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور خاص طور پر دینی حلقوں کے سوچنے کا مقام ہے کہ کیا اس حوالے سے انھیں جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا یا جو کردار وہ ادا کر سکتے تھے، کیا ان کا ضمیر اس کردار کی ادائیگی کے بارے میں مطمئن ہے؟ یہ بہت حساس سوال ہے جس کا پوری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ نہ لیا گیا تو آئندہ اس قسم کے المیوں کو روکا نہیں جا سکے گا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں غزوۂ احد کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خود زخمی ہوئے بلکہ ستر صحابہ کرام نے جام شہادت نوش کیا اور مسلمانوں کی واضح فتح وقتی طور پر ہزیمت میں بدل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن

کریم میں اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس کے اسباب وعوامل کی نشان دہی کی ہے، اس پر ڈانٹ ڈپٹ کی ہے اور پھر معافی کا اعلان بھی فرمایا ہے لیکن ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ اپنی ناکامی اور ہزیمت کے اسباب کو ضرور دیکھو، عوامل کی نشان دہی کرو اور کسی رعایت کے بغیر جس کی جو غلطی ہے، اسے اس سے آگاہ کرو تا کہ آئندہ اس سے بچا جا سکے۔

قرآن کریم کا یہ اسلوب ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے شہدا کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا اپنا احتساب بھی کریں اور اس حوالے سے اپنی اپنی کوتاہیوں کا ادراک کرتے ہوئے ان کی تلافی کی کوشش کریں۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف مسلح آپریشن کی مذمت کرتے ہیں، اس دوران میں جام شہادت نوش کرنے والوں کے لیے بلندیٔ درجات کی دعا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وفاق المدارس العربیہ کے ان مطالبات کی مکمل حمایت کرتے ہیں کہ:

o کھلی عدالتی انکوائری کے ذریعے سے لال مسجد کے سانحے کے اسباب وعوامل اور ذمہ دار عناصر کو بے نقاب کیا جائے۔

o شہدا کی لاشیں ان کے ورثہ کے حوالے کی جائیں۔

o گم شدگان اور لاپتہ افراد کو بازیاب کیا جائے اور ان کے اہل خاندان کو اعتماد میں لیا جائے۔

o جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کے دینی مدرسے کے طور پر باقی رہنے کی ضمانت دی جائے اور ان کی حیثیت تبدیل نہ کرنے کا واضح اعلان کیا جائے۔

o تمام جھوٹے مقدمات واپس لیے جائیں اور مولانا عبدالعزیز سمیت تمام گرفتار شدگان کو رہا کیا جائے۔

o اس سانحہ کی آڑ میں ملک کے دینی مدارس کو دھمکیاں دینے کا سلسلہ بند کیا جائے۔*

---

* ماہنامہ نصرۃ العلوم، اگست ۲۰۰۷ء

سپریم کورٹ میں وفاق المدارس کی آئینی درخواست

میں اس وقت جدہ میں ہوں۔ پرسوں ۱۳راگست کو عشا کی نماز کے وقت یہاں پہنچا ہوں۔ یوم آزادی یہیں گزارا ہے اور آج ۱۵راگست کو مدینہ منورہ روانہ ہونے سے قبل یہ سطور تحریر کر رہا ہوں۔ مولانا عبدالعزیز کے بھانجے عامر صدیق اور ہمشیرگان محترمات کی پریس کانفرنس کی رپورٹ میں نے سفر کے دوران پڑھی ہے جس میں انھوں نے مولانا عبدالعزیز کی طرف سے اپنے وکیل کی تبدیلی اور وفاق المدارس العربیہ کی جدوجہد پر اطمینان کے اظہار کا اعلان کیا ہے اور یہ تجربہ بیان کیا ہے کہ ان کے بعض نمائندے ان کے اور علمائے کرام کے درمیان اختلافات اور غلط فہمیوں کا باعث بنے ہیں۔

میرے نزدیک یہ دونوں باتیں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے حوالے سے دینی جدوجہد کے مستقبل کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ مولانا عبدالعزیز نے شوکت عزیز صدیقی صاحب کو اپنے خاندان کی طرف سے وکیل مقرر کیا ہے جو لال مسجد آپریشن کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر کی جانے والی رٹ میں وفاق المدارس کے بھی وکیل ہیں اور اس طرح وفاق المدارس کی عدالتی جدوجہد اور مولانا عبدالعزیز کی قانونی تگ ودو میں عملی ہم آہنگی کا امکان واضح ہوتا دکھائی دینے لگا ہے جو نہ صرف یہ کہ خوش آئند ہے بلکہ عدالتی جدوجہد کے منظم اور مربوط طور پر آگے بڑھنے کے لیے ضروری بھی ہے۔ اسی طرح مولانا عبدالعزیز اور ان کے اہل خاندان کو اس امر کا احساس ہو جانا بھی اطمینان بخش ہے کہ اس سارے عمل کے دوران میں کچھ لوگ مولانا عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے ساتھ ملک کی اعلیٰ دینی قیادت، بالخصوص وفاق المدارس کے راہ نماؤں کے مثبت روابط میں

رکاوٹ بنتے رہے ہیں۔

مجھے کسی خاص شخصیت سے غرض نہیں، اسی لیے میں کسی کا نام نہیں لے رہا، لیکن اپنے کم وبیش چالیس سالہ تجربہ کی بنیاد پر لال مسجد کا تنازع شروع ہونے کے دن سے ہی مجھے یہ شدت کے ساتھ محسوس ہوتا رہا ہے کہ کچھ لوگ درمیان میں ضرور موجود ہیں جو اس مقصد کے لیے متحرک ہیں کہ وفاق المدارس کی قیادت، ملک کی دینی جماعتوں اور خاص طور پر اسلام آباد اور راول پنڈی کے سرکردہ علمائے کرام سے مولانا عبدالعزیز، غازی عبدالرشید شہید اور ان کے اہل خاندان کو دور رکھا جائے اور غلط فہمیوں اور بے اعتمادی کی ایسی فضا قائم کر دی جائے کہ ملک کی عمومی دینی قوت نہ تو اس خاندان کے کام آ سکے اور نہ ہی ان کی جدوجہد کو کوئی ایسا رخ دے سکے جو اس دینی محنت کے مثبت طور پر آگے بڑھنے کا ذریعہ بن جائے۔ ایسے افراد دونوں طرف موجود ہو سکتے ہیں، اس لیے اگر اس پہلو سے پوری صورت حال کا ازسرنو جائزہ لے لیا جائے تو میرے خیال میں مطلع مزید صاف ہو سکتا ہے اور باہمی اعتماد کی فضا میں مستقبل کے تحریکی امکانات کو بہتر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

وفاق المدارس نے اپنی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں پیش کی جانے والی معزز ارکان کی شکایات، اعتراضات، تجاویز اور مطالبات کا جائزہ لینے کے لیے ۱۸/اگست کو کراچی میں مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کر رکھا ہے جو ظاہر ہے کہ خاصی اہمیت کا حامل ہوگا، لیکن میں ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہو سکوں گا، اس لیے اس اجلاس کے ممکنہ ایجنڈے کے بارے میں کچھ ضروری گزارشات اس کالم کے ذریعے پیش کر رہا ہوں۔ البتہ اس سے قبل اس رٹ درخواست کا اردو ترجمہ قارئین کی معلومات کے لیے درج کر رہا ہوں جو لال مسجد کے آپریشن کے خلاف وفاق المدارس کے صدر حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کی طرف سے عدالت عظمیٰ میں دائر کی گئی ہے اور اسے سماعت کے لیے منظور کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ ان سطور کی اشاعت تک غالباً سامنے آ چکا ہوگا۔

وفاق المدارس کے صدر محترم اور سیکرٹری جنرل کی جانب سے عدالت عظمیٰ میں پیش کی جانے والی درخواست کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''بخدمت جناب محترم چیف جسٹس، پاکستان سپریم کورٹ، اسلام آباد

جنابِ عالی!

- درخواست دہندہ وفاق المدارس کے صدر اور جنرل سیکرٹری ہیں، جو پاکستان کے دینی مدارس کا ایک وفاق ہے جو دینی مدارس کے نصاب اور ملک بھر میں منعقد کیے جانے والے امتحانات سے متعلق امور کی نگرانی کرتا اور انھیں کنٹرول کرتا ہے اور تقریباً دس ہزار دینی مدارس وفاق المدارس کے ساتھ الحاق رکھتے ہیں۔

- لال مسجد/جامعہ حفصہ میں انتہائی غیر انسانی، افسوس ناک، ظالمانہ اور دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا ہے۔ انتظامیہ کے اس غیر قانونی ایکشن کے نتیجے میں، جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، سینکڑوں انسانی جانوں کو، جن میں لڑکے، لڑکیاں اور بزرگ شامل ہیں، بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ ہر شہری کا بنیادی حق ہے کہ اس کے ساتھ قانون کے مطابق معاملہ کیا جائے اور کسی بھی حال میں قانون سے ہٹ کر اسے اس کی زندگی یا آزادی سے محروم نہ کیا جائے۔

- پاکستان کے قوانین یہ قرار دیتے ہیں کہ جو شخص بھی کسی کے قتل کا ذمہ دار ہو، اس کے ساتھ ملک کے قانون کے مطابق معاملہ کیا جائے، چنانچہ مسٹر جسٹس محمد نواز عباسی کی طرف سے چیف جسٹس آف پاکستان کے نام لکھے گئے نوٹ اور اس کے نتیجے میں (عدالت کے) سوموٹو ایکشن نمبر ۹، ۲۰۰۷ میں کہا گیا ہے کہ:

> ''معصوم شہریوں کا قتل، خواہ ان دہشت گردوں کے ہاتھوں ہو یا قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کے ہاتھ سے، صریح طور پر ''قتلِ عمد'' کے دائرے میں آتا ہے اور اس طرح کے قتل کی انفرادی ذمہ داری کے علاوہ ان تمام لوگوں کو بھی، جو اس واقعے کے ذمہ دار ہیں، قانونی نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔''

- انتظامیہ کے کہنے پر (جامعہ حفصہ) کے طلبہ نے اپنے آپ کو انتظامیہ کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جو شخص سرنڈر کر دے گا، اس کے خلاف کوئی فوج داری مقدمہ قائم نہیں کیا جائے گا، لیکن انتظامیہ اپنے اس وعدے سے منحرف ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں چالیس سے زیادہ

طلبہ ابھی تک سلاخوں کے پیچھے ہیں۔ انتظامیہ یہ بات بھی چھپا رہی ہے کہ گم شدہ افراد کہاں ہیں؟

- قانون کی رو سے قرآن مجید کی بے حرمتی ایک جرم ہے، جیسا کہ سیکشن ۲۹۵۔ بی میں درج ہے۔ ''آپریشن سائیلنس'' کرنے والے افراد کے ہاتھوں قرآن مجید کی بے حرمتی نے پوری قوم کے جذبات کو مجروح کیا ہے اور جس طریقے سے لاشوں کو ٹھکانے لگایا گیا اور انھیں مسخ کیا گیا، اس نے بھی ہر شہری کو مضطرب کر دیا ہے۔

- جامعہ حفصہ کو غیر قانونی طور پر مسمار کرنے کے بعد ارباب حل وعقد قتل کیے جانے والے افراد کی لاشوں کو چھپانے/موقع سے غائب کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور اس طرح منہدم عمارت کی جگہ پر موجود ملبے کو وہاں سے ہٹانے اور موجود شواہد کو بگاڑنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

- ان امور کے ذمہ دار افراد کی یہ کارروائی قانون کے عمل کو خراب کرنے اور انسانی حقوق میں مداخلت کے مترادف ہے۔

اس لیے مودبانہ درخواست کی جاتی ہے کہ:

۱۔ درج ذیل افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دیا جائے:

جنرل پرویز مشرف، چیف آف آرمی اسٹاف،

وزیر داخلہ،

کور کمانڈر، ہیڈ کوارٹر، ایکس کورز، راول پنڈی،

چیف کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور آئی جی اسلام آباد۔

۲۔ مسمار کی جانے والی عمارت کے ملبے کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور جب تک باقاعدہ تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، نہ تو ملبے میں موجودہ شواہد کو بگاڑا جائے اور نہ اسے وہاں سے ہٹایا جائے۔

۳۔ ذمہ داران کے خلاف سیکشن ۲۹۵۔ بی کے تحت قرآن مجید کی دانستہ توہین اور لاشوں کی بے حرمتی کرنے کے فوج داری مقدمات درج کیے جائیں۔

۴۔ سرنڈر کرنے کے بعد گرفتار کیے جانے والے افراد کو فوری طور پر رہا کیا جائے۔

۵۔ انتظامیہ کو حکم دیا جائے کہ وہ تمام گم شدہ افراد سے متعلق معلومات مہیا کرے۔''

یہ لال مسجد آپریشن کے خلاف وفاق المدارس کی رٹ درخواست کا متن ہے جس کے ذریعے وفاق المدارس نے اس حوالے سے اپنی آئندہ جدوجہد کا رخ متعین کرلیا ہے اور میرے خیال میں وفاق المدارس کی مجلس عاملہ کو اپنے ۱۸؍اگست کے اجلاس میں اسی عدالتی وقانونی جدوجہد کو سنجیدگی اور ربط ونظم کے ساتھ آگے بڑھانے کی حکمت عملی طے کرنی چاہیے، کیونکہ یہ عدالتی جنگ اگر صحیح طریقے سے لڑی گئی تو اس کے انتہائی دوررس نتائج سامنے آئیں گے۔ باقی رہی بات عوامی تحریک کی تو میں اس سلسلے میں اپنے اس موقف پر پورے شرح صدر کے ساتھ قائم ہوں کہ یہ وفاق المدارس کا کام نہیں بلکہ دیگر دینی جماعتوں کی ذمہ داری ہے، البتہ اگر وفاق المدارس دینی جماعتوں کو اس سلسلے میں مشاورت کے لیے جمع کرنے کی غرض سے داعی اور میزبان کا کردار ادا کرنا چاہے تو اس میں بظاہر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔*

O

* روزنامہ اسلام، ۱۷؍اگست ۲۰۰۷ء۔

جامعہ حفصہ کا سانحہ۔ کچھ پس پردہ حقائق

[اس دفعہ ادارتی صفحات میں ہم ایک خاتون کا خط شائع کر رہے ہیں جو حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ کے نام ہے۔ اس میں جامعہ حفصہ کے الم ناک سانحہ کے بارے میں جامعہ کی طالبات ہی کے حوالے سے کچھ پس پردہ حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے اور بہت سے توجہ طلب امور کی نشان دہی کی گئی ہے جن پر علمی و دینی حلقوں کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔

ہماری رائے میں افغانستان سے روسی استعمار کے انخلا کے بعد سے ہی پاکستان کے ان ہزاروں نوجوانوں کی فہرستوں کی تیاری اور ان کی درجہ بندی شروع ہو گئی تھی جنھوں نے افغانستان کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اسی وقت سے یہ حکمت عملی بھی طے کر لی گئی تھی کہ مرحلہ وار مختلف علاقوں میں ان مجاہدین کو کسی نہ کسی طرح اشتعال دلا کر سامنے لایا جائے اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ یہ ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو جائیں اور پھر فوجی آپریشن کے ذریعے ان کی قوت کو ختم کر دیا جائے۔ وزیرستان، اسلام آباد اور سوات کے آپریشن اسی حکمت عملی کا حصہ ہیں اور ملک کے بہت سے دیگر حصوں میں بھی اس قسم کی کارروائیوں کی راہ ہموار کرنے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔

غزوۂ موتہ میں حضرت زید بن حارثہ، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہم کی شہادت کے بعد حضرت خالد بن ولید نے از خود آگے بڑھ کر مسلمان فوج کی کمان سنبھال لی تھی اور بڑی حکمت عملی کے ساتھ اسے دشمن کے نرغے سے بحفاظت نکال کر واپس لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر ''سیف من سیوف اللہ'' کا خطاب دیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ دشمن سے بھڑ جانے اور اپنی قوت کو ضائع

کرتے چلے جانے کی بجائے اپنی قوت کو مشکل وقت میں بچا لینے کی حکمت عملی اختیار کرنا بھی بہادری اور شجاعت کہلاتا ہے۔ اے کاش ہمارے عسکری حلقے اس پہلو پر غور کر سکیں اور جوش و جذبہ کے ساتھ ساتھ حکمت و تدبر کے تقاضوں کا بھی احساس کر لیں۔

بہر حال ایک محترم خاتون کا یہ فکر انگیز خط ملاحظہ فرمائیے اور اس بات کا جائزہ لیجیے کہ ہم اس خط میں اٹھائے گئے نکات کے حوالے سے ہم اپنے اپنے دائرے میں عملی طور پر کیا کر سکتے ہیں۔

(ابوعمار زاہد الراشدی)]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت اقدس گرامی قدر حضرت مفتی صاحب، دامت برکاتکم العالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اس ماہ البلاغ میں جامعہ حفصہ سے متعلق آپ کا مضمون پڑھا، اس سلسلہ میں چند مزید باتیں آپ کے علم میں لانا چاہتی ہوں۔ یہ باتیں میرا عینی مشاہدہ تو نہیں مگر جامعہ حفصہ سے آنی والی طالبات کی بیان کردہ ہیں۔

ا۔ جامعہ حفصہ گزشتہ کئی سال سے انٹرنیشنل شہر میں دینی تہذیب کا داعی تھا اور ہزاروں کی تعداد میں باپردہ طالبات کا آنا جانا اور اسلام آباد کے ماڈرن گھرانوں کی عورتوں اور لڑکیوں کا اس کی طرف میلان، روشن خیال طبقہ اور امریکہ کو برداشت نہ تھا۔ اس لیے گزشتہ دو سال سے جامعہ کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دین کا کام کرنے کے لیے دینی احکام کو پامال کرنا یا مشورہ اور صحیح حکمت عملی، نیز طویل منصوبہ بندی نہ کرنا سخت نقصان کا باعث ہے۔ دینی تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں، مگر ہم ان سے سبق حاصل نہیں کرتے اور نہ تاریخ کا مضمون اس نقطہ نظر سے درس نظامی میں شامل ہے جس کی وجہ سے اس کی طرف توجہ بہت کم ہوتی ہے۔

مولانا عبداللہ صاحب کے طالبان کے ساتھ براہ راست مراسم تھے اور وہ انقلابی ذہن کے حامل تھے۔ ان کی شہادت کے بعد برادران میں شدت آنا فطری عمل تھا، خصوصاً جب مظلوم کو

عدالت سے انصاف نہ ملے اور نہ اس کی بات سنی جائے۔ چنانچہ جامعہ حفصہ کو ختم کرنے کے لیے ان کی سوچ میں باقاعدہ منصوبہ بندی سے مزید شدت پیدا کی گئی تاکہ وہ ایسا اقدام کریں جس سے قانونی گرفت میں آسکیں اور آپریشن کا جواز پیدا کیا جاسکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سات اعلیٰ تعلیم یافتہ جن میں بعض اعلیٰ افسران کی بیویاں بھی تھیں ان کو تربیت دی گئی، جہاد کی آیات و احادیث، طاغوتی نظام کے خلاف جان دے دینے کے جذبات پر مشتمل اشعار، تاریخ میں اصحاب عزیمت کے واقعات، پر جوش تقاریر، اور ذہن سازی کی تربیت دی گئی۔ پھر ان خواتین نے جامعہ حفصہ میں آنا شروع کیا۔ ام حسان اور غازی برادران سے تعلقات مضبوط کیے۔ جامعہ میں تعلیم لینا شروع کی اور طالبات میں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں، ان کی ذہن سازی شروع کی، فحاشی اور عریانی کے خلاف طاقت کا استعمال، اسلامی نظام کے لیے عملی جہاد کا ذہن بنایا۔ اس محنت کے نتیجے میں ۷۰ طالبات جن میں لیڈر شپ کی کوالٹی تھی تیار ہوگئیں۔ ان طالبات میں بھی بعض طالبات کے متعلق یہ گمان تھا کہ وہ خفیہ ایجنسی کی تربیت یافتہ ہیں۔ ان کی پر جوش تقاریر سے انقلابی سوچ اور جہادی جذبہ اس قدر عروج پر تھا کہ معاملہ اب غازی برادران کے بس میں بھی نہ تھا، اور خلاف قانون اقدام ہونا شروع ہوئے اور آپریشن لمبا کرنے کے حکمتوں میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ آخری لمحات تک یہ نمائندہ خواتین جامعہ میں رہیں تاکہ جذبات میں کمی نہ آنے پائے، چنانچہ آہستہ آہستہ ان خواتین کو بحفاظت باہر لایا گیا اور منظر سے غائب کر دیا گیا۔ ان خواتین کے صحیح ایڈریس شاید اب ام حسان کو بھی معلوم نہ ہوں کیوں کہ اپنے تعارف کے متعلق جو معلومات دیں، وہ سب غلط تھیں۔

۲۔ بعض وزرا جو علما سے دوستی کے رنگ میں منافقت کر رہے تھے اور علما سے ذاتی گہرے مراسم رکھتے تھے وہ بھی غازی برادران کو ملاقاتوں میں کہتے تھے کہ تم اپنے مطالبات میں حق پر ہو اپنے مقصد پر ڈٹ جاؤ، ان کا اصل مقصد بھی آپریشن کا جواز پیدا کرنا تھا جبکہ میڈیا پر ان کے بیان اور تھے۔

۳۔ مولانا صاحب! ایک ملنے والے اسلام آباد خفیہ سرکاری ایجنسی کے ملازم ہیں۔ ان کے مطابق یہ منصوبہ بندی ہو چکی ہے کہ بڑے بڑے دینی مدارس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طلبا و طالبات کو داخل

کیا جائے گا جس کا اہم مقصد طلبا اور اساتذہ میں نفرتیں پیدا کر کے مقابلہ میں لانا ہوگا تا کہ اساتذہ پر اعتماد کی فضا ختم ہو۔ یہ طلبا دین پر عمل کرنے میں اساتذہ کی نظر میں دوسروں سے ممتاز ہوں گے۔ اساتذہ کا خصوصی قرب حاصل کریں گے، عربی، انگریزی دینی علوم میں ممتاز اور قوت بیان کی خصوصی تربیت یافتہ ہوں گے۔

۴۔ طالبات مذکورہ بالا مقصد کے علاوہ مزید یہ کام انجام دیں گی کہ مدرسہ سے اچانک غائب ہوں گی، ان کے سرپرست جامعہ کی انتظامیہ سے رابطہ کریں گے۔ آخر معاملہ متعلقہ تھانہ تک جائے گا، اور میڈیا کے ذریعہ بنات کے مدارس کو بدنام کیا جائے گا۔

۵۔ یہ طلبا اور طالبات منتظمین کے سرکاری انتظامیہ سے خفیہ تعلقات استوار کرائیں گے اور ڈالروں کے ذریعہ ان کو خرید کر اپنے وفاقوں سے بدگمان کیا جائے گا، اور مزید دوسرے مقاصد میں استعمال کیا جائے گا۔

۶۔ پبلک مقامات پر تربیت یافتہ لوگ عوام سے مدارس اور علما کے کردار پر بحث ومباحثہ کریں گے اور عوام میں مدارس اور علما کی نفرت پیدا کریں گے اور جو چینل مدارس، علما اور اختلافی مسائل پر زیادہ مذاکرے کرائے گا، اسے مراعات دی جائیں گی۔

۷۔ اسکولوں سے یونیورسٹی کی سطح تک تفریح گاہوں اور پبلک مقامات پر تربیت یافتہ تنخواہ دار مرد وخواتین مغربی تہذیب وتمدن پھیلانے کے لیے اپنے لباس اور حرکتوں سے ایسے امور انجام دیں گے کہ آہستہ آہستہ ان کی برائی ختم ہو اور یہ ذہن بنے کہ ہر آدمی آزاد ہے، کسی کو روک ٹوک کرنا گویا ایک عظیم جرم ہے۔ یہ نوجوان اس مقصد کے لیے ملازم ہوں گے۔ یومیہ آٹھ گھنٹے مختلف پبلک مقامات پر اپنے لباس اور حرکتوں سے یہ امور انجام دیں گے۔

۸۔ یونیورسٹی اور کالج کی سطح پر مخلوط محافل موسیقی اور ناچ ہوگا جس کا خرچ غیر ملکی تنظیمیں برداشت کریں گی، یونیورسٹی کے طلبا وطالبات کو یہ تنظیمیں اپنے خرچ پر پہاڑی مقامات کی سیر کرائیں گی جہاں ان کا قیام وطعام اکٹھا ہوگا، گانا اور ناچ کے مقابلے ہوں گے اور غیر ملکی سفر کے ٹکٹ دے کر لڑکے اور لڑکی کو باہر بھیجا جائے گا اور باہر بریفنگ کے ذریعے ان کی ذہن سازی کی جائے گی اور اپنا

نمائندہ بنایا جائے گا۔

۹۔بعض فوجی افسران کو درس نظامی کا مختصر نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔ وہ علما کے رنگ اپنا کر مدارس کے منتظم بنیں گے اوران کے کردار پر طویل منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔

۱۰۔تبلیغی مرکز رائے ونڈ میں خفیہ اداروں کے اعلیٰ افسران با قاعدہ مقیم ہیں، جماعتوں میں جاتے ہیں، بعض اب منبر سے ہدایات بھی دیتے ہیں، مشوروں میں با قاعدہ شامل ہوتے ہیں اور بزرگوں کی صف میں شامل کر مکمل کنٹرول کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب! آپ غور فرمائیں کتنی طویل منصوبہ بندی مذہبی طبقہ کے لیے ہو رہی ہے۔اس کے مقابلے میں کیا دینی طبقہ اپنی پوری ذمہ داری کا احساس کر رہا ہے؟.....

حضرت مفتی صاحب !بعض وجوہات کی بنا پر مکمل تعارف کرانے سے معذور ہوں جس پر معذرت خواہ ہوں۔

فقط والسلام

آپ کی ایک بیٹی*

O

---

* ماہنامہ الشریعہ، دسمبر ۲۰۰۷ء۔

مذہبی شدت پسندی: اسباب و عوامل

مذہبی شدت پسندی، حکومت اور دینی سیاسی جماعتیں

جامعہ حفصہ اور لال مسجد اسلام آباد کے خلاف سرکاری فورسز کے مسلح آپریشن نے پورے ملک کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایک عرصہ سے مختلف حلقوں کی طرف سے یہ کوشش جاری تھی کہ کسی طرح یہ تصادم رک جائے اور خونریزی کا وہ الم ناک منظر قوم کو نہ دیکھنا پڑے جس نے ملک کے ہر فرد کو رنج و صدمہ کی تصویر بنا دیا ہے، لیکن جو ہونا تھا وہ ہوا، بہت برا ہوا اور بہت برے طریقے سے ہوا۔ اس سے کچھ لوگوں کو ضرور تسکین حاصل ہوئی ہوگی جو حکومت کی رٹ بحال کرنے کے ساتھ ساتھ دہشت اور رعب و دبدبہ مسلط کرنا بھی ضروری سمجھ بیٹھے تھے اور ان کا خیال تھا کہ طاقت اور اسلحہ کا بے دریغ استعمال کیے بغیر اور آگ اور خون کا کھیل کھیلے بغیر شاید حکومت کی رٹ کا وقار قائم نہیں رہے گا۔ چند افراد ضرور ایسے ہوں گے، لیکن بحیثیت مجموعی پوری قوم غم زدہ ہے، افسردہ ہے، مضطرب اور بے چین ہے کہ بہت سے بے گناہوں کے لاشے تڑپے ہیں، بچوں اور عورتوں کا خون بہا ہے اور یہ سب کچھ اللہ کے گھر میں ہوا ہے اور ایک دینی درس گاہ میں ہوا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک سرکاری چلڈرن لائبریری پر جامعہ حفصہ کی طالبات کے قبضہ کے ساتھ جب اس تنازع کا آغاز ہوا تھا اور اس کے بعد ایک مبینہ قحبہ خانہ اور پھر مساج پارلر کے خلاف کارروائی نے اس معاملہ کو آگے بڑھایا تھا تو ہم نے اسی وقت یہ عرض کر دیا تھا کہ ایک مسلمان ملک کے اندر حکومت وقت کے خلاف اس قسم کے تصادم کے ماحول اور قانون کو ہاتھ میں لینے کی حمایت نہیں کی جا سکتی اور مقاصد کتنے ہی نیک اور اچھے کیوں نہ ہوں، ان کے لیے اس طرز کی جدوجہد کو سند جواز فراہم نہیں کی

جا سکتی۔ اس پر ملک بھر کے جمہور علماے کرام کا کم وبیش اجماع منعقد ہو گیا تھا، مگر اس کی پروا کیے بغیر معاملات کو اسی رخ پر آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسری طرف ملک کی سنجیدہ دینی قیادت نے حکومت پر مسلسل زور دیا کہ وہ طاقت کے استعمال سے گریز کرے، جائز مطالبات منظور کرنے کی طرف توجہ دے، ان اسباب وعوامل کو دور کرنے کی کوشش کرے جن کے ردعمل میں شدت کی یہ صورت سامنے آئی ہے اور مذاکرات کے ذریعے سے مسئلے کو حل کرنے کا راستہ نکالے، لیکن حکومت نے بھی اس کے لیے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس کی غیر سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ان جائز مطالبات میں سے کسی ایک کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا جن کی بنیاد پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ شدت کی اس انتہا تک جا پہنچی تھی۔

ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ اگر حکومت اسلامی نظام کے نفاذ، اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کرنے، حدود شرعیہ میں کی گئی ترامیم پر نظر ثانی اور فحاشی کے مبینہ مراکز کو بند کرنے میں سے کسی ایک مسئلے کی طرف بھی سنجیدگی سے متوجہ ہو جاتی تو اس سلسلے میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے رویے میں پائی جانے والی شدت کو کم کیا جا سکتا تھا اور ہم لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز کی اس بات سے بھی متفق ہیں جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے طریق کار سے اختلاف کرنے والے ان جائز مطالبات کے لیے صحیح طریق کار سے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید شہید کے طریق کار سے ہم نے بھی اختلاف کیا تھا اور اب بھی ہم اسے غلط ہی سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان ملک میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا اور مسلح تصادم کا ماحول پیدا کرنا ہمارے نزدیک شرعاً اور اخلاقاً کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہے، لیکن مولانا عبدالعزیز کے اس سوال کا آخر کیا جواب ہے کہ ان کے طریق کار سے اختلاف کرنے والوں نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ اور فحاشی ومنکرات کے سدباب کے لیے صحیح طریق کار پر مبنی کون سی جدوجہد کا اہتمام کیا ہے؟ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ معاملات کو اس رخ تک پہنچانے میں جہاں اسلامی نظام کے معاملے میں حکومت کی سرد مہری کارفرما ہے، وہاں اسلامی

نظام کے لیے جدوجہد کی داعی دینی سیاسی جماعتیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں کہ ان کی بے عملی اور تغافل نے وہ خوف ناک خلا پیدا کر دیا ہے جس کو پر کرنے کے لیے تشدد اور بغاوت کی تحریکات آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ قانونِ فطرت ہے کہ خلا جس قدر گہرا ہو، اس کی جگہ لینے والی قوتیں اسی قدر شدت اور تیزی کے ساتھ لپکتی ہیں اور بسا اوقات آندھی اور طوفان کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔

جہادِ افغانستان کے بعد یہ بات حکومت اور دینی سیاسی جماعتوں، دونوں سے توجہ کی طالب تھی کہ جن ہزاروں افراد نے پاکستان سے جا کر افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف عملی جنگ لڑی ہے، وہ صرف اسلحہ چلانے کا ہی عملی تجربہ نہیں رکھتے بلکہ اسلام کی بالادستی اور نفاذِ اسلام کے مخلصانہ جذبے سے بھی سرشار ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے اور وہ ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ انھیں ملک وقوم کا قیمتی اثاثہ سمجھتے ہوئے نہ حکومت نے ان کے جذبات و رجحانات کو اسلام اور پاکستان کے لیے مثبت رخ پر قائم رکھنے کی کوئی پالیسی اپنائی اور نہ ہی دینی سیاسی جماعتوں نے انھیں اپنانے اور اپنی جدوجہد میں شریک کرنے کی طرف توجہ دی بلکہ انھیں اپنا حریف اور اپنے لیے خطرہ تصور کیا گیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے لیے جو نیا ماحول کھڑا کیا گیا، وہ ان کی کردارکشی، توہین، طنز واستہزا، اور تحقیر وحوصلہ شکنی سے عبارت تھا۔ پھر اس فضا میں ان کے سامنے افغانستان میں امریکی فوجیں اتریں، طالبان کی حکومت کو قوت کے ساتھ تہس نہس کر دیا گیا اور پاکستان میں دینی شعائر اور اسلامی روایات واقدار کو پامال کرنے کی پالیسیاں آگے بڑھنے لگیں تو ان کا غصہ اور نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئے اور وہی غصہ ونفرت مجتمع ہو کر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

ہم نے حکومت وقت کے ساتھ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید کے تصادم اور محاذ آرائی کے طرزِ عمل کو غلط قرار دیا ہے اور فی الواقع اسے غلط سمجھتے ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی شدید دکھ ہے کہ ان بھائیوں نے حکومت کے ساتھ ساتھ خود اپنی دینی وعلمی قیادت سے بھی بغاوت کی اور ان کی مشاورت وہدایات کو قبول نہ کیا، لیکن اس کا یہ پس منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ اسلامی نظام اور دینی شعائر واقدار کے بارے میں حکومتی حلقوں اور اداروں کی منافقانہ پالیسی کا آخری جذباتی ردعمل یہی

ہوسکتا تھا اور غازی برادران کے دل میں یہ بات یقین کے درجے میں بیٹھ چکی تھی کہ دینی سیاسی جماعتوں نے اپنے لیے معروضی سیاست اور اقتدار کی اکھاڑ پچھاڑ کو ہی آخری منزل سمجھ لیا ہے اور ان سے نفاذِ اسلام کے لیے کسی موثر جدوجہد کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

ہمارے نزدیک یہ دو عوامل ہیں جنھوں نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کو حکومت کے خلاف ایک مسلح مورچہ بنا دیا اور بات لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف سرکاری آپریشن پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ملک بھر میں ہونے والے ہنگاموں اور خودکش حملوں نے لال مسجد کی اس بغاوت کا دائرہ دور دور تک وسیع کر دیا ہے۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے کہ ۱۴؍ جولائی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سرگودھا میں ایک نوجوان نے بینک ڈکیتی کے دوران میں زخمی حالت میں گرفتار ہونے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اس نے بینک پر ڈاکہ اس لیے ڈالا ہے تاکہ رقم حاصل کر کے لال مسجد کا بدلہ لینے اور ملک میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد منظّم کرنے کے لیے کام کر سکے، یعنی اس نے ملک میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد کے لیے بینک ڈکیتی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے، بہت بڑا المیہ ہے اور اس قسم کے المیے مایوسیوں سے جنم لیا کرتے ہیں۔ جب لوگوں کو ان کے جائز مطالبات اور جذبات کا صحیح جگہ سے جواب نہیں ملتا تو وہ اس کی تسکین کے لیے متبادل ذرائع اختیار کرتے ہیں اور یہ متبادل ذرائع ضروری نہیں کہ صحیح بھی ہوں۔

پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے جس کا وجود اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور اس کے دستور میں اسلامی نظام کی عمل داری اور اسلامی معاشرے کے قیام کی ضمانت دی گئی تھی۔ جب ایک مسلم نوجوان اس سلسلے میں حکومت کی سردمہری اور حکومتی اداروں کا منفی طرزِ عمل دیکھتا ہے تو اس کی نگاہیں بے ساختہ دینی جماعتوں کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہ کیا کر رہی ہیں اور حکومتی طرزِ عمل کا رخ تبدیل کرانے کے لیے کس سنجیدگی کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔ اگر اسے دینی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد اور تحریک میں اپنے جذبات کی تسکین کا سامان مل جائے تو وہ وہاں رک جائے گا اور خود کو ان کے حوالے کر دے گا، لیکن اگر اسے وہاں بھی امید کا کوئی پہلو دکھائی نہ دے اور ہر طرف وقتی مفادات اور مصلحتوں کا ہی ماحول ملے تو پھر اس کے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ خاموش ہوکر بیٹھ

جائے اور اسلام کی بالادستی اور فحاشی و بے حیائی سے معاشرہ کو پاک کرنے کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے اور یا پھر اس کے لیے اپنا راستہ خود نکالے اور جو کچھ وہ اس کے لیے کر سکتا ہے، اس کی منصوبہ بندی کرے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے ہزاروں نوجوان جو نفاذ اسلام کے مخلصانہ جذبہ سے بہرہ ور ہیں اور اسلحہ کی ٹریننگ بھی رکھتے ہیں، گزشتہ ایک عشرے کے دوران میں اسی تجربے سے گزرے ہیں اور اب وہ اس تجربے کے آخری مرحلے میں ہیں جس کی ایک جھلک لال مسجد میں پوری قوم نے دیکھ لی ہے اور اگر حکومت اور دینی جماعتوں نے اب بھی اس مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لیا اور ان مخلص اور پرجوش نوجوانوں کے جذبات کو مثبت رخ دینے کی کوئی معقول کوشش نہ کی تو لال مسجد اس قضیہ کی انتہا نہیں ہوگی بلکہ خدانخواستہ ابتدا ثابت ہو سکتی ہے۔

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع میں اپنی جانوں کا نذرانہ دینے والے شہدا کے لیے ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انھیں جوار رحمت میں جگہ دیں۔ ہمیں سرکاری فورسز کے ان نوجوانوں سے بھی گہری ہمدردی ہے جنھوں نے اپنی جانیں پیش کیں۔ وہ ڈیوٹی پر تھے اور فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت تمام شہدا کو جوار رحمت میں جگہ دیں، زخمیوں کو صحت عطا فرمائیں، پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازیں اور ہم سب کو بحیثیت قوم اس سانحہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ملک وقوم کے مستقبل کی بہتر صورت گری کی توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔*

O

* ۱۷؍ جولائی ۲۰۰۷ء

جامعہ حفصہ کی تعمیر نو اور "تحریک طالبان"

سپریم کورٹ کے حکم پر لال مسجد کے کھل جانے کے بعد سے وہاں نماز وغیرہ کی معمول کی سرگرمیاں بحال ہوگئی ہیں۔ عدالت عظمیٰ نے لال مسجد کے خلاف کیے جانے والے آپریشن کا ازخود نوٹس لینے کے بعد اس سلسلے میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی طرف سے دائر کی جانے والی رٹ اور غازی عبدالرشید شہید کے خاندان کی طرف سے دی جانے والی درخواستوں کو یک جا کر دیا ہے اور ان سب پر مجموعی طور پر کارروائی آگے بڑھ رہی ہے جس میں لال مسجد کے دوبارہ کھولے جانے اور جامعہ حفصہ کی ازسرنو تعمیر کا معاملہ بھی شامل ہے اور جامعہ فریدیہ میں تعلیمی سرگرمیوں کے آغاز کا مسئلہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ اسلام آباد اور راول پنڈی کے علمائے کرام بالخصوص مولانا قاری سعید الرحمٰن، مولانا قاضی عبدالرشید، مولانا محمد نذیر فاروقی اور مولانا ظہور احمد علوی مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ ان کا انتظامیہ سے بھی رابطہ ہے اور مولانا عبدالعزیز کے ساتھ بھی ملاقاتوں اور مشاورت کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی باہمی مشاورت کے نتیجے میں مولانا عبدالغفار کا لال مسجد کے خطیب کے طور پر تقرر عمل میں آیا ہے اور باقی معاملات دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے ہیں۔ مولانا عبدالعزیز کے ساتھ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب، حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اور حضرت مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب کی سملی ڈیم کی سب جیل میں ملاقات ہو چکی ہے۔ ہسپتال میں بھی ان سے علمائے کرام کے ایک وفد نے مولانا قاری سعید الرحمٰن کی سربراہی میں ملاقات کی ہے اور بیمار پرسی کے علاوہ ان سے بہت سے معاملات پر ان کی مشاورت ہوئی ہے۔

جامعہ حفصہ کی صورت حال یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے حکومت کو دوبارہ ایک سال کے اندر اس کی تعمیر مکمل کرنے کا حکم دیا ہے لیکن اس حکم میں یہ بات شامل ہے کہ جامعہ حفصہ کی دوبارہ تعمیر اسی رقبہ میں ہوگی جو اس کے لیے ابتدا میں الاٹ کیا گیا تھا۔ میں نے دوستوں سے اس کی تفصیل معلوم کی تو بتایا گیا کہ جامعہ حفصہ کے لیے متعلقہ سرکاری اداروں کی طرف سے باقاعدہ طور پر الاٹ شدہ رقبہ صرف دو سو پانچ مربع گز ہے جبکہ آپریشن کے دوران جامعہ کی جس عمارت کو منہدم کیا گیا ہے، وہ نو ہزار مربع گز کے رقبہ کو محیط تھی۔ اس طرح دو سو پانچ مربع گز سے زائد رقبہ سرکاری حکام کے بقول ناجائز تجاوزات میں شمار ہوتا ہے، سپریم کورٹ کے آرڈر کے بعد وہ اسے جامعہ حفصہ میں دوبارہ شامل کرنے کے پابند نہیں ہیں اور دو سو پانچ مربع گز کے رقبہ پر جامعہ حفصہ کی دوبارہ تعمیر کے حکم کے بارے میں بھی وفاقی وزارت داخلہ کی طرف سے یہ خبر آ چکی ہے کہ حکومت سپریم کورٹ میں اس فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست دائر کرنے کی تیاری کر رہی ہے، البتہ علمائے کرام اپنے اس موقف پر قائم ہیں اور اس کے لیے کوشش کر رہے ہیں کہ جامعہ حفصہ آپریشن کے وقت جتنے رقبے میں موجود تھا، اتنی جگہ پر ہی دوبارہ تعمیر کیا جائے اور دو سو پانچ مربع گز سے زائد رقبہ کی قیمت متعلقہ ادارے اگر وصول کرنا چاہیں تو وہ ان کو ادا کر دی جائے جس کے لیے بہت سے مخیّر حضرات تیار ہیں، مگر سپریم کورٹ کے مذکورہ بالا فیصلے کے بعد اس کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ عدالت عظمیٰ اس پر نظر ثانی کرے اور آپریشن کے وقت گرائی جانے والی تمام عمارت کے رقبہ کو جامعہ حفصہ کی از سر نو تعمیر میں شامل کرنے کا حکم صادر کرے۔ اس کے بغیر شاید اس کی کوئی عملی صورت نہ نکل سکے۔

جامعہ فریدیہ میں تعلیمی سرگرمیوں کی بحالی کا مسئلہ بھی تعطل کا شکار ہے۔ مولانا قاری سعید الرحمٰن نے بتایا کہ وفاقی وزیر داخلہ اور دیگر حکام کے ساتھ مسلسل گفتگو اور مطالبہ جاری ہے کہ جامعہ فریدیہ کو فوری طور پر واگزار کیا جائے اور اساتذہ کی کمیٹی کو وہاں تعلیمی سرگرمیاں دوبارہ شروع کرنے کا موقع دیا جائے۔ حکومت نے اس کا وعدہ بھی کیا ہے لیکن عملاً کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی۔ اس سلسلے میں ایک رکاوٹ یہ بھی بیان کی جا رہی ہے کہ سپریم کورٹ نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی تعلیمی سرگرمیوں اور ان سے متعلقہ خواتین اور طالبات کو بھی جامعہ فریدیہ میں منتقل کرنے کے لیے کہا ہے۔

حکومت اس حوالے سے طالبات اور خواتین کو جامعہ فریدیہ میں لے جانے کی خواہش مند ہے اور ایسا کرنے کی صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ جامعہ فریدیہ کی بلڈنگ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کا ایک حصہ طالبات کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ بہر حال وقت گزرتا جا رہا ہے اور معاملات چونکہ سپریم کورٹ میں زیرِ غور ہیں، اس لیے انتظامیہ یا علما میں سے کوئی فریق بھی اپنے طور پر کسی آزادانہ فیصلے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، سپریم کورٹ کی ہدایت کے دائرے میں ہوگا۔ چونکہ دینی مدارس کے تعلیمی سال کا آغاز ہو رہا ہے اور شوال کے تیسرے ہفتے کے دوران میں عام طور پر دینی مدارس میں طلبہ کے داخلوں اور اسباق کے آغاز کا کام مکمل ہو جاتا ہے، اس لیے حالات کی رفتار سے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اگر معاملات اسی رفتار سے آگے بڑھے تو خدانخواستہ اس سال جامعہ فریدیہ میں معمول کے مطابق تعلیمی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع نہیں ہو سکے گا اور تمام متعلقہ امور کے طے پا جانے تک انتظار کا مطلب یہ ہوگا کہ جامعہ فریدیہ کے اساتذہ اور طلبہ اس سال اپنا تعلیمی پروگرام جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

اسی دوران میں ایک اور معاملہ بھی میرے علم میں لایا گیا کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے افسوس ناک سانحہ کے پس منظر میں پشاور میں ایک اجلاس کے دوران ''تحریک طالبان وطالبات اسلام'' کے نام سے ایک فورم کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے جس کا سربراہ حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ دامت برکاتہم کو منتخب کیا گیا ہے اور ان کی امارت میں صوبائی امرا اور دیگر ذمہ داروں کا تعین کر کے اسی رخ پر تحریک کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف آپریشن سے قبل موجود تھا۔ ''تحریک طالبان وطالبات اسلام'' کا مقصد اسی تحریک کو آگے بڑھانا بیان کیا جا رہا ہے اور اس کے لیے مختلف سطحوں پر رابطوں کا سلسلہ بھی تازہ معلومات کے مطابق شروع ہو گیا ہے۔ مجھ سے اس سلسلے میں رائے پوچھی گئی تو میں نے عرض کیا کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام اور انسدادِ منکرات کے لیے جدوجہد کرنا، مطالبات کرنا، رائے عامہ کو منظم کرنا، عوامی دباؤ کو بڑھانا اور پرامن جدوجہد کا ہر ممکن راستہ اختیار کرنا نہ صرف ہمارا حق ہے بلکہ ہمارا دینی فریضہ بھی ہے، لیکن ان مقاصد کے لیے قانون کو ہاتھ میں لینا، حکومت کے ساتھ تصادم کی صورت اختیار کرنا، ہتھیار

اٹھانا اور کوئی بھی ایسی صورت اختیار کرنا جسے فقہائے کرام نے ''خروج'' سے تعبیر فرمایا ہے، ہمارے نزدیک درست نہیں ہے اور ہم اس کی تائید کے لیے تیار نہیں ہیں، البتہ ہمارے جو بزرگ اسے درست سمجھتے ہیں، اس کے شرعی اور جائز ہونے پر مطمئن ہیں اور اسے اختیار کرنا چاہتے ہیں، ان کا یہ حق ہم تسلیم کرتے ہیں مگر اس درخواست کے ساتھ کہ اس تحریک کا مورچہ ''دینی مدارس'' سے الگ رکھا جائے اور کسی دینی مدرسہ کو اس تحریک کا مورچہ نہ بنایا جائے۔ ہماری ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں مدرسہ کبھی کسی مسلح تحریک کا مورچہ نہیں رہا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی اس دور میں جب وہ برصغیر کی آزادی کے لیے برطانوی استعمار کے خلاف مسلح تحریک کا تانا بانا بن رہے تھے جسے تاریخ میں تحریک ریشمی رومال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس تحریک کا مورچہ دارالعلوم دیوبند کو نہیں بنایا تھا بلکہ اس سے علیحدگی اختیار کر کے اپنا نظام الگ تشکیل دیا تھا تاکہ دارالعلوم دیوبند اور اس سے متعلقہ دینی اداروں کا تعلیمی کردار کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے اور ان کے لیے خواہ مخواہ مشکلات اور رکاوٹیں کھڑی نہ ہوں۔

ہمارے نزدیک دینی مدارس کا تعلیمی کردار، ان کا آزادانہ وجود اور دینی تعلیمات کے فروغ کے لیے ان کی جدوجہد اور عام مسلمان کا دین کے ساتھ تعلق برقرار رکھنے کے لیے ان کی مساعی دیگر تمام امور سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ کسی بھی تحریک کے لیے اس کو خطرے میں ڈالنا اور کسی بھی حوالے سے دینی مدارس کے لیے مشکلات پیدا کرنا نہ شریعت وحکمت کے لحاظ سے درست ہے اور نہ ہی ہمارے اکابر واسلاف بالخصوص شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور ان کے رفقائے کار کی روایات اور مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگر کچھ دوست اکابر کے طے کردہ ان تحفظات کا دائرہ قائم رکھتے ہوئے ''تحریک طالبان'' کی کوئی صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں تو اس طریق کار پر شرح صدر نہ ہونے کے باعث ہم ان کا ساتھ تو نہیں دے سکیں گے، مگر ان کے خلوص اور مقصد کی سچائی کی وجہ سے ہماری دعائیں ضرور ان کے ساتھ ہوں گی۔*

---

* ۲۳/ اکتوبر ۲۰۰۷ء

تحریک نفاذ شریعت اور نظام عدل ریگولیشن

بی بی سی کے نشریہ کے حوالے سے روزنامہ پاکستان لاہور ۲۴؍جنوری ۲۰۰۸ء میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صوبہ سرحد کی نگران حکومت نے اس ''شرعی نظام عدل ریگولیشن'' میں ترامیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو ۱۹۹۴ء میں مولانا صوفی محمد کی سربراہی میں ''تنظیم نفاذ شریعت محمدیؐ'' کی طرف سے چلائی جانے والی پر جوش عوامی تحریک کے بعد اس وقت کے وزیر اعلیٰ سرحد جناب آفتاب احمد خان شیر پاؤ کی حکومت نے نافذ کیا تھا۔ اس تحریک میں کم و بیش تیس ہزار کے لگ بھگ عوام مسلح ہو کر سڑکوں پر آ گئے تھے اور کھلی سڑکوں پر ان کا کئی روز تک دھرنا جاری رہا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مالا کنڈ ڈویژن میں بھی، جو سابقہ ریاست سوات، دیر، چترال پر مشتمل ہے، شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جائے جو لوگوں کے مقدمات کے فیصلے شریعت محمدیہ کے مطابق کرنے کی پابند ہوں۔ اس تحریک کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ ملک کی مسلح افواج اور مالا کنڈ ڈویژن کے ہزاروں مسلح افراد آمنے سامنے محاذ آرائی کی کیفیت میں کھڑے تھے اور پورے ملک میں دردمند مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تھیں کہ خدا جانے کس لمحے کیا سے کیا ہو جائے، لیکن وہاں متعین افواج کے کمانڈر اور مولانا صوفی محمد کے درمیان براہ راست مذاکرات کے نتیجے میں تصادم کا خطرہ ٹل گیا اور شیر پاؤ حکومت نے مذکورہ بالا ریگولیشن جاری کر کے تحریک نفاذ شریعت کے ذمہ دار حضرات کو مطمئن کر دیا کہ ان کے مطالبہ کے مطابق ان کے علاقے میں شریعت نافذ ہو گئی ہے۔

راقم الحروف نے اس ریگولیشن کے نفاذ کے بعد مینگورہ کا دورہ کر کے وہاں کی صورت حال براہ

راست معلوم کی تھی اور تحریک کے رہنماؤں کے علاوہ سول انتظامیہ کے بعض ذمہ دار افسران اور سرکردہ وکلا سے بھی ملاقات کی تھی اور ایک تفصیلی رپورٹ لکھی تھی جو دینی جرائد کے علاوہ بعض قومی اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔اس وقت تحریک نفاذ شریعت اور اس کے نتیجے میں نافذ ہونے والے ''شرعی نظام عدل ریگولیشن'' کے بارے میں میرے تاثرات مثبت نہیں تھے اور میں نے ان پر واضح تحفظات کا اظہار کیا تھا جن کا خلاصہ درج کر رہا ہوں۔

تحریک نفاذ شریعت محمدی کے قائدین نے اپنے ساتھ مروجہ قوانین کے ماہر وکلا کو شامل کرنے سے جان بوجھ کر گریز کیا تھا جو مروجہ عدالتی نظام کو سمجھتے تھے اور اس حوالے سے بیوروکریسی کی چالوں کی نشاندہی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہائی کورٹ کے ایک سینئر وکیل نے، جو خود بھی نفاذ شریعت کے خواہاں تھے، مجھے تقریباً روتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے تحریک کے رہنماؤں کو اپنی خدمات پیش کیں تو انھیں جواب دیا گیا کہ یہ ''علما'' کا کام ہے،اس لیے وہ تحریک کی قیادت میں شریک نہیں ہو سکتے، یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام اس ریگولیشن کے ساتھ اتفاق کا اعلان کرنے کے باوجود تکنیکی طور پر مار کھا گئے چنانچہ ریگولیشن کا ترجمہ پڑھنے کے بعد خود میرا تاثر بھی یہ تھا کہ اس میں مروجہ عدالتی نظام میں اس کے سوا کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ سیشن اور سول عدالتوں کے ججوں کو ضلع قاضی اور تحصیل قاضی کا نام دے دیا گیا ہے اور ان کے لیے عدالتی نظام میں رہنمائی کے خانے میں قرآن وسنت کے الفاظ بڑھا کر تحریک کے رہنماؤں کو خوش کر دیا گیا ہے کہ عدالتیں قرآن وسنت کی پابند ہوگئی ہیں۔البتہ اس ریگولیشن کے نفاذ سے یہ تبدیلی ضرور آئی کہ شرعی طور پر متنازعہ عائلی قوانین جو اس سے قبل مالاکنڈ ڈویژن میں نافذ نہیں تھے،ان کا دائرۂ نفاذ اس علاقے تک وسیع ہوگیا۔

تنظیم نفاذ شریعت محمدی کے سربراہ مولانا صوفی محمد سے اس وقت میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی اور اس کے بعد بھی ان کی زیارت سے مسلسل محروم ہوں،لیکن تنظیم کی مرکزی مجلس شوریٰ کے متعدد ارکان سے میری ملاقات ہوئی اور مجھے یہ معلوم کر کے سخت حیرت اور افسوس ہوا کہ ان میں سے کسی نے بھی نفاذ سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی میری ملاقات تک اس ریگولیشن کے متن کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ ریگولیشن انگلش زبان میں ہے اور وہ انگلش نہیں جانتے۔ میں نے ان کی خدمت

میں ریگولیشن کا اردو ترجمہ پیش کیا جو روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی نے شائع کیا تھا اور میں نے وہ اخبار مینگورہ جاتے ہوئے راستے میں بس میں خریدا تھا اور وہاں پہنچنے سے پہلے اس کا مطالعہ کر لیا تھا۔

اس پس منظر میں مالاکنڈ ڈویژن میں ''شرعی نظام عدل ریگولیشن'' کے ذریعہ وہاں کی بعض عدالتوں کو شرعی عدالتوں کا نام دیا گیا لیکن بعد میں جب ان کا کوئی مثبت نتیجہ عملی طور پر سامنے نہ آسکا تو مولانا صوفی محمد نے اپنی تحریک دوبارہ شروع کرنے کا اعلان کیا جس میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ان شرعی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنے کا حق دیا گیا ہے اور ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ چونکہ شرعی قوانین کی بجائے انگریزی قوانین کے دائرے میں کام کرتی ہیں، اس لیے انہیں بالاتر حیثیت دے کر شرعی عدالتوں کو غیر موثر بنا دیا گیا ہے، چنانچہ مولانا صوفی محمد کے مسلسل جیل میں رہنے کی وجہ اب اس علاقے میں نفاذ شریعت کی یہ تحریک مولانا فضل اللہ چلا رہے ہیں جو ان کے داماد بتائے جاتے ہیں اور سوات ایک بار پھر نفاذ شریعت کے عنوان سے مسلح افواج کے ساتھ تحریک کے مسلح کارکنوں کے افسوسناک تصادم کا میدان بنا ہوا ہے جب کہ حکومت اپنی رٹ قائم کرنے کے عنوان سے سوات کے مختلف علاقوں میں مسلح آپریشن جاری رکھے ہوئے ہے۔

ہمیں مولانا صوفی محمد اور مولانا فضل اللہ کی تحریکوں کے طریق کار، ترجیحات اور خاص طور پر مسلح تحریک سے کبھی اتفاق نہیں رہا اور ہم نے اس کے بارے ہمیشہ واضح تحفظات کا اظہار کیا ہے، لیکن ان کے اس موقف اور مطالبہ سے ہم پوری طرح متفق ہیں کہ مالاکنڈ ڈویژن (بلکہ پورے پاکستان) میں نفاذ شریعت کے لیے باقاعدہ شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جائے اور انہیں اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ لوگوں کے مقدمات کے فیصلے شریعت محمدی کے مطابق کریں۔ سوات کا بطور خاص حق اس لیے بھی ہے کہ سوات، بہاولپور، قلات اور دیگر ریاستوں میں ان کے پاکستان کے ساتھ الحاق سے پہلے تک شرعی عدالتیں موجود تھیں جو قرآن وسنت کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتی تھیں، لیکن اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے ساتھ الحاق اور اس میں ضم ہونے کے بعد اپنے شرعی عدالتی نظام سے محروم ہوگئیں اور بجائے اس کے کہ پورے

ملک میں شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جاتا، الٹا ان ریاستوں میں پہلے سے قائم شرعی عدالتیں بھی ختم کر دی گئیں اور برطانوی دور کا نوآبادیاتی عدالتی نظام ان ریاستوں میں بھی نافذ ہو گیا، اس لیے نفاذ شریعت کے لیے سوات کے عوام کا اضطراب اور بے چینی اگر ملک کے دوسرے علاقوں کے عوام سے دوچند دکھائی دیتی ہے تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے، لیکن اضطراب، بے چینی اور احتجاج کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، وہ بہرحال ''محل نظر'' ہے اور جب تک تمام معاملات کے اتار چڑھاؤ اور اسٹیبلشمنٹ کی چالوں کو سمجھ کر حوصلہ اور تدبر کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے والی کوئی ہوش مند قیادت سامنے نہیں آتی، غیور عوام کے دینی جذبات اور بیوروکریسی کی مکروہ چالوں کے درمیان یہ خطرناک آنکھ مچولی اسی طرح جاری رہے گی۔

اس پس منظر میں صوبہ سرحد کی نگران حکومت کی طرف سے ''شرعی نظام عدل ریگولیشن'' میں کی جانے والی مجوزہ ترامیم پر ایک نظر ڈال لیں جو نگران صوبائی وزیر قانون میاں محمد اجمل کے حوالے سے بی بی سی کے نشریہ میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کی بیان کردہ مجوزہ ترامیم کے مطابق مالاکنڈ ڈویژن کی مذکورہ شرعی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل کا اختیار ہائی کورٹ کی بجائے وفاقی شرعی عدالت کو دیا جا رہا ہے اور ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی سماعت کا اختیار وفاقی شرعی عدالت کو منتقل کر کے ان عدالتوں کی شرعی حیثیت کو محفوظ کر دیا گیا ہے اور عدالتوں کو مقررہ وقت کے اندر فیصلوں کا پابند کر کے جلد انصاف مہیا کرنے کا وعدہ بھی پورا کر دیا گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ اخباری رپورٹ پڑھ کر مجھے غالب کا یہ شعر یاد آ رہا ہے کہ

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

لیکن نگران صوبائی وزیر میاں محمد اجمل صاحب نے بی بی سی کو دیے گئے اسی انٹرویو میں اس ہلکی سی خوش فہمی کا بھانڈا بھی یہ فرما کر بیچ چوراہے پھوڑ دیا ہے کہ ''مالاکنڈ ڈویژن میں ریگولر قانون ہی نافذ ہوگا، تاہم جج صاحبان کوئی بھی فیصلہ سنانے میں قرآن وسنت کے احکامات کو زیادہ اہمیت دیں گے۔ جج صاحبان معاون قاضیوں اور شرعی عدالتوں کی رہنمائی میں فیصلے سنائیں گے، تاہم وہ ان کی

تجاویز ماننے کے پابند نہیں ہوں گے‘‘۔

ہمیں سوات اور دیگر علاقوں میں نفاذ شریعت کے لیے جدوجہد کرنے اور مسلسل قربانیاں دینے والے دینی کارکنوں سے ہمدردی ہے۔ ہم ان کے جذبات اور قربانیوں کی قدر کرتے ہیں، ان کی جدوجہد کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں اور ان کے موقف اور مطالبات کی حمایت کو اپنا دینی فریضہ اور اپنے لیے باعث سعادت ونجات سمجھتے ہیں، لیکن محض جذبات اور جوش وخروش کے سہارے چلائی جانے والی تحریکات کبھی اپنے منطقی نتیجے تک نہیں پہنچا کرتیں، اس لیے ہمارے نزدیک ان پرخلوص دینی کارکنوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی حمایت وتائید کا سب سے بہتر راستہ یہی ہے کہ ان سے موجودہ طریق کار پر نظر ثانی کی درخواست کی جائے اور معروضی صورت حال اور زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے تدبر وحکمت کی رہنمائی میں جوش وجذبہ کے عملی اظہار کے نئے راستے تلاش کرنے کی گزارش کی جائے کہ نہ صرف وقت بلکہ شریعت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوۃ والتسلیمات) کا تقاضا بھی یہی ہے۔*

---

* روزنامہ اسلام، ۲۷ جنوری ۲۰۰۸ء۔

مولانا صوفی محمد کی رہائی اور نفاذ شریعت کی جدوجہد

تحریک نفاذ شریعت محمدی کے سربراہ مولانا صوفی محمد کو صوبہ سرحد کی نئی حکومت کے ساتھ ایک معاہدے کے بعد نہ صرف رہا کر دیا گیا ہے بلکہ نفاذ شریعت کی جدوجہد کے لیے صوبے میں پرامن جدوجہد کی اجازت بھی دے دی گئی ہے۔ وہ تقریباً ساڑھے چھ سال جیل میں رہے ہیں۔ انہیں گرفتار کرنے کے بعد ان کی تحریک کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت قائم ہونے کے بعد ملک بھر کے عام لوگوں اور دینی کارکنوں کو توقع تھی کہ چونکہ متحدہ مجلس عمل کی طرح مولانا صوفی محمد بھی نفاذ شریعت کے علمبردار ہیں، اس لیے ان کی رہائی اور سرگرمیوں کی بحالی کی کوئی صورت نکل آئے گی، لیکن فریقین کے درمیان متعدد بار مذاکرات کے باوجود ایسا نہ ہوسکا اور یہ اعزاز جمعیت علمائے اسلام کے وزیراعلیٰ محمد اکرم درانی کی بجائے عوامی نیشنل پارٹی کے وزیراعلیٰ امیر حیدر ہوتی کے حصے میں آیا کہ ان کے ساتھ مولانا صوفی محمد کے مذاکرات کامیاب رہے اور پھر وہ رہا بھی ہو گئے۔

اس پیش رفت پر مولانا صوفی محمد اور ان کے رفقا کے ساتھ ساتھ وزیراعلیٰ سرحد امیر حیدر ہوتی اور ان کی ٹیم بھی مبارک باد کی مستحق ہے کہ صوبہ سرحد کے ایک بڑے حصہ میں نفاذ شریعت کے عنوان سے مسلح عوام اور حکومتی فورسز کے درمیان تصادم کا جو ماحول پیدا ہو گیا تھا، اس کے ختم ہونے کے آثار نظر آنے لگے ہیں اور خود مولانا صوفی محمد کا تبصرہ بھی اس پر یہی ہے کہ اس سے امن عامہ کے قیام میں مدد ملے گی۔ ظاہر ہے کہ اب مولانا صوفی محمد اپنی جدوجہد کا ازسرنو آغاز کریں گے اور نفاذ شریعت کی

جدوجہد کے لیے نئی صف بندی کا اہتمام کریں گے، اس لیے اس موقع پر انہیں مبارک باد دیتے ہوئے نفاذ شریعت کی جدوجہد کے چند ناگزیر تقاضوں کی طرف انہیں توجہ دلانا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۔ نفاذ شریعت صرف مالاکنڈ ڈویژن کا مسئلہ نہیں، بلکہ پورے پاکستان کا مسئلہ ہے، اس لیے کہ پاکستان کے قیام کا بنیادی سبب یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس ملک میں مسلمان قرآن وسنت کے احکام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں گے اور اسی وجہ سے دستور پاکستان میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ملک کی منتخب پارلیمنٹ قرآن وسنت کے منافی قانون سازی نہیں کرے گی بلکہ قرآن وسنت کے احکام کو ملک میں نافذ کرنے کی پابند ہوگی، البتہ مالاکنڈ ڈویژن اور اس کے ساتھ ساتھ بہاولپور، خیر پور اور قلات کی ریاستوں کا یہ امتیاز ضرور رہا ہے کہ پاکستان کے ساتھ الحاق سے پہلے ان ریاستوں میں فرنگی استعمار کے دور میں بھی عدالتوں میں شرعی قوانین نافذ تھے اور ان ریاستوں کو پاکستان کے ساتھ الحاق کا صلہ نفاذ شریعت کی صورت میں نہیں، بلکہ پہلے سے نافذ شدہ چند شرعی قوانین سے بھی محرومی کی صورت میں ملا ہے، اس لیے ریاست سوات وغیرہ میں اس مقصد کے لیے لوگوں کے احساس میں طبعی طور پر زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک نفاذ شریعت کے مطالبہ کے تعلق ہے، وہ پورے ملک کا مشترکہ مسئلہ ہے اور مولانا صوفی محمد اور ان کے رفقا کو اپنی جدوجہد کے میدان کا یہ وسیع تناظر ضرور سامنے رکھنا چاہیے۔

۲۔ نفاذ شریعت کی بات جب بھی ہوتی ہے تو اس کی عملی صورت کے بارے میں لازماً سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ سیاسی نظام بھی زیر بحث آتا ہے، عدالتی طریق کار پر بھی گفتگو ہوتی ہے، رجال کار کی اہلیت اور صلاحیت کا معیار بھی بحث ومباحثے کا حصہ بنتا ہے۔ نفاذ شریعت کے لیے جدوجہد کرنے والے اکثر دوست ان سوالات کو نظر انداز کر کے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فرنگی استعمار کے دور میں ان ریاستوں میں جو عدالتی نظام اور طریق کار رائج تھا، اس کو کسی رد وبدل کے بغیر جوں کا توں اختیار کر لیا جائے۔ یہ بات نہ تو قابل عمل ہے اور نہ ہی شرعاً ضروری ہے۔ ان مسائل کے حوالے سے پاکستان کے اکابر علمائے کرام نے اس قدر وقیع علمی کام کیا ہے جو دنیا کے دوسرے مسلم ممالک کے لیے بھی رہنمائی کا سرچشمہ بن سکتا ہے، لیکن خود پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے

کام کرنے والے بہت سے حلقے اسے کلیتاً نظر انداز کر دیتے ہیں جس سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک اسلامی ریاست کے دستوری ڈھانچے کی تشکیل کے لیے تمام مکاتب فکر کے ۱۳۱ اکابر علمائے کرام کے مرتب کردہ ۲۲ متفقہ دستوری نکات، قرارداد مقاصد اور دستور پاکستان کی اسلامی دفعات اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات ومسودات جید علمائے کرام اور فقہا کی کاوشوں کا ہی ثمرہ ہیں اور پاکستان میں جب بھی نفاذ شریعت کی بات ہوگی، اس کی بنیاد انھی علمی کاوشوں پر ہوگی، بلکہ راقم الحروف نے تو طالبان حکومت کے دوران قندھار حاضری کے موقع پر وہاں کے علمائے کرام سے بھی گزارش کی تھی کہ وہ پرانے شاہی دور کے عدالتی طریق کار اور سیاسی ڈھانچے کو اسلام کے نام پر واپس لانے کی بجائے امارت اسلامی افغانستان کے دستوری اور عدالتی ڈھانچے کے لیے پاکستان کی قرارداد مقاصد، علمائے کرام کے ۲۲ دستوری نکات اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات سے استفادہ کریں، اس لیے کہ آج کے دور میں کسی بھی ملک میں اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے لیے فطری اور قابل عمل صورتیں یہی ہو سکتی ہیں۔

یہی گزارش ہماری مولانا صوفی محمد اور ان کے تمام دوستوں سے ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں نفاذ شریعت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں کہ وہ برطانوی دور کے ریاستی عدالتی ڈھانچوں اور سیاسی کلچر کو آئیڈیل قرار دینے پر اصرار نہ کریں، بلکہ سیاسی ڈھانچے، عدالتی نظام اور معاشرتی ارتقا کے بارے میں اکابر علمائے کرام کے اجتہادی اور علمی کام سے استفادہ کریں اور اس کی روشنی میں نفاذ شریعت کی عملی صورتوں کا تعین کریں۔ اسلام آباد میں جامعہ حفصہ اور لال مسجد سے نفاذ شریعت کی جو تحریک شروع ہوگئی تھی اور جس میں غازی عبدالرشید شہید اور ان کی والدہ محترمہ سمیت مبینہ طور پر ہزاروں مخلصین نے اپنی جانوں کا قیمتی نذرانہ پیش کیا ہے، اس میں بھی کنفیوژن کی یہی بات تھی کہ نفاذ شریعت کی عملی صورت کیا ہوگی؟ کیوں کہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں اور اکابر علمائے کرام نے گزشتہ نصف صدی کے دوران اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جو دستوری اور قانونی پیش رفت کی ہے، نئی تحریک کے قائدین کے سامنے وہ نہیں ہے اور وہ اس سارے عمل کو نظر انداز کر کے زیرو پوائنٹ سے دوبارہ کام شروع کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ہم مولانا صوفی

محمد اور ان کے رفقا سے گزارش کریں گے کہ اب جب کہ وہ تحریک نفاذ شریعت محمدی کے مقدس کام کے لیے نئی صف بندی اور ترجیحات کے تعین کے مرحلے میں ہیں، وہ اس پہلو پر ضرور غور کر لیں اور قرارداد مقاصد، علما کے ۲۲ دستوری نکات کی اسلامی دفعات اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات و مسودات کی بنیاد پر اپنی جدوجہد کے نئے دور کا آغاز کریں۔

۳۔ مالاکنڈ ڈویژن کی تحریک نفاذ شریعت محمدی کے پہلے دور کے حوالے سے ہم اس سے قبل بھی یہ عرض کر چکے ہیں کہ اس دور میں تحریک صرف علمائے کرام کے عنوان سے منظّم کی گئی تھی اور دوسرے تمام طبقات کو تحریک کی قیادت اور مشاورت میں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہ ہمارے خیال میں درست نہیں ہے۔ دوسرے طبقات مثلاً وکلا، صحافی برادری، پروفیسر حضرات، سرکاری افسران اور سیاسی رہنماؤں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی موجود رہی ہے اور اب بھی ہے جو پورے خلوص اور شعور کے ساتھ ملک میں نفاذ شریعت کے خواہش مند ہیں اور اس کے لیے کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انہیں صرف اس لیے نظر انداز کر دینا کہ وہ علمائے کرام کے طبقے سے تعلق نہیں رکھتے، نہ انصاف و دیانت کا تقاضا ہے اور نہ جدوجہد کی ضروریات کے حوالے سے ضروری حکمت عملی سے مطابقت رکھتی ہے۔ نفاذ شریعت صرف علما کا مسئلہ نہیں، ان طبقات کا بھی مسئلہ ہے، بلکہ قرآن وسنت پر ایمان رکھنے والے ہر مسلمان کا مسئلہ ہے، اس لیے انہیں نظر انداز کر دینے کی بجائے اعتماد میں لینے، مشاورت کے نظام میں شریک کرنے اور جن شعبوں میں وہ کام کر سکتے ہیں، ان میں ان سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ قومی تحریک صرف اسی صورت میں بنے گی اور ملک کی عمومی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری گزارش ہے کہ جب تک نفاذ شریعت کی جدوجہد کو قومی تحریک کا رنگ نہیں دیا جائے گا، مطلوبہ مقاصد تک رسائی اسی طرح مشکلات اور رکاوٹوں سے دوچار رہے گی۔

۴۔ تحریک کے طریق کار کے بارے میں ہم اپنے تحفظات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے دستوری اور سیاسی جدوجہد کو ملک کی اسٹیبلشمنٹ نے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے اور عوام کی اکثریتی رائے اور منتخب نمائندوں کے بہت سے

جمہوری فیصلوں کو بھی مسلسل پامال کیا جا رہا ہے اور نفاذ شریعت کی جدوجہد میں تشدد کا عنصر بیورو کریسی کے اسی ناروا رویہ کا وہ فطری ردعمل ہے کہ بہت سے لوگ ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ظاہری منظر کے حوالے سے بات خوفناک قسم کے خودکش حملوں تک جا پہنچی ہے، لیکن کیا تحریک کے لیے تشدد اور ہتھیار بندی کا راستہ اختیار کرنا شرعاً اور اصولاً درست بھی ہے؟ اور کیا تشدد کا یہ راستہ منزل کو قریب لا رہا ہے یا جدوجہد کو مزید مشکلات سے اور کنفیوژن سے دوچار کر رہا ہے؟ یہ بات بہرحال محلِ نظر اور لمحہ فکریہ ہے اور اس سلسلے میں ہماری جچی تلی اور سوچی سمجھی رائے ہے کہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے سیاسی عمل اور پرامن عوامی تحریک کا راستہ ہی صحیح اور قابل عمل راستہ ہے اور اس میں ہتھیار اٹھانے اور ریاستی اداروں کے ساتھ ٹکراؤ پیدا کرنے کی پالیسی شرعاً درست نہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود تحریک کے لیے بھی تباہ کن حد تک نقصان دہ ہے۔ ہمارے خیال میں صوبہ سرحد کی حکومت کے ساتھ معاہدے میں نفاذ شریعت کی جدوجہد کے لیے پرامن ہونے کی شرط کو قبول کر کے مولانا صوفی محمد نے اسی معروضی حقیقت کو تسلیم کیا ہے جس پر وہ تحسین کے مستحق ہیں، اس لیے ہم ان کی اس جدوجہد کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں اور جہاں مناسب موقع ہوا، مشاورت اور معاونت کے لیے بھی حاضر ہیں۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم مولانا صوفی محمد اور وزیراعلیٰ سرحد امیر حیدر خان ہوتی کے علاوہ عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ اسفندیار ولی خان کو بھی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ان سے ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ یہی معاہدہ جو مالاکنڈ ڈویژن کی تحریک نفاذ شریعت محمدی کے ساتھ ہوا ہے، اسلام آباد کی لال مسجد اور جامعہ حفصہ والوں کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ معاملات تقریباً ملتے جلتے ہیں اور اسفندیار ولی خان مرکز میں حکمران اتحاد کی قیادت کا حصہ ہیں، اگر وہ اس سلسلہ میں کوئی کردار ادا کر سکیں تو ملک کے بے شمار مظلوم خاندانوں کی دعائیں تو ان کو ملیں گی ہی، ہمارے خیال میں خان عبدالغفار خان مرحوم اور خان عبدالولی خان مرحوم کی روحیں بھی ان سے یقیناً خوش ہوں گی۔*

---

* روزنامہ پاکستان، ۲۷/اپریل ۲۰۰۸ء

عدالتی بحران اور عدلیہ کی بالادستی

اسٹیل ملز کیس پر عدالت عظمیٰ کا فیصلہ

پاکستان اسٹیل ملز کراچی کی نج کاری کے حوالے سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلہ پر مختلف حلقوں کی طرف سے متنوع ردِعمل کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ عام طور پر یہ فیصلہ لوگوں کی خوشی کا باعث بنا ہے، اس حوالے سے بھی کہ ملک کا ایک اہم اثاثہ اخباری رپورٹوں کے مطابق اونے اونے بکنے سے بچ گیا اور اس حوالے سے بھی کہ عدالت عظمیٰ نے حکومت وقت کے خلاف ایک اہم فیصلہ دے کر اس تاثر کو کم کرنے کی کوشش کی ہے کہ حکومت ہماری اعلیٰ عدالتوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانے میں اکثر کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ یہ تاثر صرف عام حلقوں کا ہی نہیں بلکہ ایک حالیہ انٹرویو میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب جسٹس سعید الزمان صدیقی نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ کا کردار اور رویہ نا قابل رشک اور مایوس کن ہے اور اس قسم کی صورت حال نصف صدی قبل مولوی تمیز الدین کیس کے دور سے چلی آ رہی ہے۔ کراچی کے ایک انگریزی جریدے ''ہیرالڈ'' کو دیے گئے انٹرویو میں انہوں نے کہا ہے کہ ''ہماری بدنصیبی ہے کہ سویلین اور فوجی دونوں نوعیت کے حکمرانوں نے کبھی آزاد عدلیہ کا وجود پسند نہیں کیا اور اگر ۱۹۵۴ء میں گورنر جنرل کی طرف سے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے اقدام کو فیڈرل کورٹ آف پاکستان جائز قرار نہ دیتی تو آج ملکی حالات مختلف اور بہتر ہوتے۔''

اس پس منظر میں اسٹیل ملز کے بارے میں حکومتی موقف کے خلاف عدالت عظمیٰ کے فیصلے پر عام لوگوں کو خوشی ہوئی ہے اور یہ توقع کی جانے لگی کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت خود پر حکومتی دباؤ

کا تاثر ختم کرنے کی طرف چل پڑی ہے''۔ سابق چیف جسٹس سعید الزمان صدیقی نے بھی مذکورہ انٹرویو میں اس توقع کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ پاکستان اسٹیل ملز کیس پر عدالت عظمیٰ نے جو فیصلہ دیا ہے، اس سے اصلاح احوال کی کچھ امیدیں بندھی ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کے سابق وزیر قانون اور سابق اٹارنی جنرل جناب شریف الدین پیرزادہ نے ''ہیرالڈ'' کے مذکورہ شمارے کے لیے دیے گئے انٹرویو میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور اگرچہ وہ اس انٹرویو میں اعلیٰ عدالتوں پر حکومت کے دباؤ کی بات قبول کرنے سے ہچکچا رہے ہیں، لیکن انہوں نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ ''قیام پاکستان کے بعد ابتدا میں اعلیٰ عدلیہ کا کام ٹھیک چل رہا تھا اور خرابی ۱۹۵۴ء میں اس وقت پیدا ہوئی جب چیف جسٹس پاکستان سر عبدالرشید کی ریٹائرمنٹ پر ان کا جانشین سب سے سینئر جج جسٹس اکرم کو، جن کا تعلق ڈھاکہ سے تھا، نظر انداز کر کے مسٹر جسٹس محمد منیر کو براہ راست اس اعلیٰ ترین عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا المناک ترین مرحلہ تھا۔ اس ناانصافی کے خلاف آواز بلند نہ ہوئی اور جسٹس منیر نے بعض ایسی حرکات کیں جن سے نہ صرف جمہوریت کو بدترین نقصان پہنچا بلکہ پاکستان کی خود مختاری و سالمیت کو بھی دھچکا لگا۔''

جناب شریف الدین پیرزادہ کا کہنا ہے کہ چیف جسٹس محمد منیر کے بعض فیصلے بشمول مولوی تمیزالدین کیس بعد ازاں بیگم نصرت بھٹو کیس سمیت کئی مقدموں پر اثر انداز ہوئے کیونکہ نصرت بھٹو کیس کے فیصلے نے جنرل ضیاء الحق کی بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے کی کارروائی کی تائید کی اور پھر انہی فیصلوں کے نتیجے میں جنرل پرویز مشرف کی کارروائی کو بھی تائید حاصل ہوئی۔ اس کے ساتھ شریف الدین پیرزادہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسٹیل ملز کے بارے میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ سے اس کی وقعت میں اضافہ ہوا ہے اور الزامات کے تاثر میں کمی ہوئی ہے۔

پاکستان کی عدالت عظمیٰ کے حوالے سے اس بات پر کم وبیش سب حلقوں کا اتفاق پایا جاتا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں جب گورنر جنرل غلام محمد مرحوم نے دستور ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے خلاف مولوی تمیزالدین مرحوم دادرسی کے لیے عدالت عظمیٰ کے پاس گئے تو یہی وہ مرحلہ تھا جب عدالتی کردار کی اینٹ ٹیڑھی ہوئی کیونکہ جسٹس محمد منیر نے فیڈرل کورٹ آف پاکستان کے سربراہ کی

حیثیت سے گورنر جنرل غلام محمد کے اس اقدام کو جائز قرار دے دیا اور بعد میں اس قسم کے اقدامات کے لیے ''نظریہ ضرورت'' کی اصطلاح بھی سب سے پہلے انہوں نے استعمال کی۔ اس کے بعد اس ٹیڑھی اینٹ پر جو عمارت کھڑی کی گئی، اس کی کجی ساری دنیا کو دکھائی دے رہی ہے اور دستوری حوالے سے ہماری اعلیٰ ترین عدالت کا کردار فارسی کے مشہور شعر:

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کا مصداق بن کر رہ گیا جس کا رونا شریف الدین پیرزادہ نے بھی اپنے انٹرویو میں رویا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت تک جتنے انسان قتل ہوں گے، ان سب کا بوجھ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل کی گردن پر بھی ہوگا، اس لیے کہ سب سے پہلا انسان اس کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے دنیا میں انسانی خون بہانے کی اس رسم بد کا آغاز کیا تھا، اس لیے پاکستان میں دستور اور جمہوریت کے جتنے قتل اب تک ہوئے ہیں اور جتنے خدانخواستہ آئندہ ہوتے رہیں گے، ان کی ذمہ داری اس قتل کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ ساتھ جسٹس محمد منیر کی گردن پر بھی ہوگی کہ وطن عزیز میں انصاف، جمہوریت اور دستور کی بالادستی کا قتل سب سے پہلے انہی کے ہاتھوں ہوا۔

پاکستان کی بنیاد ہمیشہ اسلام اور جمہوریت کو قرار دیا جاتا رہا ہے اور اب بھی ملک کا نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے اور اس کا دستور اسلام اور جمہوریت کو ہی ملک کی اساس تسلیم کرتا ہے، لیکن جس طرح جمہوریت کو ہماری اعلیٰ عدالت سے وہ شکایت ہے جس کا ذکر جناب شریف الدین پیرزادہ کے انٹرویو میں ہو چکا ہے، اسی طرح اسلام بھی شکوہ کناں ہے کہ اس کے بارے میں جب عدالت عظمیٰ ایک فیصلہ کن مرحلہ پر آئی تو اس نے ملک کی نظریاتی اساس اور ملت اسلامیہ کے عقیدہ و ایمان کو ترجیح دینے کی بجائے معروضی حالات کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنایا۔ میں اس کے لیے اس کیس کا حوالہ دینا چاہوں گا جس میں ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ دستور پاکستان میں ''قرارداد مقاصد'' کی حیثیت کیا ہے؟ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ اس کی

مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر نظامِ حکومت چلانے کا پابند کیا گیا ہے۔ایک دور میں قرار داد مقاصد ملک کے دستور کا صرف دیباچہ ہوا کرتی تھی اور اسے دستور کا قابلِ عمل حصہ تصور نہیں کیا جاتا تھا مگر جنرل ضیاء الحق نے سپریم کورٹ کی طرف سے تفویض کردہ اختیارات کے تحت اسے دستور کا عملی حصہ بنا دیا تو ایک کیس میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ اگر دستور کی کوئی اور دفعہ قرار داد مقاصد سے متصادم ہو تو کیا قرار داد مقاصد کو ملک کی نظریاتی اساس کی علامت ہونے کی وجہ سے باقی دستور پر بالا دستی حاصل ہوگی؟ ہمارے خیال میں جس طرح ۱۹۵۴ء میں دستور ساز اسمبلی کی گورنر جنرل کی طرف سے برطرفی کے جواز یا عدم جواز کا سوال ملک میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتا تھا اور اس میں جسٹس محمد منیر کے فیصلے نے جمہوریت کی گاڑی کو ہمیشہ کے لیے پہیے سے اتار دیا، اسی طرح دستور پاکستان میں ''قرار داد مقاصد'' کی بالا دستی کا یہ سوال ملک میں اسلامی نظام کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن مرحلہ تھا۔اگر اس موقع پر عدالت عظمیٰ ''قرار داد مقاصد'' کی بالا دستی کو تسلیم کر لیتی تو ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے خود عدالت عظمیٰ کے ذریعے راہ ہموار ہو جاتی مگر سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں عدالت عظمیٰ نے قرار داد مقاصد کی بالا دستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس سے ملک کے اجتماعی نظام کے قرآن وسنت کی پٹری پر چلنے کا جو امکان پیدا ہو گیا تھا، اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ تاریخ اور قانون کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے نزدیک ان دونوں فیصلوں کی یکساں اہمیت ہے۔ایک فیصلے نے جمہوریت کو سبوتاژ کر دیا اور دوسرے نے اسلام کے راستے میں دیوار کھڑی کر دی۔

اس طویل پس منظر کے تذکرہ کا مقصد دراصل اسٹیل ملز کے بارے میں عدالت عظمیٰ کے حالیہ فیصلے پر عوامی حلقوں کی خوشی کی اہمیت اور نوعیت کو واضح کرنا ہے کہ اس پس منظر اور ماحول میں جبکہ سابق چیف جسٹس جناب سعید الزمان صدیقی کے بقول ''عام آدمی کو عدالت پر کوئی اعتبار نہیں رہا'' ہماری عدالت عظمیٰ نے ملک کے اثاثوں کو بچانے کے لیے ایک تاریخی فیصلہ دیا ہے اور اس میں حکومت کے موقف اور پالیسی کی پروا نہیں کی تو یہ بات بلاشبہ ملک کے عوام کے لیے انتہائی خوشی کا

باعث اور مستقبل کے حوالے سے بہت حوصلہ افزا ہے اور ہم اس پر چیف جسٹس آف پاکستان محترم جسٹس افتخار محمد چودھری اور ان کے رفقا کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس توقع کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح عدالت عظمیٰ نے ملک کے مادی وسائل اور مالی اثاثوں کو بچانے کے لیے کردار ادا کیا ہے، ملک کے نظریاتی اثاثوں اسلام اور جمہوریت کو بچانے اور انہیں یرغمالیوں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے بھی ملک کے عوام کو عدالت عظمیٰ سے ہی توقع ہے۔

البتہ جنرل پرویز مشرف کا ردعمل اس سے مختلف ہے۔ روزنامہ پاکستان لاہور میں ۱۴ر جولائی ۲۰۰۶ء کو شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق صدر محترم نے اسٹیل ملز کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے دن کو پاکستان کے لیے ''یوم غم'' قرار دیا ہے اور اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے کہ ''نج کاری ہماری اقتصادی حکمت عملی کا اہم حصہ ہے، کیونکہ حکومت کا کام بزنس نہیں۔ جہاں بھی حکومت گھسی، بیڑا غرق کیا۔ اسٹیل ملز، ریلوے، واپڈا، کے ای ایس سی، رائس ایکسپورٹ کارپوریشن، کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن سب ادارے خسارے میں چلے گئے۔ بینکوں کو لوگ لوٹ رہے تھے اور قرضے معاف کرا لیتے تھے۔ ہم نے جس سے جان چھڑائی، اس کی حالت اچھی ہوگئی اور آج بینک بہترین کارکردگی دکھا رہے ہیں، اس لیے نج کاری میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔''

صدر محترم کے اس ارشاد پر ہمیں کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اس لیے کہ جس طرح جسٹس سعید الزمان صدیقی اور جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب کے ارشادات سے ہماری عدلیہ کے کردار کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے، اسی طرح صدر جنرل پرویز مشرف کا یہ فرمان ہماری انتظامیہ کی کارکردگی کا بہترین میزان ہے۔*

O

* روزنامہ اسلام، ۱۸ر جولائی ۲۰۰۶ء۔

پاکستان اسٹیل ملز اور عدالت عظمیٰ

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات سے پہلے جب ملک میں انتخابی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تو وہ میری سیاسی اور خطابتی زندگی کا ابتدائی دور تھا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز سے عقیدت زیادہ تھی اور اب بھی ہے۔ ان کی سیاسی جدوجہد اور سیاسی افکار سے سب سے زیادہ متاثر تھا اور اسی مناسبت سے استعمار دشمنی کی بات کسی طرف سے بھی ہو، اچھی لگتی تھی۔ جمعیت علمائے اسلام کا اجتماعی ذوق بھی یہی تھا (جو اب پس منظر میں چلا گیا ہے)۔ اس حوالے سے لیفٹ کے سیاسی کارکنوں کے ساتھ ہمارا میل جول زیادہ رہتا تھا اور ہم مختلف معاملات میں ایک دوسرے کو سپورٹ بھی کیا کرتے تھے۔ امریکہ ہماری سیاسی گفتگو بلکہ تابڑتوڑ حملوں کا سب سے بڑا ہدف ہوتا تھا۔ اس وقت پاکستان میں امریکہ کے سفیر جوزف فارلینڈ کو ناپسندیدہ قرار دے کر واپس بھیجنے کا مطالبہ ہماری سیاسی تقریروں کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ان پر الزام یہ تھا کہ وہ امریکی امداد کی رقوم بالخصوص پی ایل ۴۸۰ کے فنڈ کو اپنی صوابدید کی بنیاد پر پاکستان کے سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں میں خفیہ طور پر تقسیم کر کے پاکستان کی قومی سیاست میں مداخلت کی راہ ہموار کر رہے ہیں اور اپنے استعماری شکنجے کو مضبوط بنانے میں مصروف ہیں۔

اس کے بعد دوسرا اہم موضوع پاکستان میں اسٹیل مل لگانے کا مطالبہ ہوتا تھا۔ ہم اپنی تقاریر اور بیانات میں اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ فولاد کسی بھی ملک کی صنعت اور دفاع دونوں کے حوالے سے بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بغیر نہ کوئی ملک ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی

اپنے دفاع میں خود کفیل ہو سکتا ہے۔ ہم اس پر قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ساتھ بین الاقوامی حالات اور اعداد وشمار سے دلائل دیا کرتے تھے اور حکومت سے پر جوش مطالبہ کرتے تھے کہ فوری طور پر ملک میں فولادی صنعت کا اہتمام کیا جائے اور فولاد ڈھالنے کا کارخانہ لگا کر اس سمت میں پیش رفت کی جائے۔

پاکستان اسٹیل ملز کراچی کی نجکاری کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کا فیصلہ اور گزشتہ دنوں قومی اسمبلی میں اس سلسلہ میں ہونے والی بحث اخبارات میں نظر سے گزری تو یہ سارا منظر ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے گھوم گیا اور ۱۹۷۰ء سے قبل کی سیاسی گہما گہمی اور لیفٹ اور رائٹ کی کشمکش کے مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے۔ پاکستان اسٹیل ملز کراچی میں میرا کافی عرصہ سے آنا جانا رہتا ہے۔ اسٹیل ملز کے ملازمین کی کالونی گلشن حدید کے فیز اکی جامع مسجد توحید میں ہمارے ایک محترم دوست مولانا احسان اللہ اشرف ہزاروی سالہا سال سے خطیب چلے آرہے ہیں۔ ہزارہ کے علاقہ بٹگرام سے تعلق رکھتے ہیں، جمعیت علمائے اسلام کے سرگرم راہنماؤں میں سے ہیں، پاکستان شریعت کونسل کی سرگرمیوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ باذوق اور صاحب مطالعہ عالم دین ہیں، گزشتہ انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی ٹکٹ پر لانڈھی کے حلقہ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور صوبائی اسمبلی میں اپنے حلقے کے عوام کے ساتھ ساتھ اہل دین کی بھی نمائندگی کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے سے بیمار ہیں، شوگر کی زیادتی نے آنکھوں کی بینائی کو خاصا متاثر کر دیا ہے اور اب وہ مطالعہ بلکہ از خود چلنے پھرنے سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمت کاملہ سے نوازے، آمین۔

ان کے ہاں اس سے قبل کئی بار حاضری ہوئی ہے۔ گزشتہ دنوں ۱۴/اگست کو میں ایک روز کے لیے کراچی گیا تو جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی کے جلسہ ختم بخاری میں حضرت مولانا فداء الرحمٰن درخواستی کے ہاں مولانا احسان اللہ ہزاروی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ اسٹیل ملز کے بحران پر اس سے متعلقہ لوگوں سے معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے ساتھ طے ہوا کہ ۲۱/اگست کو جامعۃ الرشید کے کلیۃ الشریعہ کے نصاب کے سلسلے میں ہونے والے دوروزہ سیمینار میں شرکت کے لیے میں نے حاضر ہونا ہے تو ایک روز پہلے آجاؤں گا اور رات اسٹیل ملز کے

ملازمین کی کالونی گلشن حدید میں مولانا احسان اللہ ہزاروی کے ہاں قیام کروں گا، چنانچہ عزیزم حافظ عمار خان ناصر سلمہ مدیر ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ کے ہمراہ میں نے بیس اگست کو رات ان کے ہاں قیام کیا اور انہوں نے کچھ متعلقہ دوستوں کے ساتھ ہماری ملاقات اور گفتگو کا اہتمام کر دیا جس میں ایک عوامی نمائندے کی حیثیت سے وہ خود بھی شریک رہے۔ اس موقع پر مختلف احباب سے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کے مطابق اسٹیل ملز کراچی کے قیام اور اس کے موجودہ بحران تک پہنچنے کے حالات کا نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے:

پاکستان اسٹیل ملز کے قیام کا اصولی فیصلہ ۱۹۶۸ء میں ہو گیا تھا، لیکن اس کا سنگ بنیاد ۱۹۷۳ء میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے وزیر اعظم کی حیثیت سے رکھا۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں گراؤنڈ ورک کا آغاز ہوا اور ۱۹۸۱ء میں پہلے پیداواری یونٹ نے کام کا آغاز کیا۔ اسٹیل ملز کی مشینری سوویت یونین سے خریدی گئی۔ سوویت یونین نے اس مل کی تعمیر اور مشینری کی فٹنگ میں مسلسل تعاون کیا اور کئی سال تک سوویت یونین کے فنی ماہرین اور کاریگر ہزاروں کی تعداد میں مل میں کام کرتے رہے۔ اسٹیل ملز پر کل لاگت چوبیس ارب ستر کروڑ بتائی جاتی ہے جس میں گیارہ ارب کے لگ بھگ کے قریب رقم بینکوں سے قرض کے طور پر لی گئی جبکہ باقی رقم قومی خزانہ سے ادا کی گئی۔ اس طرح پاکستان اسٹیل ملز کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسٹیل ملز کے لیے مخصوص کی گئی زمین کا رقبہ ساڑھے چار ہزار ایکڑ سے زیادہ بتایا جاتا ہے جس میں مشینری کم وبیش ایک ہزار ایکڑ کے دائرے میں نصب ہے اور باقی زمین خالی ہے۔

مئی ۲۰۰۰ء میں پاکستان اسٹیل ملز کی انتظامی و مالیاتی تنظیم نو کا فیصلہ ہوا تو بینکوں سے حاصل کردہ گیارہ ارب سے زیادہ رقم کو ملز کے ذمہ قرار دے کر اس کی ادائیگی ملز کے کھاتے میں ڈال دی گئی جبکہ دوسری طرف سے یہ موقف تھا کہ چونکہ حکومت پاکستان خود اس کی مالک ہے اور اس کا نفع نقصان اسی کے کھاتے میں ہے، اس لیے بینکوں سے بطور قرض حاصل کی گئی رقم سرمایہ کاری کی مد میں ہی شمار ہوتی ہے اور اسے مل کے ذمہ الگ قرض قرار دینا درست نہیں ہے، لیکن اس موقف کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی اور بینکوں کی رقم کو ملز کے ذمہ قرار دے دیا گیا۔ گیارہ ارب کی اس رقم پر اس

وقت تک سات ارب کے لگ بھگ سود کی رقم کا اضافہ ہو گیا تھا اور یہ رقم انیس ارب تیئس کروڑ کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ پاکستان اسٹیل ملز اس امر کی ذمہ دار قرار پائی کہ وہ اس قرض کی سالانہ قسط دینے کے ساتھ ساتھ مجموعی رقم پر سود بھی ادا کرے گی جو تقریباً دو ارب روپے سالانہ بنتا تھا۔ اپنی سالانہ آمدنی میں سے قرض کی قسط اور سود کی رقم کی ادائیگی کے بعد اسٹیل ملز خسارے پر چلنے والی صنعت شمار ہونے لگی تو ایک معاہدے کے تحت اسٹیل ملز کو پابند کر دیا گیا کہ وہ ۲۰۱۹ء تک اس قرضے کو بہرحال ادا کرے گی۔

اس کے ساتھ ہی ملز کے اخراجات کو کم کرنے کے لیے ملازمین میں تخفیف کا فیصلہ کیا گیا۔ بائیس ہزار سے زائد باقاعدہ ملازمین کو پندرہ ہزار کے دائرے میں لانے کے لیے گولڈن ہینڈ شیک کی اسکیم اختیار کی گئی جس کے تحت آٹھ ہزار کے لگ بھگ ملازمین فارغ ہوئے اور ملز نے انہیں اس اسکیم کے تحت ساڑھے چار ارب روپے کے لگ بھگ رقم ادا کی۔ ملز کے ملازمین کا کہنا ہے کہ اس وقت تک مل منافع میں چل رہی تھی، لیکن قرضوں اور سود در سود کی ادائیگی کی اس ذمہ داری کے بعد وہ منافع بخش نہ رہی تو ۱۹۹۷ء میں اسے نجی شعبے میں فروخت کرنے کا اصولی فیصلہ کر لیا گیا، مگر یہ فیصلہ کاغذات کی حد تک رہا، جبکہ حکومت کی عملی پالیسی ملز کے دائرہ کار میں وسعت کی رہی، اس لیے نجکاری کا یہ فیصلہ حکومت کی اس حکمت عملی کے باعث لوگوں کے ذہنوں سے اتر گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ پاکستان میں اسٹیل کی مجموعی ضرورت پچاس لاکھ ٹن ہے، جبکہ پاکستان اسٹیل ملز کی پیداواری صلاحیت گیارہ لاکھ ٹن ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنے دورِ حکومت کے آغاز میں روس کی حکومت سے معاہدہ کیا کہ روس کے تعاون سے اس صلاحیت کو فوری طور پر پندرہ لاکھ ٹن تک بڑھایا جائے گا اور بعد میں اسے تیس لاکھ ٹن تک لے جایا جائے گا۔ اس کے بعد وزیرِاعظم جناب شوکت عزیز نے چین کی حکومت سے پاکستان اسٹیل ملز میں توسیع کے لیے بات چیت کی جس پر چینی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے ۸۰ فیصد رقم فراہم کرنے کے لیے تیار ہے اور اگر باقی بیس فی صد کے لیے حکومت پاکستان دقت محسوس کرتی ہے تو اس پر بھی غور کیا جا سکتا ہے، مگر کم و بیش تمام معاملات طے پانے کے بعد جب عملی معاہدہ کی نوبت آئی تو حکومت پاکستان نے قدم پیچھے ہٹا لیا۔

اس کے ساتھ ہی پاکستان اسٹیل ملز کی نجکاری کے لیے تیز رفتاری کے ساتھ کام شروع کر دیا گیا۔ نجکاری کا فیصلہ کرنے کے لیے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو توڑ کر نیا بورڈ بنایا گیا، بڑی عجلت میں اس کا اجلاس اسلام آباد میں وزیراعظم جناب شوکت عزیز کی صدارت میں ہوا، اس میں پاکستان اسٹیل ملز کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا اور نجکاری کمیشن نے اپنا کام تیزی کے ساتھ شروع کر دیا۔ اسٹیل ملز کی قیمت طے کرنے کے لیے بین الاقوامی فرم ''سٹی گروپ'' کو ایڈوائزر مقرر کیا گیا جس نے مبینہ طور پر پاکستان اسٹیل ملز، اس کی مشینری اور اثاثوں کی ''مارکیٹ ویلیو'' دیکھنے اور تعین کرنے کی بجائے ''بک ویلیو'' کے اصول پر اس کی قیمت طے کی اور ایک کنسورشیم نے جس کے ۴۰ فی صد مالک سعودی، ۱۰ فی روسی اور ۲۰ فی صد پاکستانی بتائے جاتے ہیں، ساڑھے اکیس ارب روپے میں اسے خرید لیا۔ ملازمین میں پیپلز ورکرز یونین نے اور ایک اور گروپ وطن پارٹی نے اسے عدالت میں چیلنج کر دیا جس کا موقف یہ تھا کہ:

☆ پاکستان اسٹیل ملز کو فروخت کرنے میں جلد بازی کی گئی ہے اور بہت سے قانونی تقاضوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

☆ اس کی قیمت ''مارکیٹ ویلیو'' کے معروف اصول پر طے کرنے کی بجائے ''بک ویلیو'' کے طریق کار پر لگائی گئی ہے جو اس کی مارکیٹ قیمت سے بہت زیادہ کم ہے، بلکہ مفت خریداروں کے سپرد کر دینے کے مترادف ہے۔

☆ سودے میں ملز کی جو زمین شامل کی گئی ہے، اس کی قیمت سرے سے لگائی ہی نہیں گئی۔

☆ جس تاریخ کو ملز کی فروخت مکمل ہوئی، ملز کے پاس ساڑھے بارہ ارب کا خام مال اور تیار شدہ مال موجود تھا، اس کے پاس ساڑھے آٹھ ارب روپے نقد موجود تھے اور زائد ادا کیے گئے ٹیکسوں میں سے قانون کے مطابق اسے ایک ارب روپے واپس ملنے تھے۔ اس طرح پاکستان اسٹیل ملز خریدنے والوں کو ساڑھے اکیس ارب روپے کی رقم اس صورت میں جوں کی توں واپس مل جانا تھی اور یہ اسٹیل ملز ہزاروں ایکڑ زمین اور اربوں روپے کی مشینری سمیت انہیں بالکل مفت ملنا تھی جس پر ملک کی عدالت عظمیٰ نے بروقت نوٹس لیا اور وہ تاریخی فیصلہ صادر کیا جو اس وقت ملک کے اعلیٰ

ایوانوں میں زیر بحث ہے اور جس پر ملک کے محبّ وطن حلقے اور عوام سپریم کورٹ آف پاکستان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔

پاکستان اسٹیل ملز کے جن حضرات سے ہماری ملاقات ہوئی، ان کے بقول حکومت پاکستان نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ پاکستان اسٹیل ملز خریداروں کے سپرد کرتے وقت وہ موجودہ ملازمین کو فارغ کرنے کے لیے پندرہ ارب روپے اپنی طرف سے ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس طرح ملز کی ساڑھے اکیس ارب روپے کی رقم میں سے یہ پندرہ ارب روپے نکال کر قومی خزانہ کو اس میں سے صرف ساڑھے چھ ارب روپے ملنا تھے۔

ان دوستوں نے ہمیں اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ بات بتائی کہ اگرچہ اسٹیل ملز نے بینکوں سے قرضہ ایک معاہدے کے تحت ۲۰۱۹ء تک واپس کرنا تھا، لیکن ملز یہ سارا قرض واپس کر چکی ہے، البتہ جب ملز نے تیز رفتاری کے ساتھ قرضہ واپس کرنا شروع کیا تو بینکوں نے اپنا قرضہ واپس لینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اس سودی رقم سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے جو انہیں اس قرضے کی رقم پر ۲۰۱۹ء تک مسلسل حاصل ہونی تھی، چنانچہ حکومت کو اس مسئلہ میں مداخلت کرنا پڑی۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اگرچہ مشترکہ مفادات کی کونسل نے پاکستان اسٹیل ملز کی دوبارہ نجکاری کا فیصلہ کر لیا ہے، لیکن وزیر اعلیٰ سرحد اکرم خان درانی نے اس فیصلے سے اختلاف کر کے پاکستان کے کروڑوں عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اگر وہ اپنے اس فیصلہ کو مزید قانونی پیش رفت کی شکل دے سکیں تو ملک کے اس عظیم اثاثے کو اونے پونے فروخت ہونے سے روکا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ اگر اس فیصلے کو باضابطہ چیلنج کر دیں تو نجکاری کا یہ فیصلہ پارلیمنٹ کے مشترکہ فورم کے پاس چلا جائے گا اور پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے منظوری حاصل کیے بغیر پاکستان اسٹیل ملز کو قانونی طور پر فروخت نہیں کیا جا سکے گا۔ خدا جانے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ جناب محمد اکرم خان درانی ''چہ ارزاں فروختند'' کے اس عمل کو روکنے کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کے لیے تیار بھی ہیں یا نہیں؟*

O

---

* روزنامہ پاکستان، ۲۶/اگست ۲۰۰۶ء۔

فیصلے سے قبل ہی سزا

جسٹس افتخار محمد چودھری نے جب اسٹیل ملز کی پرائیویٹائزیشن کے حوالے سے فیصلہ دیا تھا تو یہ خدشہ اسی وقت سے ذہن پر منڈلانے لگا تھا کہ ''کچھ ضرور ہوگا''۔ پھر جب پتنگ بازی کے حوالے سے عدالت عظمیٰ کا فیصلہ سامنے آیا تو خدشے کا دائرہ وسیع ہونے لگا، جبکہ بہت سے دیگر کیسوں میں چیف جسٹس کے برق رفتار فیصلوں نے بھی اس خدشے کو خطرے کا روپ دینے میں اہم کردار ادا کیا، لیکن سچی بات ہے کہ اس صورت حال کا ذہن کے کسی گوشے میں وہم وگمان بھی نہ تھا جس کا ملک کی عدالت عظمیٰ کے سربراہ کو سامنا کرنا پڑا اور جس نے پوری قوم کو ششدر کر کے رکھ دیا ہے۔ آج ہی لندن سے ایک بزرگ دوست کا فون آیا جن کا تعلق انڈیا سے ہے، وہ مجھ سے پوچھنا چاہ رہے تھے کہ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ میں نے ان سے گزارش کی کہ ہم تو ''ہوسکتا ہے'' کے مرحلے سے بہت آگے جا پہنچے ہیں۔

جہاں تک چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف جاری کی جانے والی ''فرد جرم'' کا تعلق ہے، اس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں فیصلے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکے گا، لیکن اس سے ہٹ کر آج سارا دن دو تین سوال میرے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ ایک یہ کہ اگر اس ''چارج شیٹ'' میں درج سارے الزامات درست ثابت ہو جائیں تو بھی کیا ان کی سزا وہی ہے جو دی جا رہی ہے، بلکہ اب تک دی جا چکی ہے؟ اس لیے کہ کسی جرم کی سزا کے تعین میں صرف جرم کی نوعیت نہیں دیکھی جاتی، بلکہ اس ماحول کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے جس میں اس جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ ماحول کسی جرم

کی سنگینی اور سطح کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور شاید اس معروف مسیحی روایت کا پس منظر بھی یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ کے سامنے بدکاری کا ایک مجرم لایا گیا جس کی سزا موسوی شریعت میں سنگسار کرنا تھی۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ اسے شریعت کے قانون کے مطابق سنگسار کر دیا جائے۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: ٹھیک ہے، اس کو یہی سزا دی جائے لیکن اسے سنگسار کرنے لیے پہلا پتھر وہ شخص اٹھائے جس نے زندگی میں خود کبھی بدکاری نہ کی ہو۔ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اور سزا کا مطالبہ کرنے والا ہجوم رفتہ رفتہ خود ہی چھٹ گیا تھا۔

دوسرا سوال جس نے گزشتہ دو دنوں سے میرے ذہن کو پریشان کر رکھا ہے کہ کیا کسی پر فردِ جرم عائد کرنے، الزامات لگانے اور پھر سزا دینے کا طریقہ کار وہی ہوتا ہے جو ملک کی عدالتِ عظمیٰ کے چیف جسٹس کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے؟ ابھی تو ٹرائیل نہیں ہوا، جرم ثابت نہیں ہوا، سزا کا تعین نہیں ہوا، جبکہ سزا پہلے ہی دے دی گئی ہے اور سزا بھی ایسی کہ اس سطح کے ''ملزم'' کے لیے جرم ثابت ہونے کے بعد اس سے زیادہ کسی سزا کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اس سٹیٹس کے لوگوں کے لیے تذلیل سے بڑی اور کون سی سزا ہو سکتی ہے اور اہانت سے زیادہ اور کس سلوک کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اسی سپریم کورٹ میں اس نکتے پر بحث ہو چکی ہے کہ کسی مجرم کو جرم ثابت ہونے کے بعد بھی کھلے بندوں سزا نہیں دی جا سکتی، اس لیے کہ اس سے اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اور انسانی عزت وشرف کا احترام، انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹر کی رو سے ہماری دستوری اور قانونی ذمہ داری ہے۔ اگر قانون کی دنیا کے لوگوں کو یاد ہو کہ قتل اور ڈکیتی کے کسی کیس میں ایک خصوصی عدالت نے مجرم کو کھلے بندوں پھانسی پر لٹکانے کا حکم صادر کیا تھا جس میں ''کھلے بندوں'' سزا دینے کا پہلو عدالتِ عظمیٰ میں چیلنج ہو گیا تھا اور اس پر ملک کے نامور قانون دانوں کے ساتھ ساتھ ملک کے اٹارنی جنرل اور چاروں صوبوں کے ایڈووکیٹ جنرل بھی اس نکتے کی وضاحت کے لیے عدالتِ عظمیٰ میں پیش ہوئے تھے کہ کھلے بندوں سزا دینا عزتِ نفس کے منافی ہے جو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مترادف ہے، چنانچہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، عدالتِ عظمیٰ نے اس اصول کو تسلیم کرتے ہوئے ماتحت عدالت کا فیصلہ تبدیل کر دیا تھا، لیکن اب اسی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو الزامات کی ایک

فہرست پر فیصلہ سنائے جانے سے پہلے بلکہ ٹرائیل سے بھی پہلے پوری دنیا کے سامنے سزا دی گئی ہے اور اس کی عزت و احترام کے تمام تمغے اتار کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے گئے ہیں۔

عرصہ ہوا کہ ایک افیمی کا لطیفہ سنا تھا۔ کہتے ہیں کہ افیم کھانے والوں کو اکثر قبض کی شکایت رہتی ہے۔ وہ افیمی بھی قبض کا مریض تھا، جبکہ اس کے لوٹے میں سوراخ تھا۔ جب قضائے حاجت کے لیے بیٹھتا تو اس کے فارغ ہونے سے پہلے لوٹا پانی سے فارغ ہو جایا کرتا تھا۔ وہ تنگ آ گیا کہ جب فارغ ہو کر استنجا کے لیے پانی کی ضرورت پڑتی ہیں تو لوٹا خالی ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک دن اس نے اس کا یہ حل نکالا کہ قضائے حاجت کے لیے بیٹھتے ہی پہلے استنجا کر لیا اور لوٹے سے مخاطب ہو کر بولا کہ لے میں نے اپنا یہ کام پہلے ہی کر لیا ہے، اب تجھ سے جو ہو سکتا کر لے۔ ہمارے مہربانوں نے بھی شاید یہی سوچا ہے کہ الزامات کی انکوائری، جرم کے ثبوت اور سزا کے تعین کا مرحلہ تو بہت طویل ہے، اس زلف کے سر ہونے تک کون جیتا ہے، اس لیے جو سزا دی جا سکتی ہے، وہ تو دے دی جائے، الزامات خود بخود ثابت ہوتے رہیں گے۔

میرے ذہن کی محدود سی اسکرین دو تین روز سے اس ''وسیع منظر'' کو اپنے تنگ دائرے میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے کہ ملک کی عدالت عظمیٰ کا چیف جسٹس ہے جو صدر کے کیمپ آفس اس کے روبرو بیٹھا اپنی صفائی پیش کر رہا ہے اور اس کے مطمئن نہ ہونے پر جب اپنے گھر پہنچا ہے تو وہ اپنے چیف جسٹس کے ''اسٹیٹس اور پروٹوکول'' سے محروم ہو چکا ہے، اس کے گھر پر پہرا لگ گیا ہے، اس کے خاندان کی ناکہ بندی ہو گئی ہے، ٹیلی فون کٹ گئے ہیں اور اس سے کسی کا ملنا ''شجر ممنوعہ'' قرار پا چکا ہے۔ ایمانداری کی بات ہے کہ میرے ذہن کی جھلملاتی سکرین اس منظر کو کیچ کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو رہی کہ چیف جسٹس کی رہائش گاہ ہے اور اس سے ملنے کے لیے ایک حاضر سروس جسٹس باہر کھڑا ہے، مگر درمیان میں ایک ادنیٰ درجے کا پولیس افسر حائل ہے، اس لیے کہ جسٹس کو اپنے چیف جسٹس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ شاید بیداری کیے عالم میں نہیں ہوں اور کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن جب ارد گرد چاروں طرف حرکت کرتی دنیا کو دیکھتا ہوں تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ خواب نہیں بیداری کا ماحول ہے جو کسی خوفناک خواب سے زیادہ

بھیانک روپ اختیار کر چکا ہے۔ سزا تو دی جا چکی اور پوری دنیا نے اس کا تماشا بھی دیکھ لیا۔ کیا ملک کی سب سے بڑی عدالت کے سب سے بڑے افسر کے لیے مزید کسی سزا کی گنجائش باقی رہ گئی ہے؟

تیسرا سوال جو ذہن کے نہاں خانے میں مسلسل کلبلائے جا رہا ہے، یہ ہے کہ یہ صورت حال اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے علاوہ کسی اور ملک میں پیش آتی تو کیا ہوتا؟ مغربی ممالک کو تو چھوڑیے کہ وہاں عدالت کا تصور ہی حکمرانوں کے اوسان خطا کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ کیا تیسری دنیا کے کسی ترقی پذیر، بلکہ غریب ممالک میں سے کسی ملک میں، جہاں ہماری طرح آمریتوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، کیا ملک کی عدالت عظمیٰ اور اس کے سربراہ کے ساتھ اس قسم کے طرزِ عمل کا سوچا جا سکتا ہے؟ سوالات تو اور بھی بہت سے ہیں جن پر سپریم جوڈیشل کونسل کا فیصلہ آنے کے بعد ہی کچھ عرض کیا جا سکے گا، مگر کوئی دانشور دوست سردست ان دو تین سوالات کے حوالے سے ہی کچھ رہنمائی فرما سکیں تو ان کا بے حد کرم ہوگا۔*

O

* روزنامہ پاکستان ۱۶/ مارچ ۲۰۰۷ء۔

نظریہ ضرورت اور ایڈ ہاک ازم کا خاتمہ ضروری ہے

چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان جناب جسٹس افتخار محمد چودھری کے معاملے نے اس قدر حیران و ششدر کر دیا کہ کئی بار قلم اٹھانے کے باوجود اپنے اس کالم کے لیے کچھ نہ لکھ سکا اور یہ زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ روزنامہ پاکستان لاہور میں اپنے ہفتہ وار کالم ''نوائے قلم'' کے لیے ایک مختصر سا مضمون لکھنے کے بعد قلم کو بریک سی لگ گئی اور بمشکل آج ذہن کو آمادہ کر پا رہا ہوں کہ اس کے بارے میں پھر قلم اٹھاؤں اور جو کچھ سامنے آ چکا ہے، اس کے بارے میں کچھ معروضات قارئین کی خدمت میں پیش کر دوں۔

جسٹس افتخار محمد چودھری نے جس انداز سے عدالت عظمیٰ کی سربراہی کے منصب پر اپنی کارکردگی کو آگے بڑھایا، اس کے بارے میں کئی بار دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ انہیں کسی آزمائش سے بچا لیں، مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے اور بہتری بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلوں میں ہوتی ہے کہ جس بات میں بظاہر شر ہی شر دکھائی دے رہا ہوتا ہے، اس میں کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو نکل آتا ہے۔

جسٹس افتخار محمد چودھری کے بہت سے فیصلوں سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ ہر فیصلہ اپنی آزادانہ مرضی اور رائے سے کرتے ہیں اور عوامی تاثر یہ بن چکا ہے کہ ان کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن کسی طرح بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے یہ فیصلہ کسی دباؤ یا وقتی مصلحت کی خاطر کیا ہے۔ پاکستان کی عدلیہ کے بارے میں ہر محبِّ وطن پاکستانی کی یہ آرزو چلی آ رہی ہے کہ وہ اس مقام پر فائز ہو کہ اس کے فیصلوں کی آزادانہ حیثیت کے بارے میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہ کیا جا سکے۔ ہمارے بہت سے جج صاحبان نے اس سلسلے میں شاندار روایات قائم کی ہیں جو عدلیہ کی تاریخ

میں ہمیشہ سنگ میل رہیں گی اور بہت سے جسٹس صاحبان نے یہ کیا کہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ عدلیہ کے لیے باہر سے درآمد کیے گئے سسٹم کے ساتھ نہیں چل سکیں گے تو انہوں نے خاموشی کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کر لی اور اس کام کے لیے خود کو پیش نہیں کیا، لیکن اس کے باوجود یہ صورت حال بھی قوم کے سامنے ہے کہ جب بھی کوئی طالع آزما جبر اور قوت کے بل پر آگے بڑھا ہے اور اس نے دستور و جمہوریت کی بساط لپیٹ کر قوم کے وسیع تر مفاد کو اپنے اختیار و جبر کے ساتھ وابستہ کر لیا تو اسے ہماری محترم عدلیہ سے اس جواز کا سرٹیفکیٹ لینے میں کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آئی اور ''نظریہ ضرورت'' کے تقاضے اس قدر وسعت اختیار کرتے گئے ہیں کہ دستور و جمہوریت کا معیار و تصور بھی اس کے سانچے میں ڈھلتا چلا گیا ہے اور آج قومی زندگی کا ہر شعبہ

ککرتے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

کا منظر پیش کر رہا ہے جس کا اردو میں ترجمہ کچھ اس طرح ہے کہ جب آپ انگور کے بیلوں کو پھیلانے کے لیے کیکر کے درخت پر چڑھا دیں گے تو کوئی گچھا بھی زخمی ہونے سے محفوظ نہیں رہے گا۔ آج ہماری پوری کی پوری قومی زندگی نظریہ ضرورت اور ایڈہاک ازم کے کیکر پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کا ہر گچھا زخموں سے چور کراہ رہا ہے۔

پاکستان کے بیوروکریٹ آمر غلام محمد کو دستور ساز اسمبلی توڑ دینے پر ہماری فیڈرل کورٹ نے سند جواز فراہم کی تو یہ سند جواز ہمیشہ کے لیے روایت بن گئی اور اس کے بعد اب تک جس آمر نے بھی دستوری عمل اور دستوری اداروں کو کراس کرنے کے لیے یہ سند مانگی ہے، اسے نظریہ ضرورت کے تحت کسی دقت کے بغیر ملتی چلی گئی ہے۔ اگر آج کے عدالتی بحران کے اسباب وعوامل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو اس کا شجرۂ نسب جسٹس محمد منیر کے اس فیصلے سے جا ملے گا جس نے نہ صرف عدلیہ اور مقنّنہ جیسے دو بڑے قومی اداروں کی دیواروں کے نیچے ڈائنا میٹ فٹ کر دیا بلکہ ایک اور ادارے کو درمیان میں گھس آنے کا راستہ بھی دکھایا جس کا ان اداروں کے ساتھ کوئی عملی واسطہ نہ تھا لیکن اگر کسی کو راستہ نظر آتا ہو بلکہ خود گھر میں گھس آنے کا راستہ دکھانے والے بھی موجود ہوں اور آنے والے کے پاس طاقت وقوت بھی ہو تو آنے والے کو کون روک سکتا ہے؟ ہمارے ساتھ بھی یہی

ہوا ہے اور ہم اس کے زخم چاٹنے اور مزید زخموں کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔

پاکستان کا قیام اسلام اور جمہوریت کے عنوان سے وجود میں آیا تھا جس کے لیے یہ اصول پیش کیا گیا کہ پاکستان میں حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کی ہوگی جو قرآن و سنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے نظام حکومت چلائیں گے۔ اس اصول پر ملک کے تمام طبقوں نے اتفاق کیا اور سیاسی و دینی جماعتیں بھی اس کے لیے شانہ بشانہ ہوگئیں لیکن جب بھی ملک میں اسلام یا جمہوریت کی بالادستی کے تعین کے لیے فیصلہ کن وقت آیا، ایڈہاک ازم اور نظریہ ضرورت کی ریڈ لائن نے راستہ روک دیا۔ ہمارے نزدیک دستور ساز اسمبلی توڑنے کے لیے نظریہ ضرورت کے تحت جسٹس محمد منیر کی طرف سے سند جواز فراہم کیا جانا اور دستور پاکستان کی باقی دفعات پر قرارداد مقاصد کی برتری کو تسلیم کرنے سے جسٹس نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں عدالت عظمیٰ کا انکار، دونوں ایک ہی طرح کے فیصلے ہیں۔ ایک نے جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار دیا اور دوسرے فیصلے نے ملک کے دستوری و قانونی معاملات پر اسلامی اصولوں کی عملی بالادستی کو بریک لگا دی اور ہم کولہو کے بیل کی طرح ایک آمر سے نجات حاصل کرنے اور دوسرے کا انتظار کرنے کے ایک ہی دائرے میں چکر کاٹتے چلے جا رہے ہیں۔

اس پس منظر میں جسٹس افتخار محمد چودھری کے فیصلوں نے کچھ ڈھارس بندھائی اور امید کی ایک کرن نظر آنے لگی کہ قومی زندگی کے گرد ایڈہاک ازم اور نظریہ ضرورت کی ریڈ لائنوں کا حصار شاید مدھم پڑنے لگا ہے۔ پاکستان اسٹیل ملز کے بارے میں ان کے فیصلے نے مستقبل کے بارے میں امید کے کئی چراغ روشن کر دیے اور ملک کے عام شہریوں کی مشکلات اور حقوق کے حوالہ سے ان کے ازخود نوٹس لینے کی پالیسی نے عوام کے اس احساس کو زندہ کیا کہ ہمارے عدالتی سسٹم میں ان کی دادرسی کے امکانات بھی موجود ہیں۔

جہاں تک جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف دائر کیے گئے ریفرنس اور اس میں الزامات کی فہرست کا تعلق ہے، یہ معاملہ سپریم جوڈیشل کونسل کے سپرد ہے اور وہی اس کے بارے میں فیصلہ

کرنے کا حق رکھتی ہے۔ حکومت کے پاس اگر اپنے چیف جسٹس کے خلاف شکایات اور الزامات موجود ہیں تو انہیں سپریم جوڈیشل کونسل تک لے جانا حکومت کا حق ہے اور جسٹس افتخار محمد چودھری خود کو ان الزامات سے بری الذمہ سمجھتے ہیں تو کونسل میں اپنا دفاع کرنا اور اس بات کو غلط ثابت کرنا ان کا حق ہے۔ یہ بات اگر اسی دائرے میں آگے بڑھتی تو کسی شخص کو شکایت کا کوئی حق حاصل نہیں تھا لیکن انتظامی اور حکومتی سطح پر اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے اور ملک کے عوام نے اس کے جو مناظر میڈیا کے ذریعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، وہ اس قدر مکروہ اور بھونڈے ہیں کہ ہر شریف شہری چیخ اٹھا ہے۔ اس نے ملک بھر کی وکلا برادری کو سڑکوں پر لا کھڑا کیا ہے اور ملک کی دینی و سیاسی جماعتیں بھی اس میں ان کی ہم آواز ہیں۔ ہمارے خیال میں اس معاملہ کا سب سے زیادہ روشن پہلو یہی ہے کہ عدلیہ کی آزادی، بالادستی اور وقار و احترام کے احساس نے دلوں میں کروٹ لی ہے اور یہ جذبہ بیدار ہو رہا ہے کہ قومی اداروں میں سے کسی ایک ادارے کو تو اس کے جائز مقام پر رکھا جائے، امید کی کسی ایک کرن کو تو باقی رہنے دیا جائے اور عدل و انصاف کے کسی ایک معیار کو تو مزید نیچے گرنے سے روک دیا جائے۔

ضروری نہیں کہ ہمیں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی ہر بات سے اتفاق ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم وکلا برادری کے تمام مطالبات سے متفق ہوں، لیکن جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے متعدد فیصلوں اور پھر مستعفی ہونے سے انکار کے ذریعے ایک باوقار اور باکردار جج کا جو تصور زندہ کیا ہے اور ملک بھر کی قانون دان برادری جس طرح ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی ہے، ہم اس پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انہیں عدلیہ کی بالادستی اور احترام کے تحفظ کی اس جدوجہد میں کامیابی سے ہمکنار کریں، آمین یا رب العالمین۔ باقی رہیں ہماری شکایات تو ان کا سلسلہ بھی چلتا رہے گا اور ان کے اظہار میں ان شاء اللہ تعالیٰ ہم کوئی جائز موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔*

O

---

* روزنامہ پاکستان، ۲۶/مارچ ۲۰۰۷ء۔

عدالتی بحران اور وکلا برادری کی جدوجہد

سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس محترم جناب جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر ہونے کے بعد سے ملک میں عدالتی بحران کی جو کیفیت پیدا ہو گئی ہے، اس سے ہر محبِّ وطن شہری پریشان اور مضطرب ہے اور عالمی سطح پر بھی وطن عزیز کے لیے جگ ہنسائی کی افسوس ناک صورت حال سامنے آئی ہے۔ جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف پیش کی جانے والی شکایات کو اگر نارمل طریقے سے سپریم جوڈیشل کونسل میں لایا جاتا اور اس کے ساتھ انھیں دستور کے مطابق جبری رخصت پر بھی بھیج دیا جاتا تو یہ ایک معمولی کی کارروائی سمجھی جاتی اور بعض حلقوں کے تحفظات کے باوجود بحران کا یہ منظر نمودار نہ ہوتا، لیکن اس کارروائی کا آغاز جس طریقے سے ہوا اور وہ جس قسم کے مراحل سے گزر کر آگے بڑھی، اس نے شکوک وشبہات اور اعتراضات و خدشات کا بازار گرم کر دیا جس سے ملک کے قانون دان طبقے کا مضطرب ہو کر سڑکوں پر آنا تو ایک فطری امر تھا ہی، دیگر قومی حلقوں نے بھی اس کی سنگینی کو محسوس کیا اور بہت سے سیاسی و دینی حلقے وکلا برادری کے ساتھ ہم آواز ہو گئے ہیں۔

جو کچھ ہوا اور جس طریقے سے ہوا، وہ سب کے سامنے ہے اور اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ بہت ہی غلط انداز سے ہوا اور اس پر ملک بھر میں جس اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیا جا رہا ہے، وہ نہ صرف جائز اور روا ہے بلکہ ہمارے خیال میں اصل ضرورت سے بہت کم ہے، اس لیے کہ عدلیہ، ریاست کا ایک ایسا محترم ستون ہے جس کا احترام ہر حال میں قائم رہنا ناگزیر ہے۔ ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں قومی اداروں کو وہ

مقام اور حیثیت حاصل نہیں ہے جو ان کا جائز حق ہے اور جو قومی زندگی میں اعتدال وتوازن، ملکی سلامیت، قومی وحدت اور ملی تشخص کے لیے ضروری ہے۔ عدلیہ کا مقام ان سب میں بالا ہے، اس لیے کہ دیگر قومی شعبوں اور اداروں میں توازن قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی بنیادی طور پر اسی کے پاس ہے، اس لیے اگر عدلیہ ہی خدانخواستہ بے وقار ہو جائے اور اس کی شخصیات کا احترام معروف حوالوں سے باقی نہ رہے تو دیگر قومی اداروں کے جائز مقام کے تحفظ کا اعتماد بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

جہاں تک چیف جسٹس کے خلاف شکایات اور الزامات کا تعلق ہے، یہ حکومت کا حق ہے کہ وہ ان الزامات کو سپریم جوڈیشل کونسل کے سامنے لائے اور جسٹس چودھری کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود کو ان الزامات سے بری ثابت کریں، ورنہ اس کے دستوری اور قانونی نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔ ہم ان الزامات اور ان کے حوالے سے سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کیونکہ اس کے بارے میں کونسل ہی فیصلے کی مجاز ہے، لیکن اس سے ہٹ کر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے ساتھ حکومتی سطح پر جو سلوک روا رکھا گیا ہے، اس پر وکلا برادری اور قومی حلقوں کے احتجاج میں ہم پورے طور پر شریک ہیں اور حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ عوامی جذبات اور قانون دان حلقوں کے احساسات کی پاسداری کرتے ہوئے عدلیہ اور اس سے متعلقہ شخصیات کے وقار کی بحالی کے لیے ضروری اقدامات بروئے کار لائے اور وکلا کے مطالبات کو منظور کرے۔

اس کے ساتھ ہی ہم اس معاملے کے دو پہلوؤں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک یہ کہ عدلیہ کے تمام تر احترام اور اس کی ہر ممکن پاسداری کو ناگزیر قرار دینے کے باوجود موجودہ افسوس ناک صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو اس کے اسباب وعوامل میں خود عدلیہ کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دستور کی بالادستی اور دستوری اداروں کے احترام کو اب تک جس اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا ہے اور جس کا تسلسل بدستور موجود ہے، اس سب کچھ نے ہمارے خیال میں جسٹس محمد منیر مرحوم کے اس فیصلے کی کوکھ سے جنم لیا ہے جو صرف گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کے کام نہیں آیا تھا، بلکہ اس کے بعد بھی ہر آمر اور طالع آزما کی مہم جوئی کو دستوری جواز فراہم کرنے کا باعث بنتا چلا آ رہا ہے۔ اگر جسٹس محمد منیر مرحوم یہ متنازعہ فیصلہ نہ دیتے اور ان کے بعد اسی فیصلے کے

تسلسل کو ''نظریہ ضرورت'' کے عنوان کے تحت ہر دور میں قائم نہ رکھا جاتا تو آج خود عدالت عظمیٰ کو اس افسوس ناک بحران سے دوچار نہ ہونا پڑتا اور جو کچھ ہوا ہے، اس کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا۔ اس لیے ہم بصد ادب واحترام قانون دان برادری کے دونوں حصوں یعنی جج صاحبان اور وکلا سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی موجودہ جدوجہد بالکل حق اور درست ہے، لیکن اس کے موثر اور نتیجہ خیز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ معروضی صورت حال اور مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے حقیقی اسباب اور عوامل کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور ان کے تدارک کے لیے بھی کوئی ٹھوس صورت اختیار کی جائے۔

دوسرے نمبر پر ہم اس امر کے بارے میں اپنے تحفظات کو ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں کہ ملک کے نئے قائم مقام چیف جسٹس محترم رانا بھگوان داس بنے ہیں اور موجودہ عدالتی بحران کے حل میں ان کے کردار کو اساسی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ہم ایک معروف قانون دان، اچھی شہرت رکھنے والے منصف اور صاحب کردار شخصیت کے طور پر ان کا احترام کرتے ہیں اور ان کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انھیں اس بحران میں ملک وقوم کے مفاد میں بہتر فیصلہ کرنے اور کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین، لیکن ملک کے جو دینی اور قانونی حلقے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے چیف جسٹس کے منصب پر ایک غیر مسلم جج کے فائز ہونے کے اصولی جواز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، ہم ان کے شک وشبہ کو بھی بے جواز نہیں سمجھتے۔ یہ درست ہے کہ ملک کے دستور میں کسی غیر مسلم جج کے چیف جسٹس بننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، یہ بات بھی بالکل بجا ہے کہ جسٹس رانا بھگوان داس دستوری اور قانونی طور پر سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بننے کا پورا استحقاق رکھتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ اس سے قبل جسٹس اے آر کارنیلیس غیر مسلم ہونے کے باوجود سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں، بلکہ ہم تو ان کے اس اعزاز وافتخار کے بھی پوری طرح معترف ہیں کہ انھوں نے ایک باکردار اور دیانت دار جج کے طور پر عدلیہ کے وقار میں اضافہ کیا اور غیر مسلم ہوتے ہوئے قومی اور بین الاقوامی حلقوں میں اسلامی قانون اور اسلامی نظام عدالت کا مسلسل دفاع اور وکالت کر کے ملک کے دینی حلقوں کے دلوں میں بھی اپنے لیے جگہ بنائی، لیکن اس سب کچھ کے باوجود اصولی طور پر کسی غیر مسلم کا ملک کی عدالت عظمیٰ کا سربراہ بننا بہر حال محل نظر ہے اور معاملہ

کے اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اصولی اعتراض اور بھی زیادہ قابل توجہ ہو جاتا ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کا چیف جسٹس عدالت عظمیٰ کے اس شریعت اپیلٹ بنچ کا بھی سربراہ ہوتا ہے جو وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرتا ہے اور جسے اسلامی احکام وقوانین کی بنیاد پر فیصلے کرنا ہوتے ہیں۔ اس صورت میں جہاں قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کا اختیار ایک غیر مسلم جج کے ہاتھ میں دے دینا شرعی اصولوں کے مطابق درست نظر نہیں آتا، وہاں ہمارے خیال میں یہ اس جج کے ساتھ بھی زیادتی ہے کہ اسے اس کے ایمان وعقیدہ کے خلاف کسی دوسرے مذہب کے مطابق، جس پر وہ یقین نہیں رکھتا، فیصلے کرنے کا پابند بنایا جائے۔

ہماری معلومات کے مطابق برطانیہ کا بادشاہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کیتھولک عیسائی نہ ہو، کیونکہ وہ ملک کا بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ چرچ آف انگلینڈ کا بھی سربراہ ہوتا ہے اور چرچ آف انگلینڈ کیتھولک نہیں ہے، اس لیے اس کا سربراہ کیتھولک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بادشاہت کے قواعد وضوابط میں یہ بات باقاعدہ طور پر شامل ہے کہ چونکہ برطانیہ کا بادشاہ چرچ کا بھی سربراہ ہوتا ہے، اس لیے اس کا تعلق کیتھولک فرقہ سے نہیں ہوگا۔ اگر اس نزاکت کا برطانیہ کے نظام میں لحاظ رکھا گیا ہے اور وہاں اس پابندی کا اہتمام ضروری سمجھا گیا ہے تو ہمارے ہاں بھی اس اصولی موقف کے احترام میں کوئی حجاب محسوس نہیں کیا جانا چاہیے، اس لیے ہم ملک کی قانون دان برادری اور دستوری حلقوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس مسئلے کو ابہام میں رہنے دینے کے بجائے اس کا کوئی حل ضرور نکالیں گے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان اور اس کی عدالت عظمیٰ کے اسلامی تشخص کو اس حوالے سے شکوک وشبہات کے دائرے سے نکالیں گے۔

ان تحفظات کے اظہار کے ساتھ ہم عدلیہ کے وقار اور بالادستی کے تحفظ کے لیے وکلا برادری کی جدوجہد اور مطالبات کی حمایت کرتے ہیں، ان کے ساتھ بھرپور یک جہتی اور ہم آہنگی کا اظہار کرتے ہیں اور دستور کی بالادستی، عدلیہ کے وقار واحترام اور اصول وقانون کی حکمرانی کی اس جدوجہد کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں، آمین یا رب العالمین۔ *

* ماہنامہ الشریعہ، اپریل ۲۰۰۷ء۔

جسٹس افتخار محمد چودھری کا تاریخی خطاب

لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے اجتماع سے چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس افتخار محمد چودھری کا خطاب میں نے لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا عیسیٰ منصوری کے گھر بیٹھ کر سنا ہے۔ مجھے ۵رمئی کو لاہور سے لندن کے لیے سفر کرنا تھا۔ اسی روز جسٹس افتخار محمد چودھری صاحب کے لاہور ہائی کورٹ بار سے خطاب کی خبر اخبارات میں پڑھی تو دو حوالوں سے تشویش ہوئی۔ ایک اس حوالہ سے کہ جب وہ گوجرانوالہ سے گزریں گے تو میں ان کے استقبال میں شریک نہیں ہوسکوں گا اور دوسری یہ کہ اس روز لاہور کی کیا صورت حال ہوگی اور کیا میں ایئرپورٹ پہنچ سکوں گا؟ بہت سے دوستوں نے مشورہ دیا کہ ۴رمئی کو جمعہ پڑھا کر لاہور چلا جاؤں اور ہفتہ کے روز لاہور کے سفر کا رسک نہ لوں۔ میں نے بھی ایک بار ارادہ کرلیا، مگر پھر خیال آیا کہ چیف جسٹس نے صبح ساڑھے سات بجے اسلام آباد سے روانہ ہونا ہے اور مجھے سات بجے تک ایئرپورٹ پہنچنا ہے، کیونکہ دس بجے میری ہیتھرو کے لیے پی آئی اے کی پرواز ہے، اس لیے شاید اتنی صبح پولیس اپنی ''روایتی کارروائیاں'' شروع نہ کرے۔ اسی تذبذب کی کیفیت میں مغرب کے بعد کسی کام کے لیے لاہوری دروازے تک گیا تو ہمارے پڑوسی تھانہ کوتوالی کے ایک آفیسر راستہ میں مل گئے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ یار! کل کس وقت آپ لوگوں نے اپنے ''کام کاج'' کا آغاز کرنا ہے، اس لیے کہ مجھے صبح ایئرپورٹ جانا ہے۔ انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ صبح سویرے نکل جائیں، اس لیے کہ بعد میں حالات شاید ٹھیک نہ رہیں۔ مذکورہ پولیس آفیسر سے میری بات اتفاقاً راہ چلتے ہوگئی تھی،

لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید میں لاہور جانے کے لیے تھانہ والوں سے این او سی لے رہا ہوں۔

بہر حال میں صبح نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی روانہ ہو کر سات بجے سے پہلے اطمینان کے ساتھ لاہور ایئر پورٹ پہنچ گیا اور جب پی آئی اے کا طیارہ سوا دس بجے لاہور سے روانہ ہو کر کم و بیش سوا آٹھ گھنٹے کی پرواز کے بعد لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر اترا تو وہاں کے وقت کے مطابق دن کے اڑھائی بج رہے تھے۔ اس بار خلاف معمول ایئر پورٹ سے باہر آنے میں خاصی دیر لگ گئی۔ رش بہت زیادہ تھا، امیگریشن کا عملہ کم تھا اور رفتار بہت سست تھی۔ اس سے قبل ہیتھرو ایئر پورٹ پر ایسا تجربہ کبھی نہیں ہوا، جبکہ میں کم و بیش بائیس سال سے مسلسل لندن آ رہا ہوں۔ ایئر پورٹ سے باہر نکل کر ساؤتھ آل کی ابوبکر مسجد میں پہنچا تو ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔ جلدی جلدی ظہر کی نماز ادا کی کہ اس کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ اتنے میں مولانا عیسیٰ منصوری کا فون آ گیا کہ بھئی کہاں پہنچے ہو؟ ٹی وی پر آپ کے چیف جسٹس کا جگہ جگہ استقبال مسلسل دکھایا جا رہا ہے اور اس وقت وہ گوجرانوالہ میں ہیں۔ انہوں نے ایک دوست کو فون کیا کہ وہ مجھے جتنی جلدی ہو سکے، ان کے گھر پہنچائیں تاکہ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر یہ مناظر دیکھ سکوں۔ ساؤتھ آل سے وائٹ چیپل میں مولانا منصوری کے گھر تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا، لیکن جسٹس افتخار محمد چودھری ابھی گوجرانوالہ ہی میں تھے اور مولانا منصوری سارے کام کاج چھوڑ کر ٹی وی کے سامنے براجمان تھے۔ وہ ساتھ ساتھ اپنے مخصوص انداز میں کمنٹری بھی کرتے جا رہے تھے۔ مسلسل سفر کی تھکاوٹ کے باوجود میں ان کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھا رہا اور جسٹس افتخار محمد چودھری کے والہانہ استقبال کا اسکرین پر مختلف چینلوں کے حوالے سے مشاہدہ کرتا رہا۔ البتہ جب چیف جسٹس کا قافلہ کامونکی سے گزر گیا تو میں نے مولانا منصوری سے گزارش کی کہ اب مجھے کھانا کھلائیں اور اجازت دیں کہ میں نماز عشا ادا کر کے سو جاؤں، اس لیے کہ تھکاوٹ اور نیند کے غلبے کے باعث اب زیادہ بیٹھنا میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

میرا خیال تھا کہ سونے کے بعد فجر کے لیے اٹھوں گا تو سارے مراحل گزر چکے ہوں گے اور نیوز میں ان کی جھلکیاں دیکھ لوں گا، لیکن صبح بیدار ہوا تو منصوری صاحب نے، جورات بھر ٹی وی کے سامنے رہے، کہا کہ جسٹس صاحب ابھی لاہور پہنچے ہیں اور اجتماع سے خطاب کرنے والے ہیں،

اس لیے جلدی سے نماز پڑھ کر میرے کمرے میں آ جاؤ۔ اب پھر میں مولانا منصوری کے ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا اور زندہ دلان لاہور کی زندہ دلی کا نظارہ کر رہا تھا۔ یہ الیکٹرانک میڈیا کا کمال ہے کہ لاہور سے ہزاروں میل دور لندن میں بیٹھا اس جلسے کی کارروائی یوں دیکھ اور سن رہا تھا جیسے میں خود اس میں موجود ہوں اور اس میں حصہ لے رہا ہوں۔ میں نے لاہور ہائی کورٹ بار کے صدر جناب احسن بھون اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے وکیل چودھری اعتزاز احسن کے خطابات لفظ بہ لفظ سنے۔ انہوں نے جو کچھ کہا، وہ صرف ان کے اور وکلا برادری کے جذبات کی ترجمانی نہیں تھی بلکہ وہ پوری قوم کے اجتماعی احساسات کی عکاسی کر رہے تھے۔ خصوصی طور پر چودھری اعتزاز احسن کے مختصر خطاب سے یہ محسوس ہوا کہ وہ بطور خاص میرے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ میں وکیل نہیں ہوں، اس موقع پر لاہور میں ہوتا تو بھی میرے لیے اس میں شرکت کا کوئی موقع نہیں تھا، لیکن چودھری اعتزاز احسن کا خطاب سنتے ہوئے میرے دل میں یہ احساس ابھر رہا تھا کہ اگر مجھے اس اجتماع کے سامنے اظہار خیال کا موقع ملتا تو میں بھی ایک ''مولوی'' کی حیثیت سے وہی کچھ کہتا جو ''وکیل'' کی حیثیت سے چودھری اعتزاز احسن نے کہا ہے، چنانچہ میں دل ہی دل میں اس خطاب پر چودھری اعتزاز احسن کا شکریہ ادا کرتا رہا۔

آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کی بحالی کی اس جدوجہد میں جسٹس افتخار محمد چودھری اپنی منصبی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قومی تقاضوں کی تکمیل کی طرف جس حوصلے اور تدبر کے ساتھ پیش قدمی کر رہے ہیں اور جس طرف ملک بھر کی وکلا برادری، بنچ اور بار کے دونوں فورموں سے ان کا ساتھ دے رہی ہے، وہ میرے جیسے پرانے سیاسی کارکنوں کے لیے تو ایک خوبصورت خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا کرے کہ اس کی عملی تعبیر بھی جلد دیکھنے کو مل جائے، آمین یا رب العالمین۔ چیف جسٹس جناب افتخار محمد چودھری نے اپنے اس تاریخی خطاب میں انسانی حقوق کے حوالے سے سپریم کورٹ کے کردار کو موضوع گفتگو بنایا۔ چونکہ یہ میرا دل پسند موضوع ہے، اس لیے ظاہر ہے پوری توجہ سے سنا۔ انہوں نے اپنے چیف جسٹس کا منصب سنبھالنے کے بعد اس سلسلے میں عدالت عظمیٰ کی جس عملی پیش رفت کا ذکر کیا، وہ ہم سب کے سامنے ہے اور پوری قوم اس کی معترف اور شکر

گزار ہے، لیکن میرے لیے چیف جسٹس کے خطاب کا جو حصہ سب سے زیادہ دلچسپی، اطمینان اور خوشی کا باعث ہوا، وہ ''قراردادِ مقاصد'' کے حوالے سے بنیادی انسانی حقوق کا تذکرہ اور ان کی تشریح ہے۔ گویا انہوں نے اس ''قومی کمٹمنٹ'' کا اعادہ کیا ہے کہ بنیادی انسانی حقوق کی تعبیر و تشریح میں اسلام اور قرآن و سنت کو بنیاد کا درجہ حاصل ہے اور میرے جیسے ''خالص مولوی'' کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کون سی ہو سکتی ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک چودھری اعتزاز احسن کے خطاب میں بنچ اور بار کو مولوی تمیز الدین مرحوم کیس سے ظفر علی شاہ کیس تک کی آئینی پٹیشنوں کی یاددہانی اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے تاریخی خطاب میں بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے قرآن و سنت کا ایک بنیاد کے طور پر تذکرہ اس ساری تقریب کا ماحصل ہے، کیونکہ یہی دو بنیادیں ہیں جن کے عملی احترام کا اہتمام ہو جائے تو وطنِ خداداد پاکستان کے صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ ہونے کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

چیف جسٹس محترم نے اپنے خطاب میں ان طبقات کا ذکر کیا جو خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ یہ صرف چند طبقات کی بات نہیں، بلکہ کم و بیش ہر طبقے میں ہمارے ہاں ایسے افراد موجود رہتے ہیں جو قانون سے بالاتری کو اپنا استحقاق تصور کرتے ہیں اور قانون کی پابندی ان کے نزدیک اپنے مقام و مرتبے کو کم کرنے کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ جسٹس افتخار محمد چودھری نے ایسے طبقات اور افراد کو قانون کے دائرے میں لانے کے عزم کا اظہار کیا ہے جو بہت مبارک ہے۔ اگر وہ ایسا ماحول قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک بہت بڑا قومی معرکہ سر کرنے پر ان کا نام تاریخ کے ایک روشن باب کا عنوان بن جائے گا۔ آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کی اس مہم کی قیادت اگرچہ وکلا برادری کر رہی ہے، لیکن یہ صرف وکلا کی جدوجہد نہیں، بلکہ پوری قوم اس جدوجہد میں ان کے ساتھ شریک ہے جس کا عملی اظہار چیف جسٹس آف پاکستان کے اسلام آباد سے لاہور تک کے پچیس گھنٹے کے سفر میں بخوبی ہو گیا ہے اور امید قائم ہونے لگی ہے کہ پاکستانی قوم آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کی منزل حاصل کرنے میں ان شاء اللہ العزیز جلد کامیاب ہو جائے گی۔

خدا جانے ٹی وی چینلز پر لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی اس تقریب کے مناظر دیکھتے

ہوئے ''لال مسجد'' کیوں بار بار یاد آتی رہی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ لاہور ہائی کورٹ کا ماحول دیکھتے ہوئے لال مسجد کے مینار آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی ایک مورچہ ہے، جس کا عنوان اسلام کی بالا دستی ہے اور اس مورچے کے لیے صف بندی کرنے والوں کا عزم یہ ہے کہ معاشرے کو اسلامی احکام کی کھلے بندوں نافرمانی سے پاک کیا جائے اور اسلامی احکام و روایات کی عمل داری کو یقینی بنایا جائے۔ یہ مورچہ بھی کمزور نہیں ہے اور اگر اسے ڈھنگ سے منظّم کیا جاتا تو لاہور ہائی کورٹ کے اس مورچے سے کہیں زیادہ دل کش اور حوصلہ پرور مناظر دیکھنے میں آتے، لیکن حکمت و تدبر کے فقدان نے اسے قوم کے جذبات کی ترجمانی اور اظہار کا سب سے بڑا مورچہ نہیں بننے دیا جس کا کم از کم مجھے تو بہت افسوس اور صدمہ ہے۔ اگر ''لال مسجد'' کے دوست زیادہ ناراض نہ ہوں تو ان سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور ہائی کورٹ بار کے اس مورچے کی کامیاب پیش رفت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے ایک شخصیت یا ادارے کا مسئلہ بنائے رکھنے کی بجائے ملک بھر کی وکلا برادری کا مشترکہ مسئلہ بنایا، بنچ اور بار دونوں کو اعتماد میں لیا، ملک گیر مشاورت کا نظام قائم کیا، بڑوں کی سنیارٹی کا احترام کیا، جوش و جذبے کا تعلق حکمت و تدبر کے ساتھ قائم رکھا اور شخصی فیصلوں اور اقدامات کی بجائے اجتماعیت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جس کی وجہ سے وہ آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کی مہم کو قومی تحریک کی شکل دینے میں کامیاب نظر آرہے ہیں۔ اگر ''لال مسجد'' بھی اسی طرح حکمت و تدبر کا راستہ اختیار کرتی اور اسلامی قوانین و احکام کی عمل داری، منکرات و فواحش کے سدِ باب اور مساجد کے تحفظ کی مقدس مہم کو صحیح رخ پر آگے بڑھانے کی کوئی صورت پیدا کر لیتی تو یہ ملک و قوم کے بہتر مستقبل کے لیے ایک مفید اور موثر تحریک ثابت ہوتی، لیکن ابھی تو ایسا لگتا ہے کہ اس معاملے میں ''وکیل'' بازی جیت رہا ہے اور مولوی کو ابھی تک شخصی دائروں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔*

O

* روزنامہ پاکستان، ۸/مئی ۲۰۰۷ء۔

چیف جسٹس کی بحالی اور قوم کی توقعات

چیف جسٹس جناب جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کی خبر سن کر مجھے یوں لگا جیسے کوئی ڈاکٹر ایمرجنسی آپریشن روم کے دروازے سے باہر جھانک کر مریض کے رشتہ داروں کو یہ خوش خبری دے رہا ہے کہ مریض کی حالت خطرے سے باہر ہوگئی ہے اور اس نے اب سانس لینا شروع کر دیا ہے۔ اس فیصلے کے اعلان سے قبل پوری قوم سکتے کے عالم میں تھی اور کان اسلام آباد کی طرف لگے ہوئے تھے کہ وہاں سے کیا خبر آتی ہے؟ عدالت عظمیٰ کے فل کورٹ نے قوم کا رخ مایوسی سے امید کی طرف پھیر دیا ہے جس پر فل کورٹ کے تمام ارکان پوری قوم کی طرف سے مبارک باد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

اب سے ساٹھ برس قبل جب جنوبی ایشیا میں ''پاکستان'' کے نام سے ایک نیا ملک وجود میں آیا تو کچھ باتیں اس کے قیام کے ساتھ ہی قطعی طور پر طے ہوگئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اس ملک میں بادشاہت یا شخصی آمریت نہیں ہوگی بلکہ جمہوری اصولوں کے مطابق ملک کی حکومت وجود میں آیا کرے گی، یہ سیکولر اور لادین ریاست نہیں ہوگی بلکہ اسلامی تعلیمات اور قرآن وسنت کے احکام کے مطابق اس کا نظام چلایا جائے گا اور اس ملک میں کسی فرد یا طبقے کی رائے مسلط ہونے کے بجائے دستور اور قانون کی حکمرانی ہوگی۔ قوم خوش تھی کہ ہم نے ایک نئی منزل کی طرف سفر شروع کیا ہے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ہے جس میں نہ صرف ہمارے اعتقادات وجذبات کا لحاظ رکھا جائے گا بلکہ ہماری مرضی اور رائے کو بھی پورا احترام حاصل ہوگا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قوم کی یہ امیدیں دھندلاتی چلی گئیں۔ عوام کی حکمرانی کے بجائے حکمران طبقات وجود میں آ گئے اور دستور قانون کو اسٹیبلشمنٹ کی

آ کاس بیل نے ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ ملک کو دستور فراہم کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی اپنے کام میں مصروف تھی کہ طبقاتی کشمکش کی بھینٹ چڑھ گئی اور جب دستور ساز اسمبلی نے انصاف کے لیے عدالت عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی دادرسی کے بجائے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا گیا۔ فوجی طالع آزماؤں کی ہوس اقتدار کے حوالے سے عدالت عظمیٰ ہی کی طرف سے قوم کو ''نظریہ ضرورت'' کا تحفہ ملا جس کا مطلب رفتہ رفتہ یہ سمجھ میں آیا کہ قوم کی اجتماعی ضروریات کی باگ ڈور چند افراد یا طبقوں کے ہاتھ میں ہوگی جو کسی بھی وقت ان کا رخ کسی طرف بھی موڑ سکیں گے۔ تب سے قوم و ملک اور قوم کے اجتماعی مفادات و ضروریات چند طبقات کے ہاتھوں میں یرغمال ہیں اور قوم اپنے وطن عزیز میں دستور و قانون کی حکمرانی کے راستے تلاش کرتے کرتے تھک گئی ہے۔

۱۹۷۳ء کا دستور آیا تو امید کی ایک کرن روشن ہوئی کہ یہ پوری قوم کا متفقہ دستور ہے جس میں اسلام بھی ہے، جمہوریت بھی ہے، انسانی حقوق بھی ہیں اور قانون کی حکمرانی کی ضمانت بھی ہے مگر وہ بھی ''نظریہ ضرورت'' کی کرم فرمائی سے نہ بچا، کئی بار دم توڑتے ہوئے دوبارہ زندگی کی نعمت سے بہرہ ور ہوا مگر مسلسل کومے کی حالت میں ہے اور اب سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے کچھ امید ہونے لگی ہے کہ یہ جاں بلب مریض شاید ہوش میں آ کر باتیں کرنے لگے اور اپنا معمول کا کردار ادا کرنے کے لیے چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو جائے۔

جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے اوپر استعفے کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے جب ریفرنس میں عائد کیے جانے والے الزامات کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا تو پوری قوم جھوم اٹھی تھی کہ ''چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے'' کے ماحول میں کسی نے تو سر اٹھا کر چلنے کی بات کی، کوئی تو ایسا آیا جس نے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ یہ ادا قوم کو ایسی پسند آئی کہ چیف جسٹس کے ساتھ ہی سڑکوں پر نکل آئی اور اس وقت تک واپس جانے سے انکار کر دیا جب تک جسٹس افتخار محمد چودھری چیف جسٹس کے چیمبر میں واپس جا کر اپنے فرائض ادا کرنا شروع نہیں کر دیتے۔ اس قوم کا عجیب مزاج ہے کہ اسے سر نہ جھکانے والے ہی ہمیشہ پسند آئے ہیں۔ وہ جبر و ظلم کے مقابلے میں خود کچھ کر سکے یا نہیں، مگر سر اٹھا کر چلنے والوں پر اس نے ہمیشہ اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا ہے۔ اس کی تاریخ میں سر نہ جھکانے

والے ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جہانگیر بادشاہ کے دربار میں کوئی بھی سر جھکائے بغیر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑے بڑے کج کلاہوں کو اس کے دربار میں جانے کے لیے جھکتے ہوئے اپنی دستاریں سنبھالنا پڑتی تھیں، مگر ایک مرد درویش نے یہ رسم نبھانے سے انکار کر دیا اور بادشاہ سلامت کا سامنا کرتے ہوئے سر اٹھا کر چلنے کی روایت قائم کی تو تاریخ نے اس کا نام ہمیشہ کے لیے اپنے اوراق میں ''مجدد الف ثانی'' کے نام سے ایک مستقل باب کا عنوان بنا دیا۔ جہانگیر بادشاہ کے اس دربار میں ہزاروں لوگ سر جھکا کر داخل ہوئے ہوں گے اور ان میں سے بہت سے لوگ تو اسے اپنی سعادت سمجھتے ہوئے بار بار جھکے ہوں گے مگر تاریخ کو ان میں سے دو چار کے سوا کسی کا نام یاد نہیں، البتہ ایک مردِ فقیر نے جھکنے سے انکار کیا تو وہ آج بھی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہے اور اقبال بھی اسے ''گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے'' کے عنوان سے خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

تاریخ بتلاتی ہے کہ یہ شخصی انا کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ ان دونوں یعنی اپنے اپنے سامنے ہر کسی کو سر جھکانے پر مجبور کرنے والی اور اس کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرنے والی، دونوں شخصیتوں کی پشت پر فکر اور فلسفہ کارفرما تھا۔ جہانگیر اپنے باپ اکبر بادشاہ کے ''دینِ الٰہی'' کی نمائندگی کر رہا تھا اور اس خود ساختہ نظام و فلسفہ کی بالادستی اس کے تمام تر درباری پروٹوکول کا عنوان تھی، جبکہ مجدد الف ثانی کے ہاتھ میں اس دینِ محمدی کا پرچم تھا جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے ''دینِ الٰہی'' کا ڈھونگ رچایا گیا تھا، اس لیے یہ دو افراد کی کشمکش نہیں تھی بلکہ دو فلسفوں کی جنگ تھی اور دو عقیدتوں کا معرکہ تھا اور تاریخ ہی کا کہنا ہے کہ جب مجدد الف ثانی نے گردن جھکانے سے انکار کیا تو وہی اکبر کے دینِ الٰہی کے لیے ''ریٹرن پوائنٹ'' ثابت ہوا اور ایک مردِ فقیر کی گردن نہ جھکانے کی یہ روایت دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے بالآخر اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شکل اختیار کر گئی۔

مجھے ایک صحافی دوست نے گزشتہ روز چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا تو میں نے عرض کیا کہ ایک مدت کے بعد کوئی خوشی کی خبر سنی ہے۔ انھوں نے سوال کیا کہ کیا یہ کوئی ''پرسنیلٹی کلیش'' تو نہیں تھا جس پر پوری قوم بلاوجہ خوشیاں منا رہی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، مجھے ایسا نہیں لگتا، اس لیے کہ اگر خدانخواستہ ابتدا میں یہ کوئی ''پرسنیلٹی کلیش'' تھا بھی تو جس

انداز سے یہ آگے بڑھا ہے، جس جذبے کے ساتھ ملک بھر کی وکلا برادری اپنے چیف جسٹس کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے اور جس طرح والہانہ طور پر پوری قوم نے چیف جسٹس کے اس کردار کا خیر مقدم کیا ہے، اس کے بعد اب یہ سارا کچھ پوری قوم کی مشترکہ ملکیت میں چلا گیا ہے اور ''پبلک پراپرٹی'' بن گیا ہے، اسے اب کسی شخصی دائرے کی طرف واپس لے جانا ممکن ہی نہیں رہا۔

اس انٹرویو میں مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ لوگ لال مسجد اور جامعہ حفصہؓ کے معاملات کو اب سپریم کورٹ میں لے جانا پسند کریں گے؟ میں نے جواب دیا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، اس لیے کہ لال مسجد کا معاملہ پہلے سے سپریم کورٹ کی میز پر موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اپنے فرائض دوبارہ سنبھالتے ہی سب سے پہلے اس کا نوٹس لیں گے، چنانچہ آج صبح میں نے خبر پڑھ لی ہے کہ چیف جسٹس نے جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے معاملات کو ڈیل کرنے کے لیے تین رکنی فل بنچ مقرر کر دیا ہے۔

بہرحال اس پس منظر میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی صرف ان کی بحالی نہیں ہے بلکہ عدلیہ کی بالادستی کی بحالی ہے اور دستور و قانون کی حکمرانی کی بحالی ہے جس پر چیف جسٹس موصوف، ان کا بھرپور ساتھ دینے والی وکلا برادری اور ان کی حمایت کرنے والی دینی وسیاسی جماعتیں بلکہ پوری قوم مبارک بار کی مستحق ہے۔ اب قوم کی امیدوں کا رخ سپریم کورٹ کی طرف ہے اور عوام اپنے دکھوں، محرومیوں اور مجبوریوں کے مداوا کے لیے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور ان کی ٹیم کی طرف دیکھ رہے ہیں اور یہ سوال بھی ابھی موجود ہے کہ چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کیے جانے سے لے کر ان کی بحالی تک جو کچھ ہوا، وہ کسی ''پرسنیلٹی کلیش'' کا نتیجہ تھا یا دو فکروں اور فلسفوں کی کشمکش تھی۔ چیف جسٹس کے پاس ابھی بہت وقت ہے اور ان کی ٹیم بھی بہت اچھی نظر آ رہی ہے، اس لیے اس سوال کا جواب وہی دیں گے اور یہ بات بھی تاریخ کے ریکارڈ پر ہے کہ اسی عدالت عظمیٰ کے ایک سابق سربراہ سے کسی مسئلے کے بارے میں عوامی فورم پر سوال پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ: ''جج اپنے فیصلوں میں بولا کرتے ہیں۔'' *

---

* روزنامہ پاکستان، ۲۶ جولائی ۲۰۰۷ء۔

وکلا تحریک کے قائدین کی خدمت میں چند معروضات

چودھری اعتزاز احسن صاحب ہمارے ملک کے نامور وکلا اور معروف سیاست دانوں میں سے ہیں اور قومی حلقوں میں ان کا تعارف ایک شریف النفس، شائستہ اور دانش ور راہ نما کے طور پر ہوتا ہے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس جناب جسٹس افتخار محمد چودھری جب دستور کی بالادستی اور عدلیہ کے وقار کی بحالی کے لیے میدان میں آئے تو ان کے قریبی رفیق کار کے طور پر مسلسل ان کا ساتھ دے کر چودھری اعتزاز احسن نے اپنی عزت میں مزید اضافہ کیا اور اسی کے نتیجے میں انھیں سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کا صدر چن کر ملک بھر کے وکلا نے دستور کی بحالی اور عدلیہ کی بالادستی کے لیے اپنی تحریک کی قیادت سونپ دی ہے جو فی الواقع ایک بڑے اعزاز کی بات ہے اور ہم اس پر چودھری صاحب موصوف کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انھیں دستور پاکستان کی بحالی اور عدلیہ کی بالادستی کی ایک تحریک میں سرخ روئی اور کامیابی سے ہمکنار کریں، آمین یارب العالمین۔

وکلا اس تحریک کے لیے کئی ماہ سے میدان عمل میں ہیں اور عدالتوں کے بائیکاٹ، عوامی مظاہروں اور عام انتخابات کے بائیکاٹ کی صورت میں دستور کی بحالی اور پی سی او کے تحت حلف نہ اٹھانے والے محترم جج صاحبان کی ان کے دستوری مناصب پر واپسی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جس میں ملک کا ہر باشعور شہری ان کے ساتھ ہے۔ چودھری اعتزاز احسن ایمرجنسی اور پی سی او کے نفاذ کے بعد سے مسلسل زیرحراست ہیں اور انھیں اس بات سے روکنے کے لیے کوشش کی جا رہی ہے

کہ وہ وکلا کی اس تحریک کی عملاً قیادت کریں، چنانچہ بظاہر ایمرجنسی ختم ہو جانے کے باوجود ان کی حراست کا تسلسل جاری ہے مگر وہ اپنے عزم پر قائم نظر آتے ہیں جس کا اظہار انھوں نے عید الاضحیٰ کے موقع پر اپنی ''عارضی رہائی'' کے دوران یہ کہہ کر کیا ہے کہ ۸/جنوری کے انتخابات کے بعد قائم ہونے والی حکومت کو اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی بحالی کے لیے تین ہفتوں کا وقت دیا جائے گا اور اگر اس وقت تک چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور ان کے ساتھی ججوں کو بحال نہ کیا گیا تو حکومت کے خلاف تحریک کا آغاز کر دیا جائے گا۔

ہم چودھری اعتزاز احسن صاحب کے اس عزم اور اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دستور کی بالادستی اور عدلیہ کے محترم ججوں کی بحالی کے لیے وکلا کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ اسی حوالے سے ہم دو گزارشات وکلا کی اس تحریک کی قیادت، بالخصوص چودھری اعتزاز احسن صاحب کی خدمت میں پیش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک یہ کہ قوم کے دوسرے طبقات کو ساتھ لیے بغیر صرف وکلا کے فورم پر اس تحریک کو منظّم کرنے اور آگے بڑھانے کی حکمت عملی ہمارے نزدیک محل نظر ہے، اصولاً بھی کہ جب یہ قومی مسئلہ ہے تو اس کے لیے منظّم کی جانے والی تحریک میں قوم کے تمام طبقات کی نمائندگی نظر آنی چاہیے اور عملاً بھی کہ کسی ایک طبقے کی بنیاد پر چلائی جانے والی تحریک کی کامیابی کے امکانات ہمارے خیال میں زیادہ روشن دکھائی نہیں دیتے، اس لیے سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن اس تحریک کی قیادت اور کنٹرول بے شک اپنے ہاتھ میں رکھے لیکن اس میں ملک کے دینی وسیاسی حلقوں کی نمائندگی کا اہتمام ضرور کرے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ کے تمام تر احترام کے باوجود اس کے ساٹھ سالہ مجموعی کردار کے بارے میں ملک کے عوام اور مختلف طبقات کو جو شکایات ہیں اور ان کے جو تحفظات ہیں، تحریک کے اہداف طے کرتے وقت ان سب کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور اسی صورت میں اس تحریک کو پوری قوم کی حمایت حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً ملک کے جمہوری حلقوں کا شکوہ ہے کہ جسٹس محمد منیر مرحوم نے دستور ساز اسمبلی کے توڑے جانے کے غیر جمہوری عمل کو جواز کی جو سند بخشی تھی، اسے

اس کے بعد روایت ہی کا درجہ دے دیا گیا ہے اور اب تک ہر آمر کے دستور شکن اقدامات کو ’’عدالتی تحفظ‘‘ مل رہا ہے۔ یہ صورت حال ملک کے ہر شہری کے لیے پریشان کن اور باعث اضطراب ہے اور وکلا کی موجودہ دستوری جدوجہد بھی اسی کا فطری ردعمل ہے۔ اسی طرح ملک کے دینی حلقوں کو بھی شکایت ہے کہ ملک میں اسلامی نظام وقوانین کی عمل داری کے لیے، جسے قیام پاکستان کا اہم ترین مقصد ہونے کے ساتھ ساتھ دستور پاکستان کی بنیاد اور اس کی طرف سے فراہم کی گئی ضمانت کا درجہ حاصل ہے، عدالت عظمیٰ کا اب تک کا مجموعی رول حوصلہ افزائی کا نہیں ہے اور جس طرح جمہوری اقدار کی سربلندی کے خواہاں حلقوں کو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کی طرف سے اب تک وہ ’’ریلیف‘‘ نہیں ملا جو جمہوریت کی عمل داری کے لیے ضروری ہے، اسی طرح اسلامی اقدار کی بالادستی کے لیے بھی قوم اسی طرح عدالت عظمیٰ کی طرف سے دیے جانے والے ’’ریلیف‘‘ کا انتظار کر رہی ہے اور اس کا یہ انتظار اب رفتہ رفتہ حسرت میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔

اسلام اور جمہوریت دونوں ملک کی نظریاتی اساس ہیں۔ دستور پاکستان کی بنیاد بھی انھی دو اصولوں پر رکھی گئی ہے اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ یہ بات دستور میں ہمیشہ کے لیے طے کر دی گئی ہے کہ ملک میں حکومت کا حق عوام کے منتخب نمائندوں کو ہوگا اور پارلیمنٹ کو ہی قانون سازی کا اختیار حاصل ہوگا، لیکن وہ قرآن وسنت کے اصولوں کی پابند اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی ذمہ دار ہوگی۔ اس لیے جہاں جمہوری اقدار کی سربلندی کا اہتمام کرنا اعلیٰ عدالتوں کی ذمہ داری ہے، وہاں اسلامی اصولوں کی بالادستی کا خیال رکھنا بھی ان کے فرائض میں شامل ہے، لیکن اب تک کی معروضی صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ملک کے مجموعی عدالتی کردار میں اسلام اور جمہوریت دونوں سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔

ملک کے دینی حلقوں کا عمومی تاثر یہ ہے کہ ا۔ قرارداد مقاصد کی بالادستی کو تسلیم نہ کرنے کا عدالتی فیصلہ، ۲۔ سود کے خاتمہ کے لیے شریعت کورٹ کے فیصلے کا تعطل، اور ۳۔ صوبہ سرحد میں حسبہ ایکٹ کے نفاذ کو عدالتی طور پر روک دینے کا عمل اپنے نتائج وثمرات کے حوالے سے جسٹس محمد منیر مرحوم کے اس فیصلے سے مختلف نہیں ہے جسے کے ذریعے انھوں نے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے غیر

جمہوری اقدام کو ’’نظریہ ضرورت‘‘ کا شیلٹر مہیا کر دیا تھا، بلکہ ہماری معلومات کے مطابق اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی بحالی کی تحریک کے سلسلے میں مولانا فضل الرحمٰن کا گریز کا عمل بھی حسبہ ایکٹ کے بارے میں عدالت عظمیٰ کے اس فیصلے کے پس منظر میں ہے جس کا دکھ صرف مولانا فضل الرحمٰن کو نہیں ہے بلکہ ملک میں نفاذ اسلام کی خواہش رکھنے والا ہر شخص اس کی کسک اپنے دل میں محسوس کر رہا ہے اور اعلیٰ عدالتوں سے جسٹس محمد منیر مرحوم کے فیصلے کی طرح مذکورہ بالا فیصلوں کی تلافی کی بھی بجا طور پر توقع رکھتا ہے جس پر اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان اور ملک کے سینئر وکلا کو پوری سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینی چاہیے۔ ہم مولانا فضل الرحمٰن کے موجودہ سیاسی کردار اور پالیسیوں کا دفاع نہیں کر رہے اور بہت سے دیگر سیاسی حلقوں کی طرح ہم بھی ان کے حوالے سے تحفظات رکھتے ہیں، البتہ ’’حسبہ ایکٹ‘‘ کے بارے میں مولانا فضل الرحمٰن کے تحفظات کو ہم بے جا نہیں سمجھتے، اس لیے اس کا ذکر ان گزارشات میں ہم نے مناسب سمجھا ہے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ وکلا تحریک کی اعلیٰ قیادت اس کا ضرور جائزہ لے گی۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی قیادت، بالخصوص چودھری اعتزاز احسن صاحب کی طرف سے دستور کی بالادستی اور اعلیٰ عدالتوں کے معزول ججوں کی بحالی کے لیے تحریک کے اعلان کا ایک بار پھر خیر مقدم کرتے ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ دستور پاکستان اور اس کی دونوں بنیادوں یعنی اسلام اور جمہوریت کی بالادستی کی اس جدوجہد میں انھیں ہمارا ہر ممکن تعاون حاصل ہوگا۔*

O

---

* ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۲۰۰۸ء۔

اکابر علماے کرام کا مشترکہ اعلامیہ

ملک کے تیس سرکردہ علماے کرام نے، جن میں مختلف مکاتب فکر کے زعما شامل ہیں، اپنے مشترکہ اعلامیہ میں ملک کی عمومی صورت حال کا جو تجزیہ کیا ہے اور اس کے حل کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں، وہ پاکستان کے ہر محبّ وطن شہری کے دل کی آواز ہے۔ آپ ملک کے کسی بھی حصے میں کسی ایسی جگہ پر چلے جائیں جہاں عام لوگ مل بیٹھ کر تبادلہ خیالات کیا کرتے ہیں، آپ کو اسی قسم کی باتیں سننے کو ملیں گی اور خیالات کی یکسانی اور ہم آہنگی کا یہ منظر آپ کو ہر جگہ اور ہر سطح پر نظر آئے گا۔ اس وقت جب کہ حکومت کے اعلان کے مطابق عام انتخابات میں صرف اڑھائی ہفتے باقی رہ گئے ہیں اور بہت سی سیاسی پارٹیاں اس الیکشن میں حصہ لے رہی ہیں، وہ گہما گہمی اور عوامی دلچسپی کسی طرف دکھائی نہیں دیتی جو ہمارے ملک میں عام انتخابات کے موقع پر ہوا کرتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ عوام ان انتخابات سے کسی ایسی تبدیلی کے امکانات کی امید نہیں کر رہے جس میں ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کے روز افزوں مسائل ومشکلات میں بہتری کی کوئی شکل نظر آتی ہو اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ خود ان انتخابات کے بروقت انعقاد پر بھی بہت سے لوگوں کو یقین نہیں ہے اور بے یقینی اور تذبذب کی کچھ ایسی فضا پیدا ہوگئی ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے والے امیدوار بھی اپنی الیکشن مہم میں اعتماد اور یقین کا عنصر پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔

اس وقت عمومی منظر یہ ہے کہ ایک طرف وہ سیاسی جماعتیں ہیں جو انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ وہ جمہوریت کے تسلسل کو قائم رکھنے اور اس کی طرف پیش رفت کے لیے ایسا

کرنا ضروری سمجھتی ہیں۔ دوسری طرف اے پی ڈی ایم کے عنوان سے بعض سیاسی پارٹیاں الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر کے احتجاجی تحریک کو منظّم کرنے کے لیے جگہ جگہ جلسے کر رہی ہیں۔ تیسری طرف وکلا کی بحالی دستور کی تحریک مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ گزشتہ روز ملک بھر میں وکلا نے معزول چیف جسٹس جناب جسٹس افتخار محمد چودھری اور ان کے رفقا معزول جج صاحبان کے ساتھ یک جہتی اور ہم آہنگی کے اظہار کے لیے ''یوم افتخار'' منایا ہے جس کے تحت مختلف شہروں میں ریلیاں منعقد ہوئی ہیں، عدالتوں کا بائیکاٹ ہوا ہے اور احتجاجی جلسوں سے نامور وکلا نے خطاب کیا ہے۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا وہ خط بھی اس موقع پر سامنے آیا ہے جس میں انہوں نے صدر پرویز مشرف کے حالیہ دورۂ یورپ کے دوران ان کی طرف سے جج صاحبان کے خلاف لگائے گئے الزامات کا جواب دیا ہے اور اس موقف کا دوٹوک اظہار کیا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے معزز جج صاحبان کو معزول کرنے اور اس نوعیت کے دوسرے اقدامات ماورائے آئین اقدامات ہیں جن کا دستوری طور پر کوئی جواز نہیں ہے اور صدر پرویز مشرف جو کچھ کر رہے ہیں، اسے ایک آئینی صدر کے اقدامات کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ چوتھی جانب پاک فوج کے ریٹائرڈ جنرل صاحبان نے بھی اس موقع پر سامنے آنے کا فیصلہ کیا ہے اور ان کے اب تک دو اجلاس ہو چکے ہیں جن میں صدر پرویز مشرف سے اقتدار چھوڑنے کا مطالبہ کرتے ہوئے ریٹائرڈ جنرل صاحبان کی ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے جو جنرل پرویز مشرف کی صدارت سے دست برداری کو یقینی بنانے کی راہیں تلاش کرے گی مگر صدر پرویز مشرف اس سب کچھ کے باوجود بظاہر ابھی تک اپنے موقف اور پوزیشن پر ڈٹے ہوئے ہیں اور قوم کے مختلف طبقوں کی آواز پر توجہ دینے کی بجائے ان سے کمانڈو طرز پر نمٹنے کے لیے اقدامات کر رہے ہیں۔

اس پس منظر میں دینی حلقوں بالخصوص علمائے کرام کی جماعتوں کی اس طرح کی خاموشی کو سنجیدہ اور محبِّ وطن حلقوں میں محسوس کیا جا رہا تھا کہ گروہی اور جماعتی سیاست سے بالاتر ہو کر ملک کی رائے عامہ اور اجتماعی صورت حال کے دائرے میں ان کی طرف سے کوئی واضح بات سامنے نہیں آ رہی جبکہ عوام کا ایک بڑا حصہ پہلے کی طرح اب بھی راہنمائی کے لیے جید علمائے کرام اور دینی

جماعتوں کی طرف دیکھ رہا ہے اور ان سے اس سمت پیش رفت کی توقع رکھتا ہے۔ گزشتہ روز مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا اور بعض احباب سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی تو اس موقع پر بطور خاص اس بات کو محسوس کیا گیا کہ وکلا کی طرف سے دستور کی بحالی کی جو تحریک آگے بڑھ رہی ہے اور جس کے بارے میں یہ توقع پیدا ہو رہی ہے کہ الیکشن کے بعد یا ان کے خدانخواستہ منعقد نہ ہونے کی صورت میں ملک میں عوامی تحریک کا یہی فورم سب سے زیادہ موثر اور بھرپور ہوگا اور بہت سے سیاسی مبصرین کے خیال میں ملک کے دستوری اور سیاسی مستقبل کا زیادہ تر انحصار اور دارومدار اب اسی تحریک کی کامیابی پر ہوگا جو اعلیٰ عدالتوں کے معزول ججوں کی بحالی اور دستور کی بالادستی کے لیے وکلا کے پلیٹ فارم سے منظّم کی جارہی ہے، لیکن اس تحریک میں صرف جمہوری اقدار کی سربلندی کی بات کی جارہی ہے اور اسلام کا نام برائے وزن بیت بھی کسی جانب سے سامنے نہیں آرہا، حالانکہ پاکستان کے قیام کے مقاصد میں اسلام اور جمہوریت دونوں کو بنیاد بنایا گیا تھا، قراردادِ مقاصد میں اسلام اور جمہوریت کو پہلو بہ پہلو رکھا گیا ہے، تمام مکاتب فکر کے ۳۱ علمائے کرام کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات کی بنیاد بھی اسلام اور جمہوریت دونوں پر ہے، ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلام اور جمہوریت کو متوازن دکھایا گیا ہے اور اس طرح یہ پوری قوم کا متفقہ اور اجماعی فیصلہ ہے کہ پاکستان میں طرزِ حکومت جمہوری ہوگا لیکن اس کی نظریاتی بنیاد اسلام پر ہوگی جس کی عملی صورت دستور میں یہ طے کی گئی ہے کہ ملک میں حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے اور قانون سازی کی مجاز منتخب پارلیمنٹ ہوگی لیکن یہ دونوں ادارے ان پالیسیوں اور اپنے احکامات وقوانین میں قرآن وسنت کے پابند ہوں گے، مگر وکلا کی تحریک جس رخ پر آگے بڑھ رہی ہے اور اس کے لیے جو عزائم، بیانات اور خطابات سننے اور پڑھنے میں آرہے ہیں، ان میں اسلام اور جمہوریت کا یہ توازن نظر نہیں آتا اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ملک کے نظریاتی تشخص کو غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے پس منظر میں لے جانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وکلا کی تحریک میں ''سول سوسائٹی'' کے خوبصورت عنوان کے ساتھ وہ ''سیکولر لابیاں'' اور ''این جی اوز'' شریک ہوگئی ہیں جو ملک کے اسلامی تشخص کو تبدیل کرنے اور پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کی خواہاں ہیں لیکن اپنے اصل عنوان اور اہداف کو

سامنے لانے کا صلہ نہ پا کر وکلا کی بحالی دستور کی تحریک کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کر چکی ہیں، لیکن اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ خود دینی حلقے بالخصوص علمائے کرام دستور کی بحالی کی اس تحریک سے لاتعلق ہیں اور اس ملک گیر تحریک میں کسی جگہ بھی ان کی نمائندگی دکھائی نہیں دے رہی اور یہ ایک ایسا لمحہ فکریہ ہے جس پر علمائے کرام اور ان کی نمائندگی کرنے والی جماعتوں کو سنجیدگی سے توجہ دینا ہوگی۔

ان حالات میں ملک کے تیس اکابر علمائے کرام کی طرف سے جاری ہونے والا یہ ''مشترکہ اعلامیہ'' میرے جیسے نظریاتی کارکنوں کے لیے سخت گرم موسم میں ٹھنڈی ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے سے کم نہیں ہے اور میں اسے کراچی کے علمائے کرام کا ایک ''الہامی فیصلہ'' تصور کرتا ہوں جس میں (۱) ماورائے دستور تمام اقدامات کی منسوخی، (۲) دستور کے مطابق عدلیہ کی بحالی، (۳) بلوچستان، سوات اور وزیرستان وغیرہ میں فوجی آپریشن ختم کر کے مذاکرات کا راستہ اختیار کرنے، (۴) دہشت گردی کے خلاف جنگ کے عنوان سے اختیار کی گئی پالیسیوں کو مکمل طور پر ناکام قرار دے کر انہیں فی الفور ختم کرنے اور (۵) صدر پرویز مشرف سے اقتدار سینٹ کے چیئرمین کے سپرد کر دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

مجھے علمائے کرام کے اس مشترکہ اعلامیہ کا مسودہ اشاعت سے قبل ای میل کے ذریعے بھجوایا گیا اور میری رائے دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کی رائے معلوم کرنے کے لیے بھی کہا گیا، چنانچہ یہ مسودہ گکھڑ بھجوایا گیا اور حضرت والد محترم مدظلہ کو سنایا گیا جس پر انہوں نے اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے اسے جاری کرنے والوں میں اپنا نام شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس کے بعد یہ ''مشترکہ اعلامیہ'' اخبارات کے لیے جاری کر دیا گیا۔

میں ملک بھر کے دینی راہنماؤں، کارکنوں، علمائے کرام اور خطبا سے گزارش کروں گا کہ اس مشترکہ اعلامیہ کا بغور مطالعہ کریں اور اسے اپنے اپنے حلقہ میں وکلا، سیاسی رہنماؤں، کارکنوں، مختلف طبقات اور تنظیموں کے نمائندے، اخبار نویس دوستوں اور دیگر حضرات تک زیادہ سے زیادہ پہنچانے

کی کوشش کریں، اپنے خطبات جمعہ، جلسوں کے خطابات، عام دروس اور اخباری بیانات میں اس موقف اور اس اعلامیہ میں کیے گیے مطالبات کا بار بار اعادہ کریں اور اس قومی جدوجہد میں بھرپور حصہ ڈال کر اس عمومی تاثر کو اپنے عمل اور محنت کے ساتھ زائل کریں کہ ان اہم، نازک اور سنگین قومی مسائل میں ملک کے دینی حلقوں، بالخصوص علمائے کرام کو کوئی سنجیدہ دلچسپی نہیں ہے۔ خدا کرے کہ ہم اس نازک مرحلہ میں اپنے فرائض صحیح طریقہ سے سرانجام دینے میں کامیاب رہیں، آمین یارب العالمین۔

O

عدلیہ کی بحالی اور دستور و قانون کی بالادستی

سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر جناب اعتزاز احسن اور وکلا تحریک کے دیگر قائدین جسٹس (ر) طارق محمود اور جناب علی احمد کرد دوبارہ نظر بند کر دیے گئے ہیں۔ اس سے یہ بات پھر واضح ہوگئی ہے کہ صدر پرویز مشرف اور ان کی حکومت دستور کی بالادستی اور پی سی او کے تحت معزول کیے جانے والے معزز جج صاحبان کی بحالی کے بارے میں ملک بھر کے قانون دانوں اور رائے عامہ کی بات پر توجہ دینے کے لیے ابھی تک تیار نہیں، لیکن کیا اس طرح وکلا کی قیادت کو ان سے دور رکھ کر اس تحریک کو دبایا جا سکے گا؟ ہمارے خیال میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ دستور کی بالادستی کی یہ جدوجہد نہ صرف یہ کہ جاری رہے گی، بلکہ اس میں روز بروز شدت پیدا ہوگی۔ اس سلسلے میں عوام کے مختلف طبقوں کے جذبات کیا ہیں؟ اس سلسلے میں مزید کچھ عرض کرنے سے پہلے ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

گزشتہ ہفتے کے دوران جہاں ریٹائرڈ جنرل صاحبان نے باقاعدہ اجلاس کر کے صدر پرویز مشرف کی حکومت کو چارج شیٹ کیا ہے، وہاں ملک کے تیس لگ بھگ سرکردہ علمائے کرام نے بھی، جن کا عملی سیاست اور اقتدار کی کشمکش سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جن میں مختلف مکاتب فکر کے اکابر علمائے کرام شامل ہیں، ایک متفقہ اعلامیہ کی صورت میں ملک کی موجودہ صورت حال کے بارے میں اپنی دوٹوک رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ اس اعلامیہ پر میں نے بھی دستخط کیے ہیں اور اسی کالم میں یکم فروری کی اشاعت میں اسے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے، لیکن اعلامیہ کا جو مسودہ میں نے

اپنے کالم میں پیش کیا ہے، اس میں اور حتمی طور پر جاری ہونے والے اعلامیہ میں تھوڑا فرق ہے جس کی نشان دہی میرے خیال میں ضروری ہے۔ میرے پاس توثیق کے لیے جو مسودہ بھیجا گیا تھا، میں نے اسے کالم کی شکل میں ''پاکستان'' کو فیکس کر دیا۔ اس میں عدلیہ کی بحالی کے بارے میں اگرچہ اصولی طور پر بات کہہ دی گئی تھی جس سے میں متفق ضرور تھا، لیکن پوری طرح مطمئن نہیں تھا اور اس سے زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ موقف کا اظہار چاہتا تھا، لیکن اس اعلامیہ کے جاری ہونے میں مزید تاخیر بھی میرے نزدیک مناسب نہیں تھی، اس لیے اسی پر اکتفا کر لیا۔ مگر کراچی سے جو حتمی اعلامیہ جاری ہوا، اس میں میرے کہے بغیر لیکن میری خواہش کے مطابق موقف کو مزید واضح کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ دونوں مسودوں کی عبارت پیش کر رہا ہوں تا کہ قارئین اس سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔

ہمارے اس کالم میں شائع ہونے والے مسودہ میں عدلیہ کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ

''موجودہ تہہ در تہہ بحرانوں کے حل کے لیے ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ عدلیہ کو فعال کیا جائے، عدلیہ پر عوام کا اعتماد بحال کیا جائے تا کہ لوگ سڑکوں پر انصاف کے حصول کی کوشش کی بجائے عدلیہ میں فریادرسی کر کے حقیقی انصاف حاصل کر سکیں۔ ہماری یہ بھی رائے ہے کہ جملہ ماورائے آئین اقدامات کو منسوخ کیا جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے صدر پرویز مشرف کو ملک وملت کی خاطر مستعفی بھی ہونا پڑے تو اس سے گریز نہ کریں۔ یہ ایک باوقار طریقہ ہوگا جس کا اس منصب کے شایان راستہ یہ ہے کہ وہ آئین کے مطابق صدارت کا منصب سینٹ کے چیئرمین کے حوالے کر دیں''۔

جبکہ حتمی طور پر جاری ہونے والے مسودہ میں یہ عبارت اس طرح ہے کہ:

''موجودہ بحرانوں کے حل کے لیے ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ عدلیہ کو آئین کے تقاضوں کے مطابق بحال کر کے جملہ ماورائے آئین اقدامات کو منسوخ کیا جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے مناسب یہی ہے کہ صدر پرویز مشرف ملک وملت کی خاطر مستعفی ہو جائیں۔ یہ ان کے لیے ایک باوقار طریقہ ہوگا۔ وہ آئین کے مطابق صدارت کا منصب سینٹ کے چیئرمین کے حوالے کر دیں اور وہ تمام سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لے کر معینہ تاریخ کو شفاف انتخابات کرا

کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیں‘‘۔

یہ عبارت زیادہ واضح اور دوٹوک ہے۔ ابہام کا جو خیال پہلے مسودے سے پیدا ہو گیا تھا، وہ اب دور ہو گیا ہے۔

آج ایک اخبار نویس دوست نے فون کر کے مجھ سے اس اعلامیہ کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ یہ سرکردہ علمائے کرام کی متفقہ رائے ہے۔ میرے خیال میں ریٹائرڈ جج صاحبان، وکلا برادری اور اکابر علمائے کرام کی طرف سے صدر پرویز مشرف سے اقتدار چھوڑ دینے کے اس مطالبے یا اس مشورہ کے بعد اس موقف کو قوم کے کم و بیش اجماعی موقف کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ حالات جس قدر بگڑ چکے ہیں اور ان میں خرابی اور اس کے ساتھ ساتھ بے اعتمادی کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے، اس کے پیش نظر صدر پرویز مشرف اگر اصلاح احوال کے لیے کچھ کرنا بھی چاہیں تو وہ موثر نہیں ہوگا اور ان کا کوئی اقدام ان حلقوں کا اعتماد حاصل نہیں کر پائے گا۔ اس لیے اب اس کے سوا کوئی آپشن قومی سطح پر قبولیت حاصل نہیں کر سکے گا کہ صورت حال میں بنیادی تبدیلی دکھائی دے اور ایسی کوئی تبدیلی صدر پرویز مشرف کی موجودگی میں ممکن نہیں رہی۔

اس وضاحت کے اب ہم وکلا تحریک کی طرف واپس آتے ہیں۔ گزشتہ روز گوجرانوالہ کے ایک بازار سے گزرتے ہوئے ایک دوست کی دکان پر رکا تو انہوں نے سوال کیا کہ ملکی حالات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے حالات بہتری کی طرف جاتے نظر نہیں آتے۔ انہوں نے دوسرا سوال کیا کہ آپ اس فضا میں کس کے ساتھ ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میں تو وکلا کے ساتھ ہوں۔ انہوں نے پوچھا کیوں؟ میں نے جواب دیا کہ وہ آئین اور دستور کی بالادستی کی بات کر رہے ہیں۔ اس پر انہوں نے سوال کیا کہ کیا پاکستان میں کوئی تحریک امریکہ کی مرضی کے بغیر چلی ہے اور کیا آپ مطمئن ہیں کہ وکلا کی اس تحریک کے پیچھے امریکہ کی پلاننگ نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میرے پیش نظر صرف یہ بات ہے کہ وکلا کا موقف درست ہے، وہ دستور کی بحالی کی بات کر رہے ہیں اور میں بھی چاہتا ہوں کہ ملک میں جو کچھ بھی ہو، دستور اور قانون کے مطابق ہو۔

یہ ایک عام دکاندار شہری کے تاثرات ہیں جو میں نے انہی کے الفاظ میں پیش کر دیے ہیں

جب کہ تین چار روز قبل مجھے لاہور میں علمائے کرام کی ایک محفل میں اس موضوع پر گفتگو سننے اور کرنے کا موقع ملا۔ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے:

اس محفل میں کہا گیا کہ وکلا کی تحریک میں کسی سطح پر بھی اسلام کی بات سننے میں نہیں آ رہی جب کہ پاکستان اور اس کے دستور دونوں کی بنیاد اسلام اور جمہوریت پر ہے، مگر وکلا کی قیادت صرف جمہوریت کی بات کر رہی ہے اور اسلام کا لفظ قیادت کی زبان پر نہیں آ رہا۔

اس محفل میں بھی اس بات پر تحفظات کا اظہار کیا گیا کہ ''سول سوسائٹی'' کے نام پر جو این جی اوز وکلا کی اس تحریک میں دخیل ہوگئی ہے اور پیش پیش نظر آ رہی ہیں، یہ وہی این جی اوز ہیں جو ملک میں سیکولرازم کے فروغ کے ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے بیشتر این جی اوز کو صرف اس لیے بیرونی ممالک سے فنڈز ملتے ہیں تاکہ وہ پاکستان کے معاشرے میں دین سے بیزاری اور اسلامی اقدار سے بغاوت کا ماحول پیدا کریں اور ان این جی اوز کی اس قسم کی سرگرمیاں ہم برسوں سے اسی رخ پر دیکھ رہے ہیں۔

اس محفل میں یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ یہ ''سول سوسائٹی'' کیا چیز ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مغرب میں جمہوری انقلاب کے لیے عوام کے جس ہجوم نے تحریک چلائی تھی، اسے سول سوسائٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کی نقالی میں ہمارے ہاں بھی عوامی اجتماع کو سول سوسائٹی کہہ دیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ اس طرح کہیے کہ عوام کے جس ہجوم کا کوئی متعین نظریہ یا عقیدہ نہ ہو، وہ سول سوسائٹی کہلاتا ہے۔

اس قسم کے تحفظات کے باوجود میری اور میرے جیسے بہت سے نظریاتی دینی کارکنوں کی ہمدردیاں بہرحال وکلا کی تحریک کے ساتھ ہیں۔ عدلیہ کی خودمختاری و بحالی اور دستور و قانون کی بالادستی کے لیے ان کی جدوجہد اور قربانیوں کے ہم دل سے معترف ہیں اور اسلام اور جمہوریت کی سربلندی کے لیے بارگاہ ایزدی میں اس تحریک کی جلد از جلد کامیابی کے لیے دعاگو ہیں۔ *

O

* روزنامہ پاکستان، ۶ ر فروری ۲۰۰۸ء۔

عدلیہ کی بحالی اور اسلام کی بالادستی

پاکستان شریعت کونسل پنجاب کے امیر مولانا عبدالحق خان بشیر نے، جو میرے چھوٹے بھائی اور گجرات کے محلّہ حیات النبی میں جامع مسجد امام ابوحنیفہؒ کے خطیب ہیں، ۷ فروری جمعرات کو مسجد امن باغبانپورہ لاہور میں شریعت کونسل کے صوبائی سیکرٹری جنرل مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر کی رہائش گاہ پر مختلف دینی جماعتوں کے سرکردہ رہنماؤں کی ایک غیر رسمی مشاورت کا اہتمام کیا۔ ایجنڈا دو نکات پر مشتمل تھا: ایک یہ کہ عدلیہ کی بحالی اور دستور کی بالادستی کے لیے جو تحریک وکلا کے فورم سے چل رہی ہے، اس میں دینی حلقوں کا کیا کردار ہونا چاہیے، اور دوسرا یہ کہ مختلف مکاتب فکر کے ۳۰ سرکردہ علمائے کرام نے ملک کی موجودہ صورت حال کے حوالے سے جو متفقہ اعلامیہ جاری کیا ہے، اسے زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔ وکلا کی تحریک کے بارے میں کم و بیش انہی جذبات کا اظہار کیا گیا جن کا اظہار ہم اس کالم میں ایک سے زائد مرتبہ کر چکے ہیں کہ:

☆ عدلیہ کی بحالی، دستور کی بالادستی اور پی سی او کے تحت معزول کیے جانے والے جج صاحبان کی ان کے دستوری مناصب پر واپسی کا موقف درست ہے اور اس کے لیے چلائی جانے والی تحریک پوری قوم کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے اور ملک کے تمام طبقات کو اس تحریک کی پرزور حمایت کرنی چاہیے۔

☆ دینی جماعتوں کا رویہ اس سلسلے میں حوصلہ افزا نہیں اور وہ اس میں بہت تاخیر سے کام لے رہی ہیں۔ انہیں وکلا کی اس اصولی تحریک کے ساتھ یک جہتی اختیار کرنے کے لیے عملی پیش رفت

کرنی چاہیے۔

☆ تحریک میں ''سول سوسائٹی'' کے مبہم عنوان کے ساتھ جو این جی اوز آگے بڑھ رہی ہیں، ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ این جی اوز کا ایجنڈا پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا ہے اور اس رخ پر این جی اوز کی اب تک سرگرمیاں مبہم نہیں ہیں۔

☆ چونکہ پاکستان اور اس کے دستور، دونوں کی بنیاد اسلام اور جمہوریت پر ہے اور اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس ریاست کا یہی دینی تشخص عالمی استعمار کی نظروں میں کھٹکتا ہے، اس لیے جمہوری اقدار کی سر بلندی اور آزادانہ جمہوری عمل کی بحالی کے ساتھ ساتھ اسلام کے ساتھ ملک وقوم کی کمٹمنٹ کا اظہار بھی ضروری ہے۔ لہٰذا وکلا تحریک کی قیادت کو توجہ دینی چاہیے کہ وہ اس اہم پہلو کو نظر انداز نہ کرے اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آج کی قانون دان قیادت بھی اس موقف کا دوٹوک اظہار کرے کہ ان کی تحریک جمہوری عمل کی بحالی اور جمہوری اقدار کی سر بلندی کے ساتھ ساتھ اسلام کی بالادستی کے لیے بھی ہے اور وہ دستور پاکستان کی ان دونوں بنیادوں پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔

☆ جس طرح بجا طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ سپریم کورٹ کے وہ فیصلے جن میں نظریہ ضرورت کے عنوان سے شخصی آمریتوں اور فوجی حکومتوں کو تحفظ دیا جاتا رہا ہے، وہ دباؤ کا نتیجہ تھا اور عدالت عظمیٰ کو اس قسم کے دباؤ سے آزاد کرانے کے لیے عدلیہ کی بحالی کی تحریک چلائی جا رہی ہے، اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ عدالت عظمیٰ کے وہ فیصلے جن کے تحت قرارداد مقاصد کی بالاتر حیثیت سے انکار کیا گیا ہے، سودی قوانین کے خاتمے کے عدالتی فیصلے کو معطل کیا گیا ہے اور صوبہ سرحد میں حسبہ ایکٹ کا راستہ روکا گیا ہے، وہ بھی اسی قسم کے ماحول کی پیداوار ہیں۔ اس لیے جس طرح نظریہ ضرورت کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کی ضرورت ہے، اسی طرح اسلام کی بالادستی کی دستوری ضمانت سے گریز کے طرز عمل سے بچنا بھی ضروری ہے، کیونکہ ملک کی گاڑی اسی صورت میں اسلام اور جمہوریت کے دو متوازن پہیوں پر چل سکتی ہے۔

☆ اس سلسلے میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ وکلا تحریک کی ہر سطح کی قیادت سے رابطے کیے جائیں گے

تا کہ انہیں اس تحریک میں حمایت کی یقین دہانی کرانے کے ساتھ ساتھ اپنے تحفظات سے بھی آگاہ کیا جائے اور پاکستان شریعت کونسل پنجاب لاہور میں ایک سیمینار کا اہتمام کرے گی جس میں مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ رہنماؤں کے ساتھ وکلا تحریک کے سرکردہ زعما کو بھی مدعو کیا جائے گا۔ اس کے بارے میں طے ہوا ہے کہ ۱۸ر فروری کے انتخابات کی صورت حال حتمی طور پر واضح ہوتے ہی سیمینار کی تاریخ اور جگہ کا تعین کیا جائے گا اور رابطوں کا آغاز کر دیا جائے گا، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

علمائے کرام کے متفقہ اعلامیہ کے بارے میں شرکائے اجلاس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ۳۰ سرکردہ علمائے کرام کا موقف بالکل درست ہے، لیکن بہت تاخیر سے ہے، اسے اس سے بہت پہلے منظر عام پر آ جانا چاہیے تھا، تاہم پھر بھی غنیمت ہے کہ ان علمائے کرام نے جو انتخابی سیاست میں فریق نہیں ہیں، خالصتاً علمی اور دینی حوالے سے اپنے اس موقف کا صراحت کے ساتھ اظہار کر کے پوری قوم کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ نیز یہ کہ اگرچہ اس اعلامیہ میں کم وبیش ملکی صورت حال کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا گیا ہے، لیکن اس حوالے سے یہ تشنہ ہے کہ اس میں ملک کی صورت حال کو بگاڑنے کے لیے کام کرنے والے حلقوں، بالخصوص سیکولر این جی اوز اور قادیانیوں کے منفی کردار کا تذکرہ نہیں کیا گیا جو موجودہ حالات کے تناظر میں بہت ضروری ہے اور رائے عامہ کو اس سے آگاہ کرنا انتہائی ناگزیر ہے۔

اجلاس میں بتایا گیا کہ موجودہ سیاسی صورت حال کو نیا رنگ دینے اور مستقبل کے سیاسی نقشے میں رنگ بھرنے کے عمل میں اس وقت جو حلقہ پس پردہ سب سے زیادہ متحرک ہے، وہ قادیانی لابی ہے جس کے بارے میں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے ایک موقع پر کہا تھا کہ قادیانی ہمارے ملک میں وہی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے کہ ایک چھوٹی سی اقلیت ہونے کے باوجود ملکی پالیسیوں کے تعین اور انہیں چلانے میں یہودیوں کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ امریکہ میں خواہ حکومت ڈیموکریٹس کی ہو یا ری پبلکن کی، اس کی پالیسیوں کا کنٹرول ہمیشہ یہودی لابیوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بھٹو مرحوم کا یہ خیال بالکل درست ہے اور غالباً اسی خدشے کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کے مطالبے کو منظور کیا اور پارلیمنٹ کے ذریعے

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دیا تھا، مگر قادیانی گروہ پارلیمنٹ کے اس متفقہ فیصلے کو قبول کرنے سے مسلسل انکاری ہے اور اسے تبدیل کرانے کے لیے عالمی طاقتوں سے پاکستان پر دباؤ ڈلوا رہا ہے۔

اجلاس میں بتایا گیا کہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر جو اس وقت پاکستان کے سیاسی مستقبل کا تانا بانا بننے والوں کے ماسٹر مائنڈ سمجھے جارہے ہیں، قادیانی ہیں اور اس حقیقت کا اظہار ہمارے محترم اور معاصر کالم نگار جناب جاوید چودھری نے بھی ایک حالیہ کالم میں کیا ہے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ یحییٰ خان کے دور میں جب مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے نام سے ملک سے الگ کرنے کے لیے عالمی سازشیں عروج پر تھیں، اس وقت حکومت پاکستان کے نفس ناطقہ کی حیثیت ایک نامور قادیانی ایم ایم احمد کو حاصل تھی اور مشرقی پاکستان کے ایک محبّ وطن لیڈر مولوی فرید احمد مرحوم نے کھلے بندوں یہ الزام لگایا تھا کہ ایم ایم احمد کی قیادت میں قادیانی ٹولہ پاکستان کو تقسیم کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ اس وقت جو کچھ ہوا، سب کے سامنے ہے اور ایم ایم احمد کا کردار بھی کسی سے مخفی نہیں، اس لیے آج جب کہ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں (خاکم بدہن) طرح طرح کی باتیں کہی جارہی ہیں اور جنوبی ایشیا کے جغرافیائی نقشے میں تبدیلی کی منحوس پیش گوئی کا سلسلہ جاری ہے، پاکستان کے سیاسی مستقبل کا تانا بانا بننے والوں میں ایک ریٹائرڈ قادیانی کی مبینہ سرگرمیاں کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں اور ان کا بروقت نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی سامنے آئی کہ پاکستان کے مختلف سیاسی رہنماؤں کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جارہا ہے کہ وہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فیصلے کو ری اوپن کرانے اور اس کا ازسرنو جائزہ لینے کی بات چلائیں تاکہ الیکشن کے بعد وجود میں آنے والی قومی اسمبلی میں اس کی تحریک پیش کی جاسکے۔ اس سلسلے میں اس امر کو بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب حدود آرڈیننس کا تیاپانچہ کیا گیا تو اس موقع پر امریکہ کی وزارت خارجہ کی طرف سے آن ریکارڈ یہ کہا گیا تھا کہ امریکہ نے حکومت پاکستان پر حدود آرڈیننس کے ساتھ ساتھ توہین رسالت کی سزا اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے قانون کو منسوخ کرنے کے لیے بھی دباؤ ڈال رکھا ہے۔ اس کے جواب میں حکمران مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل سید مشاہد حسین نے پیرس کی ایک اخباری کانفرنس میں فرمایا

تھا کہ اس کے لیے اب آئندہ الیکشن کے بعد ہی پیش رفت ہو سکتی ہے۔ اس پس منظر میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر کی پس پردہ سرگرمیوں کو اگر ان کے قادیانی ہونے کے حوالے سے شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور اس سے خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے تو یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے اور اس کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔

اس کے ساتھ ہی یہ افسوس ناک اطلاع بھی اجلاس کے دوران سامنے آئی کہ ہمارے ایک محترم سیاسی رہنما عمران خان نے بھی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی مخالفت کر دی ہے اور کینیڈا سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''پاکستان پوسٹ'' کی ۳۱ رجنوری ۲۰۰۸ء کی اشاعت میں جناب عمران خان کے ایک تفصیلی انٹرویو کی مین سرخی یہ ہے کہ ''قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ غلط تھا''۔ میں نے اس پر عرض کیا کہ میرا دل یہ نہیں مان رہا کہ عمران خان نے ایسا کہا ہوگا۔ بہر حال اس کی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کروں گا اور انٹرویو کی تفصیلات سامنے آنے پر ہی اس کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔

بہر حال اجلاس میں ۳۰ سرکردہ علمائے کرام کے متفقہ اعلامیہ کے بارے میں اس پہلو سے تشنگی محسوس کیے جانے کے باوجود اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا گیا اور دو باتیں طے کی گئیں: ایک یہ کہ اس اعلامیہ پر دستخطوں کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس پر زیادہ سے زیادہ علمائے کرام کے دستخط حاصل کیے جائیں۔ دوسرا یہ کہ اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی جائے اور اکابر علما کی اس آواز کو ملک بھر میں پھیلانے کی جدوجہد کی جائے۔

یہ ہے رپورٹ چند دینی رہنماؤں کی ایک باہمی مشاورت کی نشست کی جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ ملکی صورت حال کے بارے میں ملک کے دینی کارکن کس رخ پر سوچ رہے ہیں۔ اس نشست کے شرکا میں مولانا عبدالرؤف فاروقی، جناب عبداللطیف چیمہ، مولانا میاں عبدالرحمٰن، مولانا یوسف احرار، حافظ ذکاء الرحمٰن اختر اور مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر بطور خاص قابل ذکر ہیں۔*

O

* روزنامہ پاکستان، ۱۴ فروری، ۲۰۰۸ء۔

وکلا اور علما کے مابین ایک ملاقات کا احوال

وکلا کی تحریک کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور جج صاحبان کی بحالی کے لیے نئی حکومت جن عزائم کا اظہار کر رہی ہے، پوری قوم کو ان میں پیش رفت کا بے چینی کے ساتھ انتظار ہے۔ جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کی رہایش گاہ زبردستی خالی کرانے کی بھونڈی حرکت نے جہاں نومنتخب وزیراعظم کو جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے سے معذرت کرنے پر مجبور کیا ہے، وہاں وکلا کی تحریک کے لیے بھی مہمیز کا کام دیا ہے اور ملک بھر میں احتجاج کا سلسلہ پھیلتا جا رہا ہے۔ چیف جسٹس محترم جناب افتخار محمد چودھری کے اس بیان نے ان کی عزت و وقار میں مزید اضافہ کیا ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی اگرچہ معزول نہیں بلکہ اب بھی جج کے منصب پر فائز ہیں اور وہ اس حیثیت میں عدالت عظمٰی اور عدالت ہاے عالیہ کی کرسیوں پر جا کر بیٹھ سکتے ہیں، لیکن وہ پارلیمنٹ کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔ اس میں نہ صرف پارلیمنٹ کے ارکان اور حکومتی اتحاد کے قائدین کے لیے ذمہ داری کا صحیح طور پر احساس کرنے کا پیغام موجود ہے بلکہ اصل مقتدر طبقات کا امتحان بھی ہے کہ جب چیف جسٹس اور دیگر معزز جج صاحبان پارلیمنٹ کے فیصلے کے انتظار کا کہہ کر پارلیمنٹ کی بالاتری کا اعلان کر رہے ہیں تو اسٹیبلشمنٹ کو بھی پارلیمنٹ کی بالاتری کے سامنے سرتسلیم خم کر دینے میں اب مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے اور عوام کے فیصلے پر عمل درآمد کا خوش دلی سے اہتمام کرنا چاہیے۔

اس پس منظر میں گزشتہ دنوں ہماری ملاقات وکلا تحریک کے اہم رہنما جناب جسٹس (ر) وجیہ الدین احمد سے ہوئی۔ اس ملاقات کا اہتمام سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی عوام کے لیے رابطہ کمیٹی

نے ۲۶ مارچ ۲۰۰۸ء کو پنجاب بار کونسل کے ہیڈ آفس میں علمائے کرام کے ساتھ ملاقات کے عنوان سے کیا اور اس میں مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علمائے کرام کے ہمراہ راقم الحروف نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر جمعیت علمائے پاکستان (نفاذ شریعت گروپ) کے انجینئر سلیم اللہ خان نے جسٹس (ر) وجیہ الدین احمد کے اعزاز میں ظہرانہ کا اہتمام بھی کیا جس میں وکلا اور علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ ہماری معلومات کے مطابق دستور کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی اور معزز جج صاحبان کی بحالی کے لیے وکلا کی تحریک شروع ہونے کے بعد وکلا اور علما کے درمیان یہ پہلا رابطہ تھا جو سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی تحریک پر ہوا اور جس میں باہمی گلے شکووں کے ساتھ ساتھ تحریک کے ساتھ ہم آہنگی کا اظہار اور اسے موثر طور پر آگے بڑھانے کے لیے باہمی تبادلہ خیالات بھی ہوا۔ دینی جماعتوں کی طرف سے اس گفتگو میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا امیر حمزہ، انجینئر سلیم اللہ خان، مولانا سیف الدین سیف، مولانا امجد خان اور راقم الحروف نے حصہ لیا جب کہ وکلا کی طرف سے جناب حامد خان اور جناب ضیاء اللہ خان ایڈووکیٹ گفتگو میں شریک ہوئے اور دیگر شرکا میں مولانا عبدالرؤف فاروقی، مولانا عبدالحق خان بشیر، مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر اور دیگر دینی رہنما بھی تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی گفتگو میں کہا کہ وہ قوم میں بے حسی کی اجتماعی کیفیت دیکھتے ہوئے چند برس قبل مایوسی کا شکار ہو رہے تھے مگر وکلا کی تحریک نے قوم کے مستقبل کے بارے میں ان کی مایوسی کو امید میں بدل دیا ہے اور وہ اسے اسلام کے معجزہ سے کم نہیں سمجھتے۔ انہوں نے وکلا کو یاد دلایا کہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر اور اسلام کے عملی نفاذ پر ہے، اس لیے اسے اپنی تحریک میں سب سے اہم نکتہ کے طور پر اجاگر کرنا ہوگا، ورنہ وہ ملک کو بہتر مستقبل کی طرف نہیں لے جا سکیں گے۔

راقم الحروف نے عرض کیا کہ علما اور وکلا کے درمیان اس رابطے کا اہتمام بہت دیر سے کیا گیا ہے اور یہ بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ ہم شروع سے اس تحریک کی حمایت کر رہے ہیں اور اس سے مستقبل کی اچھی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ہم اس تحریک کے بعض پہلوؤں کے بارے میں تحفظات کے باوجود دستور کی بالادستی، قانون کی حکمرانی، عدلیہ کی بالاتری اور معزز جج صاحبان کی

بحالی کے لیے اس تحریک کی بھرپور حمایت کرتے ہیں اور ہمارے تحفظات میں سب سے بڑی بات وہی ہے جس کی طرف ڈاکٹر اسرار احمد نے اشارہ کیا ہے کہ وکلا کی اس تحریک میں اسلام کا نکتہ نمایاں نظر نہیں آ رہا۔

مولانا امیر حمزہ اور دیگر رہنماؤں نے بھی اپنی گفتگو میں اس امر کی طرف توجہ دلائی اور تحریک کی حمایت کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم ملک میں دستور کی بالادستی اور اسلام کے نفاذ کے لیے وکلا کے ساتھ ہیں۔ وہ چیف جسٹس سمیت تمام ججوں کی جلد از جلد بحالی چاہتے ہیں اور اس تحریک کو وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔

وکلا تحریک کے اہم رہنماؤں اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر جناب حامد خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہم دراصل قومی خودمختاری اور ملک کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ہمارے مقتدر طبقات نے جمہوریت اور دستور کی خلاف ورزی اور امریکی ہدایات کے مطابق ملک کا نظام چلانے کی جو روش اختیار کر رکھی ہے، ہم اس کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب ہم دستور کی بالادستی کی بات کرتے ہیں تو اس میں اسلام موجود ہے، بلکہ دستور کی بنیاد ہی اسلام پر ہے اور اس میں وہ تمام دفعات موجود ہیں جو ملک کی نظریاتی حیثیت متعین کرتی ہیں اور ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی ضمانت دیتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم دستور میں جنرل پرویز مشرف کی طرف سے کی گئی خرافات کو نکال کر باقی سارے دستور کی بات کرتے ہیں، اس میں اسلام کی بالادستی بھی ہے اور جمہوری راہ کی بحالی بھی ہے۔ اس لیے دینی حلقوں کو دستور کی بالادستی کی اس تحریک کا کھل کر ساتھ دینا چاہیے۔ دستور کی بالادستی قائم ہوگی تو ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

جسٹس (ر) وجیہ الدین احمد نے اپنے خطاب میں اس بات پر زور دیا کہ علمائے کرام کو معاشرے میں اہم مقام حاصل ہے اور انہوں نے تحریک پاکستان سمیت مختلف تحریکات میں بھرپور کردار ادا کیا ہے، اس لیے انہیں دستور کی بالادستی کے لیے وکلا کی تحریک میں بھی سرگرم کردار ادا کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ علمائے کرام اگر متحرک ہوں اور ان کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو تو وکلا اور سول سوسائٹی ان کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈنمارک کے اخبارات میں

توہین رسالت کے واقعات اور ہالینڈ میں توہین قرآن کریم پر مبنی فلم ہماری اجتماعی بے حسی کی وجہ سے ہے۔ دنیا میں ستاون اسلامی ملک ہیں مگر ڈنمارک اور ہالینڈ جیسے ممالک اس قسم کی حرکات کر کے ہمارے سینے پر مونگ دل رہے ہیں۔ اگر مسلمان ممالک ایک قدم اٹھالیں کہ اپنی معیشت کو ڈالر سے الگ کرلیں تو مغرب گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا، مگر ہماری دارالحکومتوں میں پرویز مشرف جیسے لوگ بیٹھے ہیں اور مغرب کی ہدایات کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ ان حکمرانوں کو علمائے کرام، وکلا اور سول سوسائٹی کے لوگ ہی دباؤ ڈال کر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ صحیح فیصلے کریں۔ انہوں نے کہا کہ وکلا کی تحریک کا مقصد بھی یہی ہے کہ عوام کے جذبات کی پاسداری ہو، دستور کی بالادستی ہو اور قانون کی حکمرانی ہو، اس لیے اس تحریک میں وہ سب کچھ موجود ہے جو آپ چاہتے ہیں۔ آپ اس سے مکمل تعاون کریں۔ جسٹس (ر) وجیہ الدین احمد نے حکومت پاکستان پر زور دیا کہ وہ توہین رسالت پر احتجاج کے لیے ڈنمارک اور ہالینڈ کے ساتھ تجارت بند کرنے کا اعلان کرے اور ان کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کرے۔

ملک میں دستور کی بالادستی اور ججوں کی بحالی کی تحریک کے حوالے سے علمائے کرام اور وکلا کی یہ ملاقات اگرچہ بہت دیر سے ہوئی اور مختصر رہی، لیکن مفید تھی اور آئندہ باہمی تعاون کی ایک اچھی تمہید تھی۔ امید ہے کہ ملک کے یہ دو اہم طبقے ملک کو بہتر مستقبل کی طرف لے جانے کی جدوجہد میں ایک دوسرے کے اچھے معاون ہوں گے۔

O

جمہوری قوتیں، انتخابات اور نئی حکومت

اسلام، جمہوریت اور پاکستانی سیاست

میاں محمد نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو صاحب کے درمیان طے پانے والا ''میثاق جمہوریت'' اس وقت نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی حلقوں میں زیر بحث ہے اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر مسلسل اظہار خیال کیا جا رہا ہے، توقعات کا اظہار بھی ہو رہا ہے اور خدشات کا تذکرہ بھی جاری ہے۔ میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو دو دفعہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیراعظم رہ چکے ہیں۔ ہر بار ایسا ہوا ہے کہ ایک نے دوسرے کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے ہر ممکن جتن کیا ہے اور اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں، جس کا بڑا حصہ فوج ہے، اپنے حریف کی اقتدار سے محرومی پر خوشی منائی ہے۔ ہر بار ایسا ہوا ہے کہ اپوزیشن نے یہ طے کر لیا ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کو اپنی مدت پوری کرنے کا موقع نہیں دینا اور ایسے حالات ہر حال میں پیدا کرنے ہیں کہ فوج مداخلت پر آمادہ ہو اور براہ راست یا بالواسطہ دخل دے کر اسے اقتدار سے محروم کر دے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف کے چاروں ادوار حکومت میں یہی کھیل کھیلا گیا ہے اور دونوں محترم لیڈر دو دو بار وزیراعظم بننے کے باوجود اپنی ٹرم پوری نہیں کر پائے۔ اس مکروہ کھیل کا نتیجہ آج نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ عالم اسلام بھگت رہا ہے اور ہمارے پاس اپنے زخم چاٹنے کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان وجود میں آیا تھا تو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اسلام اور جمہوریت کو پاکستان کی بنیاد قرار دیا تھا اور اس عزم اور وعدے کے ساتھ قیام پاکستان کی جدوجہد کو منزل مقصود تک پہنچایا تھا کہ پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگی جو اسلامی اصولوں کے دائرے میں کام کرے گی اور نئے دور میں دنیا کو اسلامی اصولوں کے تحت ایک جمہوری ریاست اور فلاحی

معاشرے کا عملی نمونہ دکھائے گی، لیکن قیام پاکستان کے بعد سے اب تک اسلام اور جمہوریت دونوں کے ساتھ مسلسل گلی ڈنڈا کھیلا جا رہا ہے اور یہ دونوں سنہری اصول ہمارے مقتدر حلقوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش میں سینڈوچ بنے ہوئے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ مولوی لوگ جمہوریت پر صاد نہیں کریں گے اور مسٹر لوگوں کو مولوی کا پیش کردہ اسلام قبول نہیں ہوگا، اس لیے یہ نوزائیدہ ریاست پہلے مرحلے میں خدانخواستہ ناکامی کا شکار ہو سکتی ہے، لیکن بحمد اللہ ایسا نہیں ہوا۔ مولوی لوگوں نے قرآن وسنت کی پاسداری کی شرط پر جمہوریت کو حکومت کی بنیاد تسلیم کر لیا اور مسٹر لوگوں نے جمہوریت کی پاسداری کی شرط پر اسلام کی بالادستی پر صاد کر دیا جس کی دستاویزی شہادت قراردادِ مقاصد، تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ سرکردہ علمائے کرام کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات اور ۱۹۷۳ کے دستور پر سب کے اتفاق کی صورت میں موجود ہے جن کے ذریعے یہ بات طے پا گئی کہ حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے، لیکن وہ مملکت کی پالیسیوں کے تعین میں قرآن وسنت کے احکام کے پابند ہوں گے۔ اس طرح جس بڑی کشمکش کا خطرہ تھا، وہ ہمیشہ کے لیے ٹل گئی، لیکن اس کی جگہ پاور پالیٹکس نے لے لی اور اقتدار کے سرچشمہ پر کنٹرول کی ہوس نے اسلام اور جمہوریت دونوں کو گزشتہ نصف صدی سے اس ملک میں سوالیہ نشان بنا رکھا ہے۔

ہم نے اسلام اور جمہوریت کے لیے اس سے قبل بھی بہت اعلانات کیے ہیں، بڑے وعدے کیے ہیں، قوم کو بڑے سبز باغ دکھائے ہیں، ہم نے قراردادِ مقاصد کی صورت میں قوم سے وعدہ کیا، ہر دستور میں اسلام اور جمہوریت کی پاسداری کا عہد کیا، ہر الیکشن کے موقع پر ہر سیاسی پارٹی نے اپنے اپنے انتخابی منشور میں ان دو سنہری اصولوں کو اپنا نصب العین قرار دیا اور سب سے بڑھ کر ۷۳ کے دستور میں ہم نے اسلام، جمہوریت، وفاقیت، فلاحی ریاست اور رفاہی پاکستان کے تقاضوں کو خوب صورت انداز میں سمویا۔ ۷۳ کے دستور میں کون سی بات نہیں ہے؟ اور اسلام، جمہوریت، صوبائی خود مختاری اور فلاحی ریاست کے تقاضوں میں ہم آہنگی اور توازن کا کون سا پہلو تشنہ ہے؟ لیکن اس دستور کا ہم نے اپنے ہاتھوں جو حشر کیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ یہ دستور ہمیں سیدھے راستے پر

چلانے کے بجائے اپنے وجود اور بقا کے حوالے سے ہمارے رحم وکرم پر ہے۔ ہم ملک کے اقتدار پر مکمل کنٹرول کرنے کے بعد اس دستور کو باقی رہنے دیتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے اس غریب کی رحم کی اپیل منظور کر لی ہے اور اسے مزید کچھ دیر زندہ رہنے کا حق دے دیا ہے، خواہ اسے کئی سال ''کومے'' میں ہی گزارنا پڑیں۔

ہمیں محترم میاں محمد نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے ''میثاق جمہوریت'' کے مندرجات سے اختلاف نہیں ہے۔ ہم ان کے جذبے کی قدر کرتے ہیں کہ بدیر سہی، لیکن انھیں جمہوریت کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری کا خیال تو آیا، انھیں احساس تو ہوا کہ جمہوریت صرف اقتدار کے حصول کے لیے سیڑھی یا اس کے تحفظ کے لیے بیساکھی کا نام نہیں ہے، بلکہ اپنے کچھ اصول رکھتی ہے، اس کے کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں، اس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، کچھ لوازمات ہوتے ہیں اور وہ آگے بڑھنے کے لیے سیاست دانوں سے ایک مخصوص ماحول اور کچھ قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ ہم دونوں لیڈروں کے اس ادراک اور احساس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اسے خوش آمدید کہتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان اصولوں پر پہلے کبھی اختلاف رہا ہے؟ کیا ان دونوں پارٹیوں کے انتخابی منشوروں اور ۷۳ کے دستور میں یہ باتیں شامل نہیں ہیں؟ اگر یہ سب کچھ پہلے سے موجود ہے اور ان کے ساتھ کمٹ منٹ کا پہلے بھی کئی بار اظہار ہو چکا ہے تو انھیں ایک نئے میثاق کی شکل دینے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟

اصل بات اصولوں، میثاقوں اور الفاظ کی نہیں بلکہ طرز عمل کی ہے، سیاسی مزاج کی ہے اور مستقبل کے عزائم کی ہے۔ اگر ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہے تو یہ ''میثاق جمہوریت'' ۷۳ کے دستور سے زیادہ مقدس دستاویز نہیں ہے۔ حالات کی ناہمواری انسان کو ایک رخ پر لے آتی ہے، وہ رخ کبھی مستقل نہیں ہوتا اور اصل صورت حال کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب حالات نارمل ہوتے ہیں اور پھر دیکھا جاتا ہے کہ ناہموار حالات میں ایک رخ اختیار کرنے والوں کا اصل رخ کیا ہے؟ مزاج او رجبلت کبھی نہیں تبدیل ہوتے۔ اس پر ایک کہاوت کا حوالہ دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ کسی بادشاہ کا اپنے وزیر کے ساتھ اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ فطرت تبدیل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بادشاہ کا موقف تھا

کہ تربیت اور ماحول کے ساتھ فطرت تبدیل ہو جاتی ہے مگر وزیر اس سے متفق نہیں تھا اور وہ بضد تھا کہ فطرت کسی حالت میں نہیں بدلتی۔ بادشاہ نے وزیر کو قائل کرنے کے لیے چند بلیاں پالیں، انھیں اس طرح تربیت دلوائی کہ وہ بڑے ادب اور ترتیب کے ساتھ اگلے ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں اٹھائے دو پاؤں پر چلتی ہوئی دربار میں آتیں اور بادشاہ کے گرد گھیرا ڈال کر باادب کھڑی ہو جاتیں۔ وزیر کو یہ منظر دکھا کر بادشاہ نے وزیر سے دریافت کیا کہ کیا خیال ہے، فطرت تبدیل ہوتی ہے یا نہیں؟ وزیر نے کہا کہ بادشاہ سلامت! اس کا جواب کل دوں گا۔ دوسرے روز وزیر چند چوہے آستین میں چھپا کر دربار میں لے آیا اور جونہی بلیاں اپنی ٹریننگ کے مطابق باادب چلتے ہوئے بادشاہ کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہوئیں، وزیر نے چپکے سے چوہوں کو دربار میں کھلا چھوڑ دیا۔ بلیوں نے چوہوں کو دوڑتے دیکھا تو جلتی ہوئی شمعیں وہیں پھینکیں اور چوہوں کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ شمعیں قالینوں پر گرنے سے بہت سی جگہوں سے قالین جل گئے اور آگ کو پھیلنے سے بڑی مشکل سے روکا گیا۔ وزیر نے بادشاہ سے کہا کہ حضور! یہ بلیوں کی اصل فطرت ہے اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔

اس لیے اس ''میثاق جمہوریت'' کی اصلیت اس وقت سامنے آئے گی جب دونوں لیڈر ملک میں ہوں گے (خدا کرے کہ وہ جلدی آ جائیں)، اقتدار کا چوہا ان کے سامنے ہوگا اور دونوں کی یکساں دسترس میں ہوگا۔ تب پتہ چلے گا کہ ''میثاق جمہوریت'' کا کون سا جملہ ان میں سے کس کو یاد رہ گیا ہے اور کون سا لندن اور دوبئی کی فضاؤں میں تحلیل ہو چکا ہے۔ ویسے ہمارے خیال میں اتنے لمبے چوڑے ''میثاق جمہوریت'' کے تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر دونوں لیڈر صرف اتنا اعلان کر دیتے کہ دونوں دستور کی پاسداری کریں گے، ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کریں گے، ایک دوسرے کا احترام کریں گے، ایک دوسرے کو جمہوری اصولوں کے مطابق آگے آنے کا موقع دیں گے اور اقتدار میں آنے کی صورت میں ٹرم پوری ہونے تک اس کے لیے مشکلات کھڑی نہیں کریں گے تو یہ چند جملے شاید بھاری بھرکم میثاق جمہوریت سے زیادہ وزنی ثابت ہوتے۔*

O

* ماہنامہ الشریعہ، جون ۲۰۰۶ء۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کا المناک قتل

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن محترمہ بے نظیر بھٹو گزشتہ روز راولپنڈی میں ایک خودکش حملے کے نتیجے میں جاں بحق ہوگئیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ملک بھر میں ان کا سوگ منایا جارہا ہے اور ہر طبقہ کے افراد ان کے اس المناک قتل کی مذمت کرتے ہوئے اس سوگ میں شریک ہیں۔حکومت نے قومی سطح پر تین دن اور پاکستان پیپلز پارٹی نے چالیس روز تک سوگ منانے کا اعلان کیا ہے اور اس دوران احتجاجی مظاہروں، تعزیتی اجتماعات اور قرآن خوانی کی محافل کے ساتھ ساتھ کاروبار زندگی تین روز سے تادم تحریر معطل ہے۔توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری ہے، ریلوے کے انجن، گاڑیاں، بسیں، کاریں اور کوچیں سینکڑوں کی تعداد میں جلائی جاچکی ہیں اور بینک، دفاتر، اور پیٹرول پمپ بھی اس توڑ پھوڑ کی زد میں ہیں۔

اب تک سامنے آنے والی میڈیا رپورٹوں کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو نے زندگی کے آخری روز اسلام آباد میں افغانستان کے صدر حامد کرزئی سے ملاقات کی، لیاقت باغ میں ایک انتخابی جلسہ سے خطاب کیا لیکن جب وہ جلسہ سے خطاب کے بعد اپنی رہائش گاہ پر جانے کے لیے لیاقت باغ سے باہر نکل رہی تھیں تو حملہ کا نشانہ بن گئیں۔کارکن ان کو دیکھ کر جوش وخروش سے نعرے لگانے لگے جس پر انہوں نے کارکنوں کے نعروں کا جواب دینے کے لیے گاڑی کی چھت کھلوائی اور سر باہر نکال کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کارکنوں کے لیے خوشی کا اظہار کرنے لگیں۔اس دوران ان پر فائرنگ ہوئی اور ساتھ ہی ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور وہ گاڑی کے اندر گر گئیں۔انہیں فوری طور پر ہسپتال لے جایا

گیا مگر وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ ڈاکٹروں نے کم وبیش نصف گھنٹہ تک ان کی جان بچانے کی کوشش کی۔ بعدازاں ان کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔

وزارت داخلہ کے ترجمان اوران کے ساتھ آخری وقت بے نظیر بھٹو کا علاج کرنے والے ڈاکٹر صاحبان کا کہنا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو کوئی گولی نہیں لگی بلکہ وہ گاڑی کی کھلنے والی چھت کا لیور سر پر لگنے سے زخمی ہوئیں اوران کے سر پر یہ شدید زخم ان کی موت کا باعث بن گیا۔ ڈاکٹر صاحبان کے بقول گاڑی کے لیور سے لگنے والے اس زخم کے علاوہ ان کے جسم پر اور کسی قسم کے زخم کا کوئی نشان نہیں تھا مگر پاکستان پیپلز پارٹی کی سیکرٹری اطلاعات شیری رحمٰن نے وزارت داخلہ کے اس موقف کو جھٹلاتے ہوئے کہا کہ وہ اس بات کی عینی شاہد ہیں کہ بے نظیر بھٹو کی گردن پر گولی لگی تھی اور وہ ان کے غسل میں بھی شریک تھیں، اس موقع پر انہوں نے گولی لگنے سے ہونے والے زخم سے خون رستے دیکھا تھا۔

ان دو متضاد بیانات سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی موت کا سبب متعین کرنا بظاہر مشکل نظر آ رہا ہے، جبکہ بہت سے حلقوں کی طرف سے، جن میں امریکا کی صدارتی امیدوار ہیلری کلنٹن بھی شامل ہیں، اس سانحہ کی عالمی سطح پر تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا ہے جس کے جواب میں وزارت داخلہ کے ترجمان بریگیڈیئر (ر) جاوید اقبال چیمہ نے کہا ہے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں، البتہ اگر بے نظیر بھٹو کے ورثا چاہیں تو ان کا شک دور کرنے کے لیے قبر کشائی کر کے محترمہ بے نظیر بھٹو کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اخبار میں شائع ہونے والی یہ خبر بھی قابل توجہ ہے کہ ہسپتال سے محترمہ بے نظیر بھٹو کے علاج سے متعلقہ تمام ریکارڈ غائب کر دیا گیا ہے۔

دوسری طرف اس الم ناک سانحہ کی ذمہ داری کے حوالے سے پہلے یہ خبر منظر عام پر آئی کہ ''القاعدہ'' نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی ہے اوراس کے ترجمان نے کہا ہے کہ ہم نے ایسا کر کے امریکا کا ایک قیمتی اثاثہ ختم کر دیا ہے، لیکن اس کے بعد ''القاعدہ'' کی طرف سے اس کی تردید بھی آگئی ہے کہ اس کے ترجمان نے یہ بیان نہیں دیا۔ اس کے ساتھ ہی وزارت داخلہ کے ترجمان کی طرف سے وزیرستان کے ایک کمانڈر بیت اللہ محسود کی ایک اور صاحب کے ساتھ ہونے والی ٹیلی فونک

گفتگو کی تفصیل جاری کی گئی ہے جس میں انہوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے اس کو بڑا کارنامہ قرار دیا ہے اور یہ کام کرنے والوں کارکنوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو ان کے والد محترم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا ہے اور ان سطور کی اشاعت تک پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت ان کے جانشین کا انتخاب کر چکی ہوگی جس کے بارے میں اخباری قیاس آرائیاں یہ ہیں کہ آصف علی زرداری کی طرف سے پارٹی کی قیادت سنبھالنے سے معذرت کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کی بہن صنم بھٹو یا ان کے فرزند بلاول بھٹو زرداری میں سے کسی کا انتخاب کیا جا سکتا ہے، جبکہ بے نظیر بھٹو کے اس المناک قتل کے بعد ۸ جنوری کو عام انتخابات کا انعقاد بھی سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے۔ ملک بھر میں تمام انتخابی سرگرمیاں معطل ہیں، پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں محمد نواز شریف نے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا ہے۔ ان سطور کی اشاعت تک پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت بھی الیکشن کے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکی ہوگی اور غالب گمان یہ ہے کہ اگر پی پی پی نے بھی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تو ۸ جنوری کو عام انتخابات کا انعقاد ممکن نہیں رہے گا، مگر اس صورت میں آئینی الجھنوں سے نمٹنے کے لیے دوبارہ ایمرجنسی کا نفاذ بھی امکان سے باہر نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی حلقوں میں صدر مشرف کی حکومت کے مستقبل کا سوال بھی زیر بحث ہے اور کہا جا رہا ہے کہ جنرل (ر) پرویز مشرف پر اقتدار سے الگ ہونے کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب اس دباؤ کا مزید مقابلہ نہ کر سکیں۔ شاید یہی صورت حال سامنے رکھ کر میاں محمد نواز شریف نے الیکشن کے التوا اور ایک ایسی قومی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا ہے جس میں پرویز مشرف کا کوئی کردار نہ ہو۔

بہر حال اس پس منظر میں آج اور کل کے دن بہت زیادہ اہم ہیں اور ملک کی قومی سیاست کے ساتھ ساتھ قومی وحدت اور ملی سالمیت کے مستقبل کا سوال بھی آج اور کل کے فیصلوں سے منسلک ہے، اس لیے کہ پنجاب میں سندھ سے تعلق رکھنے والے سابق وزیر اعظم کے قتل کی بات بعض حلقوں کی طرف سے بار بار کہی جا رہی ہے اور یہ بات اس تناظر میں اور بھی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے کہ بلوچستان میں پہلے ہی پنجاب کے خلاف سیاسی جذبات کو ابھارنے کا عمل جاری ہے اور یوں محسوس

ہوتا ہے کہ جنوبی ایشیا کے سیاسی نقشے میں بعض عالمی طاقتوں کی مجوزہ تبدیلی اور پاکستان کو اس کے موجودہ مقام وحیثیت سے (خاکم بدہن) محروم کرنے کے منصوبے کو دھیرے دھیرے آگے بڑھایا جا رہا ہے اور نواب اکبر بگٹی مرحوم کے قتل کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل سے پیدا شدہ صورت حال کو بھی اس کے لیے بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کر لی گئی ہے۔

یہ صورت حال ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں کے لیے حقیقی معنوں میں لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک جس اندرونی خلفشار کا شکار ہے اور وطن عزیز کے خلاف عالمی سطح پر سازشوں کے جو تانے بانے بنے جا رہے ہیں، اس سے ملک وقوم کو بحفاظت باہر نکالنے اور اس کے مستقبل کے بارے میں پیدا کیے جانے والے شکوک وسوالات کو عملاً رد کر کے ایک بہتر مستقبل کی طرف قوم کی راہنمائی کرنے کی ذمہ داری بہرحال سیاسی اور دینی زعما پر عائد ہوتی ہے جس کے لیے انہیں گروہی، علاقائی، طبقاتی اور جماعتی مفادات سے بالاتر ہو کر سر جوڑنا ہوگا اور ایک ایسی قومی مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مقصد قیام اور اس کے دستور وآئین کی بالادستی کی طرف پیش رفت کے ساتھ ساتھ ملکی سالمیت اور قومی وحدت کے لیے بھی ضمانت بن سکے۔ یہ اس وقت ہماری قومی سطح کی دینی سیاسی قیادت کا امتحان ہے اور اگر ہمارے زعما اس وقت بھی اپنے اپنے محدود دائروں کے خول سے نہ نکل سکے اور قومی مفاہمت کے ساتھ ملک وقوم کی قیادت کی ذمہ داری (خدانخواستہ) نہ نبھا سکے تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم محترمہ بے نظیر بھٹو کے المناک قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے ان کے خاندان اور پارٹی کے ساتھ ان کے غم میں شرکت کا اظہار کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں اور وطن عزیز کی سالمیت اور مظلوم پاکستانی قوم کی وحدت کی حفاظت فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔*

O

---

* روزنامہ اسلام، ۳۱ دسمبر ۲۰۰۷ء۔

بلاول بھٹو زرداری سے چند گزارشات

محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ کی جگہ ان کے بیٹے بلاول بھٹو زرداری کو پاکستان پیپلز پارٹی کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت مکمل کرنے تک ان کے والد جناب آصف علی زرداری کو شریک چیئرمین کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہے، جبکہ مخدوم امین فہیم کو آئندہ وزارت عظمیٰ کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح پاکستان پیپلز پارٹی کی آئندہ قیادت کے خدوخال کچھ نہ کچھ واضح ہو گئے ہیں۔ چیئرمین شپ کو بھٹو خاندان میں رکھنا ہمارے خطے کی روایتی مجبوری ہے کہ مغرب کی طرز کی خالص جمہوریت ہمیں راس نہیں آتی اور خاندانی عقیدت اور وابستگی کا پیوند لگائے بغیر ہمارے ہاں جمہوری اور عوامی قیادت بھی مکمل نہیں ہو پاتی۔ بھارت میں نہرو خاندان اور پاکستان میں بھٹو خاندان اس کی واضح مثالیں ہیں اور ان کے علاوہ مولانا فضل الرحمٰن، اسفند یار ولی اور محمود اچکزئی جیسے سیاسی قائدین کے نام بھی اس روایت کے تسلسل کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ہمیں پی پی کے داخلی معاملات میں دخل اندازی کا حق نہیں ہے، لیکن ایک ہمدرد کے طور پر رائے تو دے سکتے ہیں اور اس حوالے سے ہماری رائے یہ ہے کہ اگر پیپلز پارٹی کی قیادت کے خانے میں بھٹو خاندان، زرداری خاندان اور مخدوم امین فہیم کے ساتھ جناب اعتزاز احسن کو بھی فٹ کر لیا جاتا یا اب کر لیا جائے تو خود پی پی کے لیے بھی یہ بہت فائدے کی بات ہے۔ بھٹو خاندان کے ساتھ بے لچک اور مسلسل سیاسی وفاداری کے ساتھ ساتھ ملک میں دستور کی بالادستی کے لیے جدوجہد نے

جناب اعتزاز احسن کے لیے یہ استحقاق پیدا کر دیا ہے کہ انہیں ان کی سیاسی جماعت کی قیادت میں باقاعدہ شریک کیا جائے اور اس معروضی حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دینا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں ہوگا۔

بلاول زرداری نے اپنے نام کے ساتھ بھٹو کا لفظ بھی شامل کر لیا ہے اور اب وہ بلاول بھٹو زرداری کہلائیں گے تاکہ بھٹو خاندان کے ساتھ ان کی نسبت قائم رہے۔ اس پر بعض حلقوں میں چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں، لیکن ہمارے خیال میں یہ کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ حضرت امام جعفر صادق سے کسی نے سوال کیا تھا کہ جناب آپ کا خاندان اولاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہلاتا ہے، حالانکہ آپ حضرات کا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتے کا تعلق حضرت فاطمہ کے حوالے سے ہے جبکہ نسب تو باپ کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق نے جواب میں فرمایا کہ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ کو اولاد آدم میں شمار کیا ہے، حالانکہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور ان کا آدم کے ساتھ رشتہ ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم کے ذریعے ہے، اس لیے اگر حضرت عیسیٰ حضرت آدم کی اولاد میں شمار ہوتے ہیں تو ہمیں بھی اولاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہلانے کا حق ہے۔ علاوہ ازیں ایک حدیث مبارکہ میں بھی یہ آتا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ایک خاندان کے لوگوں سے بات کرنے کے لیے انہیں ایک جگہ جمع ہونے کو کہا اور فرمایا کہ صرف اس خاندان کے افراد جمع ہوں اور جب وہ ایک چار دیواری میں جمع ہو گئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دریافت کیا کہ کیا خاندان سے باہر سے کوئی شخص تو تمہارے اندر موجود نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اور تو کوئی نہیں ہے، لیکن ہمارا ایک بھانجا یہاں بیٹھا ہے جو دوسرے خاندان سے ہے۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں، 'ابن اخت القوم منھم'، بھانجا بھی قوم میں شمار ہوتا ہے۔ اس لیے اگر بلاول زرداری نے اپنی نسبت بھٹو خاندان کے ساتھ مستقل طور پر رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو اس میں ہمارے خیال میں کوئی زیادہ اشکال کی بات نہیں ہے۔

بلاول بھٹو زرداری ۱۹ سالہ نوجوان ہیں اور انہوں نے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی تربیت بھی ہونی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دوران پارٹی کے معاملات آصف

زرداری ہی چلائیں گے اور اپنی تعلیم اور تربیت مکمل کرنے کے بعد بلاول اپنی نئی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ ہم اس موقع پر عزیز بلاول کے ساتھ ان والدہ محترمہ کی المناک شہادت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کا جانشین منتخب ہونے پر انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ان کے ایک بہی خواہ اور ہمدرد ہونے کے ناتے سے ایک دو گزارشات ان سے کرنا چاہتے ہیں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ وہ اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھیں کہ بھٹو خاندان کے موجودہ سیاسی قد کاٹھ، ملکی وبین الاقوامی تعارف اور لیڈرشپ کی ساکھ کا اصل سرچشمہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی شخصیت ہے۔ ان کی فکر وجدوجہد سے پاکستانی عوام کی ایک بڑی تعداد کی ہمدردیاں اور سیاسی وابستگی اس خاندان کو بھٹو مرحوم کی وجہ سے حاصل ہے اور بھٹو مرحوم کی جن خدمات اور کارناموں نے انہیں قومی اور بین الاقوامی سیاست میں یہ مقام بخشا ہے، ملک کے عام لوگوں کی نظر میں اس کا نقشہ کچھ اس طرح ہے:

☆ انہوں نے مزدور، کسان اور دیگر محنت کش اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کو حقوق کا شعور دیا اور ان میں اس کے لیے آواز بلند کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔

☆ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان کو سنبھالا اور ملک کے تمام سیاسی حلقوں کو اعتماد میں لے کر ملک کی تعمیر نو کا آغاز کیا۔

☆ ملک کے دینی، سیاسی اور علاقائی گروہوں کو اعتماد کی لڑی میں پرو کر ۱۹۷۳ء کا متفقہ دستور دیا جو آج بھی ملک کے تمام طبقوں کا متفقہ دستور ہے اور قومی وحدت کا ضامن ہے۔

☆ اسلام، جمہوریت یا سوشلزم کی بحث کو ملک کی اعلیٰ ترین قیادت کو اپنے ساتھ رکھتے ہوئے ۱۹۷۳ء کے دستور میں سمو کر ہمیشہ کے لیے یہ بات طے کرا دی کہ ملک میں جمہوری حکومت ہوگی جو قرآن وسنت کے دائرے میں رہتے ہوئے ملک کا نظام چلائے گی۔

☆ ایک صدی سے لاینحل چلا آنے والا قادیانی مسئلہ حل کیا اور اس سلسلے میں پوری دنیا کی امت مسلمہ کا اعتماد حاصل کیا۔

☆ لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد کر کے عالم اسلام کی وحدت کے ساتھ پاکستان کی

عملی وابستگی کا اظہار کیا۔

☆ پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی طرف پیش رفت کی اور اسے پاکستان اور عالم اسلام کی ضرورت قرار دیتے ہوئے عالم استعمار کی دھمکیوں کے باوجود ایٹمی پروگرام کو پروان چڑھایا۔

یہ وہ کارنامے ہیں جن کا پاکستان پیپلز پارٹی کے باشعور رہنماؤں اور کارکنوں کی زبان پر اکثر تذکرہ رہتا ہے اور جن کا بھٹو مرحوم کے سیاسی مخالفین بھی اعتراف کرتے ہیں۔اس لیے ہمارے خیال میں یہ بھٹو مرحوم کا ورثہ ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری اب بلاول بھٹو زرداری پر آپڑی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پی پی پی کی نئی قیادت اور اپنا وقت آنے پر بلاول بھٹو زرداری اپنی سیاسی پالیسیاں اور ترجیحات طے کرتے وقت ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ان کارناموں اور اصولوں کو ضرور پیش نظر رکھیں گے جن کی وجہ سے بھٹو خاندان اور پی پی پی کو قومی اور بین الاقوامی سیاست میں یہ مقام حاصل ہوا ہے۔

عزیز بلاول سے دوسری گزارش ہم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے دبئی پہنچنے کے بعد ان سے منسوب ایک انٹرویو ان کی ویب سائٹ کے حوالے سے سامنے آیا ہے جس میں انہوں نے دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ وہ لبرل مسلمان ہیں اور اس انتہا پسندی کے خلاف ہیں جو اسلام کے بارے میں سترھویں صدی کی مخصوص تشریح کو زبردستی مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے نماز اور ڈاڑھی کے لیے زبردستی کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔اگرچہ ان کے والد محترم جناب آصف علی زرداری نے ایک بیان میں اس ویب سائٹ کے بارے میں تحفظات کا اظہار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ایسی ویب سائٹ بلاول بھٹو زرداری کا امیج خراب کرنے کے لیے سازش کے تحت بنائی گئی ہے،لیکن اس کے باوجود چونکہ بلاول بھٹو زرداری کی عمر اور ان کے معاشرتی طبقے اور کلاس کے نوجوانوں کا عام ذہن اسی نوعیت کا ہے اور اس میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں ہے کہ انہیں اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے جو ذرائع میسر ہیں، ان سے اسلام کے بارے میں اسی طرح کا تاثر قائم ہوسکتا ہے، چنانچہ مسلم دنیا کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت، جن کی اسلامی تعلیمات کے اصل سورسز تک رسائی نہیں ہے، اسلام کے بارے میں

یہی ذہن رکھتی ہے، اس لیے اگر بلاول بھٹو زرداری نے یہ بات کہہ دی ہے تو اس میں ہمارے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور اس میں ہم ان نوجوانوں کو قصوروار بھی نہیں سمجھتے کہ اصل قصور ہمارے تعلیمی نظام اور تربیتی سسٹم کا ہے جو اسلامی تعلیمات کے اصل سورسز تک آج کے نوجوانوں کی رسائی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ قصور عصری نظام کا ہے کہ اس کا ایجنڈا ہی یہی ہے اور دینی نظامِ تعلیم کا بھی ہے کہ وہ آج کے ان جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں تک اپروچ کی سرے سے ضرورت ہی محسوس نہیں کر رہا جنہوں نے کل اس قوم کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔

اس لیے ہم عزیز بلاول سے اس مسئلے کی تمام جزئیات وتفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ سترھویں صدی یا اکیسویں صدی کے چکر میں نہ پڑیں اور اسلام کو اس کے اصل سورسز (۱) قرآن کریم، (۲) سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (۳) اسوۂ خلفاے راشدین کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں، انہیں ان شاء اللہ کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے کچھ عرصہ قبل اپنے دانشوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسلام کی اسٹڈی کریں اور یہ بات بھول جائیں کہ اسلام کے بارے میں ان کے بڑوں نے کیا کہا ہے اور موجودہ مسلمان کیسے نظر آ رہے ہیں، بلکہ اسلام کو اس کے اصل سورسز سے اسٹڈی کریں۔ شہزادہ چارلس کا یہی مشورہ عزیز بلاول کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہم ان کی زندگی اور کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔*

O

---

* روزنامہ پاکستان، لاہور۔

عام انتخابات کے نتائج اور متحدہ مجلس عمل

۱۸ر فروری کو ہونے والے عام انتخابات کے نتائج ملک بھر میں زیر بحث ہیں اور ان کے حوالے سے ملک کے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ نتائج خلاف توقع نہیں ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات جس رخ پر آگے بڑھ رہے تھے، ان سے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ الیکشن میں ووٹروں کا ٹرن آؤٹ کم رہے گا، پیپلز پارٹی سیٹوں کے حصول میں سب سے آگے رہے گی اور مسلم لیگ ق کے ساتھ ساتھ متحدہ مجلس عمل کو بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بہر حال اب قومی سیاست کی نئی صف بندی ہو چکی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (ن)، پاکستان مسلم لیگ (ق)، متحدہ قومی موومنٹ اور نیشنل عوامی پارٹی اس پوزیشن میں آ گئی ہیں کہ وہ مرکز اور صوبوں میں حکومت سازی کے لیے کسی نہ کسی درجے میں کوئی کردار ادا کر سکیں اور اس کے لیے مختلف سطحوں پر جوڑ توڑ کا سلسلہ جاری ہے۔

الیکشن کے نتائج سے ظاہر ہے کہ جتنے لوگوں نے بھی ووٹ ڈالے ہیں، ان کی غالب اکثریت نے سابقہ حکومت کی پالیسیوں کو مسترد کر دیا ہے اور ملک کی رائے عامہ کی یہ خواہش نمایاں نظر آ رہی ہے کہ الیکشن کے بعد صرف حکومت ہی تبدیل نہ ہو، بلکہ قومی پالیسیوں میں بھی واضح تبدیلی نظر آئے، لیکن صدر پرویز مشرف مسلسل اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ حکومت بے شک الیکشن کے نتائج کی روشنی میں نئی بن جائے، لیکن ان کی پالیسیوں کا تسلسل اسی طرح جاری رہے اور عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والی نئی حکومت عوامی رجحانات کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد بنانے کی بجائے صدر

پرویز مشرف کی پالیسیوں کو بدستور قائم رکھے، جبکہ اس مقصد کے لیے انھیں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی سفارتی سرگرمیوں کی حمایت حاصل ہے۔ دوسری طرف سابقہ حکمران پارٹی کے ذمہ دار راہ نماؤں کا کہنا ہے کہ ان کی شکست کے اسباب میں (۱) امریکہ نواز پالیسی، (۲) قبائلی علاقوں میں فوج کشی، (۳) لال مسجد کے خلاف وحشیانہ آپریشن (۴) مہنگائی میں ہوش ربا اضافے اور (۵) عدلیہ کی بالادستی کے خلاف کیے جانے والے اقدامات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے جس کا مطلب ظاہر ہے کہ عوام نے ان پالیسیوں کو مسترد کر دیا ہے اور وہ ان میں جوہری تبدیلیوں کے خواہاں ہیں، اس لیے اس مرحلے میں سابقہ حکومت کی پالیسیوں کا تسلسل جاری رکھنے کی کوششیں الیکشن کے نتائج اور ملک کی رائے عامہ کے اجتماعی فیصلے کو مسترد کرنے کے مترادف ہوں گی۔ ایسی کوششوں کو آگے بڑھانے میں سب سے زیادہ افسوس ناک کردار امریکہ سمیت ان مغربی ممالک اور حکومتوں کا دکھائی دے رہا ہے جو مشرف حکومت کی پالیسیوں کو بچانے کے لیے منتخب سیاسی پارٹیوں کی لیڈرشپ پر دباؤ ڈال رہی ہیں اور اگر خدانخواستہ یہ کوششیں کامیاب ہوگئیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پاکستان میں ۱۸رفروری کے انتخابات کا ڈول صرف چہروں کی تبدیلی کے لیے ڈالا گیا تھا اور قومی پالیسیوں کے حوالے سے پاکستان کے عوام کی رائے کو کوئی حیثیت نہیں دی جارہی جو انتہائی افسوس ناک اور مایوس کن بات ہوگی۔ اس لیے ان انتخابات میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والی سیاسی جماعتوں کی قیادتوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ ان کی سیاسی فراست، حب الوطنی اور حوصلہ وتدبر کا امتحان ہے کہ وہ اس الیکشن کے نتیجے میں صرف چہروں کی تبدیلی اور حکومتی مناصب پر اکتفا کرتی ہیں یا عوامی رائے اور رجحانات کا احترام کرتے ہوئے سابقہ حکومت کی ان پالیسیوں کو تبدیل کرنے میں بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی ہیں جن پر نہ صرف یہ کہ عوام کی ایک بڑی اکثریت نے انتخابات میں عدم اعتماد کر دیا ہے بلکہ لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے ان پالیسیوں کے ساتھ شدید نفرت کی وجہ سے پولنگ اسٹیشنوں تک آنا بھی گوارا نہیں کیا۔

ہمارے ہاں سیاسی عمل اور ووٹ کے ذریعے تبدیلی کے طریق کار پر لوگوں کا اعتماد پہلے ہی کم ہوتا جا رہا ہے جو ۱۸رفروری کے انتخابات میں ڈالے جانے والے ووٹوں کے تناسب سے واضح طور

پر محسوس کیا جا رہا ہے اور اگر ووٹ ڈالنے والوں کا اعتماد بھی اس عمل پر باقی نہ رہا تو سیاسی عمل کی افادیت سے عام لوگوں کی یہ مایوسی شدید ردعمل کا باعث بھی بن سکتی ہے جس کا ان نازک حالات میں ہمارا ملک متحمل نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) اور دوسری بڑی سیاسی جماعتیں اس مرحلے پر ذمہ داری اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عوامی رجحانات کی پاس داری کے لیے موثر کردار ادا کریں گی اور جمہوری عمل کو مایوسی اور تذبذب کی دلدل کی طرف دھکیلنے کی بجائے امید اور حوصلہ افزائی کی شاہراہ پر گامزن کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی کہ قوم کے بہتر اور روشن مستقبل کی طرف یہی راستہ جاتا ہے۔

اس موقع پر ہم متحدہ مجلس عمل کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ پانچ سال قبل ہونے والے عام انتخابات میں دینی جماعتوں کے اس متحدہ محاذ نے جو پیش رفت کی تھی، اس سے ملک میں نفاذ اسلام اور دینی اقدار کے تحفظ وفروغ کے حوالے سے امید کی ایک کرن ذہنوں میں نمودار ہونے لگی تھی اور عوام یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ پاکستان جس مقصد کے لیے وجود میں آیا تھا، اس کی تکمیل کا کوئی راستہ اب نکل آئے گا، لیکن حالیہ الیکشن سے قبل متحدہ مجلس عمل کے باہمی خلفشار اور الیکشن میں اس کی پسپائی نے امید کی اس شمع کو گل کر دیا ہے اور قومی سیاست میں دینی حلقوں کا کردار پھر ایک بار سوالیہ نشان بنتا جا رہا ہے۔

۲۰۰۲ کے انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی نمایاں کامیابی کے اسباب ہمارے خیال میں یہ تھے:

o یہ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والی دینی سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ تھا اور پاکستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ دینی جماعتوں نے جب بھی مسلکی دائروں سے بالاتر ہو کر دینی وقومی مقاصد کے لیے جدوجہد کی ہے، ملک کے عوام نے ان کا ساتھ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

o افغانستان پر امریکی اتحاد کی فوج کشی اور طالبان حکومت کے جبری خاتمہ نے پاکستانی عوام کے دینی جذبات میں ہلچل پیدا کر دی تھی جس کا براہ راست فائدہ دینی جماعتوں کے اس متحدہ محاذ کو ہوا۔

o مغرب کی فکری یلغار اور اسلامی اقدار کے خلاف مغربی لابیوں کی طوفانی پیش قدمی میں پاکستانی عوام یہ امید کر رہے تھے کہ اس کی روک تھام کے لیے متحدہ مجلس عمل کوئی بھرپور کردار ادا کر سکے گی۔

اس پس منظر میں عوام کی ایک بڑی تعداد نے متحدہ مجلس عمل کا ساتھ دیا اور قومی اسمبلی اور سینٹ میں معقول نمائندگی کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد کی حکومت اور بلوچستان کی حکومت میں اشتراک ایم ایم اے کے حصے میں آیا جس سے عوام کو حوصلہ ہوا کہ ان کے امریکہ مخالف جذبات اور نفاذ اسلام کی خواہش کو اچھی ترجمانی میسر آ گئی ہے، لیکن متحدہ مجلس عمل اپنے پانچ سالہ دور میں عوام کی توقعات اور امیدوں کا ساتھ نہیں دے سکی۔ اس سلسلے میں معترضین کی شکایات کی فہرست طویل ہے، لیکن چند امور ان میں ایسے ہیں جن پر سنجیدہ توجہ دینے کی ضرورت ہے:

o باجوڑ کے دینی مدرسہ پر امریکی بمباری کے موقع پر ملک بھر کے دینی حلقے بجا طور پر یہ توقع کر رہے تھے کہ صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت اور متحدہ مجلس عمل کی قیادت عوام کی احتجاجی لہر کی قیادت کرے گی، مگر ایم ایم اے نے عوامی احتجاج کی قیادت پر اپنی حکومت کے تحفظ کو ترجیح دی جس سے دینی حلقوں کے جذبات کو دھچکا لگا۔

o حدود آرڈیننس کے بارے میں وفاقی حکومت کے عزائم سب پر واضح تھے اور اس نے حدود شرعیہ کا تیا پانچہ کر دیا، مگر متحدہ مجلس عمل کا کردار اس میں یہ رہا کہ نہ تو وہ خود اس سلسلے میں اپنے بلند بانگ دعووں کو عملی جامہ پہنا سکی اور نہ ہی اس نے اس کے لیے کوئی دوسرا احتجاجی فورم وجود میں آنے دیا، حتیٰ کہ ''مجلس تحفظ حدود شرعیہ پاکستان'' کے عنوان سے ایک احتجاجی فورم تشکیل پاتے پاتے رہ گیا اور اس کے تشکیل نہ پا سکنے کی بنیادی وجہ ایم ایم اے کی قیادت کا طرز عمل تھا۔

o لال مسجد کے سانحہ میں بھی متحدہ مجلس عمل سے جس کردار کی توقع ملک کے عوام اور خاص طور پر دینی حلقے بجا طور پر رکھتے تھے، ایم ایم اے کی قیادت نے خود کو اس کردار سے دور رکھا۔ اس سلسلے میں عوامی جذبات اور احتجاج کی قیادت کرنا اور اسے صحیح رخ پر رکھتے ہوئے موثر بنانا بنیادی طور پر متحدہ مجلس عمل کی ذمہ داری تھی، لیکن ایم ایم اے کی قیادت کی ترجیحات میں یہ ذمہ داری اپنی جگہ نہ بنا

سکی جس کا خمیازہ اپنے دائرے میں تھوڑا بہت کردار ادا کرنے والے وفاق المدارس العربیہ کو بھگتنا پڑا اور لوگوں کے جذبات کی شدت کا رخ اس کی طرف مڑ گیا حالانکہ کوئی احتجاجی تحریک سرے سے وفاق المدارس کے دائرۂ کار میں ہی شامل نہیں تھی اور نہ ہی یہ اس کی ذمہ داری بنتی تھی۔

o متحدہ مجلس عمل کی قیادت سے لوگوں کو یہ توقع تھی کہ وہ اپنے دائرے میں ملک کے ان دیگر دینی حلقوں کو بھی شامل کرنے کا راستہ اختیار کرے گی جو دینی وملی مقاصد میں اس کا ساتھ دے سکتے ہیں اور اس طرح یہ متحدہ محاذ زیادہ موثر حیثیت حاصل کرے گا، لیکن ایم ایم اے سے باہر کے دینی حلقوں کو اعتماد میں لینے کی بجائے خود اس کے داخلی حلقوں کا باہمی اعتماد بھی مسلسل سکڑنے لگا جو پہلے دو جماعتوں (جمعیۃ علماے اسلام اور جماعت اسلامی) کے دائرے تک محدود ہوا اور پھر ان دونوں میں ایک دوسرے پر بالا دستی حاصل کرنے کی کشمکش نے الیکشن سے قبل متحدہ مجلس عمل کا شیرازہ مکمل طور پر بکھیر کر رکھ دیا۔ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اگر جمعیۃ علماے اسلام اور جماعت اسلامی ہی ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کی بجائے باہمی اعتماد کے ساتھ حالیہ الیکشن میں کوئی مشترکہ موقف اختیار کر لیتیں تو صورت حال اس قدر خراب نہ ہوتی۔

o اس سب کچھ کے باوجود بلوچستان کی حد تک ہمیں یہ توقع تھی کہ جمعیۃ علماے اسلام ان انتخابات میں پہلے سے زیادہ اچھی پوزیشن حاصل کر لے گی اور متحدہ مجلس عمل کا صف اول کا سیاسی کردار باقی رہ جائے گا مگر وہاں بھی جمعیۃ علماے اسلام میں پیدا ہو جانے والے باہمی خلفشار پر حکمت عملی کے ساتھ قابو پانے کی بجائے دستوری موشگافیوں کو ترجیح دی گئی جس سے سیاسی عمل میں جمعیۃ کی مزید پیش رفت کا خواب بکھر کر رہ گیا۔

ان حالات میں متحدہ مجلس عمل کے گزشتہ پانچ سالہ سیاسی کردار پر ایک حد تک مایوسی کا اظہار کرنے کے باوجود بھی ہماری شدید خواہش ہے کہ ایم ایم اے کا فورم قائم رہے اور وہ مذکورہ بالا شکایات کا ازالہ کرتے ہوئے مستقبل کے سیاسی سفر میں باہمی اشتراک وتعاون کو جاری رکھنے کا اہتمام کرے۔

ہمیں متحدہ مجلس عمل سے یہ شکایت نہیں ہے کہ وہ اپنے حکومتی دائرے میں نفاذ اسلام کا اہتمام

کیوں نہیں کر سکی، کیونکہ ہم بخوبی یہ بات سمجھتے ہیں کہ موجودہ حکومتی نیٹ ورک میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے جس کی تصدیق حسبہ بل کے ساتھ وفاقی دار الحکومت کی طرف سے روا رکھے جانے والے طرز عمل نے کر دی ہے، البتہ ہم اس شکایت کو بے جا نہیں سمجھتے کہ عوام کے دینی جذبات کی ترجمانی، دینی حلقوں کے درمیان مفاہمت وتعاون کو وسعت دینے اور ان کی احتجاجی قوت کو منظّم واستعمال کرنے کے لیے متحدہ مجلس عمل جو کچھ کر سکتی تھی اور جو کچھ اسے کرنا چاہیے تھا، وہ نہیں ہوا اور متحدہ مجلس عمل کی پالیسی ترجیحات میں آہستہ آہستہ معروضی اور روایتی سیاست کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر متحدہ مجلس عمل اور دینی جماعتوں نے بھی معروضی سیاست ہی کو اوڑھنا بچھونا بنانا ہے تو اس کے لیے دوسری روایتی سیاسی جماعتیں ہی کافی ہیں اور وہ ان سے زیادہ اچھے انداز میں معروضی سیاست کے تقاضے پورے کر رہی ہیں۔ دینی جماعتوں کا اصل اور امتیازی کردار ہمارے نزدیک یہ ہے کہ وہ معروضی سیاست میں صرف اس حد تک ملوث ہوں جتنا نظریاتی اور دینی مقاصد کے لیے ناگزیر حد تک ضروری ہو۔ وہ اسے اساس بنا کر موجودہ عالمی اور قومی تناظر میں دینی اقدار کے تحفظ وفروغ اور نفاذ اسلام کے لیے پیش رفت کا راستہ نکالیں اور اس سلسلے میں عوامی احتجاج کی قیادت کریں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اب بھی متحدہ مجلس عمل کے قائدین ایک بار پھر مل بیٹھیں اور گزشتہ کوتاہیوں کا احساس وادراک کرتے ہوئے باہمی مفاہمت واعتماد کے ساتھ آگے بڑھنے کا راستہ اختیار کر لیں تو بہت سی باتوں کی تلافی ہو سکتی ہے اور قومی سیاست میں دینی جماعتوں کے کردار کو موثر بنانے کے راستے نکل سکتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہماری یہ گزارشات متحدہ مجلس عمل کے قائدین کے اذہان وقلوب تک رسائی حاصل کر پائیں اور دینی جدوجہد کے از سر نو منظّم ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، آمین یارب العالمین۔*

O

* ماہنامہ الشریعہ، مارچ ۲۰۰۳ء۔

نئے وزیرِاعظم کو درپیش چیلنج

جناب یوسف رضا گیلانی کے وزیرِاعظم منتخب ہونے کے ساتھ ہی ۱۸ر فروری ۲۰۰۸ء کو ہونے والے عام انتخابات کے نتیجے میں تبدیلیوں کا عملی آغاز ہوگیا ہے اور عدلیہ کے قابلِ صد احترام جج صاحبان کی رہائی کے حکم کے ساتھ یوسف رضا گیلانی نے اپنی حکومتی ترجیحات کا خود اظہار کر دیا ہے۔ اس سے عام شہریوں کو اطمینان حاصل ہوا ہے کہ ملک کے عوام نے ۱۸ فروری کو اپنے ووٹ کے ذریعے رائے عامہ کے اجتماعی رجحانات کی جو جھلک دنیا کے سامنے پیش کی ہے، اسے احترام کا عملی درجہ حاصل ہونے والا ہے۔

یوسف رضا گیلانی پاکستان پیپلز پارٹی کے اہم رہنماؤں میں سے ہیں۔ انہوں نے کئی برس جیل میں گزار کر پارٹی کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دیا ہے اور پارٹی کی قیادت اور پالیسیوں کے ساتھ ان کی وفاداری کا تسلسل انہیں اس مقام تک لے آیا ہے کہ وہ نہ صرف پاکستان پیپلز پارٹی کے نمائندے کے طور پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیرِاعظم کے منصب پر فائز ہوئے ہیں، بلکہ پاکستان مسلم لیگ (ن)، نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کے ساتھ ساتھ متحدہ قومی موومنٹ نے بھی انہیں اپنے اعتماد سے نوازا ہے۔ اس طرح وہ ملک کی بہت سی پارٹیوں کے مشترکہ نمائندہ کے طور پر اپنے اقتدار کا دور شروع کر رہے ہیں۔ یہ ان پر قوم کی غالب اکثریت کے اعتماد کا مظہر ہے اور ایک عظیم چیلنج کی حیثیت بھی رکھتا ہے کہ وہ متنوع مزاجوں اور مختلف خیالات کی حامل جماعتوں اور طبقات کو کس طرح ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

وزارت عظمٰی کے لیے ان کے انتخاب میں تنوع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کا تعلق ملتان سے ہے اور گزشتہ ۸ برس کے دوران یہ اعزاز ملتان کے حصے میں آیا ہے کہ اس کے سپوتوں مخدوم جاوید ہاشمی اور یوسف رضا گیلانی نے آمریت کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے بجائے عزیمت اور قربانی کا راستہ اختیار کیا اور ڈکٹیٹر شپ کو پورے حوصلہ کے ساتھ یہ پیغام دیا کہ آج کی سیاست میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مفادات اور اقتدار کی سیاست کرنے کے بجائے اصولوں اور اقدار کے ساتھ وابستہ رہتے اور ان کے لیے قربانیاں دینے کی ہمت رکھتے ہیں۔ اس لیے ۸ گزشتہ سالہ سیاسی دور کی تاریخ میں جب ایثار اور قربانی کے باب میں آصف علی زرداری، محترمہ بےنظیر بھٹو شہید، میاں محمد نواز شریف اور میاں شہباز شریف اور ان کے دیگر رفقا کے نام نمایاں ہوں گے تو جاوید ہاشمی اور یوسف رضا گیلانی کے نام بھی مستقل عنوانات کے ساتھ تاریخ کا حصہ بنیں گے۔

ملک کے نئے وزیراعظم کا ملتان کے ساتھ تعلق قومی سیاست میں اس نئی سیاسی کروٹ کا بھی عنوان ہے کہ پنجاب کی سرائیکی پٹی میں ایک عرصے سے جس محرومی کے احساس کا سیاسی حلقوں میں تذکرہ چل رہا ہے اور اس محرومی کے احساس کو کیش کرانے کی مختلف اطراف سے مسلسل کوششیں بھی ہو رہی ہیں، اس کے مداوے کی صورت سامنے آئی ہے اور یوسف رضا گیلانی کا ایک امتحان یہ بھی ہے کہ وہ سرائیکی پٹی کے اس مبینہ احساس محرومی کی تلافی کے لیے اپنے اس دورِ اقتدار میں کیا کچھ کر پاتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر وہ اپنی پالیسیوں اور طرز عمل سے اس احساس کو کم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کی یہ کامیابی سیاسی اور نظریاتی دونوں حوالوں سے قومی وحدت کے استحکام کا باعث بنے گی اور انہیں بےشمار اصحاب دل کی دعائیں ملیں گی۔

قومی سیاست میں اس پیش رفت پر جناب یوسف رضا گیلانی کے ساتھ ساتھ انہیں آگے لانے والی پارٹیوں پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (ن)، نیشنل عوامی پارٹی، جمعیت علماے اسلام پاکستان اور ایم کیو ایم کے قائدین بھی مبارک باد کے مستحق ہیں اور ہم اس اجتماعی سیاسی قیادت بالخصوص جناب رضا یوسف گیلانی کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں اور اس مرحلے میں ملک کے ایک عام شہری کے طور پر یہ عرض کرنا چاہتے

ہیں کہ بلاشبہ ان کے سامنے مسائل کا انبار ہے اور مشکلات کا اس قدر ہجوم ہے کہ

تن ہمہ داغ داغ شد

پنبہ کجا کجا نہم

کا منظر دکھائی دے رہا ہے، اس لیے انہیں ان مسائل اور مشکلات کے حل کی ترجیحات طے کرنے میں یقیناً وقت لگے گا اور ان ترجیحات کے مطابق عملی پیش رفت میں بھی دیدہ اور نادیدہ رکاوٹوں سے قدم قدم پر سابقہ پیش آئے گا، مگر ملک کا ایک عام شہری اس فضا میں ان سے کیا توقعات رکھتا ہے، اس کا ایک ہلکا سا نقشہ ہمارے خیال میں کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ:

o اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ ہم قومی سطح پر اپنے فیصلے خود کرنے کا اپنا اختیار بحال کریں۔ بدقسمتی سے اس وقت عام تاثر یہی ہے اور یہ خلاف واقعہ نہیں ہے کہ ہم اپنے فیصلے اور پالیسیاں طے کرنے میں خود مختار نہیں ہیں۔ اس لیے جب تک ہم اپنا یہ اختیار اور اس پر عوام کا اعتماد بحال نہیں کر لیتے، قومی سطح پر جتنی اچھی پالیسیاں بھی بنائی جائیں اور جتنے عمدہ فیصلے بھی کر لیے جائیں، ان کے گرد شکوک وشبہات کی دھند ڈیرہ ڈالے رہے گی اور شکوک وشبہات کی فضا میں اچھے سے اچھا فیصلہ بھی اپنے مطلوبہ نتائج اور مقاصد حاصل نہیں کر سکتا۔

o دستور کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کا اہتمام بھی ہمارا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ بھی بدقسمتی کی بات ہے کہ دستور اور قانون کو ہمارے ہاں اب تک حکمرانی کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا، بلکہ یہ دو ہتھیار ہیں جنہیں ہم ہر سطح پر اپنے مقاصد اور مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس طرز عمل میں ہمارا کوئی طبقہ اور فرد (اکا دکا مستثنیات کے ساتھ) پیچھے نہیں ہے۔ جس کا جب اور جہاں داؤ لگتا ہے، وہ اس سے گریز نہیں کرتا۔ اس لیے جب تک ہم دستور اور قانون کو ہتھیار کے دائرے سے نکال کر حکمرانی کا درجہ نہیں دیتے اور اس کے لیے خلوص دل کے ساتھ قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، ہم قوم کے بہتر مستقبل بلکہ اسے مزید خلفشار، انارکی اور بربادی سے بچانے کے لیے بھی کچھ نہیں کر پائیں گے۔

o کرپشن ہمارا تیسرا بڑا مسئلہ ہے۔ بدعنوانی ہمارے قومی مزاج اور کلچر کی علامت بن کر رہ گئی

ہے۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا: جب امانت ضائع ہونے لگے تو قیامت کا انتظار کرنا۔ سوال کرنے والے نے دریافت کیا کہ امانت کے ضائع ہونے کی عملی صورت کیا ہوگی؟ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب معاملات نااہل لوگوں کے سپرد کیے جائیں تو پھر قیامت ہی کا انتظار کرنا۔ یہ کرپشن کی بدترین شکل ہے کہ مناصب اور عہدے اہلیت، دیانت اور صلاحیت کے بجائے دوسری ترجیحات کے حوالے سے سپرد کیے جائیں اور اس کرپشن کے نتیجے میں ہم صرف قیامت کا انتظار ہی نہیں کر رہے، بلکہ دنیا کی قیامت بھگت بھی رہے ہیں، لیکن اپنے کسی سطح کے معاملات کے لیے اہلیت، دیانت، صلاحیت اور قومی ضروریات کو بنیاد بنانے کے لیے تیار نہیں۔ کرپشن کا دوسرا بڑا پہلو قومی خزانے کی لوٹ مار ہے جو ہر سطح پر اور ہر انداز سے جاری ہے۔ جس کو بھی موقع ملتا ہے، وہ اس لوٹ مار میں اپنا حصہ وصول کرنے میں حجاب محسوس نہیں کرتا اور قومی ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود کا ہر منصوبہ اس دلدل میں پھنس کر اپنے وجود تک سے محروم ہو جاتا ہے۔

ہمیں اس وقت قوم کو درپیش عملی مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ عدلیہ کی بحالی کا مسئلہ ہو، ملک کے مختلف حصوں میں اپنے ہی بھائیوں کے خلاف فوجی آپریشن روکنے کی بات ہو، مہنگائی کے عفریت کو قابو میں لانے کا معاملہ ہو، دہشت گردی کو کنٹرول کا قضیہ ہو، جامعہ حفصہ کی بحالی کا مطالبہ ہو، خفیہ اداروں کے ذریعے غائب کیے جانے والے شہریوں کا المیہ ہو، صوبائی خودمختاری کی بحالی کا سوال ہو یا غریب اور نادار طبقات کی زندگی اجیرن ہو جانے کا مسئلہ ہو، یہ اور ان جیسے دیگر مسائل ہمارے عملی مسائل ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اپنی اہمیت اور سنگینی میں کم نہیں ہے، لیکن ہم نے جن تین اصولی مسئلوں کا ذکر کیا ہے، ان سب عملی مسائل نے انہی کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور جب تک ہم قومی خودمختاری کے تحفظ، دستور و قانون کی بالادستی اور کرپشن کے خاتمہ کے لیے قومی سطح پر کوئی واضح لائحہ عمل اور دوٹوک پالیسی طے نہیں کرتے اور حکومتی اقدامات کے دائرے سے باہر نکل کر ان کے لیے قومی مہم کی کوئی مشترکہ صورت اختیار نہیں کر لیتے، یہ مسائل جنم لیتے رہیں گے اور ان کی سنگینی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ گندگی کے ڈھیر موجود رہیں گے تو جراثیم پیدا ہوتے رہیں گے اور بیماریاں

پھیلتی رہیں گی۔ ہم نے اب تک گندگی کے ڈھیر باقی رکھتے ہوئے ان پر وقتاً فوقتاً چونا یا دیگر جراثیم کش ادویات ڈالتے رہنے کی جو روش اپنا رکھی ہے، یہ مسائل کا حل نہیں ہے اور اگر نئی حکومت نے بھی یہی روش اختیار کی تو نرم سے نرم الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اور اس کی پیش رو حکومت میں ایک عام شہری کی نظر میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور یہ ملک وقوم کی ایک اور بڑی بدقسمتی ہوگی۔

جناب یوسف رضا گیلانی اور ان کی ٹیم کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ہم ان سے گزارش کر رہے ہیں کہ قومی اہداف کی طرف حوصلہ سے آگے بڑھیے۔ قوم تو ساتھ ہی ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بھی آپ پر سایہ فگن ہوں گی۔*

O

* روزنامہ پاکستان، ۲۸ مارچ ۲۰۰۸ء۔

ججوں کی بحالی اور جامعہ حفصہ کا مسئلہ

۳۰ر اپریل کو لندن پہنچا ہوں۔ دو ہفتے قیام رہے گا۔ ۱۳ر مئی کو ورلڈ اسلامک فورم کا سالانہ اجلاس ہے اور ۱۵ر اپریل کو واپس گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مختلف طبقات کے احباب سے ملاقاتیں ہو رہی ہیں اور بہت سے مسائل گفتگو کا حصہ ہیں، مگر جو دوست بھی ملتا ہے، اس کا پہلا سوال جج صاحبان کی بحالی کے بارے میں ہوتا ہے، دوسرا جامعہ حفصہ کے بارے میں اور پھر اس کے بعد دوسرے مسائل کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے۔ عدلیہ کی خودمختاری اور معزز جج صاحبان کی بحالی کی بارے میں پاکستان طرح یہاں بھی پریشانی کی عمومی فضا پائی جاتی ہے اور پاکستانیوں کے ساتھ ساتھ بھارتی اور بنگلہ دیشی احباب بھی اس پریشانی میں شریک ہیں، بلکہ ان کی تشویش زیادہ دکھائی دے رہی ہے۔ عمومی تاثر یہاں بھی یہی ہے کہ پاکستان میں دستور وقانون کی بالادستی اور عدلیہ کی خودمختاری کے لیے یہ فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ اگر وکلا کی یہ تحریک اپنے منطقی نتیجے تک پہنچتی ہے اور حکمران اتحاد کے وعدے کے مطابق جج صاحبان بحال ہو جاتے ہیں تو پاکستان میں قانون کی حکمرانی اور قومی اداروں کے استحکام کے حوالے سے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے اور اگر خدانخواستہ یہ جدوجہد منطقی نتائج حاصل نہیں کر پاتی تو آمریت کے سائے اور گہرے ہوتے چلے جائیں گے اور دستور وقانون کے عنوان سے ملک میں اسلام اور جمہوریت کا خواب دیکھنے والوں کو شاید ایک بار پھر ''زیرو پوائنٹ'' سے اپنی جدوجہد کا آغاز کرنا پڑے گا۔

میاں محمد نواز شریف اور جناب آصف زرداری کے دوبئی میں ہونے والے مذاکرات کی

خبریں میں نے لندن میں پڑھیں اور سنیں۔ بھارت سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان دوست کے گھر میں جیو پر خبریں سن رہا تھا تو صاحب خانہ نے تقریباً پھٹ پڑنے کے انداز میں سوال کیا کہ یہ آصف زرداری صاحب کیا کر رہے ہیں؟ ان کا کہنا تھا کہ میاں محمد نواز شریف کا موقف مضبوط اور اصولی ہے اور آصف زرداری صاحب لیت ولعل سے کام لے رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے خیال میں آصف زرداری صاحب موجودہ انتخابات کے نتائج کی بنیاد پر اس سلسلے میں اس سے قبل ہونے والی ''انڈرسٹینڈنگ'' کے دائرے میں سیاست کر رہے ہیں، جبکہ میاں نواز شریف حالیہ انتخابات کے نتائج پر نہیں بلکہ اگلے انتخابات کے امکانات کے حوالے سے سیاسی صف بندی میں مصروف ہیں، اس لیے باہمی کولیشن کے باوجود دونوں کے سیاسی اہداف الگ الگ ہیں۔

جامعہ حفصہ کے بارے میں دوستوں کا شکوہ ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے اور حکم کے باوجود اس کی دوبارہ تعمیر کا سلسلہ شروع نہیں کیا گیا، جامعہ فریدیہ کی تعلیمی سرگرمیوں کی بحالی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے، مولانا عبدالعزیز کی رہائی کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے لیے دینی حلقوں میں کوئی تحریک بھی نظر نہیں آ رہی۔ میں نے ان دوستوں کو بتایا کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد کی بات تو خود سپریم کورٹ کی پوزیشن واضح ہونے کے بعد آگے بڑھے گی۔ سپریم کورٹ نے صرف جامعہ حفصہؓ کی دوبارہ تعمیر کا حکم نہیں دیا، بلکہ جامعہ حفصہ کے خلاف وحشیانہ آپریشن کے ذمہ داریوں کے تعین اور اس کے قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بارے میں بھی وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی رٹ درخواست بھی عدالت عظمیٰ میں موجود ہے جس میں آپریشن کے ذریعے سینکڑوں طالبات اور افراد کو شہید کرنے پر ذمہ دار حضرات کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کی استدعا کی گئی ہے۔ یہ سب معاملات معزز جج صاحبان کی بحالی کے بعد آگے بڑھیں گے اور اخباری اطلاعات کے مطابق مولانا فضل الرحمٰن نے بھی حکمران اتحاد میں شمولیت کے لیے اپنی شرائط اور ترجیحات میں جامعہ حفصہؓ کے مسئلہ کو حل کرنے کی شق شامل کر رکھی ہے۔

اس سلسلے میں گزشتہ دنوں اسلام آباد میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی ایک اعلیٰ سطحی مشاورت میں، جس میں راقم الحروف بھی شریک تھا، سپریم کورٹ میں اس مسئلے میں پیش رفت کی

درخواست دائر کرنے پر غور ہوا تو وفاق المدارس کے وکیل جناب سید افتخار گیلانی نے مشورہ دیا کہ ابھی انتظار کیا جائے اور جج صاحبان کی بحالی کی صورت حال واضح ہو جانے کے بعد اس سلسلے میں کوئی مزید قدم اٹھایا جائے۔ البتہ اس سے ہٹ کر بعض دوستوں کا خیال ہے کہ اگر جامعہ حفصہ کے کیس کو دوبارہ فرنٹ پر لانا ہے اور رائے عامہ کو منظم و متحرک کرنا ہے تو اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ راولپنڈی میں مخدوم جاوید ہاشمی صاحب کی خالی کردہ سیٹ پر مولانا عبدالعزیز یا ان کی اہلیہ ام حسان کو قومی اسمبلی کے ضمنی الیکشن میں کھڑا کر دیا جائے۔ اس طرح راولپنڈی ایک بار پھر جامعہ حفصہ اور لال مسجد کی تحریک کا مورچہ بن جائے گا، ملک بھر کی رائے عامہ اس طرف متوجہ ہوگی اور یہ سیاسی مورچہ لال مسجد کی تحریک کے لیے اس مسلح مورچے سے زیادہ موثر ثابت ہو سکتا ہے جس کا اختتام وحشیانہ آپریشن اور سینکڑوں مظلوموں کی الم ناک شہادت پر ہوا تھا۔ مجھ سے دریافت کیا گیا تو میں نے عرض کیا کہ مجھے اس تجویز سے اتفاق ہے اور میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ باقی بہت سے معاملات سے قطع نظر اگر ضمنی الیکشن میں اس سیٹ پر مولانا عبدالعزیز یا ان کی اہلیہ یہ غازی عبدالرشید شہیدؒ کی اہلیہ بطور امیدوار سامنے آ جائیں تو جامعہ حفصہ کے مسئلہ کے حل اور نفاذ شریعت کی جدوجہد میں پیش رفت کے لیے قومی اسمبلی کا یہ حلقہ ایک مضبوط مورچہ اور موثر فورم بن سکتا ہے۔

O

وکلا کا لانگ مارچ اسلام آباد پہنچ گیا ہے اور اس کے قائدین کا عزم ہے کہ وہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سمیت تمام معزول ججوں کی بحالی تک اپنی یہ جدوجہد جاری رکھیں گے۔ لانگ مارچ میں ملک بھر سے وکلا اور سیاسی جماعتوں کے کارکن شریک ہیں اور ان کی تعداد لاکھوں میں بتائی جاتی ہے۔ اگرچہ پنجاب کے گورنر جناب سلمان تاثیر نے اسے ''شارٹ مارچ'' سے تعبیر کر کے اور اس کا نتیجہ ''زیرو بٹا زیرو'' بتا کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن سیاسی حلقے سمجھ رہے ہیں کہ وکلا نے دستور کی بالادستی، عدلیہ کی خودمختاری اور پی سی او کے تحت معزول کیے جانے والے معزز ججوں کی بحالی کے لیے جو صبر آزما جدوجہد شروع کر رکھی ہے، اس میں واضح پیش رفت نظر آ رہی ہے اور اس کا فوری نتیجہ خدانخواستہ نہ برآمد ہوا تو بھی لانگ مارچ سے اس تحریک کو آگے بڑھانے کا حوصلہ ملا ہے اور اگر وکلا کی قیادت نے حوصلہ نہ ہارا تو وہ قوم کو دستور کی بالادستی اور خودمختار عدلیہ کی منزل سے ہم کنار کرنے میں ضرور کامیاب ہوگی۔ اس تحریک میں میاں محمد نواز شریف اور عمران خان کی شرکت سے سیاسی حلقوں اور قاضی حسین احمد کی شمولیت سے دینی حلقوں کی نمائندگی بھی اک حد تک دکھائی دے رہی ہے، ورنہ دینی حلقوں کی معروف قیادتیں اس کی صف اول میں کہیں نظر نہیں آ رہیں، حالانکہ اپنے موقف اور کاز کے حوالے سے دستور کی بالادستی اور عدلیہ کی خودمختاری کے لیے سب سے زیادہ انھیں متحرک ہونا چاہیے تھا۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ شخصی حکومت کی بجائے دستور و قانون کی حکومت کی بات کرتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا کہ ''اپنے حکمرانوں کی بات سنو

اوران کی اطاعت کرو، اگر چہ تم پر سیاہ فام اور ناک کٹا حبشی غلام ہی حکمران بنادیا جائے، جب تک کہ وہ تم میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت کریں۔'' اس ارشاد نبوی سے علمائے عمرانیات نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ اسلام میں حکومت موروثی نہیں ہے اور ایک حبشی غلام بھی حکومت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور اسی طرح اسلام میں شخصی حکومت کی کوئی گنجایش نہیں، بلکہ حکمران کو قانون ودستور (کتاب اللہ) کے دائرے میں رہنا ہوگا۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ پر مشتمل خلافت راشدہ میں خلافت کا تسلسل موروثیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ عوامی رائے اور شورائیت کے حوالے سے تھا، حتیٰ کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جب حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری اختیار کی اور امت مسلمہ نے انھیں خلیفۃ المسلمین تسلیم کرلیا تو ان کی اس خلافت کی بنیاد بھی موروثیت پر نہیں تھی اور موروثی خلافت کا آغاز ان کے بعد ان کے بیٹے یزید کے خلیفہ بننے سے ہوا جس کے بعد موروثی خلافت کو نظریہ ضرورت کے تحت صدیوں تک تسلیم تو کیا جاتا رہا، لیکن اسے کبھی آئیڈیل اور اصولی حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد اپنے پہلے خطبے میں قرآن وسنت کے احکام کی پابندی کا اعلان کیا اور اپنی رعیت کو اختیار دیا کہ اگر وہ قرآن وسنت کے خلاف چلیں تو ان کا محاسبہ کیا جائے اور انھیں سیدھا کر دیا جائے۔ تاریخ میں اسے ''قانون کی حکمرانی'' کا نام دیا گیا اور اسلام کا مزاج یہی ہے، اسی لیے جب پاکستان بننے کے بعد تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علمائے کرام نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات کا اعلان کیا تو اس میں یہ اصول واضح طور پر طے کر دیا کہ حکومت عوام کی منتخب کردہ ہوگی اور دستور کی پابند ہوگی۔ اس میں علمائے کرام نے ایک مستقل دفعہ کے طور پر یہ اصول پیش کیا کہ رئیس مملکت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ وہ دستور یا اس کے کسی جز و کو معطل کر کے اپنی مرضی سے حکومت کرنے لگے۔

اس اصول کی روشنی میں دینی جماعتوں کی یہ ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ پی سی او کے خاتمہ اور دستور کی بالادستی کے لیے چلائی جانے والی اس تحریک کا ساتھ دیتیں بلکہ اس کی قیادت میں پیش پیش ہوتیں، لیکن جماعت اسلامی کے سوا کوئی دینی جماعت اس میں نمایاں دکھائی نہیں دے رہی۔ جمعیۃ علمائے

پاکستان کے انجینئر سلیم اللہ خان، جمعیۃ علماے پاکستان کے پیر سید امین الحسنات شاہ صاحب اور جمعیۃ اہل حدیث کے پروفیسر ساجد میر صاحب شخصی طور پر اس تحریک کی حمایت میں سرگرم ہوئے، لیکن اپنی جماعتوں کو متحرک نہ کر سکے۔ جمعیۃ علماے اسلام کے مولانا فضل الرحمٰن نے گزشتہ پی سی اوز کی آڑ لیتے ہوئے موجودہ پی سی او کی خلاف تحریک کا حصہ بننے سے گریز کیا ہے بلکہ تحفظات کا اظہار کر کے من جملہ مخالفت ہی کے راستے کو ترجیح دی ہے، حالانکہ اگر گزشتہ پی سی اوز کے خلاف کوئی تحریک منظّم نہیں ہوسکی تو اس سے ان کے جواز پر استدلال نہیں کیا جا سکتا اور اسی طرح اگر موجودہ پی سی او کے خلاف تحریک کا ماحول بن گیا ہے تو ماضی کے کسی غلط طرزِ عمل کو اس میں شرکت سے گریز کا بہانہ بنانا درست طرزِ عمل نہیں ہے۔ دستور کو جب بھی معطل کیا گیا اور جس نے بھی کیا، وہ نہ دستوری اور قانونی لحاظ سے صحیح تھا، نہ اخلاقی اور سیاسی حوالے سے جائز تھا اور نہ ہی قرآن وسنت اور علما کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات کی روشنی میں اس کا کوئی جواز بنتا ہے، مگر مولانا فضل الرحمٰن گزشتہ پی سی اوز کو قبول کیے جانے کی آڑ میں موجودہ پی سی او کو جواز کا راستہ دینے کی بالواسطہ کوشش کر رہے ہیں جو ایک دینی جماعت کی قیادت کے شایانِ شان نہیں ہے اور انھیں بہرحال اس پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

مولانا سمیع الحق کی جمعیۃ علماے اسلام نے گزشتہ دنوں وکلا کی تحریک کی حمایت اور اس میں شریک ہونے کا اعلان کیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے جمعیۃ (س) کے راہ نماؤں کو مبارک باد بھی دی، مگر وہ بھی اعلان اور قرارداد سے آگے نہ بڑھ سکے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وکلا کی اس تحریک میں جو اپنے موقف کے حوالے سے بالکل درست اور قومی امنگوں کا ترجمان ہے، علماے کرم کی دور دور تک نمائندگی موجود نہیں ہے اور کم وبیش علما کی سب جماعتیں خاموش تماشائی بنی ہوئی ہیں۔ ہم نے پاکستان شریعت کونسل کے فورم سے پنجاب بار کونسل لاہور میں وکلا کے متعدد اجلاسوں میں شرکت کی اور اخبارات میں تحریک کی حمایت کا بار بار اعلان بھی کیا، مگر ہم بھی اس اعلان تک ہی محدود رہے اور ہماری مجبوری یہ تھی کہ پاکستان شریعت کونسل اپنی ہیئت اور دستور کے حوالے سے تحریک یا انتخابی سیاست میں حصہ دار نہیں بن سکتی اور اس کا دائرہ علمی اور فکری راہ نمائی تک محدود ہے۔

گزشتہ منگل کو جب راقم الحروف، مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر اور مولانا

حافظ ذکاء الرحمٰن اختر کے ہمراہ لاہور ہائی کورٹ بار کے کراچی ہال میں منعقدہ وکلا کے اجلاس میں شریک ہوا اور وہاں موجود قیادت کو وکلا کی تحریک کی حمایت کا یقین دلایا تو دوسری طرف سے بھی کوئی نمایاں ردعمل سامنے نہیں آیا جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ شاید وکلا کی قیادت بھی یہ چاہتی ہے کہ علما اور دینی جماعتیں اس تحریک کا ساتھ تو دیں اور اس میں شریک بھی ہوں، لیکن تحریک میں وہ نمایاں نظر نہ آئیں اور نہ ہی اسلام کا نعرہ اس فورم سے بلند ہونے پائے۔ انھوں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ وکلا تحریک کی قیادت اسلام کے حوالے سے بین الاقوامی دباؤ کا شکار ہے اور تحریک میں سول سوسائٹی کے نام سے جو این جی اوز گھس گئی ہیں، بلکہ پیش پیش ہیں، ان کی کوشش بھی یہ ہے کہ اسلام کا نعرہ اور علما کی جماعتیں اس تحریک سے دور ہی رہیں۔

بہرحال دینی جماعتوں کے اپنے تحفظات ہوں، وکلا تحریک کی قیادت پر بین الاقوامی دباؤ ہو یا سول سوسائٹی کے پردے میں متحرک این جی اوز کی کارستانی ہو، اس وقت وکلا کی تحریک اور دینی جماعتوں کے درمیان صورت حال کچھ اس طرح کی ہی دکھائی دے رہی ہے کہ

کچھ وہ کھچے کھچے رہے، کچھ ہم کھچے کھچے رہے
اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا